digest.library.com/ http://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

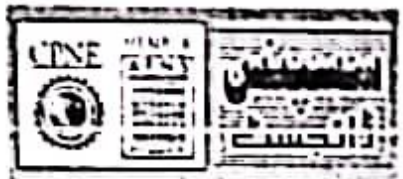

انشائیہ — جون ایلیا — 07
عصری المیہ کا آفاقی حل
نکتہ رس کی نکتہ رسی

آپ کے خط — مدیر اعلیٰ — 08
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں اگلے شکوے اور پرخلوص مشورے

ظالم مظلوم — زویا صفوان — 12
[illegible] کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار [illegible] آموز اور عبرت آمیز واقعات

بدقسمتی — عاطر شاہین — 37
سابقہ بیوی کو قتل کرنے والے ایک شخص کی بدقسمتی

رمز شناس — نازیہ کامران کاشف — 44
خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

سونے کا راستہ — ماہ وش طالب — 57
[illegible] ایک [illegible] والے [illegible] ناکامی

پیش کار — مرزا امجد بیگ — 72
قتل کر کے اپنا جرم دوسرے کے سر ڈالنے والے مجرم کا قصہ

بلائے ناگہانی — عائشہ نصیر — 95
ناگہانی مصیبت کا شکار ایک شخص کی بے بسی

پختہ عزم — اے ار راجپوت — 99
محبت میں دھوکا کھانے والی ایک لڑکی کی کتھا

عذرا رسول

مدیر
اطہر حسین

نائب مدیرہ
شازیہ حمیر

مارکیٹنگ و سرکولیشن منیجر
ثمر عباس
0301-2454188

جلد 55 • شمارہ 02 فروری 2026 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 200 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:ldpgroup@hotmail.com

digest library.com/
https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

محفلِ شعر و سخن
108
قارئین

آپ کے ہاتھوں کی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

دور دیس کا مہمان
109
جاوید بسام

ایک مسرے ہوئے شخص کا اپنے
قاتل سے انوکھا انتقام

جگنو
118
ڈاکٹر عبدالوہاب ہنی

معاشرتی ناسوروں اور ان کی خوں ریز یلغار کا
زخم زخم ہونے والا ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

زنجیر
141
محمد فاروق انجم

بیوی کی گمشدگی پر
پریشان شوہر کا احوال

ایک لوہار کی
151
آصفہ ضیا احمد

غربت کے ہاتھوں
مجبور ایک ماں کی کہانی

آخری وکیل
163
ڈاکٹر طیب سنگھانوی

انسانیت کی خاطر ایک وکیل
کی خطرناک دشمنوں سے جنگ

ابوعلی شیخ بخارا
173
ضیا تسنیم بلگرامی

عظمت کے مینار جن کی روشنی
سے ایک جہان منور ہوا

غلط فہمی
181
عمران قریشی

غلط فہمی کا شکار ایک
لڑکی کا انوکھا انتقام

وہم
191
عیوق بخاری

معمولات زندگی کو بے جان
چیزوں سے متھی کرنے والی لڑکی کا وہم

دیس پردیس
198
ناہید سلطانہ اختر

دلوں میں امنگ آنکھوں میں سہانے خواب سجائے
پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان

کرن کرن
90
ادارہ

دنیا بھر کے ادھر ادھر کے لطیفے چٹکلے اقتباسات
مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ ایک ساتھ

پبلشر و پروپرائٹر: ذبیشان رسول ● مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 نیو آئیکس لبنشن ایکسٹینشن، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ● مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

digest library
https://www.urdudubes.com/
Scanned with CamScanner

انشائیہ

جون ایلیا

منطق اور فلسفہ

تم دیکھ رہے ہو کہ انسانوں نے انسانیت کی طرف سے کس طرح آنکھیں پھیر لی ہیں۔ محبت ہماری بستیوں میں کس طرح نایاب ہو گئی ہے۔ ہر طرف نفرت کا دور دورہ ہے۔ نفرت کے جو مناظر ہم نے اپنے دور میں دیکھے ہیں، انہوں نے انسانیت کی نگاہیں نیچی کر دی ہیں۔ سیاست نے کیا کیا؟ زندگی کے خلاف فقط سازشیں کیں۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ زندگی حرام ہو کر رہ گئی ہے۔ غرض مند علم نے کیا فرض انجام دیا؟ جہل کے حوصلے بڑھائے۔ اس کا فیضان یہ ہے کہ لوگ بدی کے نئے نئے گر سیکھ گئے ہیں۔

ہمارے مدبر بے تدبیری میں طاق اور مشاق ہیں۔ سن لو! وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں جو غریبوں، سادہ لوحوں اور مظلوموں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا جانی دشمن بنا دیں۔ جھگڑا آخر کیوں کھڑا کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ مظلوم اور محروم آپس میں ٹکرا جائیں اور ظالم اور غاصب تماشا دیکھیں۔ یہی ان کا تدبر ہے اور یہی ان کی حکمت۔

سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ تعصب کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔ اگر یہ لوگ فریب کار نہیں ہیں تو یقیناً فریب خوردہ ہیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس ملک میں جتنی نفرتیں پھیلائی ہیں، وہ پڑھے لکھے لوگوں ہی نے پھیلائی ہیں۔ یہاں پڑھا لکھا ہونا اور متعصب ہونا دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ علم نے جہل کو جس گرمجوشی کے ساتھ اپنے سینے سے لگا رکھا ہے، وہ ہمارے زمانے کا ایک طرفہ ماجرا ہے۔

تم ان لوگوں سے بات کرو جو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اگر انہیں بری طرح بہکا نہ دیا گیا ہو تو پھر تم دیکھو گے کہ نہ ان میں زبان کا تعصب ہے اور نہ علاقے کا۔ اگر انہیں کسی پر غصہ آئے گا یا وہ کسی وجہ سے کسی سے نفرت کریں گے تو وہ اپنے غصے اور اپنی نفرت کے حق میں کوئی فلسفہ نہیں گھڑیں گے۔ ان کی نفرت اس شخص کی ذات سے آگے نہیں بڑھے گی جس سے انہیں کوئی اذیت پہنچی ہو۔ مگر یہ پڑھے لکھے لوگ اپنی نفرت اور غصے کو ایک منطق اور فلسفہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ مفسدانہ کلیے بناتے ہیں اور گروہوں کے درمیان مستقل فتنے پھیلاتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی زبان سے اس قسم کے مقولے سننے کو ملتے ہیں کہ فلاں قوم تعصبی ہوتی ہے۔ اس قسم کے بے رحمانہ کلیے صرف چند مثالوں کو سامنے رکھ کر بڑی شتابی اور نہایت بے حسی اور بے شرمی کے ساتھ لاکھوں کروڑوں انسانوں پر تھوپ دیے جاتے ہیں۔

آج کل ان "حکیمانہ کلیوں" اور "دانشمندانہ مقولوں" کی سماعتوں کے بازاروں میں بڑی مانگ ہے۔ لوگ یہ کلیے اور مقولے تحفے کے طور پر ایک دوسرے کی سماعت کو پیش کرتے ہیں۔ زہر ہے کہ پھیل رہا ہے، نفرتیں ہیں کہ بڑھ رہی ہیں۔ عقل دیوانی ہو گئی ہے اور دماغ ماؤف اور دانش بے دانشی کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی بکواس کر رہی ہے۔ سمجھا جائے کہ ہم اپنی تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ہیں وہاں خود غرض اور مطلبی طبقے اسی قسم کے شوشے اٹھایا کرتے ہیں۔ اسی طرح کے اشکلے چھوڑا کرتے ہیں ورنہ تم خود سوچو کہ زبانوں، تہذیبوں اور علاقوں کے درمیان بھلا کیا جھگڑا ہے۔ آخر اس بات کے کیا معنی ہیں کہ میں فلاں گروہ سے اس لیے نفرت کرنے لگوں کہ وہ ایک خاص زبان بولتا ہے اور ایک خاص گرد و پیش سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر گروہ کو اپنے گروہ کے سوا ہر گروہ کا دشمن ہونا چاہیے۔ یہ کتنی مجنونانہ بات ہے اور کتنی بے معنی۔ سنو کہ ہمیں اس بات کو اور ایسی ہی باتوں کو سختی سے رد کرنا ہے۔

Scanned with CamScanner

آپ کے خط

قارئین کرام!

السلام علیکم!

فروری 2026ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ماہِ فروری میں ہم "یوم یکجہتی کشمیر" مناتے ہیں اور کیوں نہ منائیں..... یہ ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ دنیا بھر میں جہاں جہاں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، اس کے خلاف آواز بلند کریں۔ مسئلہ کشمیر عالمی انسانیت کا ایک بڑا اہم اور نازک مسئلہ ہے جس کے لیے سالہا سال کی کوششوں کے باوجود نہ تو اقوامِ متحدہ کشمیریوں کو انصاف دلا سکی اور نہ بڑی عالمی طاقتوں نے کوئی منصفانہ کردار ادا کیا..... بلکہ انہی طاقتوں نے اقوامِ متحدہ کو بھی اپنا کردار ادا کرنے سے روکے رکھا۔ ظلم و بربریت کا یہ کھیل کب ختم ہوگا، کوئی نہیں جانتا۔ ماہ فروری میں ہی رمضان المبارک کی آمد ہے۔ یہ وہ مقدس مہینا ہے جس کے بارے میں حضور سرورِ کائناتؐ نے فرمایا کہ یہ برکتوں کا مہینا ہے۔ اسی ماہ مبارک میں قرآن کا نزول ہوا۔ روزہ ہمیں تقویٰ کا درس دیتا ہے۔ رمضان المبارک کا مہینا نفس کو روندنے اور روح کو تقویت فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، لہٰذا جو اس مہینے کو پائے، اسے چاہیے کہ وہ اس ماہ میں روزے رکھے اور اچھے عمل کرے۔ غریب بھائیوں کو نہ بھولے اور جتنا ہو سکے صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ دے..... مگر بدقسمتی سے یہاں اس ماہ کے آتے ہی اشیائے خورونوش کو مہنگا کر دیا جاتا ہے، روزمرہ اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ جبکہ غیر مسلم اپنے تہواروں پر ہر چیز کی قیمت آدھی کر دیتے ہیں اور یہی نہیں، وہ ہمارے تہواروں پر بھی قیمتوں میں کمی کر کے آسانی فراہم کرتے ہیں مگر افسوس ہمارے لوگ اس کا الٹ کرتے ہیں۔ حکومت کی جانب سے بھی کھوکھلے بیانات کے سوا کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ روزمرہ اشیاء پر اتنا ہی منافع رکھنا چاہیے جو جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ماہِ صیام کی رحمتیں و برکتیں سمیٹنے، نیک کام کرنے اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی توفیق دے، آمین۔ اب چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب جہان قارئین کے خوبصورت تبصرے ہمارے منتظر ہیں۔

● سید محی الدین اشفاق، فتح پور لیہ سے خط لکھ رہے ہیں۔ "ٹھنڈے ٹھار سرما میں نئے سال کا پہلا سسپنس ڈائجسٹ مل چکا ہے۔ رسالہ لینے میں دیر سویر ہو جاتی تھی لیکن اب ہم نے ڈائریکٹ ادارے سے ڈیل کر لی ہے اور الحمدللہ ادارہ ہمیں بہت جلد رسالہ بھجوا دیتا ہے۔ انتظار کی کوفت ختم اور وقت پر پسندیدہ ڈائجسٹ مل جانے کی خوشی حاصل ہو گئی ہے۔ ادارے کا تہِ دل سے شکریہ کہ ہر موسم میں مطالعے کے شوقین لوگوں کے لیے اپنے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ اداریہ میں نئے برس کا استقبال کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، خدارا سب اس پر عمل کریں اور مدیر صاحب کی دعا پر صدقِ دل سے آمین کہیں۔ نئے برس کی خوشیوں میں ایک اور پاکیزہ خوشی ملنے والی ہے۔ وہ یہ کہ موسمِ بہار کی آمد کی خبر دیتے ماہِ فروری میں ماہِ صیام شروع ہو جائے گا۔ ایک ایک لمحہ برکت، رحمت اور سعادت لیے ماہِ مقدس ہمیں صاحبِ کتاب ہونے کی نوید بھی سناتا ہے۔ ادارہ، قارئین، لکھاریوں سمیت پورے پاکستان اور امتِ مسلمہ کو رمضان کی مبارک۔ اللہ ہمیں ان مقدس دنوں کی برکتیں سمیٹنے کی توفیق دے، آمین۔ شہرِ قائد کی روبینہ اشعر کرسیِ صدارت پر براجمان نظر آئیں۔ ان کا تبصرہ پڑھا تو ادارے کا فیصلہ انتہائی میرٹ پر نظر آیا۔ صدرِ محفل بننے کی مبارک ہو۔ سبیتا شاہ، ڈیرہ غازی خان سے خوبصورت تبصرہ لے کر آئیں۔ سیدہ روبینہ شاہین روبی، تھل کے خوبصورت ریت کے ٹیلوں سے دعائیں بھجواتی نظر آئیں۔ ان کی ہر دعا خدا قبول فرمائے اور نیا برس پاکستان و اہلِ پاکستان کے لیے خوشیوں بھرا ثابت ہو، آمین۔ عون احمد نے کہا ہے "ہو سکتا ہے شاعری میں حصہ لیں" بھئی "ہو سکتا" کو چھوڑ کر فوری حصہ لے کر ہمیں اپنے الفاظ سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ ملک وحید اور انجم فاروق ساحلی کی مختصر سہی لیکن حاضری تھی۔ رفعت مقصود بھی اپنے جاندار تجزیے کو لے کر آئیں، گڈ۔ سب سے پہلے "دیس پردیس" پڑھی۔ ناہید سلطانہ اختر بڑے دلکش انداز میں کہانی آگے بڑھا رہی ہیں۔ رجب علی پیسا اور خوبصورت بیوی پا کر ماں اور آپا جیسے رشتوں کو بھول گیا اور پھر اب اس کے ساتھ وہی ہو رہا ہے جو ایسوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ویسے نشاط بھی کافی ناشکری نکلی۔ شاید رجب کی خطاؤں کی سزا کے لیے وہ یوں بن گئی۔ اگلے حصے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ملک صفدر حیات نے "کینہ کش" میں کنگن بڑے دلچسپ انداز میں ڈھونڈے۔ ملازمین پر شک تھا لیکن نادان بیٹی کا تصور نکلا۔ اچھی تحریر تھی۔ عیوق بخاری کی "بدلا دسمبر" سبق دیتی اور امید دلاتی تحریر تھی۔ سانحہ مشرقی پاکستان کو مدِنظر رکھ کر لکھی گئی تحریر واقعی دلگداز تھی۔ زیب النسا بیگم نے نہ صرف ایک گھر سے محبت کرنے والی عورت اور سربراہ ہونے کا ثبوت دیا ساتھ ہی اس نے سانحہ 71ء کے بارے میں بات کر کے علم والی ہونے کا بھی بتایا اور جاندار انداز میں کہانی سنا کر اپنا بکھرتا شیرازہ سمیٹ لیا۔ نعمان اسحاق کی "ڈھلتا سورج" اور عمران قریشی کی "چارہ کار" عمدہ تحریریں تھیں۔ سارا رسالہ حسبِ روایت دلچسپ و معلومات افزا ہے۔"

● سبیتا شاہ کا تبصرہ، ڈیرہ غازی خان سے۔ "دلچسپ تحریروں سے سجا سالِ نو کا پہلا شمارہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں موصول ہوا۔ ٹائٹل پر ایک نظر ڈالی اور جون ایلیا کے انشائیے پر پوری توجہ۔ خطوط کی محفل میں روبینہ اشعر شمارہ جلدی مل جانے کی خبر کے ساتھ کرسیِ صدارت سنبھالے ہوئے تھیں۔ ان شاء اللہ کراچی پھر سے روشنیوں کا شہر بنے گا۔ تبصرہ شاندار تھا۔ دلچسپ تبصرے کے ساتھ سید محی الدین اشفاق بھی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ ملک و قوم کے لیے اچھی دعائیں لیے سیدہ روبینہ شاہین روبی بھی بہترین تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ عون احمد اور رفعت مقصود کی حاضری خوب رہی۔ روایت پسند ملک وحید کا مختصر نامہ زبردست تھا۔ انجم فاروق ساحلی کی گزشتہ شمارے کے حوالے سے حاضری اچھی رہی۔ کہانیوں میں اس بار "رمز شناس" سے آغاز کیا۔ مختلف سلسلوں سے جڑی قسط بہت دلچسپ تھی۔ ملک صفدر حیات کی "کینہ کش" میں خاندانی کنگن کا چوری ہونا اور چور تک پہنچنا سب دلچسپ تھا۔ لبنیٰ خان کی "جام اجل" میں بے خبر رک کا انجام بہت پسند آیا۔ اچھی تحریر تھی۔ جاوید بسام کی "مغربی کھڑکی" آنٹی میری کے باپ کو معصوم لڑکی کو سزا دینے کی سزا تو مل گئی مگر آنے والے وقت میں مغربی کھڑکی آنٹی میری کے لیے خوف کی علامت بن گئی۔ ماہ وش طالب کی "روڈ ٹرپ" میں سلویا کے دھوکے نے ڈیوڈ کو قاتل اور نفسیاتی مریض بنا دیا۔ اچھی کہانی تھی۔ عمران قریشی کی "چارۂ کار" سندس کے لالچ نے اسے واپس یتیم خانے پہنچا دیا۔ عیوق بخاری کی "بدلا دسمبر" میں گھر (پاکستان) کے ٹوٹنے کا زخم سہنے والی زیب النسا نے اپنی دانشمندی سے اپنا آشیانہ ٹوٹنے سے بچا لیا، عمدہ تحریر تھی۔ نعمان اسحاق کی "ڈھلتا سورج" کافی سارے دکھوں کو بیان کرتی تحریر دکھی کر گئی۔ ندیم رحمٰن ملک کی "آزمائش" سمجھنے سے قاصر رہے۔ اگلا صفحہ پلٹنا چاہا مگر کہانی تو ختم تھی۔ "دیس پردیس" میں رجب علی نے رشتوں پر کمائی کو ترجیح دی اور اب اس کے سارے رشتے ٹوٹتے بکھرتے جا رہے ہیں۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ "جنگ باز" کچھ خاص نہیں لگی۔ "جرم پرواز" مختصر مگر دلچسپ تھی۔ کترنیں اور محفل شعر و سخن زبردست تھے۔ ایم نذیر، کوئٹہ اور زینت اللہ خان، راولپنڈی کے انتخاب زیادہ پسند آئے۔ پورا شمارہ بہت زبردست رہا۔ سسپنس اور اس کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو۔"

● عون احمد ملیر کراچی سے رقم طراز ہیں۔ "نئے سال کا پہلا شمارہ دسمبر میں ہی موصول ہو گیا۔ یعنی سال کے بدلنے کا بھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سالِ نو کی مناسبت سے سرورق موزوں ترین تھا۔ نیا شادی شدہ جوڑا سمندر کی جانب رخ کیے آئندہ آنے والے سالوں کے لیے منصوبہ سازی میں مصروف ہے۔ سمندر کے اس پار حسینہ جانے کیا سوچ کر مسکرا رہی ہے۔ بہرحال اچھی، بری یادوں اور باتوں کے ساتھ 2025ء ماضی کا قصہ بن چکا۔ آنے والے سال کو خوش آمدید کہتے ہوئے سسپنس کے قارئین، ادارتی عملے اور پاکستانی عوام کے لیے دعا ہے کہ آنے والا سال ہر لحاظ سے ہم سب کے لیے مبارک ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کی نیک خواہشات کو پورا کرے، آمین۔ سرورق کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد خطوط کی محفل کا رخ کیا تو خوشی ہوئی کہ تقریباً ہر خط میں ہمارا ذکر موجود تھا۔ یاد رکھنے کا شکریہ۔ آپ سب احباب کی توجہ ہمارے لیے فخر و خوشی کا باعث بن گئی ہے۔ جون ایلیا انشائیے میں انسانیت کی بات کرتے نظر آئے۔ ان کے دنیا سے جانے کے اتنے برس بعد بھی انسانیت کا وہی حال ہے۔ سوائے امید اور اللہ سے دعا کے کوئی دوسرا چارہ نہیں۔ فہرست کی جانب رخ کیا تو اپنی پسندیدہ کہانیوں کو دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ جنگ باز، رمز شناس، دیس پردیس..... کس کس کی تعریف کی جائے۔ لیکن دیس پردیس پڑھتے ہوئے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ اتنی محنت اور جدوجہد کے بعد بنایا ہوا گھر نشاط کی ایک غلطی سے بری طرح ٹوٹ گیا۔ رجب اب کیا کرے گا، بچوں کا کیا بنے گا؟ یہ سب سوچتے ہوئے دل بہت خراب ہوا۔ گھر بنانے کے لیے عورت اور مرد دونوں کی بھرپور کوششیں شامل ہوتی ہیں جو کہ "دیس پردیس" میں نظر بھی آ رہی تھیں لیکن شیطان کے کاری وار نے ہنستا بستا گھر برباد کر ڈالا۔ آگے کی اقساط کا انتظار رہے گا۔ "ظالم مظلوم" میں پھولن پر ظلم کی انتہا ہو چکی ہے۔ ظلم بڑھتے بڑھتے مٹنے کے قریب آ چکا ہے۔ ٹھاکروں کا انجام بہت قریب ہے۔ پھولن کے فرار نے اسے ایک نئی راہ پر ڈال دیا ہے، دیکھیں اب اس کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ "جنگ باز" بھی اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ سہراب کے نت نئے ایڈونچر اسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہے۔ شکر ہے نگہت صحت یاب ہو گئی لیکن اب سلیم چھالیا کے مل جانے سے کیا کیا طوفان اٹھائے جاتے ہیں، آگے ہی پتا لگے گا۔ دیگر کہانیوں میں "بدلا دسمبر" حساس موضوع پر خوبصورتی کے ساتھ لکھی گئی کہانی تھی۔ اکیلے رہ کر پریشان ہونے سے بہتر ہے کہ سب کے ساتھ رہ کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔ رشتوں کی اہمیت، بزرگوں کا وقار، رکھ رکھاؤ سب کے ساتھ رہ کر ہی ہم اپنے بچوں میں منتقل کر سکتے ہیں۔ "کینہ کش" میں بٹ صاحب کنگن تلاش کرتے نظر آئے۔ اچھی کہانی تھی۔ "مغربی کھڑکی" بھی دلچسپ کہانی تھی۔ جاوید بسام نے اچھا انتخاب کیا۔ روحانی کہانی پڑھ کر دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس مرتبہ ابو علی شفیق بلخی کے حالات پڑھنے کا موقع ملا۔ دین کے پھیلاؤ کے لیے ان جیسے بزرگانِ دین کی کوششیں بے مثال ہیں۔ "روڈ ٹرپ" بھی اچھی کہانی تھی۔ سلویا کی بے وفائی بھی اس کے کام نہ آ سکی اور اسے جان سے جانا پڑا۔ بیچارہ ڈیوڈ نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار بن گیا۔ اشعار کا انتخاب بہت خوب تھا۔ اس کے علاوہ کترنیں بھی لاجواب تھیں۔ آپ کا انتخاب بہت عمدہ ہوتا ہے۔ رسالہ پڑھنے کے بعد سے ہی دوسرے شمارے کے انتظار کا عرصہ کچھ طویل محسوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش و خرم رکھے اور آپ لوگ اسی محنت سے ہمارے لیے شمارہ وقت پر لاتے رہیں، آمین۔ اگلے پرچے کے آنے تک خدا حافظ۔"

● سیدہ روبینہ شاہین روبی کی خوشی، تھل ساؤتھ پنجاب سے۔ "سالِ نو کی مبارک دیتا جنوری 2026ء کا سسپنس ہاتھوں میں ہے اور ہم بہت جلدی شمارہ مل جانے پر نہایت خوش ہیں۔ نئے سال پر یہ ایک نیک شگون ہے۔ ہمارے ہاں اس بار اسموگ سے سامنا نہیں کرنا پڑا اس لیے خدا کا شکر ہے کہ موسم سرما اچھا گزر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آنے والے دنوں میں بھی موسم کو سب کے لیے خوشگوار رکھے، آمین۔ سال کے پہلے شمارے میں صدر محفل بن جانے والی میری ہم نام کو ڈھیروں مبارک باد۔ روبینہ اشعر صاحبہ نے روشنیوں کے شہر سے بڑی جاندار حاضری دی۔ سیتا شاہ جی! شمارہ قدرے جلدی مل گیا تھا پھر بھی ٹائٹل سرسری نظر سے دیکھا؟ خیر آپ کی مرضی۔ سید محی الدین اشفاق امیدیں لے کر حاضر ہوئے۔ انہوں نے امید کا چراغ لے

https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

کر چلتے رہنے کی بڑی خوبصورت بات کہی ہے اور نئے سال کی مبارک باد دی ہے، خیر مبارک اور آپ کو بھی نئے سال کی ڈھیروں خوشیاں مبارک ہو۔ خدا آپ کی اور اہلِ وطن کی دو ساری توقعات پوری فرمائے جو گزشتہ برس پوری نہ ہو سکیں۔ عون احمد کی حاضری کی خوب دی۔ شاعری میں ان کی دلچسپی کا پڑھ کر اچھا لگا۔ ملک وحید "روایتی" انداز میں نظر آئے۔ انجم فاروق بھی مختصر حاضری میں شریکِ محفل تھے۔ رفعت مقصود صاحب! پچھلے شمارے کی سرورق کی لڑکی "دودھ ملائی پر پلی" آپ کی بات پڑھ کر رسالہ اٹھا کر دیکھا۔ واقعی آپ نے تو خوب گہرا جائزہ لیا تھا۔ زویا صفوان "ظالم مقلوم" کا سلسلہ نہایت اچھے انداز میں آگے بڑھا رہی ہیں۔ ملک صفدر حیات کی "کینہ کش" پڑھی۔ شروع سے آخر تک ساری تحریر دلچسپ تھی۔ رجو پر شک ہو رہا تھا لیکن مجرم کمر کی بیٹی نکلی۔ نعمان اسحاق کی "اے سورج" نے اداس کر دیا۔ مریم کی زندگی درد بھری تھی اور انجام بھی دردناک ہوا۔ عتیق بخاری نے متوفی اماکا کے پس منظر میں "بدلا و سمبر" لکھ کر جذباتی انداز میں سمیٹ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نا اتفاقی انسان کو سوا کرتی ہے اور جڑ جانا مضبوط و باوقار بناتا ہے۔ عائشہ نصیر کی "ہندھن" اور عمران قریشی کی "چارہ گار" مزیدار کہانیاں تھیں۔ محسن صاحب نے منظر گڑھ سے خوبصورت شعر بھجوایا۔ کترنوں میں کوئٹہ سے تابش خان اور سوات سے عنبر خان کے چٹکلے زیادہ پسند آئے۔ اس بار رمضان المبارک فروری میں شروع ہو جائے گا۔ رحمتوں، برکتوں اور نزولِ قرآن والا مہینا..... ادارہ و قارئین کو ماہِ مقدس کی ڈھیروں مبارک اور سعادتیں سمیٹنے کے لیے دعا۔ وطن و اہلِ وطن اور امنِ مسلسل کے لیے بہت سی نیک خواہشات۔"

قیصری بشیر امیر کا شکوہ، سینٹرل جیل پشاور سے۔ "ماہ جنوری کا شمارہ اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔ پہلے تو آپ سے شکوہ ہے کہ میرا پہلا خط شائع کرنے جو فوری مجھے ملی، اس سے کئی گنا زیادہ دکھ جنوری والے شمارے میں میرا خط شامل نہ کرکے ہوا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ڈاکیے صاحبان ایسا کیوں کرتے ہیں۔ عقیدت کے ساتھ، ڈاکیوں کی شکایت اس لیے کر رہا ہوں کہ میرا خط نہیں پہنچا آپ تک اور اگر بالفرض آپ تک میرا خط پہنچا بھی ہے اور آپ نے جان بوجھ کر شائع نہیں کیا تو بھی ڈاکیے صاحب کی ہی شکایت کروں گا۔ بھلا آپ کی شکایت اور وہ بھی آپ ہی سے کرنے سے بہتر ہے کہ میں آسمان خط ہی نہ لکھوں۔ یہ دیوان حشت والی بات ہو گئی کہ دریا میں رہتے ہوئے لوہڑی سے کیسی دشمنی — باقی ماشاء اللہ آپ خود سمجھ دار ہیں، میری بات کا مفہوم سمجھ گئے ہوں گے۔ شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ میرا پہلا خط شائع ہوا تو میرے جیل کے ایک ساتھی فرید صاحب نے مجھے سب سے پہلے بتایا اور اس بتانے پر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ خیر اس دفعہ تبصرہ یا میرا خط شائع کرکے مجھے ضرور شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں (جناب! آپ کا خط ہمیں نہیں ملا، اگر ملتا تو ضرور شائع کرتے۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں اور اپنا تبصرہ بھیجتے رہیں)۔ سب سے پہلے ٹائٹل فوٹو پر قاتل لیکن حسینہ مسکراتے ہوئے کرشمہ کپور کی طرح لگی، باقی تمام خواتین اپنی اپنی پسند بتا دیں۔ ساتھ ہی ایک خوبصورت جوڑا بھی دیکھا جس کی صرف پشت ہی نظر آئی۔ "انشائیہ" میں جون ایلیا کی تحریر پسند آئی۔ سب سے زیادہ تحریر میں یہ بات پسند آئی کہ انسان دوسرے انسان سے تو مایوس اور بیزار ہو سکتا ہے لیکن انسانیت سے کبھی بھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ اداریے میں ایڈیٹر صاحب نے خوب کہا کہ مہنگائی کی دہائی تو پوری قوم دے رہی ہے لیکن محکمہ جاتی ارکان سب اچھا ہے کی گردان پیش کر رہے ہیں۔ پھر کرنی صدارت پر رویندر شاہین صاحب کا تبصرہ پڑھا۔ پچھلے شمارے کے تبصروں پر تبصرہ اور تمام کہانیوں پر مکمل، شاندار بلکہ جاندار تبصرہ کیا گیا۔ مجھے خوش آمدید کہنے پر شکریہ ادا کرتا ہوں ان کا۔ پھر بیتا شاہ کا تبصرہ بھی میرے حاصل تھا۔ مجھے مبارک باد دینے کا ان کا بھی شکریہ۔ پھر محی الدین صاحب کی امید پڑھی۔ اچھا تبصرہ تھا۔ میرے اور میرے جیسے قیدیوں کے لیے دعا کی درخواست کہ ہمارے مطالعہ انسان کو مثبت راستوں پر لے جاتا ہے۔ روبینہ شاہین صاحبہ بھی خوب لکھتی ہیں اور مسلسل لکھتی ہیں۔ عون صاحب کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ ملک وحید، انجم فاروق اور رفعت مقصود صاحب کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ جن کے خطوط شائع ہوئے ان تمام صاحبان کو مبارک باد اور جو نام شاملِ اشاعت نہ ہو سکے انکی صرف یہی کہوں گا کہ ــــ لڑائی لگین۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پھولن دیوی کی "ظالم مقلوم" پڑھی۔ سری رام نے اپنا اصلی چہرہ دکھا ہی دیا، پھولن دیوی کے کرم کو مار کر ہی دم لیا اور بیچاری پھولن دیوی کے ساتھ ایک دفعہ پھر سے ظلم کی شروعات ہو گئی۔ عثمان ذوالفقار صاحب کی "جرم پرواز" پڑھی۔ شہنشاہ نے کام تو اچھا کیا لیکن ایسی ایجادات قاتلوں کے ساتھ ساتھ نقصانات زیادہ لاتی ہیں۔ آج کل ہم صرف جہازوں کی ایجاد ہی دیکھ لیں اور انکے نقصانات کا اندازہ ہو ہی جائے گا کہ اس میں فائدے زیادہ ہیں یا نقصانات۔ پھر "دعوتِ شاہ" جو میری طرح تمام قارئین کی پسندیدہ ہے، پڑھی۔ ایجادات و تناولی پر مصیبتیں آنے والی ہیں کیونکہ گرہ بلی تو خود شیطان کے چیلے نکلے ہیں۔ عیار اور لالچی کی محبت کہاں تک جاتی ہے، آئندہ آنے والے شماروں میں معلوم ہو ہی جائے گا لیکن حلیہ ضرور کوئی نہ کوئی شرارت کرتی رہے گی اور تماس بھی اب الیکزینڈر کی اصلیت جان چکا ہے۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ "جگ ال" میں سہراب ایک دفعہ پھر مشکل سے نکل آیا لیکن چوٹ زخمی ہو گئی۔ شاید ایک طرح سے یہ بھی بہتر ہو کیونکہ بھائے کبیر کو بھی موقع مل گیا اور اس کی محبت بھی گھٹ کے دل میں بیٹھ گئی۔ ہم صاحب کی "آزمائش" بھی اچھی تھی لیکن مزید بہتری کی جا سکتی ہے۔ ملک صفدر صاحب ہر دفعہ کی طرح پھر کیس بھی حل کر لیتے ہیں۔ میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے ملک صاحب سے کہ اپنا کوئی ایسا کیس بھی لکھیں جس میں انہیں ناکامی ہوئی ہو کیونکہ ایک طرح کا تسلسل میرے خیال میں قارئین کے لیے اچھا نہیں۔ پھر اکرم طیب سکھانوی صاحب کی "ساحرہ تبر" پڑھی۔ بہت ہی مہارت کے ساتھ ماس کہانی کا تانا بانا بُنا۔ مجھے سر لاحظہ نہ ہی پاس۔ باقی ابھی شمارہ نہیں پڑھا، امید ہے تمام کہانیاں اچھی ہی ہوں گی۔ ایک درخواست ہے، اگر آپ کے پاس یا کسی قاری کے پاس سسپنس ڈائجسٹ کا مشہورِ زمانہ ناول "دیوتا" ہو تو برائے کرم مجھے سینٹرل جیل پشاور کے ایڈریس پر بھیج کر شکریہ ادا کرنے کا موقع فراہم کریں۔ باقی آپ تمام لوگوں سے التجا ہے کہ ہم قیدیوں کے لیے بھی دعا کیا کریں کہ ہم بھی جلد اپنے گھر، اپنے والدین، بیوی، بچوں کے پاس

digest.tibrary.com
https://www.urdudigest.com
Scanned with CamScanner

جائیں۔ اللہ آپ کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے اور آپ سب کو آسانیاں تقسیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔"

● روبینہ اشعر کی مبارک باد، کراچی سے۔ "تمام احباب کو سالِ نو کی ڈھیروں ڈھیر مبارک باد۔ جنوری کا شمارہ حسبِ معمول جلد موصول ہوا۔ ٹائٹل پسند آیا۔ فہرست پر سرسری نظر ڈالی اور پھر جون ایلیا کے انشائیہ "ہمہ رخ" سے مستفید ہوئے۔ خطوط کی محفل میں ایڈیٹر صاحب گزرے سال کی تلخ و شیریں یادیں دہراتے نظر آئے۔ محفل میں خود کو کرسیِ صدارت پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ دیگر احباب میں سیتا شاہ کی حاضری اپنے جاندار تبصرے کے ساتھ خوب رہی۔ شکر ادا کیا کہ شمارہ جلد ملنے کے باعث انہیں تبصرہ لکھنے کا ٹائم مل گیا۔ ہمارا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ سیدہ روبینہ شاہین روبی کا زبردست تبصرہ پڑھا، ان کی تمام دعاؤں پر آمین کہتے ہیں۔ ہمیں بھی ان کا تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ عون احمد کا بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ ملک وحید مختصر تبصرے کے ساتھ اپنی حاضری یقینی بنائے نظر آئے۔ رفعت مقصود کو سرورق کی دوشیزہ دودھ پر پلی ہوئی لگی۔ واہ، کیا عقابی نگاہیں ہیں۔ تبصرہ بھی شاندار رہا۔ انجم فاروق ساحلی کا گزشتہ شمارے پر تبصرہ مختصر رہا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے زویا صفوان کی تحریر "ظالم مظلوم" کا چھٹا حصہ زبردست رہا۔ پھولن دیوی پر ظلم کی انتہا ہو گئی ہے اور وہ وکرم کی موت کے بعد اس کا انتقام لینے کے لیے واپس آئے گی۔ آگے کے واقعات یقیناً دلچسپ اور سنسنی خیز ہوں گے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ محمد عثمان ذوالفقار کی مختصر کہانی "جرمِ پرواز" میں اپنی ایجاد کے جرم میں جان سے جانے والے موجد کا قصہ دلچسپ رہا۔ لبنیٰ خان کی تحریر "جامِ اجل" متاثر کن تحریر رہی۔ نازیہ کامران کے قلم کا جادو "رمزِ شناس" میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ قسط نمبر 11 بھی لاجواب رہی۔ عباد اور امیر 11 ایک دوسرے کے مزید قریب آ رہے ہیں۔ ساتھ ہی حلیمہ کی سازشیں بھی شروع ہو گئی ہیں۔ راج گڑھ کے واقعات بھی دلچسپ اور سنسنی خیز ہیں۔ آگے کے واقعات پڑھنے کے لیے فروری کے شمارے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ندیم رحمان ملک کی "آزمائش" سیلاب کی تباہ کاریوں اور مشکلات کا احاطہ کرتی اچھی تحریر تھی۔ جرم و سزا کے گرد گھومتی ملک صفدر حیات کی تحریر "کینہ کش" زبردست رہی۔ چودھری فیاض کی حویلی میں اس کی اپنی بیٹی مہرو نے چوری کی مگر ملک صاحب نے اسے استثنیٰ دے دیا ساتھ ہی چودھری فیاض نے بھی اسے معاف کر دیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر "دیس پردیس" کا تیسرا حصہ بھی زبردست رہا۔ نشاط نے رجب علی کو چھوڑ دیا اور نبیل کے ساتھ چلی گئی۔ رجب علی کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا اور بچے پاکستان میں آپا کے پاس چھوڑ آیا۔ آگے دیکھتے ہیں رجب علی ان حالات سے کس طرح نبرد آزما ہوتا ہے۔ جاوید بسام کی کہانی "مغربی کھڑکی" سنسنی خیز رہی۔ ڈاکٹر محمد طیب خان سنگھانوی کی تحریر "سائبر قبر" آنے والے جدید دور کی عکاسی کرتی عمدہ کہانی تھی۔ ماہ وش طالب کی کاوش "روڈ ٹرپ" کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ عمران قریشی کی "چارۂ کار" متاثر کن تحریر تھی۔ سندس کو اس کے لالچ کی خوب سزا ملی اور اس کا ٹھکانا دوبارہ یتیم خانہ ہوا۔ صائمہ دانش کی "عناد" پسند آئی۔ نعمان اسحاق کی کہانی "ڈھلتا سورج" پڑھ کر دل اداس اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر "ابو علی شفیق بلخی" ایمان افروز تحریر رہی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ عیوق بخاری کی "بدلا دسمبر" رشتوں کی اہمیت کو اجاگر کرتی شاندار تحریر رہی۔ زیب النساء بیگم نے سقوطِ ڈھاکا کے پس منظر میں کہانی شاندار انداز میں بیان کی جس کے باعث اس کے گھر کا شیرازہ بکھرنے سے بچ گیا۔ عائشہ نصیر کی تحریر "بندھن" اچھی رہی۔ محفلِ شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب خوب رہا۔ کترنوں نے بھی لطف دیا۔"

● ملک وحید، کراچی سے چلے آ رہے ہیں۔ "سب سے پہلے تمام احباب ہماری جانب سے سالِ نو کی مبارک باد قبول فرمائیں۔ جنوری کا شمارہ اس بار تھوڑا سا لیٹ ملا۔ ٹائٹل پسند آیا۔ فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد جون ایلیا کے پُرمغز انشائیہ "ہمہ رخ" سے مستفید ہوئے۔ خطوط کی محفل میں روبینہ اشعر کو کرسیِ صدارت کی مبارک باد، تبصرہ بھی دلچسپ تھا۔ دیگر احباب میں سیتا شاہ، سید علی الدین، سیدہ روبینہ شاہین روبی، عون احمد، رفعت مقصود، انجم فاروق ساحلی کے تبصرے بھی خوب رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے نازیہ کامران کی "رمزِ شناس" پڑھی۔ قسط نمبر 11 بھی زبردست تھی۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ زویا صفوان کی تحریر "ظالم مظلوم" میں پھولن دیوی پر ڈھائے گئے ظلم پر دل اداس ہو گیا۔ محمد عثمان ذوالفقار کی تحریر "جرمِ پرواز" دلچسپ رہی۔ لبنیٰ خان کی کہانی "جامِ اجل" خوب تھی۔ ندیم رحمان ملک کی تحریر "آزمائش" متاثر کن رہی۔ ملک صفدر حیات کی کہانی "کینہ کش" نے لطف دیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی "دیس پردیس" خوب جا رہی ہے۔ جاوید بسام کی تحریر "مغربی کھڑکی" اچھی رہی۔ ڈاکٹر محمد طیب خان سنگھانوی کی تحریر "سائبر قبر" عمدہ کہانی تھی۔ ماہ وش طالب کی "روڈ ٹرپ" اچھی لگی۔ عمران قریشی کی "چارۂ کار" پسند آئی۔ صائمہ دانش کی تحریر "عناد" دلچسپ رہی۔ نعمان اسحاق کی کہانی "ڈھلتا سورج" متاثر کن تحریر تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ایمان افروز تحریر "ابو علی شفیق بلخی" پسند آئی۔ عیوق بخاری کی کہانی "بدلا دسمبر" دلچسپ رہی۔ عائشہ نصیر کی "بندھن" خوب تھی۔ محفلِ شعر و سخن میں اشعار اور کترنوں کا انتخاب بھی اچھا رہا۔"

سانحہ ارتحال

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن ملتان کے ایجنٹ ملک محمد عباس جو ادارے کے لیے عرصہ دراز سے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے، رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے ہیں۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کے درجات بلند کرے اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

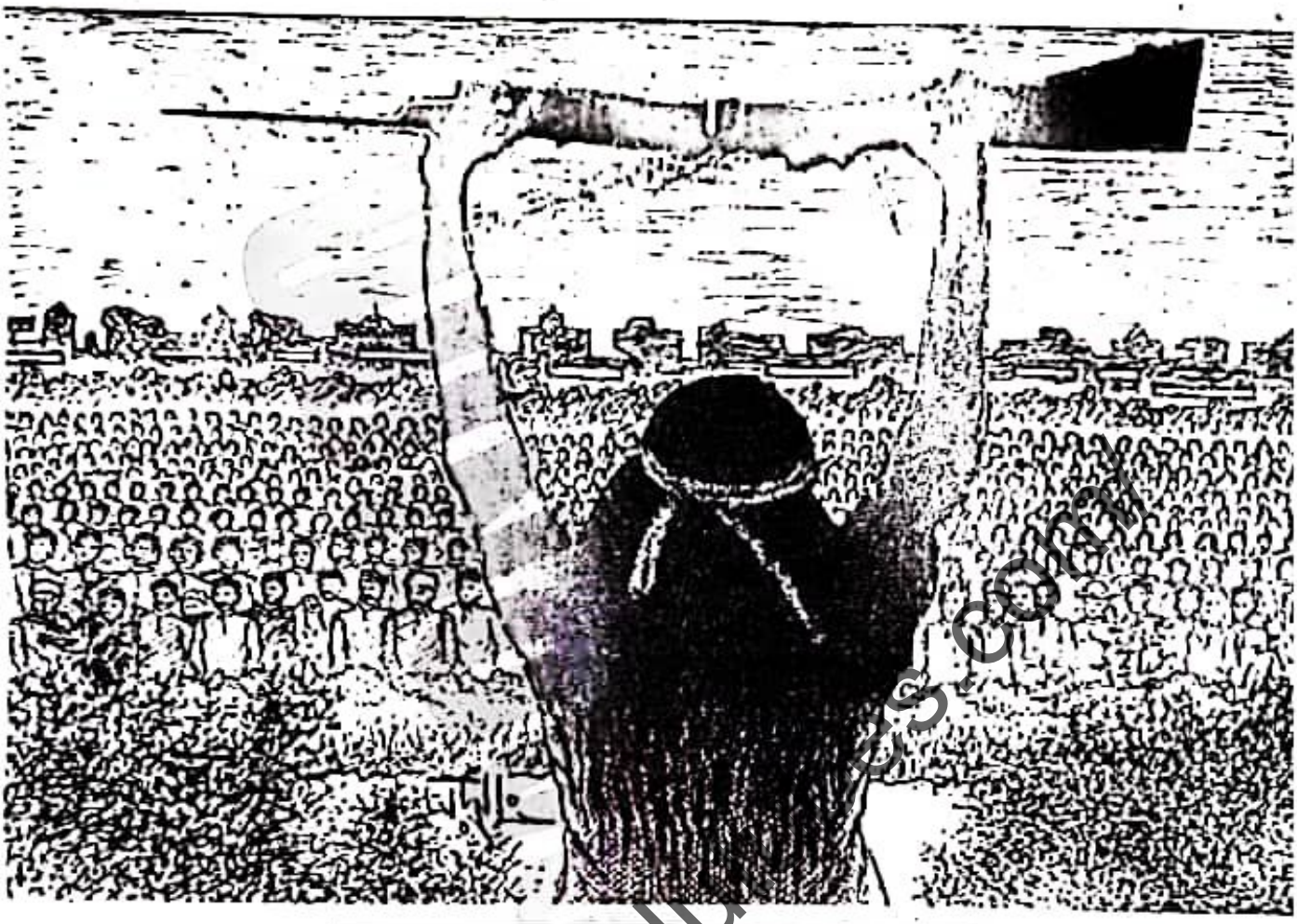

ماضی کا آئینہ... بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ظالم مظلوم

زویا عنوان

ساتواں حصہ

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو مظلوم بھی ظالم بن جاتا ہے لیکن... اس کی شخصیت کے کئی روپ ہمیں سامنے آتے ہیں... جسے دنیا دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے... وہ معصوم بچی جسے اپنے بھگوان سے چھوٹا سا شکوہ تھا کہ اسے کسی کی ذرا سی خیرات سے بھی ترسادیا... معمولی شکل و صورت کی حامل یہ بچی آگے چل کر کیا قیامت ڈھا سکتی ہے کسی کو خبر نہ تھی... تاریخ میں اس ہستی کا نام پھولن دیوی کے نام سے رقم ہے جسے زمانے کے ظلم و ستم نے ایک راہ کا مسافر بنادیا جہاں بچے اپنے بچپن کو بہت پہلے خیرباد کہہ دیتے ہیں... اس نے بھی بہت چھوٹی عمر سے گرم سرد موسموں کا مقابلہ کیا اور ساتھ ہی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کی بھی حفاظت کرتی رہی... اور جب ظلم حد سے سوا ہوا تو اس بچی نے پھولن دیوی کا روپ دھار لیا۔

https://www.urdudigestlibrary.com
Scanned with CamScanner

بوڑھا برہمن بے تابی سے پھولن کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ مسلسل دعائیہ انداز میں متحرک تھے۔

''ہے بھگوان! اس کی رکھشا کرنا۔ اسے دوبارہ اس دشت پاپی کے ہتھے نہ چڑھنے دینا۔''

پھولن کا وجود اب ایک سیاہ نقطے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ برہمن نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور مکان کی بیرونی سمت کا رخ کر لیا۔

''کہاں مر گیا ہے یہ بوڑھا؟'' اسے سری رام کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کہیں دم ہی نہ نکل گیا ہو۔'' لالہ رام نے چٹکی بھری۔

ان کے قرب و جوار میں سبھی افراد ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ برہمن کی آنکھیں احساسِ ذلت سے جل رہی تھیں۔

''تم نے بہت اچھا کیا سری رام!'' ٹھاکر کے ایک معتمدِ خاص نے کہا۔ ''وکرم ملاح اب اپنی ریکھا بھول چکا تھا، ٹھاکروں کے لیے سر درد بننے لگا تھا۔''

سری رام کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

''یہ سب ہوا کیسے تھا؟ کیا اسے تم پر بالکل شک نہیں ہوا؟'' برہمن کو ایک قریبی گاؤں کے ٹھاکر کی آواز سنائی دی۔

''ارے وہ میرے سامنے کل کا لونڈا تھا۔ اسے مجھ پر کیسے شک ہو سکتا تھا؟'' سری رام نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

''تم نے آخر اسے مارا کیسے؟'' ٹھاکر نے استفسار کیا۔

برہمن کے چہرے پر افسردگی جھلکنے لگی۔ اسے علم تھا کہ قرب و جوار کے سبھی ٹھاکر اس قصے کو بار بار سننے میں ایک ناقابلِ بیان راحت محسوس کرتے تھے۔

''بہت ہی آسانی سے۔'' سری رام نے تفاخر سے بتایا۔ ''مجھے جانکاری تھی کہ وہ اپنی کمر میں گولی کا کوئی ٹکڑا رہ جانے کے کارن پہلے جیسا پھرتیلا نہیں رہا۔ اس رات بہت دکھی آتما بنا ہوا تھا۔ دونوں پتی، پتنی اتنے بیوقوف تھے کہ کسی نے بھی پہرے کے لیے جاگنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اپنی بندوق لے کر وکرم ملاح کے سر پر پہنچا اور اس کے چہرے پر ٹھوکر دے ماری۔''

''اس نے کچھ کہا نہیں؟'' ٹھاکر نے چٹخارا لیا۔

''نہیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اور بے بسی کے ساتھ ایک بنتی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ کہنے لگا تم مہان پرش ہو، مجھے شما کر دو۔ میں کسی ٹھاکر کے ورودھ ہتھیار نہیں اٹھاؤں گا۔''

سری رام کی اس منظر کشی نے ٹھاکروں کا سرور ہوا تر کر دیا۔

''جب تم نے اسے گولیاں ماریں تو بیچارہ بہت نراش ہوا ہوگا؟''

''وہ مجھ سے اپنے جیون کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اسپتال لے جانے کی بنتی کر رہا تھا۔'' سری رام ہنسا۔

''واہ! کیا شاندار نظارہ ہوگا۔ وکرم ملاح اپنے جیون کی بھیک مانگتے ہوئے کیسا لگ رہا ہوگا؟''

''کسی خارش والے جانور کے مانگ۔'' اس نے حقارت سے بتایا۔

''پھولن کے ساتھ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ نیچ عورت! وکرم ملاح کی شہ پر بہت اچھلتی پھرتی تھی۔'' ٹھاکر کے لہجے میں شدید نفرت تھی۔

سری رام اپنے اس کارنامے پر خود کو ہوا بردوش محسوس کرنے لگا۔ اسی لمحے اسے پھولن کے خیال نے چونکا دیا۔ اس نے دروازے پر زوردار دستک دی اور چلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''ارے او برہمن! کھانا ہضم نہیں ہوا کیا؟''

سری رام کے اندازِ تکلم نے سب کو قہقہہ بار کر دیا۔ برہمن کے لیے اب ان کے روبرو ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا سر دیوار میں مارتے ہوئے خود کو لہولہان کیا اور اعصاب مضبوط کرتے ہوئے سری رام کے سامنے چلا آیا۔

''کہاں رہ گئے تھے شریمان؟'' وہ طنزیہ گویا ہوا۔

''اور یہ تمہارے سر پر کیا ہوا ہے؟''

''پھولن دیوی کہاں ہے؟'' ٹھاکر نے استفسار کیا۔

''اندر ہی پڑی ہوگی کہیں۔'' سری رام نے حقارت سے کہا۔

''اسے باہر لا کر ان ملاحوں کے ساتھ باندھ دو اب۔'' لالہ رام نے یاد دہانی کروائی۔

سری رام کی آنکھوں میں اضطراب دکھائی دینے لگا۔ وہ برق رفتاری سے اندرونی سمت لپکا اور پھولن کے غیاب پر تلملاتا ہوا باہر چلا آیا۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"کہاں ہے وہ.....؟" اس نے دشنام طرازی کی۔

"اس نے میرے سر پر وار کیا اور خود جانے کہاں غائب ہوگئی۔" برہمن نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔

سری رام کی آنکھیں لہو کی طرح سرخ دکھائی دینے لگیں۔ اس نے آؤ دیکھا، نہ تاؤ اور برہمن کے چہرے پر طمانچہ رسید کردیا۔

"تجھ سے ایک چھوکری نہیں سنبھالی گئی۔" وہ دہاڑا۔

"مجھے واقعی اندازہ نہیں ہوا، اس نے کیسے حملہ کردیا۔" برہمن متوحش ہوا۔

لالہ رام کے چہرے پر بھی وحشت برسنے لگی تھی۔ اسی لیے اس کی نگاہ دیوار پر پڑی۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" اس نے دانت پیسے۔ "پھولن کو اسی نے یہاں سے بھگایا ہے۔"

اسی اثنا میں سری رام کی نگاہ بھی دیوار پر تازہ لہو کے نشانات پر گڑ گئی۔ اس کے لیے دو جمع دو، چار کرنا مشکل ثابت نہ ہوا۔ وہ بے اختیار اس پر پل پڑا۔

"تیری یہ ہمت..... تو نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔"

"میری بات سنو سری رام!" برہمن چلانے لگا۔ "اسے بہت سزا مل چکی تھی۔ تجھے کیا لگتا ہے پولیس اسے....."

برہمن کی بات مکمل نہ ہوسکی۔ سری رام اسے گریبان سے گھسیٹ کر زدوکوب کرنے لگا۔

"کہاں گئی ہے وہ..... کس کے ساتھ بھیجا ہے اسے؟"

"میں..... کچھ..... نہیں..... جانتا۔" اس نے نقاہت سے کہا۔

سری رام کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے برہمن کے جسم پر بے دریغ گولیاں برسادیں۔

"یہ کیا کردیا تم نے؟" لالہ رام زچ ہوا۔ "ہم اس سے پھولن کا پتا اگلوا لیتے۔"

"اب تک تو وہ کہیں دور نکل گئی ہوگی۔" ٹھاکر متوحش ہوا۔

"وہ بہت ذہین ہے، اس علاقے سے انجان ہے۔ ہمیں کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔ ہم دھیرج سے کام لے کر اسے ڈھونڈ لیں گے۔" لالہ رام پُرامید تھا۔

سری رام کا ذہن مکمل طور پر الٹ چکا تھا۔ وہ بھائی کی بات اَن سنی کرتے ہوئے اکرم کے ساتھیوں کی جانب لپکا اور انہیں زندہ ہی نذرِ آتش کردیا۔ فضا میں انسانی گوشت کے جلنے کی سڑاند نہایت ہولناک تھی۔ اہلِ علاقہ بھی بہت سراسیمہ دکھائی دے رہے تھے۔

"اپنے آدمی اس پورے علاقے میں پھیلا دو۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔ بھوک پیاس سے مجبور ہوکر باہر ضرور نکلے گی۔" لالہ رام کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔

سری رام کی نظریں برہمن کی لاش پر مرکوز تھیں۔ اس کے سینے کا مدھم زیر و بم محسوس کرتے ہوئے وہ مزید آگ بگولا ہوگیا۔ کچھ ہی لمحوں میں برہمن کے بدن کو نارنجی شعلوں نے خاکستر کردیا۔

"وہ اپنا بدلہ لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گی۔" سری رام کی دہشت دوچند ہوئی۔

"چنتا نہ کرو، سب سنبھال لیں گے۔" لالہ رام نے اسے تسلی دی تاہم وہ اندرونی طور پر خلفشار کا شکار ہورہا تھا۔

☆☆☆

پھولن کی حالت بے حد خستہ تھی۔ وہ گزشتہ دو روز سے بھوک پیاس کے علاوہ نیند سے بھی بے حال تھی۔ تیسرے دن سورج طلوع ہوتے ہی اس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور چٹان کی بلندی سے نشیب کا جائزہ لینے لگی۔

"وہاں کون ہے دیدی؟" کالی نے دریافت کیا۔

"پولیس والوں نے گاؤں کو گھیر رکھا ہے۔" پھولن نے گہری سانس لی۔

"دیدی! تھوڑی دیر سو جاؤ۔" چرن نے اس کی جانب ترحم سے دیکھا۔

"نہیں، میں سو نہیں سکتی۔" اس نے نقاہت سے جواب دیا۔

"کیوں دیدی؟ بھوک پیاس برداشت کرنا تو مجبوری ہے، کم از کم نیند ہی پوری کرلو۔" کالی نے بھی اصرار کیا۔

"مجھے نیند کا سوچ کر ہی گھن ہوتی ہے۔ ایک بار سو گئی تھی، اس کی سزا میں وکرم مجھ سے دور ہوگیا۔ اب نہیں سو سکتی۔" وہ پچھتاوے کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

دونوں لڑکے بے بسی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔ ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ پیاس کی شدت ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔ سنگلاخ چٹانیں ایک پھندے کی حیثیت اختیار کرچکی تھیں۔ ان چٹانوں کے گرد وسیع و عریض کمیت عبور کرنا ہی جوکھم تھا۔ وہ کسی کی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

نظروں میں آئے بغیر یہ فاصلہ عبور نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہیں روپوش رہ کر مناسب موقعے کی تلاش کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''تم واپس جانا چاہو تو مجھے کوئی سستیا نہیں۔ تم دونوں نے مجھے یہاں پہنچا کر واقعی بہت اپکار کیا ہے۔'' پھولن نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ اس کی نگاہیں آسمان پر مرکوز تھیں جہاں جا بہ جا چیلیں منڈلاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

''یہ کیسی بات کر دی دیدی؟'' کالی تڑپ گیا تاہم اس نے اپنی آواز مدھم ہی رکھی تھی۔ اس روپوشی کے دوران وہ سانس بھی نہایت تدھم انداز میں لے رہے تھے۔

''ہم تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔'' چرن نے حتمی انداز میں کہا۔ ''برہمن نے تمہاری ذمے داری ہم دونوں کو سونپی تھی۔''

برہمن کا نام سنتے ہی پھولن کی رگوں میں انگاروں کی سی جلن برپا ہوگئی۔ اس شخص نے اپنی حویلی کی بہت بھیانک سزا پائی تھی۔

''ہم تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔'' کالی نے اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا۔

پھولن بے بسی سے خاموش ہوگئی۔ وقت نہایت سست روی سے بیت رہا تھا۔ ہر طرف چھائی خاموشی، جنگلی جانوروں کی آمد کا خدشہ اور پیاس کی شدت اعصاب میں تھکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔

''اگر آج بھی کہیں سے پانی نہ ملا تو گاؤں واپس چلی جانا۔'' اس کے دماغ نے ایک راہ سجھائی۔

''پولیس مجھے وہاں دیکھتے ہی گولی مار دے گی۔'' دل میں خدشہ بیدار ہوا۔

''جب بھاگ میں مرنا ہی لکھا ہے تو پیاس کیا اور گولی کیا؟'' دماغ نے ڈپٹا۔ ''گولی لگنے سے ایک ہی بار مر تو جائے گی۔ پانی نہ مل پایا تو سسک سسک کر جیون ختم ہوگا۔''

کچھ ہی لمحوں میں اس کا رجحان وکرم کی جانب مبذول ہوگیا۔ اسے وکرم سے دائمی جدائی کا یقین آ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کبھی کسی روز اچانک اس کے سامنے چلا آئے گا۔

''مجھے اکیلا چھوڑ کر کیوں چلے گئے وکرم؟ تمہیں نہیں پتا تھا کیا کہ میرا تمہارے سوا کوئی بھی نہیں ہے؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ''اب مجھے پولیس والوں کے علاوہ مری رام کے آدمیوں سے بھی چھپنا ہوگا۔ میں یہ سب کچھ اکیلے کیسے کروں گی؟''

''دیدی! تم بہت بہادر ہو۔ خود کو مضبوط رکھو۔'' کالی نے اپنایت سے کہا۔

''تم نے دیکھا نہیں، انہوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟'' پھولن چیخ گئی۔

کالی نے تاسف سے سر جھکا لیا۔ اسے پھولن کو برہنہ حالت میں گاؤں درگاؤں گھمانے کے سانحے پر دلی رنج تھا۔

''میں تو کیول اتنا جانتا ہوں کہ پھولن دیوی اپنے پتی وکرم ملاح سے بہت پریم کرتی تھی۔ وہ اس کی ہتھیارا اور اپنے اپمان کا بدلہ لینے تک ہتھیار نہیں ڈالے گی۔''

چرن کی اس بات نے پھولن کو ساکت کر دیا۔ اس کے وجود میں ایک شعلہ سا لپک گیا۔

''ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔'' وہ ایک عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لیکن کہاں جائیں گے؟'' وہ دونوں ہی حیران تھے۔

''میں نے کچھ جانوروں کو وہاں سے آتے دیکھا تھا۔'' پھولن نے ایک سمت اشارہ کیا۔ ''یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی۔ ہمیں سمجھ کیوں نہیں آئی، اس طرف پانی موجود ہے۔''

دونوں اس کے عقب میں ہو لیے۔ وہ سب چٹان کے عقب سے دوسری طرف گھوم گئے۔ یہ گاؤں کی دوسری جانب تھی۔ پرتھی دوپہر میں ڈھلوان چٹانیں عبور کرنے کا مرحلہ آسان نہیں تھا۔ ان ڈھلانوں پر جا بہ جا کانٹے دار جھاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ پسینے سے شرابور لیے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں درخت موجود تھے۔ درختوں کی ویدان کے لیے بڑھوا جاں فزا تھی۔

''یہاں کہیں نہ کہیں پانی موجود ہے۔'' کالی نے قیاری بھری۔

اس تصور نے ناتواں بدن میں از خود ہی توانائی پیدا کر دی۔ تقریباً دس منٹ کی مسافت کے بعد انہیں چٹانوں سے ایک چھوٹا سا چشمہ بہتا دکھائی دے گیا۔ پھولن دیوانہ وار آگے بڑھی اور دونوں ہاتھ پیالے کے انداز میں پھیلا کر کتنی ہی دیر پانی پیتی رہی۔ وجود میں توانائی اور فرحت کا

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

احساس پیدا ہوتے ہی اس نے اپنے سر، بازوؤں اور چہرے کے زخم دھونے کا آغاز کر دیا۔ گرچی گرچی بدن پر پانی کی بھتی دھاریں ایک نئی امید پیدا کر رہی تھیں۔ دونوں بچے بھی تازہ دم ہو گئے تھے۔

"ہمیں "شرا" گاؤں چلنا چاہیے۔" پھولن نے ایک توقف کے بعد کہا۔

"وہاں کون رہتا ہے دیدی؟" کالی نے استفسار کیا۔

"کوئی بھی نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم شرا گاؤں کے قریب سے گزر کر جمنا پر پہنچیں گے اور دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے "ڈلکھان" پہنچ جائیں گے۔ وہاں میری ایک موسی رہتی ہے۔"

دونوں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

سری رام کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس کی نیند، بھوک، پیاس، سکون اور اطمینان مکمل طور پر رخصت ہو چکے تھے۔

"میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا تھا کہ اسے ایک ہی بار جان سے مار دو۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔" لالہ رام نے زچ ہو کر کہا۔

"اس ـــ کے لیے یہ بہت آسان موت ہوتی۔" وہ تلخی سے گویا ہوا۔ "اگر اسے ایسی سزا نہ دیتے تو کل کو کسی ذات کا کوئی بھی شخص ہمارے سامنے اٹھ کھڑا ہوتا۔ ڈاکوؤں کا خوف بنائے رکھنے کے لیے یہ سب بہت ضروری تھا۔"

"تو اب اتنے بے چین کیوں ہو؟" لالہ رام نے طنز کیا۔

"مجھے اس برہمن پر وشواس کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" اس نے اپنی مٹھیاں بھینچیں۔

"للہ۔" لالہ رام نے ٹوکا۔ "تم نے برہمن کو اتنی جلدی مرتیو دے کر غلطی کی تھی۔"

"وہ ـــ کچھ بولنے کے لیے تیار ہی کہاں تھا؟" سری رام نے دشنام طرازی کی۔

"تم پوری طرح کوشش تو کرتے۔ پھولن اس کی سہائکا سے بھاگی تھی اور وہ اکیلی بھی نہیں ہو گی۔ برہمن نے اس کے ساتھ کسی نہ کسی کو تو ضرور بھیجا ہو گا۔ ہم گاؤں میں تلاشی لیتے تو کوئی سراغ مل ہی جاتا۔" اس نے تفصیلی تجزیہ کیا۔

"اب تو جو ہونا تھا، سو ہو گیا۔" سری رام نے سر جھٹکا۔

"یہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جو ہو گیا اسے بدل نہیں سکتے، آگے کی سوچو۔ ذہن پر زور دو کہ پھولن کہاں جا سکتی ہے؟ اسے ایسی حالت میں کون شرن دے سکتا ہے؟" لالہ رام نے راہ سجھائی۔

"میں اس کے سب رشتے داروں کو جانتا ہوں۔" وہ تنفر سے کہنے لگا۔ "ان سب کے گاؤں میں اپنے دو، دو بندے بھیج دوں گا۔"

"انہیں وہاں جاتے ہی پھولن کے خلاف زہر اگلنا ہو گا تاکہ اس کے آنے سے پہلے ہی گاؤں کے لوگ دردی ہو جائیں۔"

لالہ رام کی اس تجویز پر سری رام کی آنکھوں میں سفاک چمک بیدار ہو گئی۔ وہ سنجیدگی سے اپنے منصوبے کی جزئیات طے کرنے لگا۔

☆☆☆

پھولن کی قسمت ایک بار پھر اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہو گئی تھی۔ وہ انتہائی محتاط مسافت طے کر کے گاؤں کے بیرونی حصے میں قدرے فاصلے پر واقع آبادی تک پہنچ کر رک گئے۔

فضا میں تاریکی غالب آتے ہی وہ آگے بڑھنے لگے۔ پھولن تیز نگاہوں سے قرب و جوار کا جائزہ لے رہی تھی۔

"تم دونوں اس گڑھے میں چھپ جاؤ۔" اس نے گھر کے احاطے میں پہنچتے ہی ایک سمت اشارہ کیا۔ "مجھے اندر کوئی خطرہ محسوس ہوا تو سیٹی بجا کر اشارہ دوں گی۔"

دونوں لڑکے بھی اندر میں سر ہلاتے ہوئے پھولن کی ہدایت پر عمل کرتا ہوا گئے۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتی گھر میں داخل ہو گئی۔ اس کی موسی صحن میں ہی موجود روٹیاں بنانے میں مصروف تھی۔ پھولن نے سیٹی بجا کر کالی اور چرن کو بھی وہیں طلب کر لیا۔

"تم ..... پھولن ـــ یہاں ـــ کیسے؟" موسی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اسی لیے اسے عقب میں دو دردی بردار نوجوانوں کی دیدے نشکا دیا۔

"تو ـــ ٹھیک ـــ ہے ـــ نا؟" وہ متوحش ہوئی۔

پھولن بے اختیار اس سے بغلگیر ہو گئی۔ اس کی اذیت و کرب کے آبلے پل بھر میں ہی پھوٹ گئے تھے۔ وہ موسی کو اپنی بپتا سنانے کا حوصلہ جمع ہی نہیں کر پا رہی تھی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

عقب میں موجود کالی اور چرن ترحم سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔

کچھ ہی لمحوں بعد انہیں چند آہٹوں اور سرسراہٹوں نے چونکا دیا۔ پھولن کے حواس چوکنا ہوگئے۔ وہ اپنی جانب بڑھنے والا خطرہ بھانپ گئی تھی۔

"اسے پکڑلو۔ پولیس کے حوالے کردیتے ہیں۔" ایک درشت آواز ابھری۔

پھولن نے فی الفور جست لگائی اور صحن میں بندھے جانوروں کی آڑ لے کر سرد مہری سے چلائی۔

"کسی نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو جان سے مار دوں گی۔" اس نے دشنام طرازی کرتے ہوئے اپنے کندھے سے بندوق اتاری اور ہوا میں ایک گولی چلادی۔

نووارد خوفزدہ ہوکر تتر بتر ہوگئے۔ پھولن نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور گھر کی عقبی سمت سے باہر نکلتے ہوئے اسی راہ پر ہولیے جہاں سے گاؤں میں داخل ہوئے تھے۔

"یہ بیوقوفی کیوں کررہی ہو پھولن؟" ان کے سامنے ایک ہیولا چلا آیا۔

پھولن نے اپنے خالہ زاد "سیوک رام" کی آواز پہچان لی تھی۔

"دوسرے راستے سے واپس جاسورکھا! وہ سب بھی ادھر سے ہی آئے ہیں اور جانے کتنے تیری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

پھولن کو اپنی حماقت پر شدید تاؤ محسوس ہوا۔ وہ اس لمحے وکرم کی دی گئی تربیت فراموش کر بیٹھی تھی۔ اس کے ذہن میں گاؤں کا مکمل نقشہ اجاگر ہوگیا۔ دوسری سمت میں پہاڑی ڈھلانیں اور جنگل کی اوٹ تھی۔ رات کی تاریکی میں وہاں سے گزرنا بالکل ممکن نہ تھا۔ جوتوں کے بغیر پتھریلی چٹانوں کا سفر کیونکر ممکن ہوسکتا تھا؟ شاخوں میں بال یا کپڑے الجھ جانے کی صورت میں چاقو کی موجودگی بھی ناگزیر تھی۔ اس کے بغیر شاخیں کاٹ کر آگے بڑھ پانا بھی ممکن نہیں تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو دیدی؟ جلدی چلو۔" کالی نے اسے مخاطب کیا۔

"وکرم اس موقعے پر کیا کرتا؟" پھولن نے الجھ کر خود کلامی کی اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے خود کو پرسکون کرنے لگی۔

وہ بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

پھولن اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ گاؤں سے تھوڑی دور آئی اور گھوم کر دریا کی طرف چل دی۔ اس نے بڑی سڑک پر سفر کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں دیدی؟" چرن مضطرب تھا۔

"وکرم کہتا تھا، دشمن کی سوچ سے مختلف سوچ کرنی سیکھنا ملتی ہے۔ اس سے وہ ہمیں گاؤں میں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ انہیں اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ ہم سڑک پر سفر کررہے ہیں۔" اس نے بتایا۔

کالی اور چرن حذبذب دکھائی دینے لگے۔

"چنتا نہ کرو، یہ سڑک ایک اور گاؤں کے قریب سے گزرتی ہے۔ ہم وہیں چلیں گے۔"

پھولن اعتماد سے آگے بڑھنے لگی تاہم اب قسمت اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کے لیے آمادہ تھی۔ نصف شب کے بعد وہ گاؤں کے سرے پر واقع ایک مندر تک پہنچے ہی تھے کہ سڑک کی جانب سے وردیوں میں ملبوس کچھ آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے۔

"دیدی! کہیں یہ پولیس تو نہیں؟" کالی ان کے ہاتھوں میں رائفل دیکھ کر چونکا۔

"نہیں۔ یہ ڈکیت ہیں۔ انہوں نے بھی تمہاری ہی طرح پولیس کی وردی پہن رکھی ہے۔" پھولن نے دلاسا دیا۔ اسے یہ افراد "بابا گھنشیام" کے گروہ کا حصہ معلوم ہورہے تھے۔

"کون ہو تم؟" پھولن نے وکرم کے انداز میں دریافت کیا۔

"تم کون ہو؟ اپنا پرچے کرواؤ۔" ایک لحیم شحیم شخص نے کہا۔

"میں پھولن دیوی ہوں۔" وہ تن کر کھڑی ہوگئی۔

اسی پل وہاں صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ اس گروہ کے کچھ افراد نے ایک گڑھے میں چھلانگ لگائی اور اس کی جانب گولیاں برسانے لگے۔ پھولن کو اب اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس کے مقابل حقیقی پولیس اہلکار ہی تھے، تاہم اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر دونوں لڑکوں کو ہدایات دیں اور اپنی پسپائی کا بھرم رکھنے کے لیے گولی چلادی۔ پھولن کے پاس اب محض ایک ہی کارتوس بچا تھا۔ وہ مزید گولیاں چلانے کی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

متحمل نہیں رہی تھی۔ راہ فرار ناگزیر تھا۔

وہ لمحات بے حد اعصاب شکن تھے۔ اس افراتفری کے باعث کالی اور چرن بھی اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکے۔ کالی جنگل کی جانب بھاگ کھڑا ہوا جبکہ چرن نے کھیتوں کا رخ کرلیا تھا۔

پھولن اب تن تنہا اپنی بقا کے لیے سرگرداں تھی۔ وہ کھلی سڑک سے ہٹ کر پہاڑی چٹانوں کی سمت واپس چلی آئی۔ اعلوان چٹانوں پر چڑھتے، پھسلتے اور گرتے پڑتے پہاڑی چوٹی پر پہنچنا ناگزیر تھا۔ کچھ فاصلے سے سنائی دینے والی گولیوں کی آوازیں ایندھن کا کام کررہی تھیں۔

چوٹی پر پہنچتے ہی اسے ایک پہاڑی نالا دکھائی دیا۔ بارش کا پانی طوفانی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ پھولن کی نگاہوں نے ایک درخت تاڑ لیا جس کی شاخ نالے کے شوریدہ سر پانی کے اوپر معلق تھی۔ وہ محتاط انداز میں اس درخت پر چڑھی اور اس شاخ پر پہنچتے ہی بھرپور قوت سے دوسری جانب چھلانگ لگادی۔ عقب میں گولیوں کی آوازیں ہولناک حد تک بلند ہوگئی تھیں۔ پھولن کے پاس زیادہ سوچ بچار کا وقت تھا نہ ہی موقع۔ وہ پیٹ کے بل عمودی چڑھائی عبور کرکے نالے کی چوٹی پر پہنچ گئی۔

اس مقام پر اسے ایک اور درخت دکھائی دے گیا۔ پھولن نے طویل ترین شاخ کا انتخاب کیا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ اس کے بوجھ تلے شاخ چرچرا کر رہ گئی۔ پھولن کا وجود ساکت ہوگیا۔ اس کی دھڑکنیں منتشر ہوچکی تھیں۔

وہ لمحات نہایت صبر آزما تھے۔ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ ہی واپسی کا کوئی راستہ۔ پھولن اگلے ایک گھنٹے تک درخت کی شاخ سے چمٹی رہی۔ پیاس نے حلق میں کیلے بچھے گاڑ رکھے تھے۔ کچھ دیر بعد اسے نشیب میں گاڑیوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ پولیس افسران کے احکامات کی بازگشت گونجنے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ تازہ ترین کمک کی آمد کے بعد گھر گھر تلاشی کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔

پھولن کوئی الفور کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ احتیاط سے نیچے اترنے لگی۔ قدموں کی ہلکی سی لغزش اسے کئی گز کی بلندی سے پتھریلی زمین پر پٹخ سکتی تھی۔ زخم اور خراشیں بدن میں سخت جلن پیدا کررہے تھے۔ وہ زمین پر چت لیٹی موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگی۔ اس کے پاس برہمن کی فراہم کردہ تین گولیوں میں سے صرف ایک ہی سلامت تھی۔

"میں پولیس کے ہتھے نہیں چڑھوں گی۔ اس آخری گولی سے اپنی جان لے لوں گی۔" اس نے عزم کیا۔

پہاڑی کے نیچے پولیس اہلکاروں کی سرگرمیاں مزید شدت اختیار کرگئیں۔ ان کی تعداد بے شمار تھی۔ گاؤں کے گھروں اور کھلیانوں میں تلاشی لی جانے لگی۔ یہ پولیس اہلکار اندرونی طور پر پھولن کے گروہ کا سامنا ہوجانے سے بوکھلاہٹ کا شکار بھی تھے۔ یہ احساس ہوتے ہی پھولن کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس کا گروہ نابود ہوچکا تھا۔ وکرم کی مرگ ناگہاں نے اسے اٹھارہ برس کی عمر میں ہی "دوھوا" کردیا تھا۔ جسمانی حالت نہایت کٹی پھٹی تھی۔ پولیس کے تشدد کی بدولت ٹوٹی ہوئی کلائیاں تاحال اپنی سابقہ حالت میں لوٹ نہ سکی تھیں۔ وہ نشانہ لگانے کے لیے بندوق صحیح طریقے سے تھام نہ پاتی۔

ان خیالات و الجھنوں سے نبرد آزما پھولن کو ایک ہی بات مزاحمت کے لیے تحریک دے رہی تھی۔ وقت آخر وکرم کی آنکھوں میں دکھائی دینے والی بے بسی اور شکستگی کا حساب چکتا کیے بغیر موت سے مقابلہ بے حد ضروری تھا۔

☆☆☆

پھولن دریا کے کنارے مسافت طے کرنے لگی۔ اس کی جسمانی نقاہت شوریدہ سر دریا میں تیراکی کی اجازت نہ تھی۔ اسے منزل کی خبر تھی، نہ ہی راستوں کا علم۔ وکرم کا تصور آگے بڑھتے رہنے کا واحد سبب بنا ہوا تھا۔

فضا میں صبح کی سفیدی جھلکنے لگی تو وہ ایک اور وادی میں پہنچ گئی۔ قرب و جوار کا جائزہ لینے کے لیے نیم کے درخت سے بہتر کوئی مقام نہ تھا۔ وہ ایک اونچی شاخ پر روپوش ہوگئی۔ تھکاوٹ نے بدن کے ہر ایک مسام میں ڈیرا جمالیا تھا۔ اس کے سونے کا خطرہ مول لینا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے کپڑے کی دھجی سے بندوق صاف کرنے لگی۔ اسی پل قسمت کو ایک اور شرارت سوجھی۔ پھولن کا اکلوتا کارتوس ہاتھ سے پھسل کر درخت کی جڑوں میں گر کر کہیں کھو گیا۔

پھولن نے نیچے اتر کر کارتوس ڈھونڈنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ درجن بھر پولیس والوں کی دید نے اسے ساکت کردیا۔ وہ اہلکار پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے اسی درخت تلے بیٹھ گئے۔ پھولن کے لیے اب ہلکی سی جنبش بھی ممکن نہیں رہی تھی۔ کسی بھی اہلکار کی گردن اوپر اٹھتے ہی اس کی موت یقینی تھی۔

https://www.urdutunes.com/

Scanned with CamScanner

اپنی اس خوش قسمتی سے بے خبر ان اہلکاروں نے کیچڑ آلود جوتے اتارے اور درخت کے تنے سے کیچڑ صاف کرنے لگے۔

"بھگوان جانے کہاں مرگئی ہے یہ پھولن دیوی۔" ایک اہلکار نے تنفر سے کہا۔

"اچھا ہوتا یہ بھی وکرم ملاح کے ساتھ ہی مرگئی ہوتی۔" دوسرے اہلکار نے تنے سے پشت ٹکائی۔

"میں تو تنگ آگیا ہوں۔ اپنی شادی کے لیے چھٹیاں لینا چاہتا تھا۔ مجھے یہاں بھیج دیا گیا ہے۔" ایک اور اہلکار بڑبڑایا۔

"میری بیوی کسی بھی سے ہمارے بچے کو جنم دے سکتی ہے۔" پہلے اہلکار نے اسے مخاطب کیا۔ "مجھے اس کے پاس موجود ہونا چاہیے لیکن میں یہاں سے برباد کر رہا ہوں۔ میری بیوی تو جیون بھر اسی بات کے طعنے دیتی رہے گی۔"

"میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔" ایک اور اہلکار نے کہا۔ "اب تک تو وہ بہت دور نکل گئی ہوگی۔"

ان کی تھکاوٹ اور پژمردگی پھولن کے اعصاب میں فرحت پیدا کرنے لگی۔ وہ ذہنی طور پر شکست تسلیم کر چکے تھے۔ ان لمحات میں صبر اور حوصلے کی ہی ضرورت تھی۔ انجام کار وہ بھی اہلکار یکے بعد دیگرے وہاں سے روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

پھولن کی مسافت کا آغاز از سر نو ہوگیا تھا۔ وہ کتنے ہی روز برہنہ پا چلتی رہی۔ اس کا وجود مجسم گھاؤ بن چکا تھا۔ اس اذیت سے بے حال ہوتے نیند پلکوں کے دریچے پر دستک دیتی تو وکرم کا الوداعی لمس تمام تر پژمردگی ہوا کر دیتا۔

ان لمحات میں سری رام کا تصور رگوں میں انگارے بھرنے لگتا۔ وہ اپنی مٹھیاں بھینچ کر سری رام سے مخاطب ہو کر کہتی۔

"تو مجھے ایک بار مل جا..... میں تیرے شریر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔ یہ کام بہت سکون سے کروں گی۔ پہلے تیرا ایک بازو کاٹوں گی، پھر ایک ٹانگ۔ اس کے بعد دوسرا بازو اور ٹانگ۔ تیرے ہی سامنے ان کے ٹکڑے کر کے جانوروں کو کھلاؤں گی۔ تو بس ایک بار کہیں مل جا۔"

اسی مسافت اور شکستگی کے درمیان تقدیر نے ایک اور موڑ لیا۔ پھولن کی بھیڑ کسی چرواہے کی بیوی سے ہوگئی۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر خدا خوفی میں مبتلا ہوگئی۔

"تمہارا یہ حال کس نے کیا ہے؟"

"یہ سب بھاگیہ کا کھیل ہے۔" پھولن ہنسی۔

"کب سے نہیں سوئی ہو؟"

"یاد ہی نہیں۔"

"آخری بار کھانا کب کھایا تھا؟" وہ ششدر تھی۔

"مجھے یہ بھی یاد نہیں۔ میں تو کھانے کا سواد بھی بھول گئی ہوں۔"

چرواہے کی بیوی ازراہِ ترحم اسے اپنی جھونپڑی میں لے گئی۔

"میں گارے میں جڑی بوٹی پیس کر تمہارے زخموں کا لیپ کروں گی۔ تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"تم مجھ پر یہ دیا کیوں کر رہی ہو؟" پھولن نے خالی نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

"ان باتوں کو نہ سوچو۔ تم جتنے دن چاہو، یہاں رہ سکتی ہو۔" اس نے فراخدلی سے جواب دیا۔

اس عورت کی تیمارداری اور توجہ نے پھولن کی حالت میں حیرت انگیز افاقہ پیدا کیا۔ وہ کئی روز اس کی مہمان نوازی سے مستفید ہوتی رہی۔

"میرا ایک کام کر دو گی؟ بہت اُپکار ہوگا۔" پھولن نے التجا کی۔

"کہیں کوئی سندیسہ پہنچانا ہے؟" اس عورت نے قیاس کیا۔

پھولن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنی میزبان کی معاملہ فہمی اور بصیرت کی قائل ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے گروہ کے ایک مرحوم اہلکار کے بھائی کو پیغام بھجوا دیا۔ اس کے بعد پھولن کی برادری کے کچھ ملاح کشتی میں سوار اسے لینے چلے آئے۔ سولہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔

"ہائے بھگوان! میری بچی کے ساتھ یہ کیسا انرتھ ہوگیا؟" وہ اس کی حالت دیکھ کر بلکنے لگی۔

"سری رام نے جو کچھ کیا ہے، وہ اب کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں۔" اس کی برادری کے ایک شخص نے کہا۔

"مجھے ایسا لگ رہا تھا میں کوئی چڑیل یا پاگل عورت ہوں جس کا تماشا ہر گلی محلے میں لگایا گیا۔" پھولن نے کرب سے بتایا۔

سولہ نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور چرواہے کی بیوی کا تشکر بہالاتے ہوئے پھولن کو اپنے ہمراہ لے

https://www.urdufunbes.com/

Scanned with CamScanner

آئی۔ اپنے خاندان کی محبت اور خدمت اسے مزید صحت یاب کرنے لگی۔ اس کی گم گشتہ نیند بھی دھیرے دھیرے اپنی ڈگر پر لوٹ آئی۔

"سرپنچ کو پتا ہے میں یہاں ہوں؟" اس نے دو روز بعد مولہ سے دریافت کیا۔

"ہاں۔ اس سے سارا گاؤں تیرے ساتھ ہے۔" مولہ نے انکشاف کیا۔ سرپنچ کے بیٹے سریش نے تیرے لیے ایک رائفل بھی دی ہے۔"

"کہیں اس میں ان کی کوئی چال تو نہیں؟" وہ ٹھٹک گئی۔

"نہیں۔ وہ سب ٹھاکروں سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ تری رام کو سزا دینے میں تیری سہائتا کرنا چاہتے ہیں۔"

مولہ کی اس بات پر پھولن کی توانائی از سرِ نو عود کر آئی۔ اس نے مزید وقت ضائع کیے بغیر رائفل بدست سفر کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی منزل جنگل میں موجود "بلوان" نامی ڈکیت تھا۔ بلوان کا تعلق گذریا ذات سے تھا۔

"تمہارے بارے میں بہت سن رکھا ہے پھولن!" اس نے متجسس نگاہوں سے اسے دیکھا۔

پھولن نے سپاٹ انداز میں سر ہلا دیا۔

"میرے ساتھ کام کروگی؟" اس نے دریافت کیا۔

"اسی لیے تو یہاں آئی ہوں۔" وہ پُرعزم تھی۔ "لیکن ایک بات ابھی سے بتادوں۔ میں غریبوں کو نہیں لوٹتی۔"

"ہم نے دو تاجروں کا اپہرن کرنا ہے۔ دونوں کے پاس بہت مال ہے۔" بلوان نے بتایا۔

"کس ذات کے ہیں؟" پھولن نیم رضامند تھی۔

"ویش ہیں۔ تمہیں ہمارا ساتھ دینے کے لیے پچیس ہزار روپے مل جائیں گے۔"

بلوان کی یہ پیشکش مناسب تھی۔ پھولن نے اپنا تمام تجربہ بروئے کار لاتے ہوئے اسے کامیابی سے ہمکنار کردیا۔

"ہم سے ہاتھ ملالے پھولن دیوی! فائدے میں رہے گی۔" وہ سرور میں تھا۔

"میں اپنا فائدہ، نقصان اور بھلا، برا جانتی ہوں۔" اس نے متانت سے جواب دیا۔

"کیا چاہتی ہے تو؟" وہ چونکا۔

سب سے زیادہ تحریروں کا ترجمہ شائع ہونے والا ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ فروری 2026ء کی جھلکیاں

خونی تعاقب
نومولود کو والدین نے سڑک کنارے پھینک دیا، اسی بچی کو قسمت نے ہنسنا کی مسکراہٹ سنا دیا

شیلا باغ
مشہور سرنگ کا تذکرہ، تعمیر مکمل ہوئی کہ انجینئر نے خودکشی کرلی مگر کیوں؟

خونی مسودہ
مصنف نے پبلشر کے خون سے پورا ناول تحریر کیا

شکیب جلالی
معروف ادیب کی خودنوشت کا آخری حصہ

بددعا
ایک ایسی سچ بیانی پڑھتے ہوئے آپ حیران رہ جائیں گے

اس کے علاوہ
بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات جنہیں آپ پڑھنا چاہتے ہیں آپ کو پڑھنا چاہیے

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"میں اپنی مرضی کی خود مالک ہوں۔ کسی کا حکم نہیں مانوں گی۔" پھولن نے واضح کیا۔

"تو سردار بننا چاہتی ہے؟" بلوان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ جھلکی۔

"ہاں۔ میرا انومان کہتا ہے کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی نہیں پی سکتے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"تم چاہو تو اسلحہ اور ضروری سامان کے لیے مجھ سے روکڑا ادھار لے سکتی ہو۔" بلوان نے پیشکش کی۔

"میں اپنے سر پر کوئی قرضہ نہیں رکھ سکتی۔ مجھے اپنی مرضی سے کام کرنے کے لیے پوری آزادی چاہیے۔"

بلوان کچھ سوچنے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھولن بے نیازی سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے علم تھا کہ دو مختلف گروہوں کے آدمی زیادہ عرصے تک یکساں کام نہیں کر سکتے۔ انجام کار اختلاف رائے، تلخ کلامی اور لڑائی جھگڑے پر ہی ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد بلوان آتشیں مزاج کا حامل تھا۔ اسے غصہ بھی بہت جلد آتا تھا۔ کسی بھی شخص پر مخبری کا شبہ ہی اس کی ہلاکت کا پروانہ ثابت ہوتا تھا۔ پھولن کو اس کے مزاج و خصائل سے کافی تحفظات درپیش تھے۔ اس نے صرف دولت مند ہونے کی غرض سے ڈاکا زنی کی راہ اختیار کی تھی۔ ایک معمولی چور کی حیثیت سے اپنا کام شروع کرنے کے بعد لوگوں کی بھیڑ بکریاں تک اٹھا لے جاتا۔ اس کی دولت سے محبت ہی پھولن کے اعتبار میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

یہ بحث و مباحثہ اگلے کئی روز جاری رہا۔ بلوان نے اسے راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن پھولن ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"بات بالکل سادہ ہے بلوان!" اس نے حتمی انداز میں کہا۔ "میں اپنے آپ کو عورت سمجھتی ہی نہیں۔ مجھے کسی کی سہارا نہیں چاہیے۔ میں ہر چیز اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہوں۔"

بلوان نے بالآخر سر تسلیم خم کر دیا۔

"اگر تمہارے آدمی میرے ساتھ چلنا چاہیں تو ان کی چھانٹی بھی میں خود ہی کروں گی۔"

"تم ایک مشکل راستہ چن رہی ہو پھولن!" اس نے اپنی پیشانی مسلی۔

"میں اپنے انتقام کے لیے آگ کا دریا پار کرنے کے لیے بھی تیار ہوں بلوان! اس سرخ رائفس کی مرچ تک میرا ہر ایک سانس سزا ہے۔" وہ آتشیں لہجے میں گویا ہوئی۔ "کیا کوئی ایسا باغی وار یہاں پر موجود ہے؟"

اس حدت نے بلوان کے علاوہ اس کے ساتھیوں پر بھی گہرا اثر کیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد ایک دراز قامت آدمی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"میرا نام لاکھن ہے۔ میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

پھولن نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ لاکھن کی عمر تقریباً تیس برس تھی۔ اس کی داڑھی بے حد گھنی اور لمبے بال ایک ربڑ کے ساتھ بندھے تھے۔ وہ تیز طرار اور چالاک دکھائی دیتا تھا تاہم اس کے بشرے میں ایمانداری کی جھلک بھی واضح تھی۔

"یہاں آنے سے پہلے کیا کرتے تھے؟" اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ایک بینک میں کام کرتا تھا۔"

"یہاں آنے کا کارن؟"

"انتقام ——!" لاکھن کی پیشانی پر ایک رگ ابھری۔ "انتقام کے لیے میں مر بھی سکتا ہوں اور اس پورے سنسار کو آگ بھی لگا سکتا ہوں۔"

پھولن کو قدرے اطمینان محسوس ہوا۔ اس نے لاکھن کو اپنا "منشی" بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

لاکھن کی شمولیت کے کچھ ہی روز بعد بلوان نے ایک شام پھولن کو بتایا۔

"آج بابا مستقیم نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔"

"یہ کون مہاشے ہے؟" پھولن کے لیے اس کا نام اجنبی تھا۔

"ایک خطرناک ڈاکو اور اپنے سلطان گروہ کا بدنام سردار۔" اس نے وضاحت کی۔ "لیکن لوگ اس کا بہت عزت کرتے ہیں۔"

"رابطے کا کوئی خاص کارن؟" پھولن نے ایک فطری سوال کیا۔

"تم سے ملنا چاہتا ہے —— اور میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ ایک بار مل لو۔"

بلوان کی اس تجویز پر پھولن نے بابا مستقیم سے ملاقات کی ہامی بھر لی۔ مستقیم اس کی توقعات کے برعکس ثابت ہوا۔ وہ ایک خوش پوش، مہذب اور ملنسار شخص تھا۔ اس کے نرم نقوش کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک

https://www.urdutubes.com

Scanned with CamScanner

بدنام زمانہ ڈاکو ہے۔ اس نے متانت و خوش خلقی سے پھولن کا استقبال کیا۔

"مجھے وکرم کی موت کا بہت افسوس ہے۔ وہ اصل معنوں میں ایک نر بچہ تھا۔"

پھولن کی آنکھوں میں آنسو در آئے۔

"کاش، اس نے میری بات مان لی ہوتی۔" وہ کراہی۔ "کاش، میں نے اس رات اس سرخ راکھشس کو خود ہی گولی ماردی ہوتی تو آج وکرم جیوت ہوتا۔"

"قسمت ساتھ نہ دے تو زندگی میں اگر، مگر اور کاش ہی باقی رہ جاتے ہیں۔" مستقیم نے گہری سانس لی اور ایک توقف کے بعد کہنے لگا۔

"مجھے تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کا بھی بہت دکھ ہے۔ سری رام نے جو کچھ بھی کیا، وہ انسانیت کا گھناؤنا ترین فعل تھا۔"

پھولن کی رگوں میں انگارے چٹخنے لگے۔ وہ آتشِ انتقام میں بے طرح جھلس رہی تھی۔

"اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ تم چاہو تو مجھے بھی اپنے گروہ میں شامل کر سکتی ہو۔" اس نے تجویز دی۔

"میں اپنا گروہ خود بنانا چاہتی ہوں۔ سرداری میرے ہاتھ میں ہوگی۔" پھولن نے قطعیت سے جواب دیا۔

بابا مستقیم قدرے ردّ و کد کے بعد راضی ہو گیا۔

"میں تمہیں اپنے گروہ سے دس بندے دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے علاوہ کیا چاہیے؟"

"ایک آٹومیٹک رائفل۔" پھولن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد بتایا۔ "لیکن میں اس کی قیمت ادا کروں گی۔"

"مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔" اس نے رسان سے کہا۔ "تم اپنے ساتھیوں کا چناؤ کر لو۔"

"مجھے ایسا کوئی شخص نہیں چاہیے جو عورتوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کو اپنی مردانگی سمجھے۔ میں انتقام کی آگ میں جلنے والوں کا چناؤ کروں گی۔"

پھولن کے اس مطالبے پر مستقیم نے چند افراد اس کے حوالے کر دیے۔ وہ ان سے فرداً فرداً یکساں سوالات کرتی رہی۔

"کیا تم مجھے اپنا سردار مانتے ہو؟" وہ پہلا سوال کرتی۔

"ہاں، مانتا ہوں۔"

مقابل کی جانب سے یہ جواب ملتے ہی وہ مزید سنجیدگی سے استفسار کرتی۔

"تمہارے نزدیک میں ایک عورت ہوں یا مرد؟"

"تم پھول سنگھ ہو۔"

ان سوالات و جوابات کے نتیجے میں اس نے مان سنگھ، بلادین، رام داس، جھلر، اللو، جگیشور منی رام اور کھڑاگ عرف وشنو کا انتخاب کر لیا۔ ان سبھی افراد میں ایک ہی بات یکساں تھی کہ ان کا تعلق معاشرے کی نچلی اور استحصال شدہ ذاتوں سے تھا۔

"تمہارے چناؤ کی داد دینا پڑے گی۔" مستقیم نے اعتراف کیا۔ "مان سنگھ تمہارا سب سے زیادہ وفادار ہوگا۔ اس نے بھی اپنی زندگی میں تمہاری ہی طرح کشٹ اٹھائے ہیں۔"

بابا مستقیم کی بتائی گئی اس کہانی کے مطابق مان سنگھ کے دو ماموؤں نے اس کی والدہ کو زمین میں حصہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ دونوں بھائیوں نے ملی بھگت سے مستقیم اور مان سنگھ کی دیرینہ دوستی اور سامان کی فراہمی کے متعلق پولیس کو مطلع کر دیا۔ پولیس اہلکاروں نے اپنی کارروائی کے دوران مان سنگھ کے بھائی کو گولی ماردی۔ اس حادثے کے بعد وہ کچھ عرصہ روپوشی کے بعد مستقیم کے گروہ میں شامل ہو گیا۔

پھولن کے لبوں پر ایک آزردہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ بابا مستقیم اس کے ہمراہ منتخب شدہ افراد کے پاس چلا آیا۔ وہ سب اسے دیکھ کر احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ مستقیم نے گمبھیر سنجیدگی سے ان کی جانب دیکھا اور مضبوط لہجے میں گویا ہوا۔

"اللہ کی قسم کھا کر اقرار کرو کہ تم پھولن دیوی کو کبھی عورت نہیں سمجھو گے۔"

"ہم قسم کھاتے ہیں۔" ان کا آہنگ بلند تھا۔

"قسم کھاؤ کہ اسے ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھو گے۔" مستقیم نے کہا۔ "میں عہد شکنی کرنے والے کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماردوں گا۔"

"ہم اپنا وچن نبھائیں گے۔" انہوں نے خلوص سے جواب دیا۔

"پھولن دیوی میرا بھائی ہے۔ آج سے یہ تمہارا بھی بھائی ہے۔ سب تعریفیں خدا ہی کے لیے ہیں۔" وہ مکمل طور پر جوش سے مغلوب تھا۔

"پھول سنگھ کی جے ـــ پھول سنگھ کی جے.....!"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

فضا میں یکدم ہی حدت بڑھ گئی۔
مستقیم باوقار انداز میں آگے بڑھا اور پھولن کی پیشانی پر ایک "سرخ بندیا" باندھ دیا۔
"یہ انتقام کی علامت ہے۔ پروردگار تمہیں ہمیشہ سرخرو فرمائے گا۔"
فضا ایک بار پھر نعروں سے گونج اٹھی۔ اگلے روز روانگی سے قبل مستقیم نے کاغذ میں لپٹی ایک شے اس کی جانب بڑھادی۔
"یہ میری طرف سے تمہارے لیے ایک تحفہ ہے۔"
پھولن کو لفافہ کھولتے ہی ایک مہر دکھائی دی جس پر چار الفاظ کندہ تھے۔ وہ اپنی ناخواندگی کے باعث الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔
"پھولن دیوی۔۔۔ ڈاکوؤں کی ملکہ۔" مستقیم نے مسکرا کر کہا۔ "یہ مہر تمہارے ہر خط کی شناخت بن جایا کرے گی۔"
پھولن کی آنکھوں میں ایک جذباتی چمک ابھر آئی۔ اس نے اس مہر کے استعمال کی منصوبہ بندی کرلی تھی۔

☆☆☆

سورج سخت آگ برسا رہا تھا۔ قصبے کی گلیوں میں گرمی کے باعث قیامت خیز گھٹن تھی۔ پھولن موسم کی اس خارجی شدت سے بےخبر بے نیاز تھی۔ اس کے وجود کی تپش ہر ایک شے پر حاوی تھی۔ اس قصبے کے گلی کوچوں میں قدم رکھتے ہی تین برس قبل کے تمام تر زخم ہرے ہوگئے تھے۔ اسے ایک بے بس اور وحشت زدہ لڑکی پر پولیس کا بہیمانہ تشدد یاد آرہا تھا۔ "کالپی" کا یہ مقام اس کے تصور میں ناسور کی حیثیت اختیار کرچکا تھا تاہم اس روز یہ آمد ایک خصوصی مقصد کے تحت تھی۔ وہ دو متمول تاجروں کو بغرضِ تاوان اغوا کرنے آئے تھے۔
پھولن نے اپنے ساتھیوں بلوان اور مستقیم کے ہمراہ قصبے کے بازار میں واقع سناروں کی دکانوں کے شیشے کرچی کرچی کردیے۔
"جس کو جو بھی زیور چاہیے، فوراً لے لو۔" مستقیم نے بستی کے رہائشیوں کو مخاطب کیا۔
اس اعلان کے بعد وہاں ایک ہڑبونگ مچ گئی۔ لوٹ مار کا یہ عالم تھا کہ اگلے چند ہی لمحوں میں دکانوں کے مال واسباب کا صفایا ہوگیا۔ پھولن کو ان غریب افراد کی جگمگاتی آنکھیں دیکھ کر بے حد سرور حاصل ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے مغویوں کو سنبھالا اور کام مکمل ہوتے ہی قصبے سے فرار ہونے لگے۔
ان کا منصوبہ بے حد سادہ تھا۔ وہ واپسی کے وقت ریلوے کی پٹری عبور کرکے دوسری جانب جھاڑیوں کی اوٹ میں روپوش ہونا چاہتے تھے۔ یہ منصوبہ پٹری پر پولیس کو دیکھتے ہی کھٹائی میں پڑتا دکھائی دینے لگا۔ پولیس اہلکاروں نے ریت کے بورے سامنے رکھ کر گھات لگائی ہوئی تھی۔ وہ دم سادھے ان کی آمد کے منتظر تھے۔ پھولن اپنے جوش وجذبے میں سب سے آگے موجود تھی۔ گولیوں کی اچانک بوچھاڑ اور مستقیم کی متنبہ کرتی آواز نے اسے ایک آڑ میں چھلانگ لگانے پر مجبور کردیا۔
گولیوں کی سنسناہٹ اور گرم ہوا میں چاروں طرف بارود کی بدبو ہیجان انگیز تھی۔ وہ پیٹ کے بل رینگتی اپنے ساتھیوں کے پاس پلٹنے لگی۔ پولیس کی جانب سے پھینکے جانے والے گرینیڈ اور اپنے ساتھیوں کی فائرنگ سے بچتی ہوئی پھولن کے دل ودماغ میں ایک ہی خیال غالب تھا۔
"میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ میں اس راجھنس سے اپنا انتقام لیے بغیر کہیں مروں گی۔"
پٹری کے ساتھ ساتھ پتھروں کے ڈھیروں کی آڑ لیتے ہوئے وہ بالآخر جمنا کے اوپر واقع ایک پل تک رسائی میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد انہوں نے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائیں اور بالآخر پولیس کا نرغہ توڑنے میں کامیاب ہوگئے۔
دن بھر کی بھاگ دوڑ اور دہشت نے دونوں مغویان کی حالت خستہ کردی۔ وہ بھوک وپیاس سے شدید بے حال تھے۔ پھولن اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق مستقیم کے گاؤں "گیرئی" پہنچ گئی۔ اس کے دیگر ساتھی بھی نصف شب تک وہیں آپہنچے۔ پھولن، مستقیم اور بلوان ابھی سکھ کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ پولیس ایک بار پھر حملہ آور ہوگئی۔ ان کے ہتھیار مسلسل آگ برسا رہے تھے۔
"ہمیں ان دونوں کو چھوڑنا ہوگا۔" مستقیم نے مغویان کی سمت اشارہ کیا۔
"ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" پھولن مضطرب ہوئی۔
"یہ ہمارے ساتھ رہے تو بھوک، پیاس اور دہشت سے ہی مرجائیں گے۔ ان کی لاش کے بدلے میں کوئی ہمیں کیا دے گا بھلا؟"
مستقیم کی یہ بات پھولن کے فہم میں سما گئی۔ اس نے مغویان کو سرد مہری سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"اگر تم نے ہمیں پھولی کا پیسا نہ بھیجا تو تمہارا انجام

https://www.urdufanbase.com
Scanned with CamScanner

digest library.com

بہت برا ہوگا۔"

"ہم وچن دیتے ہیں، تمہیں پیسا مل جائے گا۔ ہم وچن دیتے ہیں۔" وہ اعصابی شکستگی کا شکار ہو چکے تھے۔

"اگر نہ دیے تو ہم واپس آ کر اپنی رقم لے لیں گے اور تمہیں جان سے مار دیں گے۔" اس نے ایک بار پھر دھمکایا۔

دونوں تاجر اسے اپنی وفاداری اور تابعداری کا یقین دلانے لگے۔

پولیس اہلکاروں کے خلاف یہ مقابلہ اگلے کئی گھنٹے جاری رہا۔ پھولن کے گروہ میں کسی کا بھی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس نے بالآخر پولیس کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کامیابی کے بعد پھولن کا اعتماد آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ ساتھیوں کے اعتماد میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ اس نے موجودہ حالات و واقعات کے پیش نظر بلوان اور بابا مستقیم کے ہمراہ ڈاکا زنی جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ان شب و روز میں اس کی اولین خواہش سری رام کے بدن سے گوشت کا ہر ایک ریشہ الگ کر کے جانوروں کی ضیافت تھی۔

☆☆☆

بابا مستقیم، پھولن اور بلوان کا یہ الحاق اگلے چھ ماہ تک پولیس اہلکاروں کے لیے دردِ سر بنا رہا۔ وہ نہایت غور و خوض کے بعد اپنے شکار کا انتخاب کرتے اور مکمل منصوبہ بندی سے ہلا بول دیتے۔

اس یلغار میں شکار سے دو بدو بات چیت بھی پھولن ہی کرتی تھی۔ اس کا سفاک اور سرد مہر انداز مقابل پر لرزہ طاری کر دیتا۔ وہ بجلی کی طرح کڑکتی تھی، طوفان کی طرح گرجتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں شعلوں کی سی لپک ہوتی، الفاظ انگاروں کی طرح بھسم کرتے، انداز دل و دماغ میں دہشت بن کر ثبت ہو جاتا اور آمد کا تصور ہی شیر کی کسی کچھار سے برآمدگی جیسا لرزہ طاری کرنے لگتا۔

انہی دنوں دیوالی کی آمد آمد تھی۔ ہندو عقائد کے مطابق یہ تہوار وشنو دیوتا کی پتنی لکشمی دیوی سے منسوب کیا جاتا ہے جسے غربت اور گندگی سے سخت نفرت تھی۔ اس روز ہر کوئی اپنے گھر کو دھونے اور چمکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔

پھولن کو اپنے گاؤں میں منائی گئی دیوالی کی یادیں خلش میں مبتلا کر رہی تھیں۔ وہ اپنی بہنوں کے ساتھ نہایت جوش اور خوشی سے گھر کی دیواروں پر گائے کے گوبر کا تازہ لیپ کرتی، فرش اور دیواروں پر دیوی کی شبیہ بنایا کرتی اور لالٹینوں، موم بتیوں اور دیوں کی مدد سے چراغاں کیا جاتا۔

"دیوالی کے موقع پر کوئی بڑا دھماکا کرنا چاہیے۔" بلوان نے کہا۔

"کسے شکار کرنا چاہتے ہو؟" پھولن نے معنی خیزی سے دریافت کیا۔

"میں نے ایک امیر زمیندار کے متعلق سنا ہے۔" اس نے بتایا۔

"میں نے آج تک کوئی بھی زمیندار غریب نہیں دیکھا۔" وہ تلخی سے کہنے لگی۔

مستقیم نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

"یہ زمیندار اپنی اوقات بھول چکا ہے۔ کسانوں کو قرض دے کر ان کی زمین گروی رکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد ایک بھی دن کی مہلت نہیں دیتا۔ چند سو روپوں کے لیے ان کے گھروں سے برتن تک اٹھا کر باہر پھنکوا دیتا ہے۔" بلوان نے وضاحت کی۔

"کتنی دولت ہوگی اس کے پاس؟" مستقیم نے دریافت کیا۔

"گنتے ہوئے تھک جاؤ گے۔" وہ ہنسا۔ "میں نے سنا ہے اس نے اپنے گھر میں بہت سی دولت چھپا رکھی ہے۔"

"تو پھر دیوالی کے دن لکشمی دیوی کے نام پر اسے سبق سکھا دیتے ہیں۔" پھولن نے حتمی انداز میں کہا۔

"اسے ایک پیشگی خط بھیج دو۔" مستقیم نے تجویز دی۔

بلوان نے دیوالی کی صبح اپنے ایک اہلکار کو خط دے کر زمیندار کے پاس روانہ کر دیا۔

"تم نے غریبوں سے جو زمینیں اور دولت جمع کر رکھی ہے انہیں واپس کر دو۔"

زمیندار نے تنفر سے اس اہلکار کو دیکھا اور استہزائیہ انداز میں کہنے لگا۔

"مجھے ہر صبح، شام ایسے کئی سندیسے ملتے ہیں۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیل رکھیں۔ میری مرضی کے بغیر یہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

اس پیغام نے پھولن کو ایک عجیب جنون میں مبتلا کر دیا۔ وہ اگلے ہی روز اس کی وسیع و عریض حویلی میں پہنچ گئے۔ سرسبز باغات کے درمیان واقع اس عمارت کے گرد

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

بلند و بالا دیواریں تھیں۔ زمیندار کے نصف درجن سے زائد پہریدار ان پچاسیوں افراد کی یلغار پر حواس باختہ ہو گئے۔ انہوں نے وہاں سے فرار میں ہی عافیت سمجھی۔ پھولن دیوی، بابا مستقیم اور بلوان کو دیکھتے ہی گاؤں کے غریب مقروض کسانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

پہریداروں کے راہ سے ہٹتے ہی بوڑھے زمیندار پر قابو پانا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ پھولن نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔

"تم لوگ مجھے جانتے نہیں ہو۔ اس حرکت پر بہت پچھتاؤ گے۔" وہ بھنایا۔

پھولن نے اطمینان سے ایک اور طمانچہ جڑ دیا۔

"تم ان سب غریبوں کی زمینوں اور زیور پر قبضہ کرنے والے ایک جالور ہو۔" بلوان نے تنفر سے اسے دیکھا۔

"میں تو ان کا بھلا کرتا ہوں۔" زمیندار نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"تمہارا سب سامان کہاں ہے؟" مستقیم نے اسے گھورا۔

زمیندار کے چہرے پر تذبذب دیکھتے ہوئے پھولن نے اسے وحشیانہ انداز میں زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ اس کی مزاحمت بالکل دم توڑ گئی۔ اگلے کچھ ہی لمحوں میں زمیندار نے اس مقام کی نشاندہی کر دی جہاں تمام تر مال و اسباب چھپایا گیا تھا۔

بالو کے اس مخصوص گوشے کی کھدائی کرتے ہی بے شمار زیورات اور رقم برآمد ہوئی۔ قرض کے بدلے میں حاصل ہونے والے یہ زیورات خلیف مٹکوں میں رکھے گئے تھے۔ ایک مٹکے میں رہن شدہ زمینوں اور جائدادوں کے کاغذات بھی موجود تھے۔

پھولن نے تنفر سے زمیندار کو دیکھا اور برق رفتاری سے حویلی کی چھت پر چڑھنے کے بعد میگافون میں پکارنے لگی۔

"گاؤں والو! تم میں سے جس نے بھی اپنے زیور، سونا، چاندی اور زمینوں کے کاغذات واپس لینے ہیں، وہ زمیندار کی حویلی میں چلا آئے۔"

پھولن کے اس اعلان پر وہاں ایک بڑبونگ مچ گئی۔ مقروض افراد نے اپنی اشیا حاصل کیں اور طیر حاضر افراد کو بھی اس سنہری موقع سے استفادے کے لیے بلانے دوڑ پڑے۔ اس روز زمیندار کو بالکل کنگال کر دیا گیا تھا۔ اہلِ گاؤں کا سامان لوٹانے کے بعد انہیں تقریباً نو لاکھ روپے کا اسباب حاصل ہوا تھا۔

پھولن دیوی کی دہشت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

سری رام اور لالہ رام اس کے روز افزوں بڑھتے دبدبے پر سخت مضطرب تھے۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ پولیس کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ اس کل کی چھوکری نے ہر طرف آتنک مچایا ہوا ہے اور یہ..... ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کر بیٹھے ہیں۔" سری رام بے نوشی کے زیر اثر نازیبا القابات تراشنے لگا۔

"بلوان اور مستقیم نے اس کے ہاتھ مضبوط کیے ہوئے ہیں۔" لالہ رام نے بھی اپنا جام اٹھایا۔

"میں ایک بات پر حیران ہوتا ہوں۔ اس..... میں آخر ایسا کیا جادو ہے کہ ہر کوئی اس کے پیچھے دم ہلاتا پھرتا ہے۔" اس نے مزید دشنام طرازی کی۔ "پہلے اس وکرم کو اپنے پلو سے باندھے رکھا اور اب ان دونوں کو بھی مردانگی بھلا دی ہے۔"

لالہ رام کی پیشانی بھی پرشکن دکھائی دینے لگی۔

"ہمت تو دیکھو، اب شہر میں بیوپاریوں کو بھی لوٹنے لگی ہے۔" وہ بلبلایا۔

"وہ بہت سمجھداری سے کھیل رہی ہے۔" لالہ رام نے کہا۔ "شہر کے بازار میں کپڑوں کے بیوپاریوں سے لوٹا ہوا سارا مال خود نہیں رکھا۔ میرے خبریوں نے بتایا ہے کہ ایک لاکھ روپے غریبوں پر لٹائی رہی۔ وہاں ان پیسوں کی بارش ہو رہی تھی۔"

"اس کا ٹینٹوا دبانے میں اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔" سری رام نے جام پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

"یہ تم کہہ رہے ہو؟" اس نے طنز کیا۔ "دیر تو تم کر ہی چکے ہو۔"

"مجھے بار بار وہی بات یاد نہ کروایا کرو۔" وہ بھڑک گیا۔

"کیوں نہ یاد کرواؤں؟" لالہ رام بھی تلخ ہوا۔ "تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ تم نے کیا غلطی کر دی ہے۔ ہم اس ناگن کا پھن بہت آرام سے کچل سکتے تھے۔ اسے بھی وکرم کے ساتھ ہی گولی مار سکتے تھے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ اس ناگن کے سامنے ناگ کو مارا اور اسے گلیوں میں گھسیٹتے رہے۔ تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ ناگن اپنے ناگ کا

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

انتقام ضرور لیتی ہے۔ زخمی ناگن تو اور بھی خطرناک ہو جاتی ہے۔"

"میں اسے دیکھ لوں گا۔ وہ بس ایک بار میرے ہاتھ لگ جائے۔" سری رام نے ایک اور جام بھر لیا۔

اسی اثنا میں ان کا خصوصی مخبر بوکھلاہٹ میں وہاں چلا آیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے، کوئی بھوت دیکھ لیا ہے کیا؟" سری رام دہاڑا۔

"پھولن دیوی ـــ یہیں آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے آدمی ہیں۔"

مخبر اس اطلاع پر ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔

"اسے کیسے جانکاری ملی کہ ہم یہاں ہیں؟" لالہ رام بوکھلایا۔

"آج سارے پرانے حساب چکا دیتے ہیں۔" سری رام نے کہا۔ تاہم وہاں موجود دونوں افراد کو اس کے لہجے کا کھوکھلا پن واضح محسوس ہوا تھا۔

"اس نے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تو بہت سستا ہو جائے گی۔ آپ دونوں ترنت یہاں سے نکل جائیں۔ ہمارے پاس ابھی اتنے ہتھیار نہیں ہیں کہ ان کا مقابلہ کر سکیں۔" مخبر نے صاف گوئی سے کہا۔

سری رام نے بھی فرار میں ہی عافیت سمجھی۔

☆☆☆

پھولن کا جوش و ولولہ لرزہ خیز تھا۔ اس کے مزاج کی سفاکی اور تلخی اس قدر شدید تھی کہ مستقیم اور بلوان بھی اسے مخاطب کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے۔ انہیں مصدقہ اطلاع ملی تھی کہ رام برادران کسی شادی میں شرکت کے لیے اس گاؤں میں موجود تھے۔ پھولن نے بلا تامل حملے کا منصوبہ بنا لیا۔ وہ اپنے گروہ کے ہمراہ گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ آنے والے لمحات کا تصور اس کے رگ و پے میں بجلیاں بھر رہا تھا۔

"اس سرخ بالوں والے راکھشس کو پہلی گولی میں ماروں گی۔" اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اسے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

گروہ کے افراد اس کے تیور دیکھ کر سہم چکے تھے۔ ان میں حکم عدولی کی تاب ہی نہیں تھی۔

"گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ ایک بھی منش باہر نہ جانے پائے۔" پھولن نے حکم دیا۔

بلوان اور مستقیم اپنے اہلکاروں کو ہدایات دینے لگے۔ پھولن کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ اس کی پیشانی پر سرخ "بندانا" اور لہراتے بال نگاہیں چندھیا رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ستائی لباس میں ملبوس دو خواتین وہاں سے گزرتی دکھائی دیں۔ ان کے چہرے طویل پلو میں پوشیدہ تھے۔ انہوں نے اپنے سروں پر لکڑیوں کے گٹھر اٹھا رکھے تھے۔ پھولن ابھی ہونی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا پھول سنگھ! کوئی سستا ہے کیا؟" بابا مستقیم نے اس کی کیفیت بھانپ لی۔

"مجھے یہ دونوں ناریاں کچھ عجیب لگ رہی ہیں۔" اس نے کہا۔

مستقیم نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے مذکورہ خواتین کو دیکھا اور ایک توقف سے کہنے لگا۔

"کچھ کچھ تحیم ہیں۔ عام طور پر عورتیں ایسی جسامت کی مالک تو نہیں ہوتیں لیکن چند ایک کا ڈیل ڈول مختلف ہوتا ہے۔"

"میں اپنی تسلی کرنا چاہتی ہوں۔ انہیں روک لو۔" وہ مضطرب تھی۔

"ہم ایسا نہیں کر سکتے پھول سنگھ!" اس نے رسان سے کہا۔ "ہمارے اس دھندے میں عورت ذات کا بہت سمان کیا جاتا ہے۔ ہم انہیں روک کر تلاشی نہیں لے سکتے۔ یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے۔"

مستقیم کی اس بات پر پھولن کو ایک بار پھر وکرم کی یاد نے گھیر لیا۔ وہ بھی اسی طرح اصول و ضوابط کی پاسداری کیا کرتا تھا۔ ایک با اصول اور منظم ڈاکو بنے رہنے کے باوجود وہ ایسی سوچ سے ہمکنار ہو گیا تھا۔

پھولن کی ذہنی رو وکرم سے وابستہ یادوں میں الجھی رہی۔ اسی اثنا میں خواتین نظروں سے اوجھل ہو کر جنگل میں داخل ہو گئیں۔ گاؤں میں داخلے کے بعد جب پھولن کو علم ہوا کہ سری رام اور لالہ رام کچھ ہی دیر پہلے زنانہ لباس میں فرار ہو گئے ہیں تو وہ جھلا کر رہ گئی۔

"وہ میری نظروں کے سامنے سے گزر گئے۔ میں نے انہیں روکا کیوں نہیں؟" وہ اپنا سر پیٹنے پر مجبور تھی۔

"پھولن! جو ہوتا ہے، بہتری کے لیے ہی ہوتا ہے۔" مستقیم نے سمجھایا۔

وہ کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"ان دونوں کو کس نے شرن دی تھی، کس کے گھر میں رہ رہے تھے؟" وہ دہاڑی۔

اگلے چند لمحات بے حد ہولناک تھے۔ پھولن ان

https://www.urdutube.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

کے میزبانوں کو گھسیٹتے ہوئے چوراہے میں لے آئی۔ اس نے گاؤں کے اکثر افراد کی شناخت کر لی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جو سری رام کو اسے برہنہ گلیوں میں گھمانے اور بے آبرو کرنے سے روکنے کے بجائے خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے تھے۔

پھولن کا خون بے طرح کھول رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا رگیں پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔ اس نے اپنے مجرمان کو وحشیانہ انداز میں زدوکوب کیا۔ ان کی تڑپ اور التجائیں اس کا غصہ مہمیز کر رہی تھیں۔

"سامان میں جتنے بھی چاقو ہیں یہاں لے آؤ۔" اس نے بلوان کو مخاطب کیا۔

"تم کیا کرنا چاہتی ہو پھولن؟" وہ جھرجھرایا۔

"کچھ نہیں..... بس آج کے بعد یہ مرد ہوتے ہوئے بھی مرد نہیں رہیں گے۔" پھولن نے سفاکی سے کہا۔

اس سزا کا تصور مجرمان کے لیے قیامت خیز تھا۔ وہ پھولن کے قدموں میں گرتے ہوئے گڑگڑانے لگے۔

"اور تڑپو..... تھوڑا سا اور روؤ۔" اس کا اطمینان دیدنی تھا۔ "میں بھی اسی طرح دیا کی بھیک مانگتی تھی۔ کسی ایک نے بھی میری سہائتا نہیں کی۔ لعنت ہے ایسی مردانگی پر۔"

کچھ ہی دیر بعد ان کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اس روز گاؤں کی آبادی میں مرد و خواتین کے بعد ایک نئے فریق کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اس یادگار سزا کے بعد پھولن کی شہرت اور دہشت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ملاح برادری اور دیگر کمتر ذاتوں سے تعلق رکھنے والے استحصال شدہ افراد نے بھی اپنے مسائل کے حل کے لیے پھولن کو ہی مسیحا بنا لیا۔ وہ ظالم اور غاصب کو برملا کہتے۔

"تمہیں پھولن دیوی ہی سبق سکھائے گی۔"

پھولن بھی ان افراد کی امید اور آرزو نہایت اہتمام سے برلاتی۔ وہ غریب طبقے کی مالی مدد کے علاوہ ظالم کو انہی کے سکوں میں ادائیگی کرتی تھی۔ اسے علم تھا کہ پولیس ان لوگوں کی کبھی دادرسی نہیں کرے گی۔ وہ پولیس اہلکاروں کی بددیانتی اور رجحان بخوبی جانتی تھی۔

پھولن کا اولین ہدف ٹھاکر برادری تھی۔ وہ ان کی ہوس پرستی اور اپنے محکوم طبقے کی خواتین پر ظلم و تشدد سے بھی واقف تھی۔ ان خواتین کو بدترین جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ وہ ان گناہوں کی نشانی اپنے وجود میں پنپتے محسوس کرتیں تو دریا برد ہونے پر مجبور ہو جاتیں یا انازی حکیم اور طبیب کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتیں۔

وہ کسی بھی ٹھاکر کی حویلی پر واردات کے دوران وہاں دکھائی دینے والی کم عمر لڑکیوں کو ایک جانب لے جا کر استفسار کرتی۔

"تم یہاں اپنی اچھا سے رہ رہی ہو؟"

"نہیں دیدی! ہمیں یہاں ویشیا بنا کر رکھا گیا ہے۔" اکثریت کا جواب یکساں ہی ہوتا۔

"یہ ٹھاکر لوگ مجھے زبردستی یہاں لائے ہیں۔" چند ایک انکشاف کرتیں۔ "ساری رات دارو پینے کے بعد اپنا ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ باپ، بیٹا، بھائی، چچا، تایا جس کا جو من چاہے، سلوک کرتے ہیں۔"

پھولن اس جواب پر برافروختہ ہو جاتی۔ اس کا طیش شدت سے عود کر آتا۔

"کیا سزا دینا چاہتی ہو انہیں؟" وہ مقابل سے دریافت کرتی۔

"کیا میں انہیں سزا دے سکتی ہوں؟" حیرت و معصومیت سے استفسار ہوتا۔

"بالکل دے سکتی ہو۔" پھولن مصر رہتی۔ "انہیں تو ایسی سزا ملنی چاہیے کہ یہ کسی بھی لڑکی پر اتیاچار کا سوچ بھی نہ سکیں۔"

اس کے بعد وہ اپنی سزا کی جزئیات بتا کر انہیں مزید حیرت میں مبتلا کر دیتی۔ اپنی مردانگی سے محروم ہو جانے والے ٹھاکروں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ سزا یافتہ افراد کو برہنہ کر کے گاؤں بھر میں گھمایا جاتا۔ پھولن اپنے معتوبین کے بدن پر بے دریغ لاٹھیاں برسا کر کہتی۔

"کچھ منورنجن بھی ہونا چاہیے۔"

پھولن کے یہ الفاظ انہیں تڑپنے پر مجبور کر دیتے لیکن وہ انہیں کوئی بھی رعایت دینے کو تیار نہ تھی۔ وہ بآواز بلند اس کے ادا کیے گئے الفاظ دہراتے۔

"پھولن دیوی آئے گی
ظالم کو نچائے گی
..... نے کی تڑپائے گی
پھولن دیوی آئے گی
غریبوں کو بچائے گی
امیروں کو رلائے گی"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

لہو رنگ شکستہ وجود کے ساتھ یہ الفاظ دہراتے وہ افراد اپنا کروفر خاک آلود زمین میں دفن ہوتا محسوس کرتے۔

استحصال شدہ طبقے کی یہ امیدیں اور محبت اسے آبدیدہ بھی کر دیتی۔ وہ انہیں انصاف دلانے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہو جاتی۔ اسی دوران پھولن کو ایک ایسے ٹھاکر کے بارے میں علم ہوا جو اپنے ضلع کی حدود میں واقع ہر دیہات کی غریب لڑکی کو بے آبرو کرنا موروثی حق سمجھتا۔ غریب خواتین کے علاوہ کم عمر لڑکوں اور اپنے ہی گھر کی بہو بیٹیوں کا جنسی استحصال بھی اس کا ایک پسندیدہ مشغلہ تھا۔

پھولن نے اسے اغوا کر کے جنگل میں مخصوص مقام تک پہنچا دیا۔ ٹھاکر کا کروفر جوں کا توں برقرار تھا۔ اگلے آٹھ روز اس کی شاندار "ضیافت" کے بعد پھولن نے اس کا مزاج خاصا درست کر دیا۔

"میری ساری دولت اور زمینیں لے لو۔" وہ نقاہت سے ہانپنے لگا۔

"مجھے کیول سچ جاننا ہے۔" پھولن نے اس کے بال مٹھی میں بھینچ لیے۔

"کیا جاننا چاہتی ہو؟" وہ کراہا۔

"اب تک کتنی لڑکیوں اور بچوں کو روند چکے ہو؟ ذرا گن کر بتاؤ۔" پھولن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اس کے بعد مجھے چھوڑ دو گی کیا؟ تمہیں واقعی میری دولت نہیں چاہیے؟" وہ حیران ہوا۔

پھولن نے اطمینان سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ٹھاکر کے چہرے پر امید جھلکنے لگی۔ وہ خلا میں دیکھتے ہوئے ان سبھی افراد کو یاد کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھولن کو اصل تعداد بتا دی۔

"اس کے اتنے ہی ٹکڑے کر دو۔" پھولن نے اپنے قریب کھڑے ایک آدمی کو حکم دیا۔

ٹھاکر کی آنکھیں دہشت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔

"مجھے شما کر دو پھولن دیوی..... تمہیں بھگوان کا واسطہ۔"

"اس کے سب ٹکڑے پہلے درگا دیوی کی پوجا میں بھینٹ چڑھانا، پھر اس کی حویلی کے باہر درختوں پر لٹکا دینا۔" اس نے اگلا حکم جاری کیا۔

ٹھاکر کی دھڑکنیں دہشت سے ہی ساکن ہونے لگیں۔

تعاقب

بابا نظام الدین دینا کی نظر کمزور تھی۔ ایک روز وہ کھیتوں کے قریب سے گزر رہے تھے کہ تیز ہوا کی وجہ سے ان کی سیاہ جناح کیپ اڑ کر دور چلی گئی۔ وہ اسے پکڑنے کے لیے دوڑے مگر تیز ہوا کی وجہ سے ٹوپی بھی لڑھکتی ہوئی مزید دور جا رہی تھی۔ بابا نظام دین نے ہانپتے کانپتے تعاقب جاری رکھا۔

اچانک کھیتوں کے قریب سے ایک عورت چلائی۔ "بابا جی! یہ آپ کس چیز کے پیچھے بھاگ رہے ہیں؟"

"اپنی ٹوپی کے پیچھے۔" بابا جی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹوپی.....؟" عورت حیرت سے بولی۔ "آپ کی ٹوپی تو پتا نہیں کہاں ہے۔ آپ تو ہماری مرغی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔"

تصدیق

مسز نیاز نے قدرے اٹھلا کر اپنے شوہر سے کہا۔ "میری سہیلیاں کہتی ہیں میں روز بروز پہلے سے زیادہ جوان ہوتی جا رہی ہوں۔"

نیاز صاحب نے اخبار سے نظر ہٹا کر ٹھنڈی سانس لی اور بولے۔ "وہ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ تقریباً کئی برس پہلے تم چالیس سال کی تھیں اور پچھلے ہفتے تم نے اپنی تیسویں سالگرہ منائی ہے۔"

(مرسلہ: عاصم خان، کراچی)

الجھن

شائستہ نے فرزانہ سے کہا۔ "میں تم سے کھل کر کہہ سکتی ہوں کہ صرف میرے شوہر ہی وہ مرد ہیں جو میری زندگی میں میرے قریب آئے۔"

"یہ تم فخر کا اظہار کر رہی ہو یا تقدیر سے شکوہ کر رہی ہو؟" فرزانہ نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

(مرسلہ: عنبر خان، سوات)

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

☆☆☆

اپنی شہرت، دہشت اور ایک مخصوص طبقے کی جانب سے انمول محبت کے باوجود پھولن کو اپنے وجود میں بے نام خلش محسوس ہوتی۔ شب کی تاریکی میں سیاہ آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھتے اس کی آنکھیں دھندلانے لگتیں۔ وکرم کی باتیں سرگوشیوں کی صورت میں سماعت میں گونجتی تھیں۔

''تم اتنی جلدی کیوں چلے گئے وکرم! مجھے اکیلا کیوں چھوڑ دیا؟'' وہ بلکنے لگتی۔

وکرم کی یادیں بھرپور شدت سے حملہ آور ہو کر اسے شدید بے بس کر دیتی تھیں۔ وکرم نے اسے اعتماد اور حوصلہ بخشا تھا، دنیاداری کے بہت سے معاملات سکھائے۔ اس کی ہمراہی نے ہی پھولن کو اپنے بچپن کی ایک کوتاہی دور کرنے کا موقع دیا۔ وہ اوائل عمری سے ہی ''گنتی'' کے فن سے ناآشنا تھی۔ وکرم نے اسے دھیرے دھیرے ہر چھوٹے بڑے نوٹ کی پہچان کرواتے ہوئے گنتی بھی سکھا دی۔

وکرم کی یاد آتے ہی ذہنی رو غیر محسوس انداز میں دیوی دین کی جانب بھی منتقل ہو جاتی۔ اس کی آنکھیں گہرے نیلے نشتر کے مانند روح و قلب کو نشانہ بناتیں۔

''تم دوسری لڑکیوں کی طرح کیوں نہیں ہو پھولن؟'' وہ زچ ہو کر کہتا تھا۔

''کیوں باپو! کیا فرق ہے دوسری لڑکیوں اور مجھ میں؟'' پھولن آزردہ ہو کر دریافت کرتی۔

''بہت زیادہ فرق ہے۔'' دیوی دین اپنے ہونٹ کچلتا۔ ''وہ زیادہ باتیں نہیں کرتیں، بڑے لوگوں اور اونچی ذات والوں کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دیتیں۔''

''تو کیا کرتی ہیں وہ؟'' پھولن کے لہجے میں تلخی سما جاتی۔

''جب کسی ٹھاکر کے سامنے سے گزرتی ہیں تو جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیتی ہیں۔ ویسے بہتر یہی ہے کہ ٹھاکروں کے سامنے جوتے پہنے ہی نہ جائیں۔ سرپنچ گاؤں کے کنوئیں سے پانی بھرنے کے لیے منع کر دے تو دور دریا سے پانی لانے کے لیے انکار نہیں کرتیں۔''

پھولن اس کا تمسخر بھانپ گئی۔ وہ یہ نصائح اسے دانستہ طور پر سنا رہا تھا۔

''آہ باپو..... تم نے مجھے ہمیشہ دب کر رہنا سکھایا۔ اگر وکرم میرے جیون میں نہ آتا تو.....''

اس کے بعد پھولن کی ذہنی رو وکرم کی سکھائی گئی باتوں کی جانب مبذول ہو گئی۔

''ہمیں کسی کے سامنے جوتے اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ برملا کہتا۔ ''ہم بھی دوسروں کی طرح کنوئیں سے پانی پی سکتے ہیں۔ ہمیں ایک ہی بھگوان نے بنایا ہے۔ یہ ذاتیں انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ کوئی بھی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔''

وکرم کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں ساون کی طرح برسنے لگتیں۔ وہ ایک جہاندیدہ شخص اور بہترین شریک حیات تھا۔ بحیثیت سردار بھی اس کی خوبیاں بے مثل تھیں۔ اس کی معاملہ فہمی، نرم دلی اور انصاف پسندی گروہ کے ساتھیوں کو گرویدہ بنائے رکھتی۔ ان خصوصیات کے باوجود سری رام پر حد درجہ اعتماد اور اندھی تقلید سمجھ سے بالاتر تھی۔ آخری ایام میں وہ اس شخص کی حقیقت جان گیا تھا۔ اس کے باوجود علیحدگی میں تاخیر کرتا رہا۔

''غلط بات ہے پھولن! کسی سوئے ہوئے شخص پر گولی نہیں چلاتے۔'' اس کی سماعت میں وکرم کی آواز گونجی۔

وکرم نے اسے خوابیدہ سری رام کو نشانہ بنانے سے منع کر دیا تھا۔ اب قسمت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ اسے موت نے اسی انداز میں گھیر لیا۔ وکرم کی اس دائمی جدائی نے پھولن کو ایک ناقابل فراموش سبق سکھایا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں کسی بھی شخص پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔

ان سوچوں سے الجھتے ہوئے پھولن نے ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کو دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

''مجھے دوگا دیوی کا آشیرواد حاصل ہے۔ میں اس سنسار سے ہر ظالم کا سرناش کر دوں گی۔'' اس نے خود کلامی کی۔

اسی لمحے وہ ایک بار پھر وکرم کی یاد سے مغلوب ہو گئی۔ پردۂ تصور پر ایک اور منظر ابھر کر معدوم ہو گیا تھا۔

''پھولن! تم ہمیشہ درگا دیوی کا آشیرواد ہی کیوں چاہتی ہو؟'' وکرم نے دریافت کیا۔

''کیونکہ وہ بہت شکتی شالی ہے۔ ظالموں کا سرناش کرنا جانتی ہے۔'' پھولن نے جھٹ سے جواب دیا۔

''وہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے۔'' اس نے رسان سے کہا۔ ''لیکن اپنے جیون میں ہمیشہ سرسوتی دیوی کا آشیرواد مانگو۔ وہ عقل اور سمجھ کی دیوی ہے۔''

پھولن کی آنکھیں آنسوؤں کی تپش سے بے طرح

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

چلنے لگیں۔

☆☆☆

تھا کر سری رام اور لالہ رام اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک گاؤں میں روپوش تھے۔ پھولن دیوی کے قریب سے گزر کر واپس آپانا ہنوز ایک خواب محسوس ہوتا۔ اس روز پھولن کی بربریت کے متعلق سوچتے ہوئے انہیں یہ احساس بھی لرزا دیتا کہ وہ ان کے ساتھ جانے کیا سلوک کرتی؟

"پھولن دیوی اب حد سے بڑھ چکی ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی انتظام کرنا ہی ہوگا۔" لالہ رام کی پیشانی پر شکن تھی۔

"اس کا گروہ بہت بڑا ہے۔ ان تینوں نے آتنک مچا رکھا ہے۔ انہیں قابو کرنا آسان نہیں ہوگا۔" رام چدر نے کہا۔

"ہاں، ہم ان کے ٹھکانے پر حملہ نہیں کر سکتے۔ یہ تو آتما ہتھیا ہوگی۔" سریش نے بھی رائے جتائی۔

"تمہیں پتا ہے کوئی بھی سپیرا کس سانپ کو بل سے کیسے نکالتا ہے؟" ہری ناتھ نے اپنی سوچوں کو زبان دیا۔

لالہ رام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔

"تو تم چاہتے ہو کہ اس ناگن کو بل سے باہر نکالا جائے؟"

"ہاں، ہم سپیرے کی طرح بین پر ایسے منتر پڑھیں گے کہ وہ ناگن خود ہی جھومتی ہوئی شکار ہونے کے لیے چلی آئے گی۔" ہری ناتھ نے کہا۔

سری رام کے بشرے سے پہلی بار اطمینان جھلکتا محسوس ہوا۔

"اس ناگن کا پھن میں خود کچلوں گا۔"

"بس یہ دھیان رکھنا کہ پہلے جیسی کوئی غلطی نہ ہو۔" لالہ رام جتائے بغیر نہ رہ سکا۔

سری رام نے طیش سے اس کی جانب دیکھا اور بھنا کر کہنے لگا۔

"اس بار میں اسے کوئی موقع ہی نہیں دوں گا۔"

لالہ رام نے آسودگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

بابا مستقیم، پھولن اور بلوان سنگھ اپنے معتمد مخبر کی ایک اطلاع پر بے حد پرجوش تھے۔

"کیا یہ خبر پکی ہے؟" مستقیم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بالکل سچ ہے جی۔" وہ ادب سے کہنے لگا۔ "پہلے کوئی غلط خبر دی ہے کیا؟"

"وہ دونوں بھائی وہاں کیا کر رہے ہیں؟" پھولن مضطرب تھی۔

"اپنے گروہ کے ساتھ کہیں سے حملہ کر کے آئے ہیں۔ اب کسی اور استھان پر جانے کی تیاری میں ہیں۔" مخبر نے بتایا۔

"ہم اس سے پہلے ہی انہیں دبوچ لیں گے۔" وہ حتمی انداز میں کہنے لگی۔

بلوان سنگھ اور بابا مستقیم نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

"گاؤں کا نام کیا بتایا ہے تم نے؟" مستقیم نے استفسار کیا۔

"بھیائی۔"

مستقیم کی پیشانی پر شکن ہو گئی۔

"تم کبھی گئے ہو وہاں؟" پھولن نے دریافت کیا۔

"ہاں۔ میں اس علاقے کو کافی حد تک جانتا ہوں۔" اس نے گہری سانس لی۔

"کوئی سمسیا ہے کیا؟" وہ اس کی کیفیت بھانپ گئی۔

"اس علاقے میں مقابلہ آسان نہیں ہے۔" مستقیم نے بتایا۔

"کیسے نمٹنا چاہتے ہو؟" پھولن نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں نے ایسا کب کہا؟" وہ زچ ہوا۔

"ہم یہ حملہ کریں گے۔ میں سری رام کو بھیانک موت دینا چاہتی ہوں۔" اس کے جذبات بے قابو ہو چکے تھے۔

"ایسا ہی ہوگا۔ تمہارا انتقام ضرور پورا ہوگا۔" بلوان سنگھ نے تسلی دی۔

مستقیم ہنوز گہری سوچ میں غرق تھا۔ وہ بھائی کے قتل و توڑ کی بابت چند تحفظات کا شکار تھا۔ وہ علاقہ اونچی بلند سنگلاخ پہاڑیوں پر مشتمل تھا جن میں گہرے برساتی نالے تھے۔ بے آب و گیاہ پہاڑیوں کے باعث کسی درخت کی آڑ میسر نہ تھی۔ بھائی انہی پہاڑیوں اور برساتی نالوں کے درمیان بلندی پر واقع تھا۔ دریائے جمنا کے کنارے بھی بہت نشیب میں تھے۔

اس حملے کی جزئیات طے کرتے ہوئے تین کشتیوں

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

میں سوار ہو کر دریا کے کنارے کنارے سفر کا فیصلہ کیا گیا۔ بعد ازاں بھائی تک رسائی کے لیے پہاڑی پگڈنڈیوں سے پیادہ مسافت طے کی جاتی۔

اس مسافت کا اختتام رات کی تاریکی میں چرواہوں کے ایک گاؤں "انگوائی" میں ہوا۔ اس علاقے کے رہائشی گارے کی جھونپڑیوں اور گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں مقیم تھے۔ انہوں نے ایک عارضی پناہ گاہ بنائی اور موجودہ صورت حال پر غور و فکر کرنے لگے۔ وہ اپنے سینہ حملے میں پوشیدہ خطرات سے بے خبر نہیں تھے۔

"اپنے جوش میں ہوش مت کھو دینا۔" مستقیم نے پھولن کو مخاطب کیا۔

پھولن نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

"سری رام کا گروہ بہت بڑا ہے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہوگا۔" بلوان کہنے لگا۔

"بالکل۔ وہ سب کے سب ڈاکو ہیں۔ انہیں اس علاقے کے دیہاتوں سے اپنی ضرورت کی ہر چیز آسانی سے مل سکتی ہے۔ اناج، اسلحہ، گولیاں اور پناہ گاہ کے لیے کوئی تنگی نہیں ہوگی۔" مستقیم نے تجزیہ کیا۔

"مجھے بس اس جانور کے ٹکڑے کرنے ہیں۔" پھولن کا چہرہ اندرونی حدت سے تمتمانے لگا۔

اس شب نیند سبھی کی آنکھوں سے دور تھی۔ اگلی صبح مان سنگھ نے کہا۔

"میں علاقے میں گھوم پھر کر آتا ہوں۔ سری رام اور اس کے ساتھیوں کی کوئی نہ کوئی خبر مل ہی جائے گی۔"

اپنے دشمن کے قریب تر ہونے کا تصور پھولن کے اعصاب میں سنسنی پیدا کرنے لگا۔ وہ اسے یادگار موت سے ہمکنار کرنا چاہتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد مان سنگھ کی واپسی نے ان کیفیات کو مہمیز کر دیا۔

"یہ وہی جگہ ہے جہاں تمہیں وکرم کی موت کے بعد لایا گیا تھا۔"

مان سنگھ کے اس انکشاف پر پھولن کے جبڑے بھنچ گئے۔

"اور کیا، کیا جانکاری ملی ہے؟"

"گاؤں والوں نے بھائی جانے کا راستہ بھی بتا دیا ہے۔"

"وہ راکھشس وہیں موجود ہے نا؟"

"ہاں، اس نے اسی جگہ پر تمہاری رسوائی کا تماشا دیکھا تھا۔ اس کے لیے مرنے کی اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے؟" مان سنگھ بھی بے چین تھا۔

"اتنی آسان موت نہیں ملے گی اسے۔" وہ پھنکاری۔

اس کے بعد بھائی جانے کے لیے سفر کا آغاز ہو گیا۔ یہ مسافت دوپہر تک جاری رہی۔ وہ ایک ٹیلے پر کھانا کھانے کے لیے رک گئے۔ ریتلی ارغوانی پہاڑیوں کی بلندی پر سورج مکمل آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ فضا میں بہار کی آمد کی خوشبو تھی۔ یہ موسم پھولن کے دل میں نہاں زخموں کے لیے بہت اذیت ناک ثابت ہوتا تھا۔

کھانا نہایت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد سری رام کی آواز فضاؤں کو چیرتی ہوئی سماعت میں پڑی۔

"تم لوگ میرے اندازے سے زیادہ بیوقوف ثابت ہوئے ہو۔ تمہاری موت ہی تمہیں یہاں کھینچ کر لائی ہے۔"

مستقیم، بلوان اور پھولن نے اپنے ہتھیار مضبوطی سے تھام لیے۔

"میں نے اس کے پاس کئی بار ایک بہت طاقتور بیٹری والا میگا فون دیکھا ہے۔ وہ بھائی کے ہی کسی گھر کی چھت پر موجود ہے۔" پھولن نے طیش سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم یہاں خود نہیں آئے، ہمیں یہاں لایا گیا ہے۔" مستقیم نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔

اگلے لمحے پہاڑیوں میں سری رام کی للکار بازگشت بن کر گونجنے لگی۔

"مستقیم! تمہیں کیا لگتا ہے کہ مجھے پکڑ لو گے۔ تمہاری اتنی اوقات کب سے ہو گئی کہ اپنے ان ..... کے ساتھ سری رام ٹھاکر پر ہاتھ ڈال سکو۔" وہ اس کے مسلمان ساتھیوں کو نازیبا اور فحش ترین القابات سے نوازنے لگا۔

"دھیرج رکھو سب۔" مستقیم نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "وہ ہمیں طیش دلا کر کوئی نہ کوئی غلطی کروانا چاہتا ہے۔"

سری رام کی آواز ایک بار پھر گونجنے لگی۔ وہ اس بار بلوان سنگھ سے مخاطب تھا۔

"بلوان گدھے، گندی نالی کے کیڑے! اپنا پچھلا سبق بھول گیا ہے کیا جو ایک نیا سبق لینے چلا آیا ہے۔"

"پھول سنگھ! میرے پیارے بھائی، میں کب سے تیری راہ دیکھ رہا ہوں۔" اس نے خباثت سے کہا۔ "وکرم

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

مجھے روز سپنے میں ملتا ہے۔ اس کے زخموں سے خون رس رہا ہوتا ہے۔ وہ میرے قدموں میں کسی جانور کی طرح لوٹتے ہوئے کہتا ہے، پھول سنگھ کو کہو مستقیم اور بلوان کے بستر گرم کرنے سے سری رام قابو میں نہیں آئے گا۔ وہ مجھ سے روتے ہوئے بنتی کرتا ہے کہ پھول سنگھ کو میرے پاس بھیج دو ورنہ وہ ایسے ہی بستر گرم کرتی رہے گی۔"

پھولن کا چہرہ اہانت سے سرخ ہوگیا۔ مستقیم نے اسے پرسکون رہنے کا اشارہ کیا اور گروہ کے آدمیوں کو روانگی کا عندیہ دے دیا۔ وہ سبھی اپنی رائفلیں سنبھالتے ہوئے مستعد ہوگئے۔ ان کا رخ سری رام کی آواز کے ماخذ کی سمت تھا۔

خشک اور سنگلاخ زمین کے باعث کہیں بھی آڑ میسر نہ تھی۔ بھاٹی گاؤں کی سرحد بھی ہنوز آنکھوں سے اوجھل تھی۔ وہ نالے کے اوپر سے گھومتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ سری رام کی لغو گوئی کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

"پھول سنگھ! وکرم کے سینے سے نکلتے خون پر کیڑے رینگتے ہیں۔ وہ مجھے بہت زیادہ یاد آتا ہے۔"

"یہاں سے ہم تین ٹولیوں میں تقسیم ہوجائیں تو بہتر ہے۔" مستقیم نے رائے دی۔

"ٹھیک ہے۔ تم اسے کسی بھی طرح گاؤں سے باہر لے آؤ۔" پھولن نے تاکید کی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے آدمیوں کے ہمراہ گھوم کر دوسری جانب پہنچی تو اسے بلوان کی آواز نے ٹھٹکنے پر مجبور کردیا۔ وہ گاؤں کے اندر پہنچ چکا تھا۔ اس کے آدمیوں کی رائفلیں ہولناک انداز میں گرجتی اہلِ علاقہ کو دہشت زدہ کررہی تھیں۔

پھولن چٹانوں کے درمیان ایک تنگ راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ بلوان کے اس وحشیانہ ردِعمل سے بھانپ گئی کہ وہ سری رام کی لغو گوئی سے اپنا ضبط کھو بیٹھا ہے۔ اس کی نگاہیں اب قرب وجوار کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آڑ کے لیے کوئی جھاڑی تک میسر نہ تھی۔ گاؤں سے چیخ وپکار میں مزید اضافہ ہونے لگا۔ انسانی چیخیں اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ مدغم ہورہی تھیں۔ بلوان سنگھ نے سری رام کی تلاش میں گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔

کچھ ہی لمحوں بعد پھولن کو گاؤں کے عقب سے کچھ لوگ فرار ہوتے دکھائی دیے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سری رام اور اس کے ساتھی ہی تھے۔ اس نے فائرنگ کرتے ہوئے بلوان اور مستقیم کو پکارنا شروع کردیا۔

"وہ راکھشس یہاں سے فرار ہورہا ہے۔ ترنت ادھر پہنچو۔" وہ چلائی۔

اس وقت صورتِ حال یکدم ہی الجھ گئی۔ بلوان سنگھ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لوٹ مار میں مصروف ہوگیا تھا۔ مان سنگھ اور بلادین بھی اسی کی تقلید میں شامل ہوگئے۔ مستقیم اور پھولن اپنے آدمیوں کے ساتھ گاؤں کی عقبی سمت ایک دوسرے سے آن ملے۔ فرار ہونے والے افراد کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ پھولن کی جانب مسلسل فائرنگ بھی کررہے تھے۔ سری رام اس آڑ میں انہیں گھل دینے میں کامیاب ہوگیا۔ بلوان کی آمد تک وہ پھولن کی نگاہوں سے روپوش ہوچکا تھا۔

پھولن غم وغصے سے بے حال ہونے لگی۔ سری رام کا تعاقب اب ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ پھولن کی لاعلمی اسے کسی جال میں الجھا سکتی تھی اور مقابل کا مسلح نظر بھی یہی تھا۔ وہ تنگ راستے پر گاؤں کی سمت واپس بڑھنے لگے۔ چیخ وپکار میں اضافہ سمع خراش تھا۔ پھولن کے غیظ وغضب نے بیس ٹھاکروں کی زندگی کا چراغ گل کردیا۔

"اس سارے گاؤں کو ہی پھونک دینا چاہیے۔" بلوان نے غصے سے کہا۔

"تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا۔" مستقیم دہاڑا۔ "یہاں بچے اور پریوار موجود ہیں۔"

"تو ان سب کو بھی اسے شرن دینے کا انعام ملنا چاہیے کہ نہیں؟"

"یہ سارا کھیل تمہاری وجہ سے ہی خراب ہوا ہے۔" مستقیم نے دانت پیسے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس حرام خور کی باتیں برداشت سے باہر تھیں۔" وہ چیخ کر بولا۔

"تو اسے گھسیٹ کر باہر لاتے اور بدلہ لے لیتے۔"

مستقیم کی اس بات پر وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"اور تم.....؟" مستقیم، پھولن کی جانب متوجہ ہوا۔ "تم کسی بھی ٹھاکر کو دیکھتے ہی پاگل کیوں ہوجاتی ہو؟ تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ ہوش سے کام لینا۔"

"مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" پھولن بھڑک گئی۔ "میں اس دھرتی سے ہر ٹھاکر کا سروناش کردوں گی۔"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس حرکت کا کیا انجام

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

ہوگا۔" وہ ان دنوں کی ڈھٹائی پر جز بز تھا۔ اخبار والوں نے آسمان سر پر اٹھالیا ہے۔ اس کے بعد سارے ہندوستان کی پولیس ہمارے پیچھے ہوگی۔ وہ ہمیں کہیں سے بھی کھود نکالیں گے۔"

بلوان کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ وہ اس صورت حال پر متوحش ہونے لگا۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" اس نے بدقت کہا۔

"ہمیں کچھ دنوں کے لیے الگ ہوجانا چاہیے۔ اکٹھے رہے تو پکڑے جانے کا خطرہ بھی زیادہ ہوگا۔"

بلوان کو اس تجویز پر عمل میں کوئی عار نہ تھا۔ مستقیم بھی اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ کسی انجانی مسافت پر روانہ ہوگیا۔ پھولن کے ساتھ سات افراد تھے۔ وہ بھی اس ناکام مہم پر دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

بابا مستقیم کی پیشگوئی بالکل درست ثابت ہوئی تھی۔ ریڈیو اور اخبارات میں سنسنی خیز خبروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

"اتر پردیش کے ایک گاؤں میں موت کا تانڈو..... ڈاکو پھولن دیوی نے اپنے گینگ کے ساتھ ٹھاکروں کے خون سے انتقام کی پیاس بجھائی۔"

ریڈیو پر بھی بار بار ایک ہی خبر نشر ہوتی۔

"گاؤں والوں کا بیان ہے کہ پھولن دیوی اپنے گروہ کے ساتھ وہاں آئی اور قتل عام شروع کردیا۔ وہ اپنے محبوب وکرم کی موت کا بدلہ پوری ٹھاکر برادری سے لے رہی ہے۔ ٹھاکر سری رام کی جانب سے وکرم کی ہتھیا اور اپنے بلاتکار کے کارن پھولن دیوی نے ہر طرف موت کا کھیل شروع کر رکھا ہے۔ بھائی گاؤں میں اب صرف بچے، دودھ مونہی عورتیں اور بکریاں ہی زندہ بچی ہیں۔"

مان سنگھ بالالہ اخبارات کا مطالعہ بھی کرتا۔ وہاں بھی کم وبیش انہی خبروں کا بازار گرم تھا۔

"وادی چمبل کی ڈکیت ملکہ خون کی پیاسی اور ایک پاگل عورت ہے۔ وہ اپنے ذاتی انتقام کے لیے کئی نسلیں اجاڑ چکی ہے۔"

اس قتل عام کے بعد اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر اس قدر واویلا کیا گیا کہ وزیر اعلیٰ وشوا ناتھ پرتاپ سنگھ نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ ٹیلی ویژن کے نمائندے اس گاؤں میں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کرتے ہوئے چشم دید گواہان کے بیانات محفوظ کرنے لگے۔

"آپ نے پھولن دیوی کو دیکھا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ بتانا چاہیں گے؟"

اس سوال کے جواب میں کئی تضادات سامنے آئے۔

"اس کا قد دو گز لمبا ہے۔ میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"وہ ایک بن مانس کی طرح دکھتی ہے۔"

"پھولن دیوی کسی دیوی ہی کی طرح سندر ہے۔"

ان تضادات کے بعد اخبار میں پھولن کی ایک تصویر بھی شائع کی گئی جو اصلیت سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ پھولن کی شکل وصورت سے صرف اس کے راجیہ کے دیہاتی ہی واقف تھے۔

انہی دنوں ریڈیو پر ایک اور خبر گردش کرنے لگی۔

"نئے چیف منسٹر نے کانپور میں پولیس کی تازہ نفری منگوالی ہے۔ پورے راجیہ میں پولیس کو چوکس کردیا گیا ہے۔ پولیس کی سہائتا کے لیے فوج کو بلالیا گیا ہے۔ انہیں آدیش ملا ہے کہ پھولن دیوی کو دیکھتے ہی گولی ماردی جائے۔"

پھولن اس صورت حال پر اعصابی شکستگی محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کے لیے زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ سری رام تاحال روپوش تھا اور اس کے معاون ہم مزاج افراد کو معصومیت کا پیکر ثابت کیا جارہا تھا۔

☆☆☆

پھولن کی ذہنی کیفیت نہایت دگرگوں ہوچکی تھی۔ وہ سری رام کو پناہ دینے والے کسی بھی شخص کو اپنی اختراع کردہ مخصوص سزا سے ہمکنار کردیتی۔ اس کے علاوہ پولیس کا مخبر ہونے کا شبہ ہوتے ہی مقابل کی ناک تن سے جدا کرنے میں کوئی عار نہ سمجھتی۔

ان تمام تر سرگرمیوں میں اسے ایک دلی اطمینان حاصل تھا کہ وہ ان لوگوں کو انصاف مہیا کررہی ہے جن کی کہیں بھی شنوائی نہیں ہو پاتی۔ وہ برملا ایک ہی بات کہتی تھی کہ اس نے کسی کا بھی ناجائز قتل نہیں کیا۔

اس کے نظریات سے قطع نظر قانونی اداروں میں ایک نئی حکمت عملی تیار ہورہی تھی۔

☆☆☆

مان سنگھ کی نگاہیں اخبار پر مرکوز تھیں۔ اس کی پیشانی پر شکن اور بھویں مزید سکڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

"کیا کوئی خاص خبر چھپی ہے مان سنگھ؟" پھولن نے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

دریافت کیا۔

"ہاں، بہت ہی خاص۔"

"کہیں سری رام نے میرے خوف سے آتما ہتھیا تو نہیں کرلی؟" وہ ازراہِ تفنن کہنے لگی۔

"سرکار نے تمہاری گرفتاری کی خبر دینے والے کے لیے ایک لاکھ روپے کا اعلان کیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"بس، میرے بارے میں ہی؟" وہ مسکرائی۔

"نہیں، میرے لیے بھی پانچ ہزار روپے کا اعلان ہے۔" مان سنگھ ہنسا۔

"ارے واہ، سرکار تو بہت امیر ہوگئی ہے۔ ایک ڈاکا تو یہاں بھی بنتا ہے۔" وہ محظوظ ہوئی۔

"نئے منتری نے کہا ہے کہ چھ مہینے کے اندر علاقے سے پھولن دیوی کی دہشت ختم کردی جائے گی۔" اس نے مزید بتایا۔ "وہ تمہیں زندہ یا مردہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔"

"دیکھ لیتے ہیں۔" پھولن نے سر جھٹکا۔

اس اعلان کے بعد تیزی سے تغیرات رونما ہونے لگے۔ آسمان پر ہیلی کاپٹرز کی لپکی پروازوں میں اضافہ ہو رہا تھا، سڑکیں مختلف جیپوں اور لاریوں سے اٹی رہتیں۔ مسافر بردار سواریوں کی مکمل تلاشی لی جاتی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی ہیلی کاپٹر منڈلانے لگے تھے۔

ان حالات میں پھولن کو وکرم کی یاد مزید ستانے لگی۔ وہ ایسی صورتِ حال میں بچاؤ کی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لیتا تھا۔ اس نے پھولن کو ایک سبق بارہا ذہن نشین کروایا تھا۔

"کبھی کسی پر وشواس نہ کرنا۔ اپنے قریبی آدمیوں پر بالکل بھی نہیں۔"

وکرم کی یہ بات یاد آتے ہی پھولن ترچھی نگاہوں سے مان سنگھ کی جانب دیکھنے لگی۔

"کیا یہ شخص ایک لاکھ روپے کے لیے میرے خلاف پولیس کو خبر دے سکتا ہے؟"

اس کے بعد وہ جاٹ، منشی لاکھن اور بلا دین کا بغور جائزہ لینے لگی۔

"اتنے پیسوں کے لیے تو کسی کی نیت میں بھی فتور پیدا ہوسکتا ہے۔" اس کے ذہن میں ایک اور سوچ ابھری۔ ہتھیار پر گرفت مضبوط تر ہوگئی۔

"پھولن! تمہاری یہ رائفل بہت زوردار ہے۔" مان سنگھ نے حسبِ عادت ستائشی انداز میں کہا۔

"بہت مہنگی بھی ہے۔" لاکھن نے بھی رائے دی۔

"دو لاکھ سے کم کی نہیں ہوگی۔"

"کتنے کی ملی تھی تمہیں؟" مان سنگھ نے دریافت کیا۔

"کوڑیوں کے مول ہی سمجھ لو۔" وہ سرشاری سے مسکرائی۔ "ایک چرواہے سے صرف پچاس ہزار میں مل گئی تھی۔"

"تم مذاق کر رہی ہو نا؟" لاکھن خفیف ہوا۔

"بالکل بھی نہیں۔ اس چرواہے سے ملاقات اچانک ہی ہوئی تھی۔ ان دنوں ہم دریائے چمبل اور جمنا کے درمیان واقع گہرے ویران پہاڑی نالوں میں چھپنے کے لیے جا رہے تھے۔ میں نے چرواہے سے پانی مانگا۔ وہ میری رائفل بہت شوق سے دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے پتا چلا کہ اسے بھی راستے سے کہیں ایک رائفل پڑی مل گئی تھی۔ میں سمجھی آرمی کی کوئی پرانی سی بندوق ہوگی۔ میرے کہنے پر وہ گھر سے ایک بڑا سا کٹھرا اٹھا لایا جس میں باجرے کی تہ میں رائفل پڑی تھی۔ میں نے پچاس ہزار دے کر خرید لی۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"پچاس ہزار کی رقم تو اس نے پورے جیون میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔" جاٹ ہنسا۔

"ہاں، اس کا باپ تو خوشی سے پاگل ہی ہوگیا تھا۔ وہ بیٹے کے لیے زمین خریدنے کے سپنے دیکھنے لگا تھا۔"

"پھولن! میں بھی تمہیں ایک چرواہے سے ملانا چاہتا ہوں۔" مان سنگھ نے سنجیدگی سے کہا۔

پھولن سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ مان سنگھ اسے جنگل میں ایک شخص کے پاس لے گیا۔

"آج پھر نراش بیٹھے ہو، کیا ہوا ہے؟" اس نے استفسار کیا۔

"وہ پھولن کی بچی پرسوں پھر آئی تھی۔" چرواہے نے دانت پیسے۔

"کون؟" وہ چونکی۔ "پھولن کا نام لیا ہے نا تم نے؟ وہ یہاں آتی ہے کیا؟"

"ہاں، روز آتی ہے اور ہماری بکریاں چرا کر لے جاتی ہے۔"

"کیسی دکھتی ہے بھلا؟" وہ مزید متجسس ہوئی۔

"اونچی، لمبی اور ہٹی کٹی۔" چرواہے نے بتایا۔

"تمہیں بکریوں کے پیسے نہیں دیتی کیا؟"

"نہیں، ہمارے جانور لے جاتی ہے۔"

"پھر وہ پھولن دیوی نہیں ہوسکتی۔" اس نے اطمینان سے کہتے ہوئے اپنے سر سے ٹوپی اتار دی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"تم..... کون..... ہو؟" وہ حیران ہوا۔ ٹوپی کے باعث اسے پھولن پر نر کا ہونے کا مغالطہ ہوا تھا۔

"میں ہی پھولن دیوی ہوں۔" اس نے کہا۔

چرواہا سخت الجھن میں دکھائی دینے لگا۔ مان سنگھ البتہ خاموشی سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔

"میں اس عورت سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے ایک توقف کے بعد کہا۔

"وہ بہت خطرناک ہے۔ اس کے ساتھ دو بندوق والے مرد بھی ہوتے ہیں۔" چرواہا جھرجھرایا۔

پھولن کا تجسس مزید بڑھ گیا۔ وہ درختوں کی آڑ میں اس شعبدہ باز کا انتظار کرنے لگی۔ شومئی قسمت وہ اسی شام وہاں پہنچ آئی۔ پھولن نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ ایک خستہ سی دھوتی میں ملبوس تھی۔ اس نے بھی پیشانی پر سرخ پٹی باندھ رکھی تھی۔ عقب میں دونوں افراد کے پاس ایک بندوق اور لاٹھی تھی۔

"تو تم پھولن دیوی ہو۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔

"ہاں!" وہ ڈھٹائی سے مسکرائی۔

"میں ایک پولیس افسر ہوں۔ ہم کتنے ہی دن سے پھولن کو تلاش کر رہے تھے۔ مان سنگھ! ان تینوں کو گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دو۔" پھولن نے اعتماد سے کہا۔

اس شعبدہ باز کی نگاہوں سے خوف جھلکنے لگا۔ بدن پر یکدم ہی لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

"میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں تو ایک سادھارن عورت ہوں۔ یہ میرا پتی اور دیور ہیں۔"

"یہ پاکھنڈ کیوں کر رہی تھیں؟" پھولن نے اسے گھورا۔

"ہم بہت غریب ہیں۔ اس طرح گھوم پھر کر چرواہوں سے جانور لیتے ہیں اور شہر میں بیچ آتے ہیں۔" وہ رونے لگی۔

"جتنے بھی چرواہوں سے جانور لوٹے ہیں، انہیں پیسے لوٹا دو۔"

"وہ سب تو وہ وقت کی روٹی میں خرچ ہو گئے۔" اس نے نظریں جھکا لیں۔

پھولن کو اس کے لیے شدید تاسف محسوس ہوا۔ اس نے ان تینوں کو ہی کی کس پانچ ہزار روپے کی رقم تھماتے ہوئے کہا۔

"اسے رکھ لو۔ اپنے لیے ایک بیگھہ زمین خرید کر کوئی کام دھندا شروع کرو۔ چرواہوں کو لوٹنا چھوڑ دو۔ یہ بھی تمہاری ہی طرح غریب اور بے بس ہیں۔"

عورت کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلک اٹھے۔ چرواہا البتہ ناخوش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے نقصانات کی اس ڈے دار کے لیے سخت سزا کا متمنی تھا۔ پھولن نے اسے بھی خطیر رقم تھما دی۔

"تمہارا دل بہت بڑا ہے پھولن!" مان سنگھ نے واپسی کے دوران کہا۔ "اتنے پیسے آرام سے ان غریبوں کو تھما دیتی ہو۔"

"یہ سب میں نے وکرم سے سیکھا ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "اور سچ بتاؤں تو مجھے بھی بہت شانتی ملتی ہے۔"

"وکرم بہت یاد آتا ہے کیا؟" وہ اس کی کیفیت کا مدوجزر دیکھ کر آزردہ ہوا۔

"وہ مجھے بھولا ہی نہیں۔ ہر سمے میرے دل اور دماغ میں سانس لیتا ہے۔ بس آنکھوں کے سامنے نظر نہیں آتا۔"

مان سنگھ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا اور پرسوچ انداز میں کہنے لگا۔

"پھولن! تمہیں پتا ہے کہ میں تمہیں یہاں کیوں لایا تھا؟"

وہ سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"میرے من میں ایک وچار تھا۔ یہ عورت پھولن دیوی بننے کا ناٹک کرتی رہی۔ کیوں نہ ہم ایسے ہی کسی موقع کا فائدہ اٹھائیں۔"

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں پائی۔" وہ الجھی۔

"دیکھو اس دنیا میں روز کتنی ہی عورتیں مرتی ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو پھولن کا نام دے سکتے ہیں۔ تمہارے ماتا پتا اسے پھولن کہہ کر پہچان لیں۔" اس نے سمجھایا۔

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" وہ بے یقین تھی۔

"پولیس تمہارا پیچھا چھوڑ دے گی۔ سرکار بھی تمہیں مردہ سمجھ کر اپنے بل سے باہر نکل آئے گا۔ اس ایک تیر سے کتنے ہی شکار کیے جا سکتے ہیں۔"

پھولن اس تجویز پر سناٹے میں رہ گئی۔

(جاری ہے)

ماخذات

میں ہوں پھولن دیوی، از: پھولن دیوی

https://www.urdufunbes.com/

Scanned with CamScanner

بدقسمتی

مظہر شاہین

زندگی میں کوئی شخص جب کوئی بھی کام سرانجام دیتا ہے تو اس میں قسمت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے... پتا نہیں ہوتا کہ وہ کامیاب ہوگا یا ناکام... ایسا ہی اس کے ساتھ ہوا... وہ ایک جرم کرکے غائب ہوگیا... گو کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا مگر اسے نہیں پتا تھا کہ بدقسمتی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

سابقہ بیوی کو قتل کرنے والے ایک شخص کی بدقسمتی

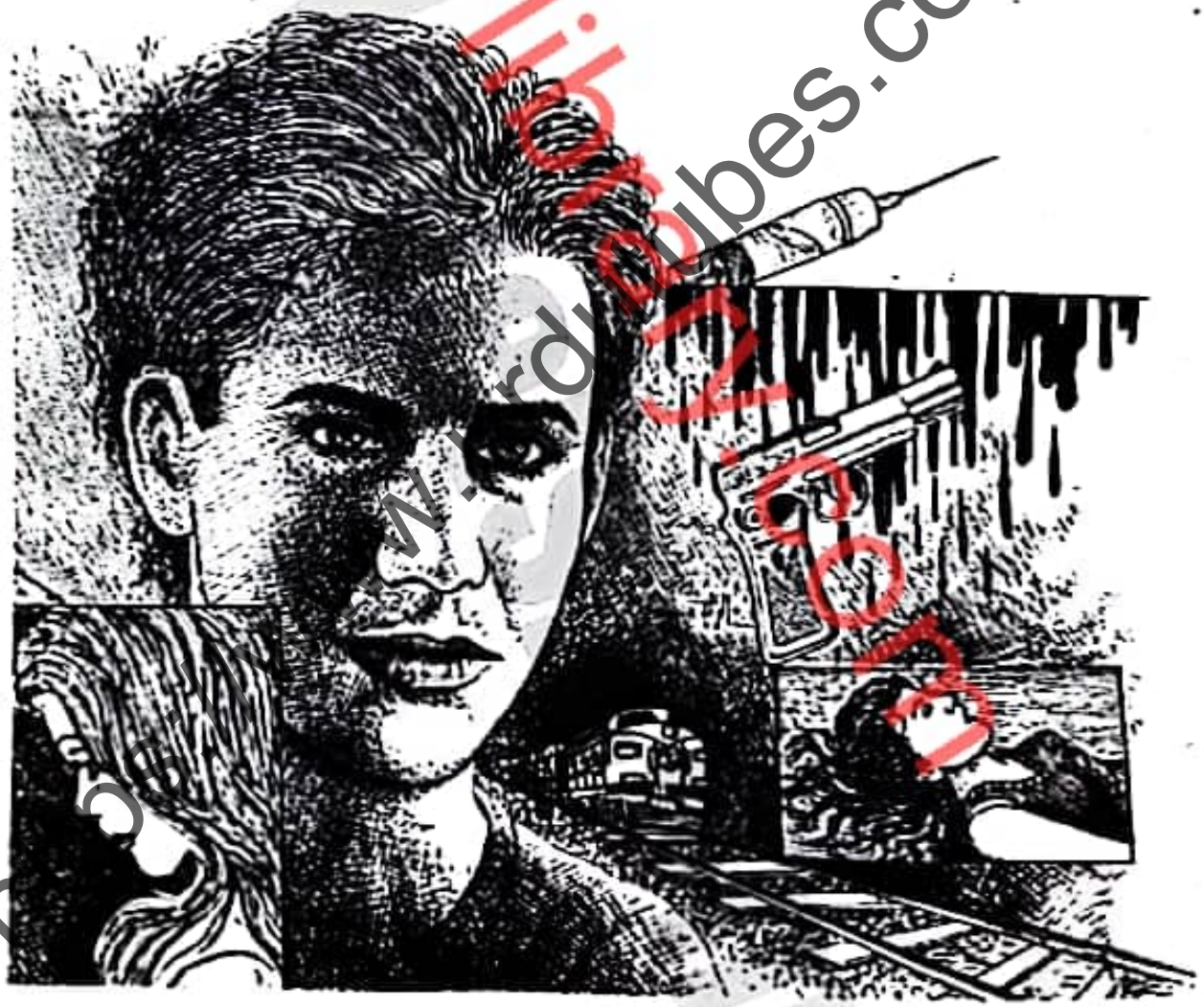

بارش مسلسل برس رہی تھی۔ ریلوے بریک کا اسٹیشن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کلاک ٹاور نے رات کے بارہ بجائے تو پلیٹ فارم پر کھڑی پرانی ریل گاڑی سے سیٹی کی آواز بلند ہوئی۔ گویا اعلان ہوا کہ بارسلونا جانے کے لیے ٹرین تیار ہے۔ دھند میں لپٹی ہوئی گاڑی کا دھات کا جسم بجلی کی روشنی میں کسی زخمی جانور کی طرح چمک رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

سارجنٹ رابرٹ ہیلر نے اپنے کوٹ کا کالر اوپر کیا اور آہستہ سے ایک ڈبے میں داخل ہوگیا۔ وہ اس سفر میں عام مسافر کی طرح جارہا تھا۔ اس کے دوست بروک کی بیٹی لزی کی اگلے روز شادی تھی اور وہ اس شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے جارہا تھا۔

تیسرے ڈبے میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا، پورا ڈبا مسافروں سے بھرا ہوا تھا، البتہ ایک جگہ اس نے چار لوگوں کو دیکھا۔ ان میں دو عورتیں اور دو مرد تھے۔ رابرٹ ہیلر نے غور کیا تو اسے ایک عورت کے چہرے پر مغروریت کے تاثرات دکھائی دیے۔ دوسری عورت اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی، وہ جوان مگر تھکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس، تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کے سامنے والی نشست پر دونوں مرد بیٹھے تھے۔ ایک مرد اونگھ رہا تھا جبکہ دوسرا کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ نشست پر چار افراد کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔

''ہائے! کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' سارجنٹ رابرٹ نے باہر دیکھنے والے مرد سے پوچھا۔ اس نے گردن موڑ کر اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور منہ بناتے ہوئے بولا۔

''کیا تم نے اپنی سیٹ بک نہیں کرائی تھی؟'' اس کے لہجے میں ناگواریت کا ہلکا سا عنصر شامل تھا۔

''نہیں۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔ ''دراصل مجھے اچانک ہی ہارسلونا جانا پڑ رہا ہے اس لیے جلدی میں سیٹ بک نہیں کروا سکا۔''

''کیا کہیں اور سیٹ خالی نہیں ہے؟''

''نہیں۔ میں نے سارا ڈبا دیکھ لیا ہے۔'' سارجنٹ رابرٹ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں میرے بیٹھنے پر اعتراض ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں کھڑے کھڑے سفر کرلوں گا۔''

''ایسے تو تم تھک جاؤ گے۔'' مرد نے کہا۔ ''بہرحال بیٹھ جاؤ۔''

''شکریہ۔'' سارجنٹ رابرٹ نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا اور اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ٹرین نے حرکت کرنا شروع کردی۔ رفتہ رفتہ ٹرین کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی اور پھر وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ رابرٹ نے محسوس کیا کہ سامنے بیٹھی مغرور عورت نے ایک نظر اس پر ڈالی تھی پھر وہ گردن موڑ کر باہر دیکھنے لگی۔ شاید اسے بھی اس کا وہاں بیٹھنا پسند نہیں آیا تھا لیکن اس نے پروا نہ کی۔

رابرٹ آج سارا دن ایک کیس کے سلسلے میں مصروف رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹرین میں اپنی سیٹ بک نہ کرا سکا تھا اور جب اسے یاد آیا تو کافی دیر ہوچکی تھی۔

رابرٹ کو اسٹیشن دیر سے پہنچنے پر بے حد افسوس ہورہا تھا۔ اس نے آج رات ہی ہر حالت میں ہارسلونا پہنچنا تھا ورنہ اس کے دوست کی بیٹی لزی اس سے ناراض ہوجاتی۔ لزی اس سے بے حد محبت کرتی تھی اور اس نے فون پر اس سے ضرور آنے کو کہا تھا۔

جلدی میں وہ لزی کے لیے کوئی تحفہ بھی نہیں خرید سکا تھا لیکن اس نے سوچا تھا کہ ہارسلونا پہنچ کر وہ پہلے لزی کے لیے تحفہ خریدے گا پھر وہ چرچ، جہاں لزی کی شادی تھی، وہاں جائے گا۔ رابرٹ اکیلا رہتا تھا۔ اسے اپنے پیشے سے عشق تھا۔ اس نے اپنے پیشے کی وجہ سے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کی کوئی گرل فرینڈ تھی۔

وہاں گہری خاموشی طاری تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو۔ باہر بارش کی رفتار میں بھی کمی آگئی تھی، یہ خاموشی گھٹنا بھر رہی۔ پھر اچانک، ایک بج کر دس منٹ پر ٹرین کے سارے بلب بجھ گئے اور ٹرین میں گھپ اندھیرا پھیل گیا۔

جو مسافر جاگ رہے تھے، اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے بڑبڑائے۔ وہ ٹرین انتظامیہ کو کوس رہے تھے۔ رابرٹ نے کوئی تبصرہ نہ کیا، وہ خاموش بیٹھا رہا۔ ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ باہر بھی اندر ڈبے کی طرح گھپ اندھیرا تھا۔

تقریباً دو منٹ کے بعد جب روشنی ہوئی تو اس کی وجہ سے رابرٹ ہیلر نے آنکھیں میچ لیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے اسے سامنے بیٹھی جوان عورت کی چیخ سنائی دی۔

''مسز اینا..... مسز اینا۔''

رابرٹ ہیلر نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور جوان عورت کے ساتھ بیٹھی عورت کو دیکھ کر اچھل پڑا۔ سامنے بیٹھی مغرور عورت کی گردن اپنی نشست پر ڈھلکی ہوئی تھی، اس کی آنکھیں کھلی اور چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ کان کے نیچے خون کی پتلی سی دھار نکلی ہوئی تھی۔ شاید اس کا نام اینا تھا کیونکہ جوان عورت نے اسے اسی نام سے پکارا تھا۔ جوان عورت کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مردہ عورت کو دیکھ رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس عورت کے منہ سے چیخ تک نہ نکلی تھی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"کیا ہوا ہے انس؟" رابرٹ نے پوچھا۔

"کک..... کسی نے مسز اینا کا قتل کر دیا ہے۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ اس کی آواز سن کر رابرٹ کے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد بھی خوف زدہ ہو گئے۔ رابرٹ جلدی سے اٹھ کر مسز اینا کی طرف بڑھا اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے دیکھا، عورت کے کان کے نیچے سے خون رس رہا تھا۔ مسز اینا کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں بے انتہا حیرت اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات شامل تھے۔

مسز اینا کے قتل کی خبر پورے ڈبے میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ وہاں جتنے بھی مسافر سفر کر رہے تھے وہ بھی ہراساں اور سراسیمہ ہو گئے۔

سارجنٹ رابرٹ نے باری باری دونوں مردوں اور عورتوں پر نظر ڈالی۔ اس کے خیال کے مطابق قاتل ان تینوں میں سے کوئی ایک تھا۔

"تم ہمیں ایسے کیوں دیکھ رہے ہو، ہم میں سے کسی نے اس کا قتل نہیں کیا۔" اس کے ساتھ بیٹھے مرد نے کہا۔ اس کا لہجہ اعتماد سے بھرپور تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ قاتل تم تینوں میں سے ہی کوئی ہے۔" سارجنٹ رابرٹ نے تیقن سے کہا۔ اس کی بات سن کر کھڑکی کے پاس بیٹھا مرد طیش میں آ گیا۔

"یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟" اس نے یکدم اٹھ کر غصے سے کہا۔ "میں بھلا کیوں اس عورت کا قتل کروں گا؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے مسٹر!"

سارجنٹ رابرٹ ہیلر نے اسے اس کی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے تحمل سے کہا۔ "قتل کرنے کے لیے کئی وجوہات ہوتی ہیں مسٹر۔ اگر تم نے اس عورت کا قتل نہیں کیا تو پھر تمہیں غصہ نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ مرد سارجنٹ رابرٹ ہیلر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

"تم کیا کہتے ہو؟" سارجنٹ رابرٹ اپنے ساتھ بیٹھے مرد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں بھی بے قصور ہوں۔" اس نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے اس عورت کو قتل کیا ہو اور الزام ہم پر تھوپنا چاہتے ہو۔"

رابرٹ اس کی بات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ڈبے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ ہر شخص پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے دوڑتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ سارجنٹ رابرٹ ایک بار پھر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ درمیانی نشست پر بیٹھا مرد بے حد مضطرب الحال تھا۔ تاہم اس نے مسز اینا کے ساتھ بیٹھی عورت سے پوچھا۔

"تم نے ان کا نام مسز اینا لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم ان کو جانتی ہو؟"

"ہاں۔ میں مسز اینا کو جانتی ہوں کیونکہ میں ان کی سیکریٹری ہوں۔" وہ بولی تو سارجنٹ رابرٹ چونکا۔

"اوہ! تم ان کے ساتھ کب سے کام کر رہی ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟" سارجنٹ رابرٹ نے پوچھا۔

"میلسٹن۔" وہ بولی۔

"ہمم۔" سارجنٹ نے ایک بار پھر ہنکاری بھری اور اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر وہ اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد میلسٹن کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم کب سے مسز اینا کے ساتھ کام کر رہی ہو؟"

"دو سال سے۔" میلسٹن کپکپاتے لہجے میں بولی۔

"ہمم۔" سارجنٹ رابرٹ نے ہنکاری بھری، پھر اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھے مرد نے کہا۔

"تمہارا تفتیشی انداز پولیس کی طرح ہے۔ کیا تم پولیس میں ہو؟"

سارجنٹ رابرٹ ہیلر نے ایک لمبی سانس لی۔

"ہاں۔ میں پولیس میں ہوں۔" اس نے جواب دینے کے بعد اپنا کارڈ دکھایا تو انہوں نے یوں سر ہلا دیے جیسے وہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہو گئے ہوں۔

"میلسٹن! یہ بتاؤ مسز اینا کے شوہر کہاں ہوتے ہیں؟"

"مسز اینا کی اپنے شوہر سے دو سال پہلے ہی علیحدگی ہو گئی تھی۔" وہ بولی۔ "ان کے سابق شوہر ہیوسٹن میں ہوتے ہیں۔"

"تم دونوں کہاں جا رہے تھے؟"

"پارسلونا۔"

"کیوں؟"

"مسز اینا کی دوست جینیفر نے ان کی دعوت کی ہے۔" میلسٹن بولی۔ "ہم دعوت میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔"

"علیحدگی کے بعد کیا مسز اینا سے ان کے سابق شوہر نے ملاقات کی؟"

"نہیں۔"

عین اسی لمحے ٹکٹ چیکر وہاں آ گیا۔ کسی نے اسے بتا

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

دیا تھا کہ ایک عورت کا قتل ہو گیا ہے۔ وہ مسافروں کے ٹکٹ چیک کرنے کے بجائے سیدھا وہیں آ گیا جہاں مسز اینا قتل ہوئی تھی۔

"اسے کس نے قتل کیا ہے؟"

"بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔" رابرٹ نے جواب میں کہا۔ "میرا تعلق پولیس سے ہے۔"

"اوہ ---" وہ یکدم پریشان ہو گیا۔

"تم پولیس کا سن کر پریشان کیوں ہو گئے ہو؟" رابرٹ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ ایک فطری عمل ہے۔" ٹکٹ چیکر بولا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"ہوں --- تم اس طرح کرو کہ ڈرائیور کو کہہ دو کہ جو ٹرین اسٹیشن آئے وہ گاڑی روک دے۔ اس کے علاوہ گاڑی کے تمام دروازے بند کر دو۔ میری اجازت کے بغیر کوئی بھی باہر نہ جائے۔" رابرٹ نے اسے ہدایت کی۔

"ٹھیک ہے۔" ٹکٹ چیکر واپس مڑ گیا اور احکامات کی تعمیل کرنے لگا۔ اتنا رابرٹ کی نظر لوہے کے فرش پر گری کسی چیز پر پڑی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ ایک سرنج تھی۔ وہاں بیٹھے سبھی لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ رابرٹ نے جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر اس کی روشنی میں سرنج کا جائزہ لیا۔ سرنج کی سوئی پر ہلکا سا خون جما ہوا تھا۔ اس نے پنسل ٹارچ جیب میں رکھی اور دستانے نکال کر ہاتھوں پر چڑھا لیے۔ پھر اس نے چھوٹا سا پلاسٹک کا منی بیگ نکالا، سرنج اٹھائی اور اس میں رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"شاید قاتل نے اسی سرنج سے مسز اینا کو قتل کیا ہے۔" رابرٹ نے میلٹن اور دونوں مردوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس سرنج پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات ہوں گے جس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ قاتل کون ہے۔" یہ کہنے کے بعد اس نے منی بیگ اپنے اوور کوٹ کی جیب میں منتقل کر دیا۔

اب وہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی کے رکتے ہی وہ مقامی پولیس سے رابطہ کر کے سرنج کو انگلیوں کے نشانات چیک کرنے کے لیے دے دیتا۔ اس کے بعد مقامی پولیس مسز اینا کے قاتل تک پہنچ جاتی۔

☆☆☆

ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے دوڑتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مزید بیس منٹ گزر گئے تھے لیکن ٹرین کہیں بھی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی یا شاید ابھی تک کوئی اسٹیشن نہیں آیا تھا۔ اس دوران ریلوے انتظامیہ کی طرف سے بھی کوئی نہیں آیا تھا اور یہی بات رابرٹ کو کھٹک رہی تھی۔

اسی لمحے سارجنٹ کے ساتھ بیٹھا آدمی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"پلیز! مجھے راستہ دیں۔ میں نے واش روم جانا ہے۔"

رابرٹ نے اسے راستہ دے دیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے لاش کی طرف نظر دوڑائی۔ لاش بدستور اسی حالت میں موجود تھی اور میلٹن کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ دفعتاً ایک بار پھر ٹرین کے سارے بلب بجھ گئے اور گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ رابرٹ کے وجود میں بے چینی کی لہریں دوڑ گئیں۔

"یہ لائٹ کیوں بند کی گئی ہے؟" وہ بڑبڑایا۔ اس نے اپنی جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور اسے روشن کیا ہی تھا کہ اچانک اسے کوئی اپنی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ رابرٹ بے اختیار چونکا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، آنے والا اس پر کسی عقاب کے مانند جھپٹا۔ رابرٹ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کے ہاتھ سے ٹارچ بھی نکل کر سیٹ کے نیچے چلی گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دماغ ماؤف ہوا لیکن جب وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اس دوران اس پر جھپٹنے والا اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔

رابرٹ اٹھ کر جھپٹنے والے کے پیچھے لپکا لیکن عین اسی لمحے اس کا پیر سیٹ کے راڈ سے ٹکرایا اور وہ اچھل کر ایک مسافر پر جا گرا۔ مسافر کے حلق سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔

"کون ہے؟" وہ آواز کسی عورت کی تھی اور اسی وقت بلب جل اٹھے اور پھر روشنی پھیل گئی۔ رابرٹ ایک جوان عورت پر گرا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

"سس --- سوری! میرا اوور کوٹ سے ٹکرا گیا تھا۔"

عورت اسے گھور کر رہ گئی۔ رابرٹ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سب مسافر اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ دفعتاً اسے کوئی خیال آیا تو اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی جیب سے سرنج والا بیگ غائب تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ سب کچھ باقاعدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے۔ یعنی منصوبے کے تحت پہلے پوری ٹرین کی لائٹ بند کی گئی پھر قاتل نے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اس کی جیب سے وہ بیگ نکال لیا جس میں سرنج تھی۔

https://www.urdufunbes.com/

Scanned with CamScanner

رابرٹ نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ ایک اہم ثبوت اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس نے اپنی سیٹ کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کے ساتھ بیٹھا مرد اور مسز اینا کی سیکریٹری میلٹن بھی موجود تھی۔ البتہ دوسرا مرد ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ پھر چند ہی لمحے گزرے تھے کہ دوسرا مرد بھی آ گیا۔ سارجنٹ رابرٹ نے اس سے پوچھا۔

"مسٹر! سرنج کہاں ہے؟"

اس کی بات سن کر وہ چونکا۔

"سرنج؟ کیا مطلب مسٹر سارجنٹ۔"

"زیادہ انجان بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" رابرٹ سیخ پا ہو کر بولا۔ "تم جیسے ہی اٹھ کر گئے تھے تو لائٹ بند ہو گئی تھی، پھر تم نے آ کر میری جیب سے سرنج نکالی اور بھاگ گئے۔ بتاؤ سرنج کہاں ہے؟"

"مسٹر سارجنٹ! آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ بھویں سکیڑ کر بولا۔ "اور تم خود سے کہانی گھڑ رہے ہو۔"

"زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" رابرٹ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری ہی کارستانی ہے۔ بتاؤ، تم نے مسز اینا کو کیوں قتل کیا ہے؟"

اس کی تو حالت دیدنی تھی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ عالمِ ضبط سے بولا۔

"مسٹر! تم نے مجھ پر الزام تراشی کی ہے۔ میں تمہاری شکایت کروں گا۔ میں نہ ہی قاتل ہوں اور نہ ہی تمہاری جیب سے سرنج چوری کی ہے۔"

"غصہ دکھا کر کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم قاتل نہیں ہو؟" رابرٹ کو بھی غصہ آ گیا۔ سب مسافر بھی اس کے اونچا بولنے پر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ جو مسافر اونگھ رہے تھے یا سو رہے تھے وہ بھی پوری طرح بیدار ہو کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ہاں۔ میں قاتل نہیں ہوں۔"

"میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں مسٹر۔" رابرٹ نے کہا اور پتلون کے ساتھ اڑسی ہتھکڑی اتار لی۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے مسز اینا کا قتل کیا ہے؟" وہ جھنجلا کر بولا۔

"جب تم پر تھرڈ ڈگری استعمال کی جائے گی تو تم خود ہی اقرار کر لو گے۔" رابرٹ نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہاتھ آگے کرو۔ اگر تم نے تعاون نہ کیا تو مجھے زبردستی کرنی پڑے گی۔"

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم کی پہلی پہلی دھیمی دھیمی سردی
جنوری کے ستارے کی دل لبھاتی دلکشی

سرکتے لمحے

وقت کی ظالم گرفت میں پوشیدہ خونی ڈرامے کے سنسنی خیز واقعات..... ہر گزرتا لمحہ کلائمیکس کو قریب کر رہا تھا۔ **امجد رئیس** کے باکمال انداز تحریر سے گندھی داستان

سربکف

ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کردار کی پُراسرار داستان.....

طاہر جاوید مغل کے قلم سے

دبر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی **حسام بٹ** کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

دوستوں کے ساتھ گزارا وقت خوشگوار ہی نہیں یادگار بھی ہوتا ہے۔ سرورق کے لیے **اسما قادری** کا تحفہ۔

دوسرا رنگ

چمکیلے اندھیروں میں بھٹکتے مسافروں کی بے بسی کا احوال، **زویا صفوان** کا فنِ کمال

چٹی ٹکنہ چٹی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

https://www.urdunovels.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"میں بے گناہ ہوں سارجنٹ۔"

"اگر تم بے گناہ ہو تو فکر مت کرو، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔" رابرٹ نے کہا۔ "ہاتھ آگے کرو۔"

مجبوراً اس نے اپنے ہاتھ آگے کر دیے۔ رابرٹ نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنائی اور پھر اس کے لباس کی تلاشی لی لیکن اس کی تمام جیبیں خالی تھیں۔ کسی جیب سے بھی سرنج والا بیگ برآمد نہیں ہوا تھا۔

"تمہیں اس کی قیمت چکانا پڑے گی سارجنٹ۔"

"اب بتا دو، سرنج کہاں ہے؟ اور تم نے مسز اینا کا قتل کیوں کیا ہے؟"

"سارجنٹ! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ نہ میں نے مسز اینا کا قتل کیا ہے اور نہ ہی تمہارے لباس سے سرنج نکالی ہے۔ تم مسلسل مجھے ہی قصوروار ٹھہرا رہے ہو اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"سارے شواہد تمہارے خلاف ہی جا رہے ہیں۔" رابرٹ نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "ٹرین رک جائے تو میں پولیس کو بلاتا ہوں، وہی تم سے تحقیقات کرے گی۔"

رابرٹ اسے اس کی نشست پر بٹھا کر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹرین بدستور دوڑتی ہوئی رواں دواں تھی لیکن پینتیس منٹ گزرنے کے باوجود کسی اسٹیشن پر نہیں رکی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" دفعتاً رابرٹ کو یاد آیا تو اس نے مسز اینا کے قاتل جو صرف اس کے خیال کے مطابق تھا، پوچھا۔

"بورک....." اس نے نخوت سے جواب دیا۔

رابرٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور مسافروں کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ اس کے نیچے کوئی چیز ہے۔ اس نے اٹھ کر وہ چیز اٹھالی۔ وہ ایک لائٹر تھا۔ رابرٹ غور سے لائٹر کو دیکھنے لگا۔

"کیا یہ تمہارا لائٹر ہے؟" اس نے بورک سے پوچھا۔

بورک نے ایک نظر لائٹر پر ڈالی اور نخوت سے بولا۔

"نہیں۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

رابرٹ نے بورک کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کو بھی لائٹر دکھا کر پوچھا۔ اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا کہ وہ لائٹر اس کا نہیں ہے۔ رابرٹ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ایک بار پھر لائٹر کو غور سے دیکھنے لگا۔ دفعتاً اس کے دماغ میں ایک جھماکا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے کافی دیر پہلے یہ لائٹر کسی کے پاس دیکھا تھا اور اس کے خیال کے مطابق جس کا وہ لائٹر تھا وہی مسز اینا کا قاتل تھا۔ جب وہ اس کی جیب سے سرنج والا بیگ نکال رہا تھا تو دورانِ مزاحمت شاید اس کی جیب سے لائٹر سیٹ پر گر گیا تھا۔

سارجنٹ نے اپنے دماغ کے گھوڑے دوڑائے۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے وہ لائٹر کس کے پاس دیکھا تھا۔ سوچتے سوچتے دفعتاً اسے ٹکٹ چیکر کا خیال آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ گزرا ہوا منظر اس کے دماغ کے پردے پر گھوم گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس نے لائٹر کس کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔

اس نے لائٹر جیب میں رکھا اور ٹرین کے کسی اسٹیشن پر پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی تو چند لوگ اترے، اپنا سامان سمیٹا اور ٹرین سے اترنے لگے۔ سارجنٹ رابرٹ نے قریبی پولیس اسٹیشن کو فون کر کے مسز اینا کے قتل کے حوالے سے بتا دیا۔ فوراً ہی چار پولیس اہلکار ایک سارجنٹ پوکر کی معیت میں وہاں پہنچ گئے۔ سارجنٹ پوکر نے مسز اینا کی لاش کا معائنہ کیا اور پھر بورک کی طرف دیکھتے ہوئے سارجنٹ رابرٹ سے دریافت کیا۔

"مسٹر سارجنٹ! کیا یہی مسز اینا کا قاتل ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر اسے ہتھکڑی کیوں لگی ہوئی ہے؟"

"اوہ سوری۔ میں اس کی ہتھکڑی کھولنا بھول گیا تھا۔" اس نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر بورک کی ہتھکڑی کھول دی۔ بورک غصے سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"مسٹر سارجنٹ! میں تمہارے خلاف کیس کروں گا۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میں قاتل نہیں ہوں۔ میں نے مسز اینا کا قتل نہیں کیا لیکن....."

"آئی ایم سوری مسٹر بورک۔" سارجنٹ رابرٹ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "یہ سب لائٹر کی بنیاد پر ہوا ہے۔ پھر بھی اگر تم مجھ پر کیس کرنا چاہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

"قاتل کون ہے مسٹر سارجنٹ؟" دفعتاً سارجنٹ پوکر نے پوچھا۔

"جس کا یہ لائٹر ہے۔" رابرٹ نے لائٹر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔ ایسا نہ ہو کہ اسے پتا چل جائے اور وہ فرار ہو جائے۔"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

سارجنٹ پوکر نے اپنے دو ماتحتوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ سارجنٹ رابرٹ کے ساتھ ٹرین سے اتر کر ایک طرف چل دیے۔ تھوڑی ہی دور سارجنٹ رابرٹ کو وہی ٹکٹ چیکر دکھائی دیا جس نے آکر مسز اینا کی لاش دیکھی تھی۔ وہ اپنے کولیگ سے باتیں کر رہا تھا لیکن جیسے ہی اس کی نظر سارجنٹ رابرٹ، سارجنٹ پوکر اور پولیس اہلکاروں پر پڑی تو وہ نہ صرف خوف زدہ ہو گیا بلکہ اس نے پلٹ کر دوڑ لگا دی۔

"رک جاؤ، ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" سارجنٹ پوکر چلایا۔ اس نے پستول نکال لیا تھا اور وہ سب ٹکٹ چیکر کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ قرب و جوار میں موجود لوگ حیرت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسز اینا کے قتل کی خبر پورے اسٹیشن میں پھیل چکی تھی اور ہر کوئی ہراساں دکھائی دے رہا تھا اور پولیس کو ٹکٹ چیکر کے پیچھے بھاگتا دیکھ کر وہ سمجھ گئے تھے کہ یہی مسز اینا کا قاتل ہے ورنہ پولیس اس کے پیچھے کیوں بھاگتی؟

ٹکٹ چیکر کی بدقسمتی کہ وہ دوڑتے ہوئے سامنے سے ایک آدمی سے ٹکرا گیا۔ نتیجتاً دونوں ہی گر گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر دوبارہ بھاگتا، پولیس اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ ایک پولیس اہلکار نے اس کے بازوؤں کی طرف کر کے ہتھکڑی لگا دی اور پھر اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اسی لمحے ریلوے اسٹیشن کی انتظامیہ کے آدمی بھی وہاں پہنچ گئے۔

"میرا نام ڈیوڈ ہے اور میں اس اسٹیشن کا انچارج ہوں۔" آنے والوں میں سے ایک فربہ آدمی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اسے کیوں پکڑا ہوا ہے۔ بات کیا ہے؟"

"آپ یہ بتائیں ٹرین کی روانگی میں کتنا وقت باقی ہے۔" سارجنٹ رابرٹ نے انچارج سے پوچھا۔

"دس منٹ رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" سارجنٹ رابرٹ نے اثبات میں سر ہلایا پھر وہ ٹکٹ چیکر کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے لباس کے سینے پر ایک بیج لگا ہوا تھا جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ سارجنٹ رابرٹ نے اس کا نام پڑھنے کے بعد پوچھا۔

"مسٹر مائیکل! میرے پاس صرف دس منٹ ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے مسز اینا کا قتل کیوں کیا ہے؟ باقی کی تفتیش سارجنٹ پوکر کریں گے۔"

"اینا میری ساتھ بیوی تھی۔" ٹکٹ چیکر مائیکل نے زبان کھولی۔

"کیا؟" اس کی بات سن کر سب ہی دنگ رہ گئے۔ مائیکل کہہ رہا تھا۔

"یہ سچ ہے۔ میں اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ ہماری لو میرج تھی۔ شادی کے بعد ہی مجھے معلوم ہوا کہ میں بانجھ ہوں، مجھ میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے جبکہ اینا کو بچہ چاہیے تھا۔ اسے بچے بہت پسند ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ خرابی اس میں ہے لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ خرابی اس میں نہیں، مجھ میں ہے تو وہ مجھ سے بیزار بیزار سی رہنے لگی تھی۔ میں چونکہ ڈیوٹی پر کبھی کس شہر تو کبھی کس شہر میں ہوتا تھا۔ اس نے میری غیر موجودگی میں ڈولف سے دوستی کر لی اور اسی کی خاطر اس نے مجھ سے دو سال پہلے علیحدگی اختیار کر لی۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوا۔ میں اینا کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن مجھے موقع نہیں مل رہا تھا۔ اینا ٹرین میں سفر نہیں کرتی تھی۔ اسے دوسرے شہر جانا ہوتا تو وہ ہوائی جہاز کو ہی ترجیح دیتی تھی۔ آج جب میں نے اسے ٹرین میں دیکھا تو مجھے اسے قتل کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اینا کو قتل کیسے کروں۔ میں نے ٹرین کی روانگی سے پہلے ہی سرنج اور زہر حاصل کر لیا تھا۔ میں اس ڈبے کے قریب ہی موجود تھا جس میں اینا سفر کر رہی تھی۔ اتفاق سے ٹرین کی لائٹ بند ہوئی تو مجھے موقع مل گیا۔ بس اس طرح میں نے اینا کی گردن میں سوئی گھونپ دی اور کسی کو پتا بھی نہ چل سکا۔ لیکن جلدی میں بدقسمتی سے سرنج مجھ سے گر گئی اور سارجنٹ رابرٹ کے ہاتھ لگ گئی۔"

"ہاں! یہ تمہاری بدقسمتی ہی تھی۔" رابرٹ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "قاتل چاہے کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، اس سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو ہی جاتی ہے اور یہی اس کی بدقسمتی ہوتی ہے۔"

عین اسی لمحے ٹرین کی وسل سنائی دی تو رابرٹ نے سارجنٹ پوکر سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مسٹر سارجنٹ! باقی کا کام آپ کا ہے۔ واپسی پر میں تم سے ملتا جاؤں گا۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔" سارجنٹ پوکر نے جواب میں کہا۔

"اوکے۔" رابرٹ نے کہا اور پھر وہ ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹرین نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا تھا۔

✖✖✖

https://www.urdutunes.com
Scanned with CamScanner

رمز شناس

تازیہ کامران کاشف

قسط :12

وہ صدیوں پر محیط ایک ایسا گہرا راز تھا جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین سے لے کر مصر اور انگلستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان جڑوں میں علم کا ایسا خزانہ دفن تھا جسے صدیوں کوئی تلاش نہ کرسکا... مگر کوئی ایسا بھی تھا جسے اس خزانے کی تلاش تھی۔ یہ بھی کائنات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی اس رمز شناس کی ایسی کوشش تھی جس نے اپنے سوئی ہوئی شیطانی قوتوں کو گہری نیند سے جگادیا تھا جن پر قابو پانا کسی عام انسان کے لیے ناممکن تھا مگر علم کی معراج پر پہنچ کر اس نے ان پُراسرار علوم کو عام کرنے کی لاقانونی فراموش داستان رقم کردی اور اس نے تاریخ کے اوراق پر ایک عبرت کا نشان بنادیا... صدیاں گزرتی رہیں اور ایک بار پھر اٹھارویں صدی کے اوائل میں ان قوتوں نے سر اٹھایا... مگر کیا مصر کے عیاد ابیب، انگلستان کے آرتھر اور ہندوستان کے کاویہ سے... مقابلہ کرنا آسان تھا...؟ ہاں عشق اور فرض کی جنگ میں اسے ہی کامیابی حاصل ہوئی جو سارے بھید جان گیا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے

ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

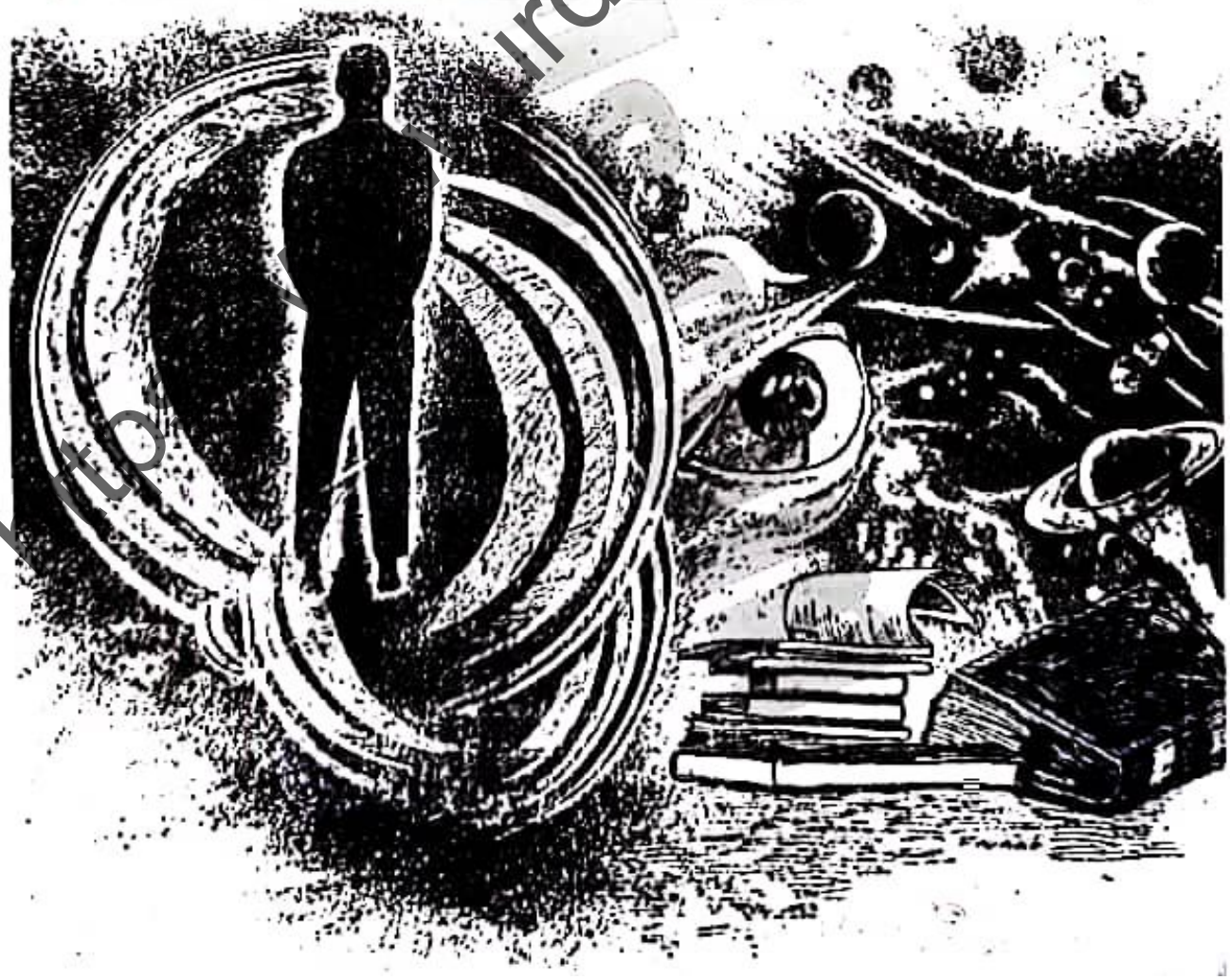

digestlibrary.com
http://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

راج نگر۔ ہندوستان

وہ قیامت کی رات تو جیسے تیسے گزر ہی گئی مگر اگلی صبح بے حد سوگوار تھی۔ مان سنگھ کے کئی سینک گزشتہ رات ہونے والے حملے میں اپنی جان گنوا چکے تھے۔ اپنے سینکوں کی آخری رسومات سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے دربار خاص لگانے کا حکم دیا۔ ان کے تمام وزیر و مشیر، راج پنڈت، سپہ سالار دربار میں حاضر تھے اور سب خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سب کے پاس تدبیروں اور مشوروں کی قلت پڑ چکی تھی۔

ان کے پرکھوں کی باتیں سچ ثابت ہوئی تھیں اور قلعے نے اپنے شرابت ہونے کی علامات ظاہر کرنا شروع کردی تھیں۔ پنڈت کے مطابق یہ بالوناتھ کا شراپ تھا جو قلعے کو اور اس زمین کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ یہاں بسنا ناممکن تھا۔

راجپوتانے کے حالات پہلے ہی خراب چل رہے تھے۔ انگریز سرکار کی بڑھتی ہوئی مداخلت نے ریاست کے معاشی حالات پر بھی کافی اثر ڈالا تھا۔ راجا مہاراجاؤں کی شان و شوکت اور شاہی خزانے کی گنتی میں واضح کمی نظر آنے لگی تھی۔ ایسے نازک حالات میں شاہی خزانے کا ایک بڑا حصہ قلعے کی تعمیر پر لگانا اور پرجا کو وہاں بسانا ایک کٹھن امر تھا اور اب مان سنگھ کو دو ہفتے بعد ہی اس فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑ رہی تھی۔

وہ اتنے بڑے پیمانے پر اتنی جلدی دوبارہ کہیں اور آباد ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ پرجا کو ایک بار پھر سے اتنی بڑی تعداد میں گھر بار تعمیر کر کے دینا اور انہیں بسانے کے ساتھ ساتھ روزگار کے مواقع فراہم کرنا اتنا آسان نہیں تھا لیکن قلعے میں رہنا بھی ناممکن نظر آ رہا تھا۔ کل رات وہ اپنی آنکھوں سے ان کالے سایوں کو دیکھ چکے تھے۔ اگر خطرہ کسی انسان یا کسی ریاست سے ہوتا تو وہ مقابلہ کرنے کے لیے ہمیشہ تیار تھے مگر ان دیکھی طاقتوں سے مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ راج پنڈت بھی ہتھیار ڈال چکا تھا۔ وہ خود تو یہاں سے سب کچھ سمیٹ کر اپنے آبائی محل میں منتقل ہو سکتے تھے مگر باقی سب کا کیا کرتے۔

"حضور! میرے پاس ایک آخری اپائے ہے۔ اگر آپ کی آگیا ہو تو عرض کروں؟" اچانک راج پنڈت بولے اور درباری جو بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے، چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

مان سنگھ نے کچھ کہے بغیر ان کی طرف دیکھ کر انہیں بولنے کا اشارہ کیا۔

"حضور! اگر کسی طرح راج گرو قلعے میں رہنے پر سہمت ہو جائیں تو ہم اس شراپ سے خود ہی مکت ہو جائیں گے۔ ان کے پرویش کرتے ہی وہ سائے خود بخود غائب ہو گئے تھے۔ یہ بری شکتیاں ان سے دور بھاگتی ہیں۔ ان کے یہاں ہونے سے یہ خود ہی نشٹ ہو جائیں گی۔ جو تپسیا وہ پہاڑ کی چوٹی پر بنی اس کٹیا میں بیٹھ کر کر سکتے ہیں، وہی تپسیا وہ قلعے کی چار دیواری میں رہتے ہوئے بھی کر سکتے ہیں۔ کل رات بھی ان کی وجہ سے ہمیں سمتی ملی تھی۔ آپ کہتے ہیں تو میں تمام پنڈتوں کو لے کر ان کی کٹیا میں جاتا ہوں اور انہیں یہاں آنے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" راج پنڈت بولا تو مان سنگھ ان کا یہ مشورہ سن کر چونک پڑے۔

راج گرو نے گزشتہ رات قلعے میں ہی قیام کیا تھا مگر سورج نمشکار کے فوراً بعد وہ واپس اپنی کٹیا کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ اگر واقعی ایسا ہو جاتا اور وہ قلعے کی چار دیواری میں ہی اپنی تپسیا پوری کرتے تو قلعہ بری شکتیوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا مگر سوال یہ تھا کہ کیا وہ قلعے میں رہنے کے لیے راضی ہوتے؟

اس علاقے میں جب جب راج گرو نے پرویش کیا تھا، ہمیشہ گرو بالوناتھ کی کٹیا میں ہی پرویش کیا۔ تو کیا وہ اپنی کٹیا چھوڑنے کے لیے راضی ہو جاتے؟

"آدیش! سواری تیار کرواؤ۔ ہم راج پنڈت کے ساتھ خود راج گرو کی سیوا میں حاضر ہو کر ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھیں گے اور انہیں قلعے میں پرویش کرنے کی وِنتی دیں گے۔" وہ اپنے تخت سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی باقی تمام لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔

ان کی بات سن کر سب کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اگر واقعی ایسا ہو جاتا تو انہیں یہاں سے دوبارہ ہجرت نہ کرنی پڑتی۔

"حضور! میں راج پنڈت کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔" آدیش بولا۔

"نہیں، ہم خود ان کی سیوا میں حاضر ہوں گے۔ اس وقت ضرورت مند ہم ہیں اس لیے ہم خود چل کر ان کے پاس جائیں گے۔ ان سے اس قلعے کی سرکھشا کی بھیک مانگیں گے۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولے اور دربار کو برخاست کر دیا۔

محل سے شاہی بگھیاں ایک ساتھ کٹیا جانے کے لیے روانہ ہوئیں۔ رتناوتی نے ان تمام بگھیوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اسے راج دربار میں ہونے والے اس فیصلے کی خبر

https://www.urdutubes.com

Scanned with CamScanner

ہو چکی تھی۔ اس نے من سے پرارتھنا کی تھی کہ راج گرو اس بات کے لیے بہت نہ ہوں مگر شام کو جب شاہی بگھیاں واپس لوٹیں تو سنگھیا کو مان سنگھ کے ساتھ ایک ہی بگھی سے اترتے دیکھ کر وہ بہت نراش ہوئی۔ نہ جانے کیوں اسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ سنگھیا راج کی موجودگی ہی ان درگھٹناؤں کا کارن ہے۔

تو بالآخر وہ قلعے میں داخل ہو چکا تھا۔ رتنا دتی کے بے حد قریب آ چکا تھا۔ اب وہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتی اور وہ اپنا مقصد پورا کرتے ہی اسے حاصل کر لیتا۔

اس کی آمد سے پرجا بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ شاہی محل کے دائیں باغ میں ہی اس کی مرضی کے مطابق ایک خیمہ لگا دیا گیا جہاں وہ اپنی تپسیا کرنے کے ساتھ ساتھ قلعے کو ہر مشکل سے محفوظ رکھتا۔

روپا کو بھی یہ ساری خبریں مل چکی تھیں۔ وہ آج ہی قلعے لوٹی تھی اور یوگی سے زہر حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی مگر امرتا کے سامنے حاضر ہونے سے کترا رہی تھی۔ اگر کسی کو پتا چل جاتا تو اس کا سر تن سے جدا کر دیا جاتا۔ راج گھرانے کی سپوتری پر بھلا کون شک کرتا؟ مگر وہ مجبور تھی۔ اس کا حکم نہیں ٹال سکتی تھی۔ وہ شام ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اب جبکہ راج گرو بھی قلعے میں آ چکے تھے اسے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا۔ شام ڈھلتے ہی وہ امرتا کے محل چلی آئی۔ امرتا نے اسے فوراً ہی اندر بلوا لیا اور باقی کنیزوں کو اپنے کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا۔

''راج کماری! یہ۔۔۔۔'' روپا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی رازداری سے اپنے ہاتھ میں پکڑی پوٹلی اسے تھمائی۔ اس نے زیادہ بولنے سے گریز کیا۔

امرتا نے جلدی سے اس پوٹلی کو لے کر اپنے سرہانے کے نیچے چھپا دیا۔

''راج کماری۔۔۔۔! میں بہت خوفزدہ ہوں۔'' روپا ہاتھ جوڑتے ہوئے سرگوشی سے بولی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''روپا! ہم تمہیں وچن دیتے ہیں کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ محل میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ جو بھی ہوگا، اسے شراپ سمجھا جائے گا۔ ایسے میں تم پر کون شک کر سکتا ہے؟ اب تم جاؤ اور اب دوبارہ اس بات کا ذکر نہیں کرنا۔'' امرتا نے تحکمی لہجے میں سرگوشی کی۔

روپا نے اس کی بات سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا اور فوراً ہی اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ کسی کی نظروں اور شک کے دائرے میں آئے بغیر اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔

آگے امرتا کا مسئلہ تھا کہ اسے یہ سب کیسے کرنا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ امرتا نے اسے زہر دینے والی مہم میں شامل نہیں کیا تھا ورنہ وہ یقیناً پکڑی جاتی۔

وہ یہی سب سوچتی ہوئی محل کی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اچانک ٹھٹک کر رکی۔ سیڑھیوں کے عین سامنے موجود حوض کے ساتھ وہ کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

''گ۔۔۔۔ گ۔۔۔۔ گرو جی۔۔۔۔ گرو جی آشیرواد دیجیے۔۔۔۔ میں تو دھنے ہو گئی۔ آپ کے درشن ہو گئے اس پاپی کو۔'' وہ تیزی سے سنگھیا طرف بڑھ کر اس کے چرنوں میں جھکی مگر اگلا پل اس کے لیے بھیانک ثابت ہوا۔

اسے زوردار ٹھوکر ماری گئی اور وہ لڑھکتی ہوئی دور جا گری۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کیے بغیر حیرت سے پلٹ کر راج گرو کی طرف دیکھا۔ اس کی قہر برساتی نظریں بہت کچھ کہہ گئیں۔ سنگھیا بغیر کچھ کہے وہاں سے پلٹ گیا۔

روپا ڈرتے ڈرتے اٹھی اور اس کی پشت کو تکنے لگی۔ اسے اپنے جسم میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہوئیں۔ راج گرو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اسے آشیرواد کیوں نہیں دیا؟ اسے شدید خوف محسوس ہوا۔ وہ وہاں رکنے کے بجائے اپنی حویلی میں چلی آئی۔ اس نے اپنی ساتھی رقاصاؤں کو وہاں سے جانے کا کہا اور خود آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اس کے دو دن سفر میں گزرے تھے۔ اس یوگی تک پہنچنے کے لیے کٹھن راستے سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا اور وہ زہر حاصل کرتے ہی بغیر کہیں رکے فوراً ہی واپسی کے لیے روانہ ہو گئی تھی تاکہ جلد از جلد محل پہنچ سکے۔

وہ لیٹی تو راج گرو کی وہ آگ برساتی آنکھیں اسے خود پر جمی محسوس ہوئیں۔ اسے بے اختیار ہی جھرجھری آ گئی۔ کیا راج گرو کو پتا چل گیا تھا کہ اس نے امرتا کو زہر لا کر دیا ہے؟

''نہیں۔۔۔۔ نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک سب کو پتا چل چکا ہوتا۔ شاید راج گرو اس کے اپوتر ہونے کی وجہ سے اسے خود سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اشنان کیے بغیر ہی ان کے چرن چھونے کی کوشش جو کر رہی تھی۔'' اس نے خود کو تسلی دی اور کمرے میں موجود چراغ کو بجھا کر اپنی آنکھیں موند لیں۔

اچانک کمرے میں سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ روپا تیزی سے اٹھ بیٹھی۔

''سس۔۔۔۔ سس۔۔۔۔ سانپ۔۔۔۔'' کمرے میں چراغ کے بجھنے کی وجہ سے اندھیرا ہو چکا تھا۔ اگر وہ نیچے قدم

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

رکھتی تو کمرے میں موجود سانپ اسے لازماً ڈس لیتا۔

"کوئی ہے باہر؟ میرے کمرے میں سانپ ہے..... کوئی ہے؟" وہ مدد کے لیے پکارنے لگی۔

سانپ دوبارہ پھنکارا مگر اس بار وہ پھنکارا اسے اپنے چہرے کے بالکل قریب سنائی دی۔

"سانپ..... سانپ..... کوئی مدد کرو میری..... سانپ....." اس بار وہ زور زور سے چلانے لگی۔

اچانک کمرے میں دو آنکھیں نمودار ہوئیں۔ روپا چلانا چھوڑ کر ان آنکھوں کی طرف متوجہ ہوئی جو اس گھپ اندھیرے میں بھی جلتے انگاروں کے مانند چمک رہی تھیں۔

"گگ..... گگ..... کون؟ گگ..... گرو جی؟ میری رکھشا کیجیے گرو جی..... میرے بستر پر سانپ ہے۔" وہ پسینے میں شرابور ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔

"جس سانپ کا زہر تو یہاں تک لائی ہے، وہی سانپ تجھے اپنے درشن کروانے خود چلا آیا ہے۔ تجھے بھی تو پتا چلے کہ اس کا زہر نسوں میں سرائیت کر کتنا سوار آتا ہے۔" سنگھیا نے اس کے بالوں کو اپنی گرفت میں لیا اور اس کے چہرے کے قریب جا کر سفاک لہجے میں سرگوشی کی۔

"نن..... نہیں..... گرو جی..... گرو جی..... شما کر دیں گرو جی..... میں نے کچھ نہیں کیا..... میں تو راج کماری امرتا دیوی کے حکم کا پالن کر رہی تھی..... شما کر دیں گرو جی.....!" وہ تڑپ کر رونا شروع ہو گئی۔

"تیری راج کماری کی باری بھی آئے گی۔ تو جا..... تیرے پیچھے وہ بھی چلی آئے گی۔" سنگھیا نے ایک جھٹکے سے اس کے بال اپنی گرفت سے آزاد کیے اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک ہی اس زہریلے ناگ نے اپنا پھن روپا کی پیشانی پر مارا۔ روپا کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی نسوں میں لاوا بھر دیا ہو۔ اسے تو شاید چیخنے کا موقع بھی نہیں ملا اور وہ ایک ہی وار میں ڈھیر ہو گئی۔

سنگھیا نے حقارت سے اس کے مردہ جسم پر نظر ڈالی اور اس کی حویلی سے نکل کر اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔

بائیں باغ میں اپنا خیمہ لگوانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رتنا دیوی کے کمرے کی کھڑکی بائیں باغ میں کھلتی تھی اور اسے جب بھی تازہ ہوا کی ضرورت پڑتی، وہ یہی کھڑکی کھولنے پر مجبور تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس نے سنگھیا کو آتے دیکھ لیا تھا مگر وہ اس بار کھڑکی سے ہٹنے کے بجائے وہیں کھڑی اسے گھورتی رہی۔ وہ نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔ اس نے اپنے خیمے میں داخل ہونے سے پہلے سر اٹھا کر رتنا دیوی کو دیکھا اور پھر اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔

"کیا ہوا، کیا دیکھ رہی ہو رتنا دیوی؟" اچانک رتنا دیوی کو پاروتی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر پلٹی۔

"کچھ نہیں ماتا شری! میں بس راج گرو کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے خیمے میں بیٹھ کر تپسیا کرنے کے بجائے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔" رتنا دیوی بولی۔

"ایسا مت کہو، پاپ لگے گا۔ راج گرو یہاں قلعے کی رکھشا کے لیے آئے ہیں۔ بری شکتیوں کو نشٹ کرنے کے لیے انہیں قلعے کے ہر کونے کو پوتر کرنا پڑ رہا ہے۔ کوئی ایسی بات اپنے منہ سے نہ نکالنا جس کی وجہ سے تم ان کا اپمان کر کے ان کے شراپ کو دعوت دو۔" وہ ناراضگی سے بولیں اور آگے بڑھ کر اس کے کمرے کی کھڑکی بند کر دی۔

"میں کسی سے کچھ نہیں کہہ رہی۔ میں نے تو بس یوں ہی آپ کے سامنے....." اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"میرے سامنے بھی مت کہو۔ تمہیں شکنتلا کے پاس جانا چاہیے۔ تمہاری وجہ سے کل رویندر گھائل ہوا ہے۔ شکنتلا تم سے سخت ناراض ہے۔" پاروتی سنجیدگی سے بولیں۔

"رویندر میری وجہ سے گھائل نہیں ہوا ہے۔ میں تو ان بری شکتیوں پر وار کر رہی تھی۔ وہ خود ہی بیچ میں آ گیا اور یہ سب ماتا شری کے سامنے ہوا ہے۔ شکنتلا دیوی مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟" وہ ناراضگی سے بولی۔

"وہ جو بھی ہیں، تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ اگر تم ان سے مل کر آ جاؤ گی تو انہیں تمہارے پتا شری کے سامنے کسی قسم کی شکایت کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ تمہارے دیوا میں کم مت رکھا ہے۔ میں اس بیچ کسی قسم کی کوئی پریشانی مول لینا نہیں چاہتی۔" پاروتی بولیں۔

"ٹھیک ہے، میں کل صبح ان سے مل آؤں گی۔" اس نے پاروتی کی بات سمجھ کر شکنتلا سے ملنے کی ہامی بھر لی۔

پاروتی سر ہلا کر اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اگلی صبح وہ سو کر اٹھی تو محل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اسے اپنی کنیز خاص سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ محل کی رقاصہ روپا اپنی حویلی میں مردہ پائی گئی ہے۔ اسے بہت افسوس ہوا۔

ایک کے بعد ایک موت واقع ہو رہی تھی اور راج گرو کے آنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ نہ جانے پتا شری کو راج گرو پر اتنا وشواس کیوں تھا۔

وہ مان سنگھ کے کمرے میں پہنچی تو وہاں شکنتلا، پاروتی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

اور امرتا پہلے سے موجود تھے۔

"پرنام پتا شری! ہمیں ابھی روپا کی موت کی خبر ملی۔" وہ سب کے چہروں پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر بولی۔

"ہاں، اس کے انتم سنسکار کی تیاری کی جارہی ہے۔" وہ بولے۔

"پتا شری! کیا یہ بھی اسی شراپ کے کارن ہوا ہے؟ راج گرو کچھ کرتے کیوں نہیں؟" وہ سب کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ امرتا کے چہرے پر گھبراہٹ تھی جبکہ باقی سب کے چہرے سپاٹ تھے۔

"نہیں۔ اسے تیز بخار تھا۔ اسی کارن اس کی مرتیو ہوئی۔ راج گرو کے ہوتے ہوئے وہ شراپ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"رتناوتی! تمہیں شوبھا نہیں دیتا کہ تم راج گرو کی شکتیوں کو شک کی نظروں سے دیکھو۔" شکنتلا کا لہجہ سخت ہوگیا۔

"شما کیجیے مہارانی شکنتلا دیوی! میں تو صرف اپنا وہم دور کرنا چاہتی تھی۔ میں آپ کی ناراضگی سمجھتی ہوں۔ میں نے رویندر پر حملہ جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ پتا شری جانتے ہیں کہ میں نے اس سائے پر وار کیا تھا۔" اس نے بھی حساب برابر کردیا۔ مان سنگھ چونک کر شکنتلا کو دیکھنے لگے۔

"میں نے ایسا کب کہا؟" وہ سٹپٹا گئیں۔

"مجھے کل رات ماتا شری سے آپ کی ناراضگی کی خبر ملی تھی۔ میں تو صبح ہوتے ہی آپ کے کمرے میں حاضر ہوکر یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی مگر روپا کی مرتیو کی خبر سن کر یہاں چلی آئی۔" وہ شکنتلا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"شکنتلا! رتناوتی کا اس میں کوئی دوش نہیں۔ آئندہ اس بات کا ذکر نہ کیا جائے۔" وہ سخت لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

شکنتلا نے غصے سے امرتا کا ہاتھ تھاما اور وہ بھی اس کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ہاروتی نے رتناوتی کو ناراضگی سے گھورا مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سمجھتی کیا ہے خود کو۔ بات بات پر مہاراجا کے سامنے ہمارا اپمان کرتی ہے۔" شکنتلا تیز قدموں سے چلتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

"ماتا شری! ہمارا ہاتھ تو چھوڑیں۔" امرتا جو ان کے اس طرح کھینچنے پر ان کے پیچھے پیچھے چلی جارہی تھی، بالآخر تنگ آکر بول ہی پڑی۔

"یہ لو، چھوڑ دیا تمہارا ہاتھ۔ اس محل میں ہمارا کوئی ہے ہی نہیں جس سے ہم اپنے من کا بوجھ ہلکا کرسکیں۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ امرتا افسوس سے سر ہلانے لگی۔

رتناوتی کی وجہ سے ان کے پریوار کو ہمیشہ ہی دوسرے درجے پر رکھا جاتا تھا۔ ایک طرف رویندر زخمی تھا تو دوسری طرف شکنتلا دکھی تھیں اور دونوں کی اس حالت کا کارن رتناوتی ہی تھی۔

"اس روپا کو بھی ابھی ہی مرنا تھا۔" کم از کم اس کے سامنے وہ اپنے دل کا بوجھ تو ہلکا کرلیا کرتی تھی۔ ویسے ایک طرح سے یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کیونکہ اس کے مرنے سے یہ راز ہمیشہ کے لیے اس کے سینے میں دفن ہوگیا تھا کہ امرتا نے اس سے رتناوتی کے لیے زہر منگوایا تھا۔ اب امرتا آرام سے یہ کام انجام دے سکتی تھی۔

"راج کماری! سوندر یکرن آپ سے ملنے کی اجازت چاہتی ہے۔" اچانک اسے رتناوتی کی کنیز خاص کی آواز سنائی دی تو وہ جلدی سے ایک ستون کے پیچھے چھپ گئی۔

"اسے ہمارے کمرے میں بھیجو۔" رتناوتی یہ حکم سنا کر وہاں سے جاچکی تھی۔

"رادھا!" امرتا نے ستون کے پیچھے سے نکل کر رتناوتی کی کنیز خاص کو پکارا۔

"جی راج کماری؟" وہ ادب سے اس کے پاس چلی آئی۔

"مجھے کنیز نے بتایا ہے کہ محل میں سوندر یکرن آئی ہے۔ اسے سندیش دینا کہ میرے کمرے میں بھی حاضر ہو۔ مجھے بھی کچھ چیزیں چاہئیں۔" وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"جب سے کی مرتیو ہوئی ہے تو لگے ہاتھوں آج رتناوتی کا بھی کام تمام کروا دیتے ہیں۔ سب کو لگے گا قلعے کا شراپ اس کی موت کا کارن بن گیا۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

دن معمول کے مطابق گزرا اور کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ رقاصہ کی موت ایسی دردناک نہیں تھی کہ کوئی اس کی وجہ سے پریشان ہوتا۔ رات کے کھانے کے بعد سب اپنے کمروں میں آرام کے لیے جانے لگے تو امرتا نے رتناوتی کو روک لیا۔

"ٹھہریے رتناوتی! ہم آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔" رتناوتی اپنے کمرے میں داخل ہونے ہی لگی تھی کہ امرتا کی آواز نے اس کے قدم روکے۔

"جی کہیے۔" وہ رک گئی۔

"کیا آپ تھوڑی دیر ہمارے ساتھ باغ میں ٹہل

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

سکتی ہیں۔ ہم آپ کو کچھ بتانا چاہتے ہیں۔" وہ اس کے قریب آکر بولی۔

"ہاں، کیوں نہیں — مگر ہم کمرے میں بھی بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں۔" رتناوتی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ہمارا کھلی فضا میں بیٹھنے کا دل کررہا ہے لیکن اگر آپ کہتی ہیں تو کمرے میں ہی بیٹھ جاتے ہیں۔" امرتا نے چالاکی سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی کہ کہیں وہ شک میں مبتلا نہ ہوجائے۔

"چلیں، باغ میں ہی چلتے ہیں۔" رتناوتی بولی تو امرتا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کامیابی کی طرف پہلا قدم بڑھا چکی تھی۔

اگر امرتا کے رتناوتی کے کمرے سے نکلنے کے بعد رتناوتی کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آتا تو رتناوتی کی کنیزیں اور اس کے کمرے کے باہر موجود پہرے دار امرتا کا نام سب سے پہلے لیتے مگر اب ان سب کے سامنے ہی رتناوتی خود باغ میں جانے کے لیے راضی ہوگئی تھی۔

امرتا پائیں باغ میں جانے کے بجائے محل کے مرکزی باغ میں آگئی۔ پائیں باغ میں راج گرو کا خیمہ نصب کردیا گیا تھا لہٰذا اب جو بھی چہل قدمی کرنا چاہتا، سیدھا مرکزی باغ میں چلا آتا۔

"ہاں، کہو امرتا! کیا کہنا چاہتی ہو؟" باغ میں پہنچتے ہی رتناوتی نے سارے تکلفات ایک طرف رکھ کر اس سے اسی کے انداز میں بات کرنا شروع کی۔

"راج کماری! آپ جانتی ہیں کہ ہماری کوئی بہن نہیں ہے اور ہم نے ہمیشہ آپ کو بہنوں جیسا مان دیا ہے۔ ہمیں ایک فیصلہ لینا ہے اور ہم کسی سے صلاح لینا چاہتے تھے۔ ماتا شری بھی رودر کی وجہ سے پریشان ہیں ورنہ ہم ان سے بات کرلیتے۔" امرتا اداس لہجے میں کہتی ہوئی باغ کے بیچ بنے حوض کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

"کیسا فیصلہ؟ تم مجھے بتا سکتی ہو۔" رتناوتی نے اس کے لہجے کو جانچنے کی کوشش کی۔ وہ واقعی پریشان لگ رہی تھی۔

"کل ہمیں آج شام گڑھ کے راج کمار کا پتر ملا ہے۔ وہ ہم سے ویواہ کے خواہشمند ہیں۔ انہوں نے اپنے ماتا پتا کو بھیجنے سے پہلے ہم سے ہمارا جواب مانگا ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" وہ حوض کے پانی کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے بولی۔

"ویواہ — شام گڑھ کے راج کمار — تمہارا مطلب راج کمار دیو یک؟" رتناوتی حیرانی سے بولی تو جواباً امرتا نے بغیر کچھ کہے اثبات میں ہلادیا۔

شام گڑھ کے مہاراجا سے ان کے پتا مان سنگھ کے اچھے مراسم تھے اور وہ اکثر ہی ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے ایک دوسرے کے راج میں آتے جاتے تھے۔

"تمہیں دیو یک پسند ہے؟" رتناوتی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

امرتا نے کچھ کہنے کے بجائے شرما کر اپنا سر جھکالیا۔

"تم چاہتی ہو کہ میں پتا شری سے بات کروں؟" رتناوتی نے خود ہی اگلا سوال کیا۔

"جی — اور مجھے یہ بھی بتائیں کہ مجھے ان کے پتر کا جواب دینا چاہیے یا نہیں؟" وہ اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے شرمائی۔

"اگر تمہیں وہ پسند ہے تو جواب بھجوادو۔ میں کل صبح ہی پتا شری سے بات کرکے ان کو یہاں بلوانے کا نیوتا بھجوادوں گی۔" رتناوتی مسکرادی۔

اس کا دل امرتا کی طرف سے صاف ہوچکا تھا۔ اسے تو لگا تھا کہ امرتا بھی کاویہ میں دلچسپی لے رہی ہے مگر امرتا کو تو دیو یک پسند تھا اور وہ خود ہی اسے اپنی پسندیدگی سے آگاہ کررہی تھی۔

"اوہ راج کماری — آپ سچ کہہ رہی ہیں؟ کیا پتا شری مان جائیں گے؟ آپ کتنی اچھی ہیں۔" وہ خوشی سے بولی اور جھک کر رتناوتی کے گلے لگ گئی۔

رتناوتی مسکرادی۔ وہ کتنا غلط سوچنے لگی تھی امرتا کے بارے میں۔

"مجھے بتائیں، میں آپ کو کیا بھینٹ دوں؟" امرتا اس سے الگ ہوکر خوشی سے اپنے گلے میں پہنا قیمتی موتیوں کا ہار اتار کر اس کے گلے میں ڈالنے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"نہیں امرتا! تم میرے لیے راگنی کی طرح ہو اور اپنی چھوٹی بہن سے کون بھینٹ لیتا ہے۔ سنبھالو اپنا ہار گردن میں ہی اچھا لگتا ہے۔" رتناوتی نے امرتا کی توقع کے عین مطابق وہ ہار لینے سے صاف انکار کردیا۔

"اچھا — پھر — ہاں — یہ — یہ تو لے سکتی ہیں نا؟ چھوٹا سا ایک تحفہ سمجھ کر ہی رکھ لیں۔" اس نے جلدی سے اپنی ساڑھی کے پلو کو سامنے کیا جس سے دو کاجل دانیاں بندھی ہوئی تھیں۔

"آپ کو کاجل بہت پسند ہے نا۔ یہ آج ہی ماتا شری نے مجھے دیے ہیں۔ ان کے لیے بنگال سے آیا تھا۔ ایک میں رکھ لیتی ہوں، ایک آپ رکھ لیں۔ آپ کی سندر آنکھوں

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

کو یہ کاجل بہت شوبھا دے گا۔" اس نے جلدی سے دونوں کاجل دانیاں نکال کر ہتھیلی پر رکھ لیں۔

"مجھے اس کی بہت ضرورت تھی۔ یہ میں ضرور لوں گی۔" اس نے ایک کاجل دانی اٹھالی۔

"اب چلیں؟ صبح پتا جی سے بات بھی تو کرنا ہے۔" رتناوتی بولی تو امرتا ہنس پڑی۔

"آپ چلیں راج کماری! ہم آتے ہیں۔" وہ شرماتے ہوئے بولی تو رتناوتی مسکرا کر محل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے جاتے ہی امرتا کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"تم کل صبح دیکھنے کے لیے جیوت رہو گی تو ہی بات کرسکو گی نا۔ یہ کاجل تمہاری آنکھوں کے ذریعے اس زہر کو تمہارے شریر میں اتار دے گا اور کسی کو مجھ پر شک بھی نہیں ہوگا۔ چاہے تم ان میں سے کوئی بھی کاجل دانی چنتیں، دونوں میں موت لگی ہوئی تھی۔ اس طرح تمہارا شک بھی دور ہو گیا اور تم نے خود موت کو چن لیا۔ صبح جب تمہارا مردہ شریر کمرے میں ملے گا اور طبیب تمہاری مرتیو کا کارن بتائے گا تو میں تمہارے انتم سنسکار کی تیاری پورے من سے کروں گی۔ کاویہ تمہاری چتا کو جلاتے ہی میری مانگ میں سیندور بھرے گا اور میں اس کی پتنی بن جاؤں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی اور ہاتھ میں پکڑی دوسری کاجل دانی کو اسی خوشی میں اچھال دیا۔ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں بچی تھی۔

امرتا نے سوندر یکرن سے معلوم کرلیا تھا کہ رتناوتی نے اسے کاجل اور خوشبو لانے کا آدیش دیا ہے اور سوندر یکرن کو یہ سب چیزیں لانے میں تین دن لگ جاتے۔ لہٰذا رتناوتی نے بنگال کے کاجل کا سن کر یہ تحفہ فوراً ہی قبول کرلیا تھا۔ بنگال کا خاص کاجل بہت مشہور تھا۔ رتناوتی کو رات کو سونے سے پہلے کاجل لگانے کی عادت تھی اور آج یہی عادت اس کی مرتیو کا کارن بننے والی تھی۔

رتناوتی محل کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے والی راہداری میں پہنچی تو راہداری اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"یہاں اندھیرا کیوں ہے رکمنی؟" اس نے راہداری کے پہرے داروں کو آواز لگائی مگر ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ وہ اندازے سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ اچانک اسے اندھیری راہداری میں ایک ہیولا نظر آیا۔ ہیولا ساکت کھڑا تھا۔

"کون۔۔۔ کون ہے؟" وہ اس ہیولے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

اچانک وہ ہیولا اس کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ رتناوتی کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس شخص کے پیروں میں موجود کڑے آپس میں ٹکرا کر آواز پیدا کررہے تھے اور وہ اس آواز کو ہزاروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ سنگھیا راج تھا۔ رات کے اس پہر اندھیری راہداری میں آخر وہ کیا کررہا تھا؟

رتناوتی کے جسم سے ہلنے کی طاقت ختم ہوچکی تھی۔ وہ چاہ کر بھی آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کی اندھیرے میں چمکتی وہ آنکھیں رتناوتی پر عجیب سا سحر طاری کردیا کرتی تھیں۔ وہ اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور اسے گھورنے لگا۔

اچانک اس نے رتناوتی کی کلائی تھام لی۔ رتناوتی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی کلائی کو چھڑانے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ سنگھیا نے بغیر کچھ کہے اس کی بھنچی ہوئی مٹھی کو کھولا اور کاجل دانی نکال کر اپنے ہاتھ میں تھام لی۔

"دیوی! آئندہ کسی سے کچھ لینے سے پہلے یہ جان لو کہ وہ تمہاری موت کا پروانہ بھی ہوسکتا ہے۔" وہ اس کے کان کے قریب آکر سرگوشی میں بولا اور بے اختیار ہی اس کی زلفوں سے اٹھنے والی خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتار کر آگے بڑھ گیا۔

رتناوتی کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہوئی تھی۔ رتناوتی نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ وہ راہداری میں موجود نہیں تھا۔ اچانک راہداری میں دوبارہ روشنی ہوگئی۔ دیواروں میں نصب مشعلیں خود ہی جلنے لگیں تھیں۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیا ہوا راج کماری! آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس کے کمرے میں موجود کنیز تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"ہاں۔۔۔ کچھ نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ۔۔۔ میں سونا چاہتی ہوں۔" وہ چونک کر بولی۔

"مگر راج کماری! ہمیں آپ کے کمرے میں ہی رہنے کا حکم ہے۔" کنیز جھجکتے ہوئی بولی۔

"ہم آج رات اپنے کمرے میں اکیلے سونا چاہتے ہیں۔ تم بے شک دروازے کے باہر موجود رہو۔" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہوگیا۔

کنیز نے باقی کنیزوں کو اشارہ کیا تو وہ ساری اس سمیت کمرے سے باہر نکل گئیں۔ رتناوتی اپنی مسہری پر پہنچ گئی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

وہ کیا کہہ کر گیا تھا؟ کون سی موت تھی جو امرتا کے اس تحفے کے ذریعے رتناوتی کا مقدر بننے والی تھی؟ کیا واقعی امرتا اس کی موت کی تیاری کر رہی تھی اور یہ بات راج گرو کو کیسے پتا چلی تھی؟

رتناوتی نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ چاہ کر بھی اس کے سامنے سے ہل نہیں پاتی تھی اور نہ ہی اسے کوئی جواب دے پاتی تھی۔ جب بھی وہ سامنے آتا، رتناوتی کا جسم جیسے حرکت کرنا بھول جاتا تھا۔

اس نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا جہاں اب بھی سنگھیا کی انگلیوں کے نشان موجود تھے۔ پورے راجپتانے میں کسی کی اتنی ہمت نہیں تھی جو اس کی کلائی تھام سکتا مگر سنگھیا اسے کئی دفعہ چھو چکا تھا۔ اسے بے اختیار ہی رونا آ گیا۔ وہ کیوں اس کے آگے اتنی بے بس ہو جاتی تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ صبح ہوتے ہی مان سنگھ سے بات کرے گی اور انہیں اس سارے معاملے سے آگاہ کرے گی لیکن صبح تو اسے مان سنگھ سے امرتا کے ویاہ کی بات کرنا تھی اور راج گرو کہہ کر گیا تھا کہ امرتا اسے جان سے مارنا چاہتی ہے۔

وہ دوبارہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی۔ کس کی بات پر یقین کرتی اور کس کی نہیں۔

"مجھے جا کر امرتا سے بات چیت کرنی چاہیے۔" وہ سوچنے لگی اور پھر اس نے خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر دوبارہ سنگھیا مل جاتا تو پھر سے اسے چھونے کی کوشش کرتا۔ اسے سوچ کر ہی گھن آ رہی تھی۔

"جو ہوگا صبح دیکھا جائے گا۔" اس نے تنگ آ کر تمام خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور بستر پر دراز ہو گئی۔ اتنا تو طے تھا کہ سنگھیا کی کل میں یہ آخری رات تھی۔ جو جرأت اس نے آج کی تھی، اس کی بنا پر وہ مان سنگھ سے کہہ کر اسے ہمیشہ کے لیے کل سے نکلوانے والی تھی۔

☆☆☆

امرتا کو باغ میں ٹہلتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ وہ خوش تھی۔ صبح اس کی جان رتناوتی سے ہمیشہ کے لیے چھوٹنے والی تھی اور کسی کو اس پر شک بھی نہ ہوتا۔ اس کے بعد وہ کادیہ کو اپنانے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کامیاب ہو جاتی۔

باغ چاندنی میں نہایا ہوا تھا اور حوض کے پانی میں اس کا عکس کافی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اسی حوض کی منڈیر پر بیٹھی سپنے بن رہی تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے باغ میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ اس نے پلٹ کر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ منڈیر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور باغ کے پہرے داروں کو تلاش کرنے لگی جو اب سے کچھ دیر پہلے اس کے آگے پیچھے ہی ٹہل رہے تھے مگر اب نہ جانے کس کونے میں چلے گئے تھے۔

اچانک ہی چاند کو بادلوں نے ڈھک لیا۔ باغ میں اندھیرا چھا گیا۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ کمرے میں جانے کا ارادہ کر کے پلٹی اور اچانک ہی ٹھٹک کر رکی۔

"کک۔۔۔ کون؟" وہ اندھیرے میں آنے والے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

"کون ہے وہاں؟ رکشک..... رکشک؟" وہ پہرے داروں کو آواز دینے لگی۔

چاروں طرف سے اونچے درختوں سے گھرا وہ باغ اور باغ سے نظر آنے والا وہ گھنا جنگل اور اونچے پہاڑ انتہائی خوفناک منظر پیش کرنے لگے تھے۔

اچانک بادلوں نے چاند سے پردہ ہٹا دیا۔

"گرو جی..... آپ؟" وہ سنگھیا کو وہاں دیکھ کر چونکی مگر اس کا ڈر گرو جی کو دیکھ کر ختم ہو چکا تھا۔ وہ آشیرواد لینے کے لیے آگے بڑھی مگر سنگھیا تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹا۔

وہ حیرانی سے سیدھی ہوئی اور اسے تکنے لگی۔

"تجھے تیرا تحفہ لوٹانے آیا ہوں۔" سنگھیا نے سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کر کے اپنی مٹھی کھول دی۔

امرتا نے نہ سمجھنے والے انداز میں سنگھیا کی ہتھیلی پر نظر ڈالی اور اس پر رکھی کاجل دانی کو دیکھ کر اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"نک۔۔۔ گرو جی۔۔۔!" وہ خوف سے چند قدم پیچھے ہٹی۔

"اس کی جوڑی دار کہاں ہے؟" وہ سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

"نک۔۔۔ رو۔۔۔ جی۔۔۔ آگے مت آئیں..... آپ۔۔۔ آپ جانتے ہیں نا کہ..... کہ میں راج کماری امرتا ہوں۔" وہ ڈرتے ڈرتے پیچھے ہٹی اور حوض کی منڈیر سے ٹکرا کر رک گئی۔

سنگھیا کی آنکھیں اسے جکڑ رہی تھیں۔ سنگھیا نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر حوض پر نظر ڈالی۔

"اوہ..... اس کا جوڑی دار یہاں ہے۔" وہ پانی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

امرتا نے پلٹ کر حوض کے پانی پر نظر ڈالی جو لال ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس حوض میں پانی کی جگہ خون ہو۔

digestlibrary.com
https://www.urdutubes.com
Scanned with CamScanner

"یہ..... یہ کیا ہے؟ رکنک..... رکنک!" وہ زور زور سے چلانے لگی مگر کوئی اسے سن کیوں نہیں رہا تھا۔

"یہ وہ زہر ہے جو تو دیوی کی رگوں میں اتارنا چاہتی تھی مگر اب یہ تیرے جسم میں اترے گا۔" وہ سفاکی سے کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اس کی گردن دبوچ کر اسے حوض میں دھکیل دیا۔

امرتا نے چلاتے ہوئے مدد کے لیے پکارا۔ ایسا لگتا تھا جیسے محل کے لوگ بہرے ہو چکے ہوں۔

سنگھیا کی گرفت اس کی گردن پر مزید مضبوط ہو چکی تھی۔ وہ اسے ابو کر مار رہا تھا..... اسی خون میں..... اس خون کے پانی میں.....

وہ بری طرح ہاتھ پیر چلانے لگی۔ اس کی ناک اور منہ میں وہ خون داخل ہو چکا تھا۔ اس کی دھندلی ہوتی آنکھوں میں چاند کا خون آلود خاکہ آخری دفعہ ابھرا اور پھر اس خاکے کی جگہ سنگھیا کی آنکھوں نے لے لی۔

اس کے پھیپھڑے خون سے بھرنے لگے۔ شدید تکلیف تھی۔ بالآخر اس کی روح اس تکلیف کو برداشت نہیں کر پائی اور اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کا جسم ہلکا ہو کر حوض کے اوپر آ ابھرا۔ سنگھیا نے اس کی گردن کو آزاد کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

حوض کا پانی صاف ہو چکا تھا..... چاند دوبارہ چاندنی بکھیر رہا تھا اور اس کی لاش پھٹی آنکھوں سے چاند کو تکتے ہوئے حوض کے پانی پر تیر رہی تھی۔

"جے ماں کالی!" سنگھیا نے آسمان کی طرف دیکھ کر پکارا اور اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔

اس مورکھ کنیا کی وجہ سے اسے اپنی تپسیا چھوڑ کر اٹھنا پڑا تھا۔

اتنی سزا تو بنتی تھی اس کی۔

☆☆☆

Year 1773

قاہرہ۔ مصر

حلیمہ واپس لوٹ آئی تھی مگر اگلے دن کا انتظار بہت مشکل تھا۔ وہ بے دلی سے گھر کے کاموں میں آیا کی بہو کا ہاتھ بٹانے لگی۔

"آج کھجور کا حلوا بنا لینا اور تھوڑا زیادہ بنانا۔ عیاد کو بھی رات کے کھانے کے ساتھ ایک پلیٹ بھجوانا ہے۔" آیا کے بیٹے عبداللہ نے باورچی خانے کے قریب آ کر باہر سے ہی اپنی بیوی حاجرہ کو مخاطب کیا۔ وہ حلیمہ کی موجودگی میں اس کے پردے کا خیال کرتے ہوئے احتیاط برتتا تھا مگر حلیمہ، عیاد کا نام سن کر بری طرح چونکی۔

"عیاد..... کون عیاد؟" حلیمہ، عبداللہ کی بیوی سے پوچھنے لگی۔

"وہی، ہمارا کرائے دار جو مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اسے کھانا ہمارے ہی گھر سے جاتا ہے۔" وہ عام سے لہجے میں بولی۔

"عیاد وہی تو نہیں جن کا دواخانہ اور کتب ہے؟" حلیمہ کے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی مگر اس نے مزید تصدیق کرنا چاہی۔

"ہاں، وہی ہیں۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں بہت شفا دی ہے۔ چند دن پہلے عبداللہ کی والدہ بیمار ہوئیں تو ان سے ہی دوا لی تھی اور ایک ہی خوراک میں آرام آ گیا تھا۔ تم انہیں جانتی ہو کیا؟" حاجرہ آٹا گوندھتے ہوئے بولی۔

"ہاں، میں انہی کے کتب میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ وہ بہت قابل استاد ہیں۔" وہ بے انتہا خوش تھی۔

انجانے میں وہ عیاد کے کس قدر قریب آ چکی تھی، اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ کہاں تو وہ کتب جا کر عیاد کی ایک جھلک دیکھنے کا انتظار کرتی تھی اور کہاں اب وہ اس کے اتنے قریب رہ رہا تھا کہ وہ جب چاہے اسے دیکھ سکتی تھی۔

"کن سوچوں میں گم ہو گئیں؟ مجھے کھجور صاف کر دو، میں حلوا بنا لیتی ہوں ورنہ عبداللہ ناراض ہوں گے۔" حاجرہ نے اسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا۔

"ہاں، میں ابھی صاف کر دیتی ہوں۔ انہیں کھانا کس وقت بھجوانا ہوتا ہے؟ آج کیوں نہ میں ان کے لیے کھانا لے کر جاؤں؟ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔" حلیمہ نے جلدی سے کھجوروں کی ٹوکری اٹھائی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ عبداللہ خود انہیں کھانا دینے جاتے ہیں۔ ہم نے تو انہیں کبھی دیکھا ہی نہیں اور بھلا تمہیں وہ کیسے پہچانیں گے؟ تم تو خود پردے میں ہوتی ہو۔ عبداللہ کو پتا چلا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔" آیا دھونیاں بنانا شروع کر چکی تھی۔ اسے حلیمہ کی بات کاٹنی پڑی تھی۔

حلیمہ کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ خاموشی سے کھجور صاف کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

'ایک قید خانے سے آزاد ہو کر دوسرے قید خانے میں پھنس گئی ہوں۔ اب یہاں امیر عبداللہ بن دمام کی بات ماننا ہوگی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں اپنے لیے الگ مکان ہی ڈھونڈ لوں لیکن وہاں عیاد تو نہیں ہوگا نا..... عیاد تو یہاں عبداللہ

https://www.urdudigest.com

Scanned with CamScanner

digest library.com

کے گھر میں رہ رہا ہے۔ اس نے خود ہی اپنی سوچوں کی نفی کی۔

"عبداللہ کے سامنے نہ سہی، عبداللہ سے نظر بچا کر تو عیاد سے ملا جا سکتا ہے۔" اس نے گھٹنوں کو دھوتے ہوئے صحن میں الگ تھلگ بنے اس کمرے پر نظر ڈالی جہاں آیا کے مطابق ان کا کرائے دار ٹھہرا ہوا تھا اور آج سے پہلے اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ کرائے دار عیاد ہے۔

کمرے کا ایک دروازہ صحن میں کھلتا تھا جس پر تالا لگا ہوا تھا۔ یقیناً اس کی چابی عبداللہ کے پاس تھی اور اس کمرے کا دوسرا دروازہ اس نے گلی کی طرف کھلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ گلی کے ذریعے بھی تو عیاد سے ملنے جا سکتی تھی۔ یہ سوچ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔

اس نے حاجرہ سے مزید باتیں نکلوانے کی کوشش کی۔ حاجرہ کے مطابق عیاد ناشتا کر کے وہاں سے چلا جاتا تھا اور رات کے کھانے کے وقت ہی واپس لوٹتا تھا۔ صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا عبداللہ اسے پہنچا دیا کرتا تھا۔ اسے بے صبری سے رات ہونے کا انتظار تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج ہی عیاد سے ملے گی۔

شام ہوئی تو عبداللہ اپنے کرائے دار کے لیے کھانا لے کر چلا گیا۔ حلیمہ نے دیکھا کہ وہ صحن میں موجود دروازے کو استعمال نہیں کرتا تھا بلکہ کھانا گلی سے دینے جایا کرتا تھا۔

عشا کی نماز کے بعد سب آرام کرنے کے لیے لیٹے تو وہ سب کے سونے کا انتظار کرنے لگی۔ جب اسے تسلی ہو گئی کہ سب سو چکے ہیں تو اس نے خاموشی سے اپنا برقع پہنا اور دبے قدموں گھر سے باہر نکل آئی۔ اگر آیا سے اجازت لیتی تو رات کے اس پہر آیا اس سے سو طرح کے سوالات کرتیں اور عین ممکن تھا کہ عبداللہ کو بھی اس کے ساتھ ہی روانہ کر دیتیں۔ لہٰذا اس نے سب کے سونے کا انتظار کیا تھا۔

صحن میں موجود کمرے کے دروازے کی جھری سے نظر آنے والی روشنی اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ عیاد ابھی تک جاگ رہا ہے۔ وہ گلی میں نکلی تو گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ اس علاقے میں عام طور پر لوگ رات کو جلدی سو جایا کرتے تھے۔ یہ محنت کشوں کا علاقہ تھا لہٰذا سب کو ہی جلدی سونے کی عادت تھی۔ اس نے گلی میں نکل کر احتیاط سے چاروں طرف دیکھا اور عیاد کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

اندر سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کی جھری سے اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

کمرے میں کھٹ پٹ ہونا شروع ہوئی۔

"کون ہے؟" چند لمحوں بعد عیاد کی آواز سنائی دی۔

حلیمہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ عیاد ہی تھا۔ اس آواز کو وہ ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔

"استادِ محترم! میں ہوں حلیمہ..... آپ سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔" اس نے آہستگی سے اپنا نام بتایا تاکہ کسی اور تک اس کی آواز نہ پہنچے۔

"حلیمہ.....؟ رات کے اس پہر؟" عیاد کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

"جی استادِ محترم! مجھے بہت ضروری بات کرنا ہے۔" وہ لہجے میں پریشانی سمو کر بولی۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد عیاد نے دروازہ کھول دیا۔ وہ دروازہ کھول کر حیرت سے اسے تکنے لگا۔ حلیمہ اندر داخل ہونے لگی تو عیاد نے اسے روک دیا۔

"آپ کو جو بھی بات کرنا ہے، آپ یہیں پر کر سکتی ہیں۔ رات کے اس پہر اکیلے میرا اور آپ کا اس کمرے میں ایک ساتھ ہونا مناسب نہیں ہے۔" عیاد سنجیدگی سے بولا۔

"یہاں اس طرح گلی میں کھڑے ہو کر بات کرنا بھی تو مناسب نہیں۔ اگر گلی میں کسی نے مجھے دیکھ لیا تو میرے لیے نئی پریشانی کھڑی ہو جائے گی۔" حلیمہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

عیاد نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔ عیاد کو نہ چاہ کر بھی دروازہ بند کرنا پڑا۔

"جلدی کہیے، آپ کو کیا کہنا ہے؟" عیاد دروازے کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

حلیمہ نے اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا۔ عیاد نے فوراً ہی اپنی نظریں جھکا لیں۔

"عیاد! میں یہ بات آپ سے کافی عرصے سے کہنا چاہتی تھی مگر موقع مجھے آج ملا ہے اور یہ موقع مجھے خود قدرت نے دیا ہے۔" حلیمہ نے کہنا شروع کیا۔

"بہتر یہی ہوگا کہ آپ تمہید باندھے بغیر مجھے آنے کا مقصد بتائیں۔" عیاد اس وقت جلد از جلد اسے کمرے سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ اس نے نظریں اٹھائے بغیر تیز لہجے میں کہا۔

"تو کیا اب آپ میری طرف دیکھیں گے بھی نہیں؟" وہ چلتی ہوئی عیاد کے قریب آئی۔ یہ تنہائی اور عیاد کا وجیہہ سراپا۔ وہ بے خود ہوئی۔

https://www.urdutubes.com

Scanned with CamScanner

عیاد تیزی سے پیچھے ہٹا اور کمرے کا دروازہ فوراً ہی کھول دیا۔

"معاف کیجیے گا، مگر میں اب آپ کی بات سننے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ آپ فوراً یہاں سے چلی جائیں۔ اگر آپ میری شاگرد نہ ہوتیں تو آپ اس کمرے میں داخل بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔" عیاد کا لہجہ سخت ہو گیا۔

حلیمہ کا چہرہ ہتک کے احساس سے سرخ ہو گیا۔

"تو پھر الیرا کو اجازت کیوں ہے؟ اس کے ساتھ تو آپ کمرے میں تنہا رہنا معیوب نہیں سمجھتے۔" اس کا لہجہ زہر اگلنے لگا۔

عیاد نے حیرت سے نظریں اٹھا کر حلیمہ کی طرف دیکھا۔

"آپ ہمارے رشتے کو غلط رنگ دے رہی ہیں۔ نہ تو وہ رات کا سنسان پہر ہوتا ہے اور نہ ہی الیرا اس طرح میرے سامنے کبھی بے پردہ ہو کر آئی ہیں۔" عیاد کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا مگر الیرا کی وجہ سے خاموش ہو گیا تھا۔

وہ الیرا اور اس لڑکی کا رشتہ نہیں جانتا تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ الیرا کی نکی ہے اور اس کے ساتھ محل میں رہتی ہے اور الیرا کے مطابق وہ محل چھوڑ کر جا چکی تھی مگر اب وہ رات کے اس پہر اچانک اس کے گھر چلی آئی تھی۔

"جو باتیں الیرا آپ سے دن کے پہر میں کرتی ہے، وہی میں رات کے اس پہر کر رہی ہوں۔ میں آپ سے عشق کرتی ہوں عیاد — میں آپ کو دنیا کا ہر سکھ دوں گی۔ آپ میری محبت کو قبول کر لیجیے۔" حلیمہ نے عیاد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے التجا کی۔

"دیکھیں حلیمہ! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ یہاں سے چلی جائیں۔" عیاد کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس نے حلیمہ کو اندر بلا کر غلطی کر دی ہے۔

"کیوں ممکن نہیں ہے؟ آپ کی اور الیرا کی محبت بے جوڑ ہے۔ وہ محل کی رہنے والی اور آپ ایک عام سے استاد۔ اس کے والد تو اسے باہر کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ جبھی تو انہوں نے —" حلیمہ کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

عیاد کے دروازے کے سامنے سے اچانک دو افراد گزر کر گئے تھے۔ وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے۔

"حلیمہ! میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اپنی عزت کا خیال کرتے ہوئے یہاں سے چلی جائیں۔" عیاد نے ان افراد کے جانے کا انتظار کیا اور پھر گویا ہوا۔ وہ اس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتا تھا۔ کیسی لڑکی تھی جسے اپنی ہی عزت کا خیال نہیں تھا۔ اگر کوئی اسے اس وقت عیاد کے ساتھ کمرے میں دیکھ لیتا تو اس کے لیے کئی مسائل کھڑے ہو سکتے تھے۔

"میں نہیں جانا چاہتی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ لوگ مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لیں۔ آپ کا نام میرے نام کے ساتھ لیے جائیں۔ ہماری محبت کے قصے قاہرہ کی گلیوں میں مشہور ہو جائیں۔" وہ اس کے بہت قریب آ چکی تھی۔

عیاد نے ہاتھ بڑھا کر سب سے پہلے تو دروازہ بند کیا کیونکہ اگر کوئی حلیمہ کو اس طرح اس کے ساتھ کھڑے دیکھ لیتا تو یقیناً ان کے قصے کہانیاں قاہرہ بھر میں مشہور ہونے والے تھے اور دروازہ بند کرتے ہی ایک زناٹے دار تھپڑ حلیمہ کے گال کو سرخ کر گیا۔

"مجھے اس عمل کے لیے مجبور کرنے والی آپ خود ہیں حلیمہ! جب انسان پر شیطان سوار ہونے لگے تو اسے ایسے ہی جگایا جاتا ہے۔ آپ کو عورت ہو کر اپنی عزت کا خیال نہیں رہا۔ دیکھیں، کیسے آپ اپنے نفس کے ہاتھوں غلام بن کر سچ غلط بھلا بیٹھی ہیں۔ صرف ایک خواہش کو پورا کرنے کے لیے آپ نے عورت ہونے کی تکریم اور رتبے کا خیال بھی نہیں کیا۔ شیطان کو خود پر سوار ہونے سے روکیں اور اللہ سے توبہ کریں۔" عیاد نے بات مکمل کر کے دروازہ دوبارہ کھولا اور حلیمہ کو بازو سے پکڑ کر باہر نکال کر دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

وہ سن کھڑی دروازے کو تکنے لگی۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ وہ اچانک مڑی اور اسی اندھیری گلی میں آگے بڑھنے لگی۔ آیا کے گھر کا دروازہ پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ جانے کہاں چلی جا رہی تھی۔

اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب ہوا ہے۔ اس نے تو صرف اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور اس کے بدلے میں اسے کیا ملا؟ ایک تھپڑ — اتنی تذلیل! وہ تو اب تک سب کی نظروں میں محل کی نوکرانی ہی تھی۔ وہاں سے نکل کر بھی وہ اپنی حیثیت تبدیل نہ کر سکی تھی۔ محبت کرنے کا حق تو صرف الیرا کو تھا۔ اس کی محبت قبول کر لی گئی تھی کیونکہ وہ دولت مند تھی۔

گرم آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے۔ اس نے حجاب دوبارہ چہرے پر ڈالا اور اپنے قدم تیز کر دیے۔ اب اس کا رخ محل کی طرف تھا۔

"میں الیرا کی بھی ایسی ہی تذلیل ہوتے ہوئے دیکھوں گی۔ میں بتاؤں گی زبیر بن دام کو کہ جس بیٹی کو وہ زمانے بھر سے چھپاتا آیا ہے، وہ کیسے اس کا نام قاہرہ کے عام سے کتب میں اچھال رہی ہے — اور یونس — وہ امیر

https://www.urdutube.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

زادہ جس کے قتل کی وہ شان بنے والی ہے، کیسے اسے دھوکا دے رہی ہے۔ اسے ہر طرف سے محبت ہی کیوں ملے؟'' اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ سب کچھ تباہ کر دینا چاہتی تھی۔

''اور عیاد ایب کو عورت کی تحریم کا خیال کسی کی منگیتر سے عشق لڑاتے ہوئے کیوں نہیں آیا؟'' وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔

رات کا اندھیرا اور گلیوں کی ویرانی بھی اسے روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ کل تو وہ ویسے ہی چھوڑ چکی تھی اور عیاد بھی اسے ملنے والا نہیں تھا لہٰذا وہ الیمرا کو بھی خوش نہیں رہنے دینا چاہتی تھی۔ سارا قصور الیمرا کا ہی تھا۔

تاہم اسے بازار سنسان پڑا تھا۔ کل بس چند گلیاں دور تھا۔ وہ بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سر پر انتقام سوار ہو چکا تھا۔ اچانک ایک گلی میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رکی۔ گلی کے آخری کونے پر کوئی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے حجاب کے پیچھے آنسوؤں سے دھندلی ہوتی آنکھوں کو رگڑ کر منظر واضح کرنے کی کوشش کی۔

وہ مضبوط جسم اور لمبے قد کا کوئی شخص تھا۔ اس نے سر تا پا کالا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ بھی اسی کالے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔ علیسہ کو اچانک ہی خوف محسوس ہوا اور ساتھ ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ رات کے اس پہر رہائشی علاقے سے نکل کر قاہرہ کے بازار کو پار کرتی ہوئی ان اندھیری گلیوں میں چلی آئی تھی۔

وہ فوراً ہی واپس پلٹی مگر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ویسا ہی دوسرا آدمی اس کے پیچھے والی گلی میں بھی موجود تھا۔ علیسہ نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا۔ وہ آدمی سامنے والی گلی سے غائب ہو چکا تھا اور اب اس راستے پر آ چکا تھا جہاں سے علیسہ کو واپس جانا تھا۔ علیسہ کی سانس رکنے لگی۔ وہ تیزی سے پلٹی اور اس گلی میں بھاگنے لگی جہاں سے وہ غائب ہوا تھا مگر آدھے راستے کو پار کرتے ہی وہ دوبارہ رکنے پر مجبور ہوئی۔ وہ دوبارہ ظاہر ہو چکا تھا اور اسی طرح ساکت کھڑا تھا۔

''کوئی ہے؟ میری مدد کرو۔'' وہ چلائی۔ کوئی تو اس کی آواز سن کر مدد کے لیے نکلتا مگر ایسا نہیں ہوا۔

اچانک وہ شخص پلک جھپکتے ہی اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ علیسہ کی آواز خوف سے گنگ ہو گئی۔

''کک..... کک..... کون ہو تم؟ مم..... مجھے جانے دو۔'' وہ کپکپاتے ہوئے بولی۔ اس وقت اس کے ذہن سے سب کچھ نکل گیا تھا۔

اس شخص نے چہرہ اوپر کر کے سر پر موجود کپڑا ہٹایا تو علیسہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ اس قدر خوفناک تھا کہ اس کی طرف دیکھنا بھی دل کی دھڑکن رکنے کا سبب بن سکتا تھا۔ وہ یقیناً انسان نہیں تھا۔

''شور مت کرو لڑکی! چلو میرے ساتھ، تمہیں سب کچھ ملے گا۔'' اچانک اس کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی جیسے کئی لوگ ایک ساتھ بول رہے ہوں۔

''نہیں..... نہیں..... مم..... مم..... میں کہیں نہیں جانا چاہتی..... مجھے کچھ نہیں چاہیے..... مجھے جانے دو۔'' علیسہ خوف سے سفید پڑ چکی تھی۔

''عیاد بھی نہیں؟'' وہ شخص پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''کک..... کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟'' علیسہ، عیاد کا نام سن کر مزید خوفزدہ ہو گئی۔

''اگر مجھے تمہیں نقصان پہنچانا ہوتا یا ڈرانا ہوتا تو تم سے بات کرنے کے بجائے سیدھا تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ ڈرنا بند کرو اور میرے ساتھ چلو۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔'' وہ شخص سخت لہجے میں بولا۔

علیسہ اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔

اس نے علیسہ کا ہاتھ تھاما اور اس سے پہلے کہ علیسہ کچھ کرتی، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ہوا میں اڑ رہی ہو۔ وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وہ آدمی اس کے ساتھ ہی محوِ پرواز تھا اور اس کی کلائی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ علیسہ نے دیکھا وہ اہراموں کے اوپر سے گزر رہے تھے مگر اس شخص کی رفتار اتنی تیز تھی کہ لمحوں میں وہ آگے نکل چکے تھے۔

اچانک اس شخص کی رفتار کم ہونا شروع ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ وہ دونوں زمین کی طرف آنے لگے۔

بالآخر وہ شخص علیسہ کو لے کر زمین پر اتر آیا۔ علیسہ نے چاروں طرف دیکھا۔ دور تک صحرا پھیلا ہوا تھا مگر وہاں جگہ جگہ گرانائی کے رخ میں گھومتی چٹانیں موجود تھیں۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟ کہاں لے آئے ہو مجھے؟'' وہ گھبراتے ہوئے بولی۔

''میری بات سنو علیسہ! میں خود چل کر کسی کے پاس نہیں جاتا مگر مصر کی زمین پر اس وقت ان کا پلڑا بھاری ہے۔ میں کسی اور کو بھیجتا تو ان کو خبر ہو جاتی لہٰذا تمہیں ایک ہی ملاقات میں ساری بات سمجھنا ہوگی۔ تمہیں من چاہا انعام ملے گا۔ دنیا کی ساری دولت اور سارے مرد تمہارے غلام ہوں گے۔ تم جسے چاہو اپنے اشاروں پر نچا سکو گی۔ کیا تم

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

ایسی بادشاہت چاہتی ہو؟" وہ صحرا پر نظریں گاڑے بولا۔

حلیمہ اس کی بات سن کر چونک پڑی۔

"ہاں، چاہتی ہوں۔ کون نہیں چاہے گا مگر مجھے کیوں ملے گا یہ سب اور کس کو پتا چل جاتا، تم کون ہو؟" حلیمہ کا ڈر اب ختم ہو چکا تھا۔

"تمہیں اس لیے ملے گا کہ تم ہمارا سب سے اہم کام کرو گی۔ کام بہت آسان اور چھوٹا سا ہے۔ ہم بہت عرصے سے تم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ تم ان کی نظروں سے غائب نہیں۔ یوں سمجھو کہ نفس ایک مقناطیس ہے جو اپنے جیسوں کو بلاتا ہے۔ آج تمہیں ہماری ضرورت ہے تو ہم خود آگئے ہیں تمہاری ضرورت پوری کرنے۔" وہ اس کی طرف چہرہ کرکے بولا۔

حلیمہ سب سنتے ہی جھرجھری آگئی۔

"کیا کرنا ہوگا مجھے اور مجھ سے ہی کیوں کروانا چاہتے ہو تم یہ سب؟" وہ بولی۔

"کیونکہ تم عیاد کے سب سے قریب رہی ہو۔ اس کے پاس ایک کتاب ہے جو مجھے چاہیے۔ تم مجھے وہ کتاب لادو۔ بدلے میں تمہیں دنیا کا ہر جادو اور ہر خزانہ مل جائے گا۔ تمہاری دشمن المیرا سے میں نمٹ لوں گا۔ عیاد تمہیں خود اپنائے گا۔ تمہارا شہر قاہرہ کے امراء میں ہوگا۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہیں سب ملے؟" وہ حلیمہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیسی کتاب..... اور تم وہ کتاب کیوں چرانا چاہتے ہو؟ کتاب تمہیں لاکر دینے سے عیاد مجھے کیسے اپنالے گا؟ اگر اسے پتا چل گیا کہ کتاب میں نے چرائی ہے تو اسے مجھ سے نفرت ہو جائے گی اور جب تم اتنا سب کچھ کرسکتے ہو تو کتاب کیوں نہیں چرا سکتے؟" وہ اپنے ہر سوال کا جواب جاننا چاہتی تھی۔

"وہ میری کتاب ہے۔ برسوں پہلے کوئی مجھ سے چھین کر لے گیا تھا۔ میں عیاد کے کمرے میں داخل نہیں ہوسکتا کیونکہ اس پر بھی کچھ طاقتوں کا پہرا ہے مگر تم ان کی نظروں میں نہیں آئی ہو اور یہ کام کوئی انسان ہی کرسکتا ہے۔ عیاد کو پتا نہیں چلے گا کیونکہ وہ اس کتاب کو رکھ کر بھول چکا ہے۔ کتاب مجھے ملے گی تو المیرا کو راستے سے ہٹانا میرے لیے مشکل نہیں، یہ دیکھو۔" اچانک اس شخص نے صحرا کی زمین کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک بہت بڑا شگاف نمودار ہوا۔ حلیمہ ڈر کر پیچھے ہٹی مگر اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس شگاف کے اندر ہیرے جواہرات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس قدر خزانہ تھا کہ پوری دنیا اس سے خریدی جاسکتی تھی۔

"اور یہ بھی دیکھو۔" اچانک اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔

ہوا میں ایک دائرہ نمودار ہوا اور اس میں المیرا کی شبیہ ابھر آئی جو اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔

"بس ایک دھکا اسے یہاں سے گرا کر اس کا کام تمام کرسکتا ہے اور اس طرح تم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔ جب یہ مرجائے گی تو عیاد کو رونے کے لیے تمہارا ہی کندھا میسر ہوگا۔ یہ کام میں کسی اور سے بھی کروا سکتا تھا مگر تم یہ سمجھو کہ تمہیں ہم نے چن لیا ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تمہیں یہ سب چاہیے یا تم اپنے بے ڈھنگانہ طریقوں پر عمل کرتے ہوئے وہ سب حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہو گی؟ لیکن یاد رکھنا، جس طریقے پر عمل کرتے ہوئے تم عیاد کو حاصل کرنے جارہی تھیں، اس کے بدلے میں تمہیں صرف اور صرف عیاد کی نفرت ملے گی۔" اس شخص نے ہاتھ کے اشارے سے اس شگاف اور اس دائرے کو دوبارہ سے بند کردیا۔

"میں تیار ہوں۔ مجھے اس کتاب کی نشانی بتا سکتے ہو؟" حلیمہ تیار ہو چکی تھی۔

اس شخص کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"وہ کچھ اس طرح کی نظر آتی ہے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس کتاب کی شبیہ حلیمہ کے سامنے ظاہر کی۔ "اس کتاب کو چرانے کے بعد تم اس صحرا میں چلی آنا اور پھر تمہیں یہاں اس مقام پر بیٹھ کر ایک مخصوص عبادت کرنا ہوگی اور چند جملے دہرانے ہوں گے۔ میں تمہارے سامنے ظاہر ہو جاؤں گا اور تم ہے یہ کتاب لے کر خزانہ تمہارے حوالے کردوں گا۔" وہ شخص ایک چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"مگر میں یہاں تک کیوں آؤں؟ تم وہ کتاب مجھ سے قاہرہ میں بھی حاصل کرسکتے ہو اور یہ عبادت کا کیا چکر ہے؟" حلیمہ کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ جب وہ اس قدر طاقتور تھا تو ہر بات کے لیے حلیمہ پر انحصار کیوں کررہا تھا۔

"میں نے تمہیں کہا نا کہ میں ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ انہیں تم پر شک ہو۔ ان کا دھیان کسی اور طرف ہے۔ تمہیں صرف یہاں تک آنا ہے۔ یہ جملے دہرانا اور سب کچھ حاصل کرلینا۔" وہ بولا اور حلیمہ کو ایک کاغذ تھما دیا جس پر کوئی تحریر لکھی ہوئی تھی۔ حلیمہ اس تحریر کو پڑھنے لگی۔

"یہ— یہ کیا لکھا ہے؟ میں اپنی روح کس کے حوالے کروں گی؟" حلیمہ تحریر پڑھ کر ڈر گئی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest.library.com

"اسی کے حوالے کرو گی جو تمہیں یہ سب کچھ دے گا اور تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ان جملوں کا مطلب یہ ہے کہ تم نے خود کو اس کی تحویل میں دے دیا ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ صرف ایک چھوٹا سا کام اور چند جملے کہنے سے تم دنیا کی ہر خوشی حاصل کر لو گی ورنہ اسی طرح قاہرہ کی گلیوں میں بھٹکتے ہوئے، مزدوری کرتے ہوئے ایک دن موت کو گلے لگا لو گی۔ نہ المیرا کا کچھ بگڑے گا اور نہ عیاد کا۔ یہ موقع ہر کسی کو نہیں ملا کرتا۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

حلیمہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے اس شخص کو کوئی جواب نہیں دیا۔

"چلو اب میں تمہیں تمہارے گھر اتار کر یہاں سے نکلوں گا۔ تہجد کا وقت داخل ہوتے ہی ان کے لوگ قاہرہ میں پہرا دینے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔"

"تم — تمہارا نام کیا ہے اور اس جگہ کا نام تو بتا دو۔ مجھے یہاں آنا ہو گا تو کم از کم اس جگہ کا نام تو پتا ہو۔" حلیمہ بولی۔

"میرا نام فراض ہے۔ اس جگہ کا نام الفرافرہ ہے اور یاد رکھنا، یہ جملے تم یہیں بیٹھ کر دہراؤ گی۔ اب چلو۔" وہ دوبارہ سے حلیمہ کی کلائی تھام چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حلیمہ آیا کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ گلی اب بھی سنسان پڑی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ یہاں سے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔ عیاد سے تھپڑ کھانے کے بعد شاید وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی مگر یہ سب خواب تو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ واقعی کسی غیبی طاقت سے مل کر آئی تھی۔

اس نے ایک نظر عیاد کے کمرے کے بند دروازے پر ڈالی اور آہستگی سے آیا کے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ جاتے ہوئے دروازے کو بھیڑ کر گئی تھی تاکہ واپس آنے میں آسانی ہو۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ کسی کو بھی اس کے جانے اور واپس آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ اس نے خاموشی سے اپنا حجاب اتارا اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

اگر اس شخص کی ساری باتیں سچ تھیں تو عیاد اس سے بس ایک دن کی دوری پر تھا۔ اس کے بعد تو اسے سب کچھ حاصل ہو جاتا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اس کتاب کو ضرور چرائے گی۔ ایک کتاب ہی تو تھی اور اس کے بدلے میں اسے اتنا سب کچھ مل رہا تھا۔ جب وہ گھر سے نکلی تھی تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا مگر واپس آتے ہوئے اسے سب کچھ حاصل کرنے کی امید مل گئی تھی۔

عیاد کے کمرے کی چابی عبداللہ کے پاس ہوتی تھی۔ وہ صفائی کے بہانے کسی بھی وقت بہ آسانی وہ چابی چرا سکتی تھی اور عیاد کی غیر موجودگی میں اس کمرے میں داخل ہو کر وہ کتاب حاصل کر لیتی۔

یقیناً اس کے لیے مدد بھیجی گئی تھی۔ یہ سب اس کے لیے ہی تو تھا، جبھی تو اس کا راستہ آسان ہو گیا تھا۔ اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔ اگلے دن کا سورج اس کی، المیرا کی اور عیاد کی زندگی تبدیل کرنے والا تھا۔

☆☆☆

Year 1773

ایڈنبرا

اگلی صبح جب الیگزینڈر سو کر اٹھا تو ڈیوڈ وہاں سے جا چکا تھا۔ یعنی آج کی رات وہ اپنا کام بہ آسانی مکمل کر سکتا تھا۔ رچرڈ اس کے لیے ناشتا اسی کمرے میں لے آیا۔ چونکہ وہ یہاں فادر تھامس کے مددگار کی حیثیت سے آیا تھا لہٰذا رچرڈ کے گھر میں گھومنا پھرنا اس کے لیے بہت آسان تھا۔

وہ اس کے گھر کے کونوں کو پاک کرنے کے بہانے سے ہر جگہ آزادی سے جا سکتا تھا اور اس نے ایسا کیا بھی۔ پہلے وہ رچرڈ کو دکھانے کے لیے گھر کے پچھلے حصے کی طرف گھومتا رہا اور مختلف کونوں میں پانی چھڑکتا رہا۔ اس کے بعد وہ گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلا آیا۔ رچرڈ کچھ دیر تو اس کے ساتھ ہی رہا مگر پھر اسے کسی کام سے بازار جانا تھا لہٰذا وہ آتھمن کو اس کے ساتھ لگا کر بازار کی طرف نکل گیا۔

رچرڈ کی بیوی ایوا بھی اس کی طرف سے مطمئن ہو کر دیگر کاموں میں مصروف ہو چکی تھی۔

"بس اب تمہاری بہن کا کمرا رہ گیا ہے۔ مجھے اس کے کمرے میں لے چلو تاکہ میں اسے بھی پاک کر کے اپنا کام مکمل کر لوں۔" الیگزینڈر نے گھر کے تمام حصوں کا جائزہ لینے کے بعد بالآخر آتھمن سے ڈیلینا کے کمرے میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔

وہ صبح سے اپنے کمرے میں بند تھی اور کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ کل رات سے اس کی طبیعت میں عجیب سی بے چینی تھی اور اپنی ماں سے یہ سننے کے بعد کہ چرچ سے آیا ہوا لڑکا گھر کے مختلف حصوں کا جائزہ لے رہا ہے، وہ اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہی۔ اس لڑکے کو دیکھتے ہی اسے اپنے جسم میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہوتی تھیں لہٰذا اس نے اس کا سامنا کرنے سے گریز کیا تھا مگر وہ تو آتھمن کے ساتھ اس کے کمرے میں ہی چلا آیا تھا۔

وہ اپنے بستر پر نیم دراز تھی، اسے دیکھ کر چونک کر اٹھ

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

بیٹھی۔ وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر کمرے کے مختلف کونوں کا جائزہ لینے لگا۔ آتھمن بھی اس کے ساتھ ہی تھا لہٰذا ایلینا کو یہ تسلی تھی کہ وہ اس کے ساتھ اس کمرے میں اکیلی نہیں ہے۔

"مجھے اس کونے سے مثنی توانائی محسوس ہو رہی ہے۔ تم میرا ایک کام کر سکتے ہو؟" وہ یہ کہتے ہوئے آتھمن کی طرف پلٹا۔

آتھمن اس کی بات سن کر چونک پڑا۔ "جی کہیے۔" آتھمن کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

"میں جس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہوں، وہاں میرا چمڑے کا ایک بستہ رکھا ہے۔ وہ اٹھا کر لے آؤ۔" وہ آتھمن سے بولا تو آتھمن سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایلینا بھی بستر سے اتر کر خاموشی سے اس کے پیچھے باہر نکلنے لگی۔ وہ اس آتھمن کے ساتھ کمرے میں اکیلے رہنا ہی نہیں چاہتی تھی مگر الیگزینڈر نے تیزی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟ میں اتنی دور سے یہاں تمہاری وجہ سے ہی آیا ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

"م۔۔۔ میری وجہ سے کیوں؟ آپ مجھے باہر جانے دیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" ایلینا کو اس سے خوف محسوس ہونا شروع ہوا۔

"ٹھیک تو تم ہو مگر تمہارے پاس ایک بہت اہم جگہ کا پتا موجود ہے۔" وہ اس کے بازو کو سختی سے پکڑ کر بولا۔

ایلینا خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ادھر دیکھو۔ میری آنکھوں میں دیکھو۔" الیگزینڈر سختی سے بولا۔

ایلینا نے بے اختیار ہی اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر اسے ایسا لگا جیسے وہ ایک سرنگ میں چلتی ہی چلی جا رہی ہو۔ الیگزینڈر اس کی آنکھوں کے ذریعے اس کے ذہن کے بند دروازوں کو کھولتا ہوا اس کی یادداشت میں محفوظ مناظر کو کھنگال رہا تھا۔

وہ جنگل سے نکل کر چیری کی ٹوکری تھامے قلعے کی طرف جانے والے راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔

وہ قلعے کے دروازے کے باہر کھڑی قلعے کو تک رہی تھی۔

وہ قلعے کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ وہاں ہر طرف اندھیرا تھا اور ایلینا کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔

وہ قلعے میں ٹہلتے ہوئے آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی۔

اسے کسی کا انتظار تھا۔ وہ تھک ہار کر صحن میں بنے فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئی تھی۔

اچانک اسے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ پیچھے پلٹی۔ ایزموڈیس کے قبیلے کا ایک عفریت اس پر حملہ کر چکا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔

اسے ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں اپنی ماں کے ساتھ تھی۔ اسے بتایا جا رہا تھا کہ فادر تھامس اس کا علاج کر کے جا چکے تھے۔

الیگزینڈر نے اس کا بازو چھوڑا اور اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"تم چابی تک نہیں گئیں تو پھر اس دن مجھے وہ بو کیوں محسوس ہوئی تھی؟" الیگزینڈر کو شدید غصہ آیا۔ اسے اتنی بڑی غلط فہمی کیسے ہو سکتی تھی۔

"الیگزینڈر! دروازہ کھولو۔ میں تمہارا بستہ لے آیا ہوں۔" اسے آتھمن کی آواز آئی۔ وہ ایلینا کے کمرے کا دروازہ بجا رہا تھا۔

الیگزینڈر نے جھنجلا کر ایلینا کی طرف دیکھا جو خوفزدہ نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

"ابھی جو کچھ بھی ہوا، تم وہ سب بھول جاؤ گی۔" الیگزینڈر نے اسے حکم دیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"کیا ہوا، یہاں کیوں کھڑی ہو؟" آتھمن کمرے میں داخل ہوا اور ایلینا کو دروازے کے قریب کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کچھ نہیں۔ میں بس باہر نکل رہی تھی۔" ایلینا کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ آتھمن کو جواب دے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"کیا ہوا، تم نے دروازہ کیوں بند کیا تھا؟" آتھمن نے تجسس سے الیگزینڈر کی طرف دیکھا۔

"میں نے بند نہیں کیا تھا۔ یہ دروازہ سخت ہو چکا ہے۔ تم جاتے ہوئے بند کر کے گئے تو یہ اٹک گیا تھا۔ ایلینا بھی اسے کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے کھولنے میں اس کی مدد کی ہے۔" وہ کندھے آچکا کر بولا اور اپنا بستہ تھام کر کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

"کیا ہوا؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں اس کونے سے مثنی توانائی محسوس ہوئی ہے تو اب تم اسے دیکھے بغیر جا کیوں رہے ہو؟" آتھمن کو اس لڑکے کی حرکتیں ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں۔

"میں اسے دیکھ چکا ہوں۔ مثنی توانائی اس کونے کے باہر کی طرف ہے۔ میں پچھلے حصے سے جا کر اس کو دیکھ لوں گا۔" الیگزینڈر کو اس کے سوالات شدید زہر لگ رہے تھے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

مگر وہ اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اب میرا کام ختم؟" احسن کو شاید کہیں جانے کی جلدی تھی۔

"ہاں، اب تم جاسکتے ہو۔ میں بھی اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔" الیگزینڈر یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس نے غصے سے اپنا بستا ایک طرف پھینکا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ مجھے اتنی بڑی غلط فہمی نہیں ہوسکتی۔ میں نے خود اس چابی کی بو کو قریب سے محسوس کیا تھا۔" وہ ٹہلتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ اس نے کچھ سوچ کر دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور کمرے میں موجود ایک پرانے سے آئینے کے سامنے آنکھیں بند کرکے کھڑا ہوگیا۔

"کیا ہوا الیگزینڈر؟" تھوڑی دیر بعد اس کے ہمزاد کی شبیہہ اس پرانے آئینے میں ابھری۔

"شکر ہے تم آگئے ورنہ مجھے یہی فکر تھی کہ اس بوسیدہ آئینے میں داخل ہونا تم پسند کرو گے بھی یا نہیں۔" وہ اس آئینے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

اس کے ہمزاد کے چہرے پر طمانیت کی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تمہاری مدد کے لیے میں کہیں بھی آسکتا ہوں۔ میں تو ہر وقت تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔ لیکن تم نے ہی مجھ سے بات کرنے کے لیے مجھے اس آئینے کا تیدی بنا رکھا ہے۔" وہ الیگزینڈر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ سب چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ میرا اندازہ غلط کیسے ثابت ہوا؟ مجھے خود اس دن فادر تھامس کے کمرے میں اس انسان کی بو محسوس ہوئی تھی جو اس چابی تک جاچکا ہے مگر لیلینا کی یادداشت میں ایسا کوئی منظر محفوظ نہیں ہے۔" وہ پریشانی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"اچھی طرح ذہن پر زور ڈالو الیگزینڈر! تمہارا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوسکتا۔ تم بہت عرصے سے اس چابی کی تلاش میں ہو اور اس کے بہت قریب پہنچ چکے ہو۔" ہمزاد بولا۔

"ایڈم نے مجھے یہ ذمے داری سونپتے ہوئے بتایا تھا کہ اس چابی اور اس جگہ کی حفاظت کی ذمے داری تھامس کے ذمے ہے۔ میں تھامس کے قریب گیا ہی اس ارادے سے تھا مگر وہ پہرے داری کے سب سے اونچے درجے پر موجود ہے لہٰذا اس سے کسی بھی قسم کی معلومات حاصل کرنا یا اس کے ذہن تک رسائی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ مجھے ذمے داری سونپتے ہوئے یہ بتایا گیا تھا کہ بہت جلد نیکی کا ایک پہرے دار اپنی ذمے داریاں سنبھالنے یہاں آنے والا ہے لہٰذا میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اس کی روحانی صلاحیتیں تھامس جتنی طاقتور نہیں ہوں گی اور جب تھامس اسے اس کی ذمے داریاں سونپنے کے لیے اس چابی تک لے کر جائے گا تو میں بہ آسانی اس مقام کا پتا لگالوں گا مگر اب تک میرے سامنے وہ نیا پہرے دار ظاہر ہی نہیں ہوا اور نہ ہی تھامس کے ساتھ مجھے ایسا کوئی شخص نظر آیا جسے وہ ہر جگہ اپنے ساتھ لیے گھومتا ہو لیکن اس دن جب میں تھامس کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے واضح طور پر اس شخص کی بو محسوس ہوئی تھی جو اس چابی تک جاچکا ہے۔ تھامس نے اپنے لیکچر کے دوران بتایا تھا کہ ایک لڑکی اس قلعے تک پہنچنے کے بعد آسیب زدہ ہوچکی ہے اور تھامس نے اس کا علاج کیا ہے مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ قلعے میں کئی عفریت گھومتے ہیں لہٰذا میں نے اس واقعے پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ایک عام سی لڑکی اس چابی تک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ عفریت بھی اسی چابی کا مقام ڈھونڈنے کے لیے قلعے تک آتے ہیں۔ بالفرض لیلینا پر کسی عفریت کا قبضہ ہو بھی گیا تھا تو وہ اسے لے کر اس چابی تک نہیں گیا ہوگا کیونکہ وہ تو خود اسی چابی کی تلاش میں اس قلعے میں داخل ہوا ہوگا لیکن جب یہ لڑکی تھامس سے ملنے انسٹی ٹیوٹ آئی تو مجھے اس کمرے میں وہ بو محسوس ہوئی تھی۔ اب میں کیا کروں؟ تم مجھے کوئی راہ دکھاؤ۔" وہ بری طرح جھنجلایا ہوا تھا اور اپنے ہمزاد سے مشورہ مانگ رہا تھا۔

"ہوسکتا ہے وہ لیلینا نہ ہو، کوئی اور ہو۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسا ہے۔ تم نے یقیناً اس چابی کی بو ہی محسوس کی ہے۔ تم یاد کرنے کی کوشش کرو کہ اس دن کمرے میں اور کون کون موجود تھا؟" ہمزاد نے اسے اشارہ دیا۔

"آرتھر، رچرڈ اور ڈیوڈ۔ بس یہی لوگ موجود تھے۔" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"تو تمہیں کیا لگتا ہے، ان میں سے کوئی ہوسکتا ہے جو چابی تک جاچکا ہو؟" ہمزاد بولا۔

"آرتھر تو نہیں ہوسکتا۔ اس کے ساتھ تو میں کافی عرصے سے رہ رہا ہوں۔ رچرڈ بھی نہیں ہوسکتا۔ ڈرپوک سا آدمی ہے..... ڈیوڈ..... ایوڈ....." وہ ڈیوڈ کے نام کو بار بار دہرانے لگا۔

"ڈیوڈ بھی تو ایک عام سا ہی آدمی ہے۔ تھامس کیوں بھلا ایک عام سے آدمی کو چابی تک لے کر چلا جائے گا؟" الیگزینڈر نے خود ہی اپنی سوچ کی نفی کی۔

"تھامس لے کر جاسکتا ہے۔ ڈیوڈ اس کی نظر میں بہادر اور سمجھ دار ہے۔ لیلینا کا اس سے کوئی رشتہ نہیں مگر پھر بھی وہ اس معاملے میں شروع سے لے کر آخر تک شامل رہا

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

ہے اور کل رات جب تم لیلیٰنا کو قابو کرنے والے تھے تو وہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے باغ تک چلا آیا تھا۔ ہوسکتا ہے تھامس کو وہی پہرے دار لگتا ہو۔" ہمزاد کی باتیں سن کر الیگزینڈر بری طرح چونکا۔

"اوہ — ہاں — مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ لیکن ایوا تو ہال بچوں والا ہے۔ وہ پہرے دار نہیں ہوسکتا۔" الیگزینڈر بولا۔

اب بھی یہ گتھی الجھی ہوئی تھی۔

"چابی تک جانے کے لیے پہرے دار کا ہونا شرط نہیں ہے۔ تھامس جب تک اس عہدے پر فائز ہے، اپنی مرضی سے جب چاہے وہاں تک لے جاسکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ تھامس کو یقین ہونا چاہیے کہ وہ شخص مضبوط اعصاب کا مالک ہو اور روحانی طور پر بھی طاقتور ہو۔" ہمزاد نے اس گتھی کا آخری الجھا سرا کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

الیگزینڈر کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے۔

"اوہ — ہاں — میں نے اس طرح سے کیوں نہیں سوچا؟ اور پھر کل رات تک تو مجھے اس چابی تک جانے والے شخص کی بو محسوس ہوتی رہی تھی مگر آج صبح ایوا کے نکلتے ہی اس گھر سے وہ بو غائب ہوگئی۔ چونکہ میرا سارا دھیان لیلیٰنا کی طرف تھا لہٰذا میں نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔" وہ پرجوش لہجے میں بولا تو ہمزاد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے —؟" اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔

"سوچ رہا ہوں کہ کیسے سارے راستے آسان ہوگئے ہیں۔ چابی بھی یہیں ہے اور چابی کا پتا جاننے والا بھی۔ قربانی کے لیے جس عورت کی ضرورت ہے، وہ بھی یہیں ہے مگر —" وہ خود سے باتیں کر رہا تھا۔

"مگر کیا؟" ہمزاد بولا۔

"مگر ایک چیز کی کمی ہے — اوہ ہاں — ا" اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

"کس چیز کی کمی ہے اور یہ سامان کیوں سمیٹ رہے ہو تم؟ جب ساری چیزیں یہیں موجود ہیں تو تمہیں تیاری شروع کردینی چاہیے۔" ہمزاد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مجھے مت بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جس چیز کی کمی ہے اسے لے کر میں سیدھا یہیں آؤں گا۔ جب تک ایوا بھی واپس آچکا ہوگا۔ اب میرا وقت ضائع مت کرو۔" وہ عجلت میں کہہ کر سامان اٹھانے لگا۔

ہمزاد چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر اس کی شبیہ آئینے سے غائب ہوگئی۔

الیگزینڈر نے اپنا سامان سمیٹا اور رچرڈ کو مطلع کیا کہ وہ اپنا کام ختم کرچکا ہے اور آج ہی اسکاٹ لینڈ روانہ ہورہا ہے۔ رچرڈ نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ اس کا گھر ہر قسم کی منفی توانائی سے پاک ہوچکا تھا۔

الیگزینڈر شام ہونے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گیا مگر وہ ایک دن بعد دوبارہ لوٹنے والا تھا اور اس کے لوٹتے ہی دنیا ایک بہت بڑی تباہی سے دوچار ہونے والی تھی۔

☆☆☆

آرتھر، فادر تھامس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ فادر تھامس نے اسے جو باتیں بتائی تھیں وہ اس کے لیے بھی حیران کن تھیں۔ ان کے مطابق وہ کسی بہت بڑی ذمے داری کو اٹھانے کے لیے یہاں تک لایا گیا تھا اور اس ذمے داری کی تفصیل سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ اس سے ملنے ازابیلا کے گھر گئے تھے مگر تھامس نے اس کے ساتھ وہاں بیٹھ کر یہ ساری باتیں کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا لہٰذا وہ آرتھر کو ساتھ لے کر چرچ آگئے تھے اور اب وہ ان کے سامنے ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"فادر! کیا آپ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دے سکتے ہیں؟" بالآخر وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر بولا۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے آرتھر! الیگزینڈر کو ڈھونڈنا بہت ضروری ہے اور اس سفر میں تمہارا میرے ساتھ ہونا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"مگر فادر — یہ ایک بہت اہم ذمے داری ہے۔ میں تو ان طاقتوں کے بارے میں صحیح طرح جانتا بھی نہیں ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی تو کیا ہوگا؟" آرتھر پریشانی سے بولا۔

"تم سے کوئی غلطی نہیں ہوگی کیونکہ تم اس مقصد کے لیے چنے گئے ہو۔ تم ان طاقتوں کو نہیں جانتے لیکن وہ تمہیں جانتی ہیں۔ اسی لیے تو بار بار تم سے ملنے آتی رہی ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ میری طرح انہیں بھی یہی دھوکا ہوا ہے کہ تم نیکی کے پہرے دار نہیں ہو ورنہ وہ تمہیں ضرور نقصان پہنچانے کی کوشش کرتیں جیسے کہ الیگزینڈر — یقیناً ایوا کا ملنا اتفاق نہیں تھا بلکہ یہ بھی قدرت کی طرف سے ان طاقتوں کا دھیان دوسری طرف لگانے کی کوشش تھی تاکہ صحیح وقت پر تم سے کام لیا جاسکے۔

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

"بدی کے اس نئے پہرے دار کو صرف اور صرف نیکی کا نیا پہرے داری ختم کر سکتا ہے۔ اس کا مقابلہ مجھ سے نہیں، اس کا مقابلہ تم سے ہے۔ میں اپنے وقت پر اپنا مقابلہ لڑ چکا ہوں اور جیت چکا ہوں۔ تم صرف یہ یاد رکھو کہ خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہے اور اسی بھروسے پر تم بڑی سے بڑی جنگ جیت سکتے ہو۔" فادر تھامس اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"فادر.....!" آرتھر ان کی باتیں سمجھنے کے باوجود بھی سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ذمے داری کو اٹھاتے ہی اسے دنیا سے دستبردار ہونا پڑتا۔ اسے ازابیلا کو چھوڑنا پڑتا۔ اس کی زندگی اس فرض کو نبھاتے ہوئے وقف ہو جانی تھی۔

"آرتھر! تم آج رات سکون سے اس بارے میں سوچو۔ ہم بات کریں گے۔" فادر تھامس بولے اور آرتھر تو جیسے اسی کے انتظار میں تھا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ بیٹھو، تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ آج رات تم میرے ساتھ ہی قیام کرو گے۔ ویسے بھی کافی رات ہو چکی ہے۔ تمہیں واپسی کے لیے کوئی سواری نہیں ملے گی۔ صبح ہم یہاں سے ایک ساتھ ہی انسٹی ٹیوٹ جائیں گے۔" وہ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر بولے۔

"مگر فادر.....! وہ....." وہ ان کے ساتھ رکنے پر ہچکچاہٹ کا شکار ہوا۔

انہوں نے بغیر کچھ کہے سر ہلا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رکنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اسے ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔ شاید نئی جگہ تھی یا نئی ذمے داریوں کا بوجھ تھا جو اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ فادر تھامس کو صاف انکار کر دے گا۔ اگر اسے واقعی یہ ذمے داری قدرت کی طرف سے سونپی جا رہی تھی تو پھر اسے قدرت کی طرف سے ہی کوئی اشارہ ملنا چاہیے تھا۔

صبح ہوئی تو وہ فادر تھامس کے ساتھ ناشتا کر کے انسٹی ٹیوٹ چلا آیا۔ اسے صبح صبح ان سے یہ بات کرنا مناسب نہیں لگا مگر اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جب وہ لیکچر کے بعد ان کے کمرے میں جائے گا تو انہیں انکار کر کے ہی باہر نکلے گا۔

انسٹی ٹیوٹ میں ازابیلا اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس کی طرف سے فکر مند تھی کیونکہ وہ رات کو فادر تھامس کے ساتھ گیا تھا اور واپس نہیں لوٹا تھا۔ اس نے ازابیلا کو تسلی دی مگر تفصیل بتانے سے گریز کیا۔ لیکچرز کے بعد اس نے ازابیلا کو گھر بھیجا اور خود جلدی آنے کا وعدہ کر کے فادر تھامس کے کمرے کی طرف چل دیا۔

الیگزینڈر آج بھی نہیں آیا تھا لہٰذا اسے انسٹی ٹیوٹ کی ذمے داریاں بھی نبھانی تھیں اور فادر تھامس کو انکار بھی کرنا تھا۔ وہ ان کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ کاغذات پر جھکے ہوئے تھے۔

"آؤ آرتھر! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا..... تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

اس سے پہلے کہ آرتھر ان کی کسی بات کا جواب دیتا، ان کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دونوں ہی دستک سن کر چونک پڑے۔ آرتھر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ انسٹی ٹیوٹ کا مددگار دروازہ کھلنے پر اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔

"کہو چارلی! کیا کام ہے؟" فادر تھامس دوبارہ کاغذات پر متوجہ ہو گئے۔

"فادر! کوئی ڈیوڈ نامی شخص آپ سے ملنے آیا ہے۔" چارلی بولا تو وہ چونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"ڈیوڈ کیوں آیا ہے؟ کل ہی تو وہ یہاں سے ہو کر گیا ہے۔ کیا اس کے ساتھ اور بھی کوئی ہے؟" انہیں ایلینا کی فکر ہوئی۔

"نہیں فادر! وہ اکیلا ہی ہے اور آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔" چارلی کندھے اچکا کر بولا۔

"ٹھیک ہے، تم اسے بھیجو۔" وہ کاغذات ایک طرف رکھ کر ڈیوڈ کا انتظار کرنے لگے۔

آرتھر سمجھ گیا کہ کوئی اہم بات ہے لہٰذا وہ بھی بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈیوڈ کمرے میں داخل ہوا۔

"آؤ ڈیوڈ! بیٹھو، کیسے آنا ہوا؟" فادر تھامس اسے جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

ڈیوڈ نے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے بے اختیار ہی آرتھر کی طرف دیکھا تو وہ ڈیوڈ کے اس طرح اسے دیکھنے پر حیران ہوا۔

"کیا ہوا، ایسے کیوں دیکھ رہے ہو اسے؟" فادر تھامس کی تیز نظروں سے اس کی یہ حرکت چھپی نہ رہ سکی۔

"کل جب میں آیا تھا تو اس کے ساتھ یہاں ایک اور لڑکا بھی موجود تھا..... الیگزینڈر!" ڈیوڈ نے اپنی بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں، مگر آج وہ غیر حاضر ہے۔ کسی کام سے گیا ہوا ہے۔" فادر تھامس بولے۔

"جی، آپ نے ہی تو اسے اہم کام سے بھیجا ہے۔" ڈیوڈ نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔ اس کا یہ جملہ سن کر

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

آرتھر بھی چونک گیا۔

"کیا مطلب؟ میں نے اسے کسی کام سے نہیں بھیجا..... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ مکمل کرکہو۔" فادر تھامس کے کان کھڑے ہوگئے۔

"کل ہمارے یہاں سے جانے کے بعد وہ لڑکا رچرڈ کے گھر آپ کا خط لے کر آیا تھا۔ اس خط پر آپ کے دستخط اور چرچ کی مہر بھی تھی۔ اس میں لکھی تحریر کے مطابق آپ نے اس لڑکے کو رچرڈ کا گھر پاک کرنے کے لیے بھیجا ہے۔" ایوڈ نے اپنی بات مکمل کی تو فادر تھامس یہ سنتے ہی اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ آرتھر کے چہرے پر بھی پریشانی پھیل گئی۔

"میں نے اسے کوئی خط نہیں دیا اور مجھے کیا ضرورت ہے رچرڈ کے گھر کو پاک کروانے کی۔ میں نے خود تمہیں کہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اب وہ کہاں ہے؟" وہ پریشانی سے اپنا کوٹ پہنتے ہوئے بولے۔

"وہ رچرڈ کے گھر میں ہی ہے۔ مجھے صبح اپنے قصبے کے لیے نکلنا تھا مگر مجھے اس پر کل رات ہی شک ہوگیا تھا جب میں نے اسے آدھی رات کے وقت اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر کھڑا پایا۔ لہٰذا میں صبح ہوتے ہی آپ کے پاس چلا آیا۔" ایوڈ بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"اوہ نہیں، یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ ہمیں فوراً ایڈنبرا کے لیے نکلنا ہوگا۔" فادر تھامس پریشانی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے۔

"آرتھر! تم جلدی سے انسٹی ٹیوٹ کے مددگاروں کو بلا لاؤ۔ مجھے انہیں کچھ ہدایات دینی ہیں اور اس کے بعد ہم فوراً ایڈنبرا کے لیے نکلیں گے۔ اگر تمہیں اپنا کچھ ضروری سامان اٹھانا ہے تو ہم ازابیلا کے گھر چل سکتے ہیں۔ ہمیں واپس لوٹنے میں کچھ دن لگ جائیں گے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے تو وہ چاہ کر بھی انکار نہیں کرسکا۔

"ایوڈ! تمہاری بگھی تیار کھڑی ہے؟ ہمیں ابھی نکلنا ہوگا۔ پہلے میں چرچ جاؤں گا اور وہاں سے اپنی چیزیں اٹھا کر ازابیلا کے گھر سے آرتھر کا سامان لیں گے، اس کے بعد ہم وقت ضائع کیے بغیر ایڈنبرا کے لیے نکل جائیں گے۔" انہوں نے عجلت میں کمرے سے اپنی چیزیں اٹھانا شروع کردیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایوڈ کو ہدایات بھی دیتے جارہے تھے۔

"جی فادر! میں بالکل تیار ہوں۔" ایوڈ بولا۔ اس نے قصبے جاکر اپنے بیوی بچوں سے ملنے کا ارادہ بھی ترک کردیا۔

انہیں ایڈنبرا پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی۔ ایوڈ نے رچرڈ کے گھر پہنچتے ہی جلدی سے بگھی سے اتر کر گھر کا دروازہ بجایا۔ دروازہ رچرڈ نے ہی کھولا اور وہ ان تینوں کو ایک ساتھ دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایوڈ تو اپنے بیوی بچوں سے ملنے کا کہہ کر گیا تھا پھر وہ اتنی جلدی کیوں چلا آیا تھا، وہ بھی فادر تھامس کے ساتھ؟

"کیا ہوا ایوڈ! سب خیریت تو ہے؟ فادر آپ؟" رچرڈ کی پریشانی بڑھنے لگی۔

فادر تھامس بغیر جواب دیے اس کے گھر کے اندر داخل ہوگئے۔ باقی سب نے بھی ان کی پیروی کی۔

"کہاں ہے وہ لڑکا؟ جلدی بلاؤ اسے۔" فادر تھامس بیٹھک میں داخل ہوتے ہی رچرڈ سے مخاطب ہوئے۔

"کون سا لڑکا فادر؟" رچرڈ حیرانی سے فادر تھامس کو دیکھنے لگا۔

فادر تھامس نے ایوڈ کی طرف دیکھا۔

"وہی لڑکا..... الیگزینڈر..... فادر کا مددگار..... جو تمہارے گھر کو پاک کرنے کے لیے آیا تھا۔" ایوڈ تیز لہجے میں رچرڈ سے کہنے لگا۔

"مگر فادر! وہ تو شام سے پہلے ہی واپس لوٹ گیا تھا۔ اس کے مطابق ہمارا گھر ہر قسم کی منفی توانائی سے پاک تھا اور اس کا کام یہاں ختم ہوچکا تھا۔" رچرڈ حیرانی سے بولا اور فادر تھامس نے اپنا سر تھام لیا۔

"کیا ہوا ہے، کوئی مجھے بتائے گا؟" رچرڈ نے ان سب کے چہروں پر پھیلی پریشانی دیکھ کر سوال کیا۔

"یہاں کوئی ایسا کمرا ہے جہاں ہم رات گزار سکیں کیونکہ اب ہم صبح ہی سفر کریں گے۔ رات کے اس پہر میں چرچ کی انتظامیہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔" وہ رچرڈ کو جواب دیے بغیر ایوڈ سے مخاطب ہوئے۔

ان کی باتوں کی آواز سن کر رچرڈ کے گھر والے بھی اسی کمرے میں آگئے اور فادر تھامس ان کے سامنے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"جی فادر! کمرا ہے۔ آپ آئیں میرے ساتھ۔" ایوڈ نے رچرڈ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور فادر تھامس اور آرتھر کو لے کر اسی کمرے میں چلا آیا جہاں وہ خود ٹھہرا ہوا تھا۔

"دروازہ بند کردو۔" فادر تھامس نے اندر داخل ہوتے ہی ایوڈ کو کمرا بند کرنے کا اشارہ کیا۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"الیگزینڈر کی حرکات میری سمجھ سے باہر ہو گئی ہیں۔ وہ مشکوک سے مشکوک تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگر وہ واقعی یہاں چابی کی تلاش میں آیا تھا تو پھر یہاں سے واپس کیوں چلا گیا؟" فادر تھامس کے چہرے پر گہری پریشانی تھی۔

"فادر! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم صبح ہی اسکاٹ لینڈ کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور وہاں پہنچ کر الیگزینڈر سے پوچھ گچھ کریں گے۔" آرتھر نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

"کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ واپس اسکاٹ لینڈ ہی گیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے وہ یہیں کہیں چھپ کر بیٹھا ہو۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"اگر وہ یہیں کہیں چھپ کر بیٹھا ہے تو میں اسے صبح ہوتے ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔ یہ قصبہ اتنا بڑا نہیں ہے۔ وہ یہاں اتنی آسانی سے چھپ نہیں سکتا۔" ڈیوڈ بولا۔

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ تم جا کر رچرڈ کو تسلی دے آؤ۔ وہ ہمارے اچانک یہاں پہنچنے سے پریشان ہو گیا ہے۔" تھامس نے ڈیوڈ کو ہدایت کی اور وہ سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"آرتھر! تم آرام کرو۔" وہ آرتھر سے مخاطب ہوئے۔ آرتھر ایک طرف لگے بستر پر بیٹھ گیا۔

تھامس نے اپنے چمڑے کے بستے سے کچھ کاغذات نکالے اور کمرے میں رکھی کرسی پر بیٹھ کر ان کاغذات پر غور کرنے میں مصروف ہو گئے۔ الیگزینڈر کا پتا معلوم کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ وہ ان کاغذات کی مدد سے الیگزینڈر کی ان حرکات کے پیچھے چھپے مقاصد کو جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ وہی کاغذات تھے جو انہیں ارمان نے ان کی ذمے داریاں سونپتے ہوئے دیے تھے۔ انہیں پوری امید تھی کہ صبح ہونے تک وہ الیگزینڈر کا سراغ ضرور لگا لیں گے۔

☆☆☆

Year 1773

راج گڑھ۔ ہندوستان

اگلی صبح محل پر قیامت بن کر ٹوٹی تھی۔ امرتا کی لاش حوض میں تیرتی ہوئی ملی تھی۔ شکنتلا اس کی لاش کو دیکھتے ہی اپنے حواس کھو بیٹھیں۔ محل میں کہرام مچ گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ رات کے اس پہر وہ اکیلے باغ میں کیا کرنے گئی تھی اور اس حوض میں ڈوبی کیسے؟ جبکہ وہ حوض گہرا بھی نہیں تھا۔

چند پہرے داروں کے مطابق امرتا اور رتناوتی ایک ساتھ باغ میں ٹہلتے ہوئے دیکھے گئے تھے مگر کچھ دیر بعد رتناوتی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور اس کے بعد بھی امرتا کو باغ میں اکیلے ٹہلتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

اس کا مطلب تو یہی تھا کہ امرتا کی موت کے پیچھے رتناوتی کا ہاتھ نہیں تھا۔ راج پریوار کا غم کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ رتناوتی کا بھی غم سے برا حال تھا۔ امرتا جیسی بھی تھی، اس کی بہن تھی۔ وہ کبھی بھی اس کے لیے ایسی خواہش نہیں کر سکتی تھی۔

امرتا کی موت کی خبر آناً فاناً جنگل کی آگ کی طرح قلعے میں پھیل گئی۔ لوگوں میں خوف دوبارہ اس پھیل چکا تھا۔ لاش کی حالت دیکھ کر سب ہی خوفزدہ تھے۔ امرتا کی لاش پھول چکی تھی اور آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

مان سنگھ نے فوراً ہی اس کے اتم سنسکار کی تیاری کا حکم دیا تھا۔ اس معاملے میں دیر کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ شکنتلا کی حالت بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ان کی لاڈلی بیٹی آج چتا کی نذر ہو گئی تھی۔ وہ سب دکھی دل کے ساتھ امرتا کا اتم سنسکار کر کے لوٹے تو مان سنگھ نے ان سب کو دربار میں طلب کر لیا۔

یہ وقت ایسا تو نہیں تھا کہ راج دربار طلب کیا جاتا مگر مان سنگھ کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر کسی کو انکار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد راج پریوار اور ریاست کے تمام اہم لوگ دربار میں موجود تھے۔

مان سنگھ ہمت جمع کر کے اپنے کمرے سے باہر نکلے اور دربار کی طرف چل دیے۔ انہوں نے ایک اہم فیصلہ لیا تھا اور وہ ہر حالت میں اس پر عملدرآمد کروانا چاہتے تھے۔ وہ دربار میں داخل ہوئے تو سب ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ وہ خاموشی سے اپنے تخت پر جا بیٹھے۔ آدیش ادب سے ان کے دائیں طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے دربار پر نظریں دوڑائیں۔ شکنتلا کے علاوہ ان کے پریوار کے تمام لوگ وہاں میں موجود تھے۔ شکنتلا کو سکون کی دوا پلا دی گئی تھی اور وہ ان کی حالت سنبھلنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

"آج ہم یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ہمارے پرکھوں کی باتیں سچ تھی مگر ہمیں اس سچائی کو قبول کرنے کی بڑی بھاری قیمت چکانا پڑی اور ہماری سپوتری امرتا اس سچائی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔" وہ یہ کہہ کر چند لمحے کے لیے رکے اور دربار میں سسکیاں گونج گئیں۔ رتناوتی کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو چکے تھے۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ترنت اس قلعے کو خالی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

کررہے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری پرجا کو، راج پریوار کو یا ہمارے مشیروں کو کسی قسم کا کوئی نقصان اٹھانا پڑے۔ راج پریوار اور مشیر ہمارے آبائی محل میں منتقل ہو جائیں۔ قلعے کے رہائشیوں کو فی الحال خیمے لگا کر رہائش گاہ مہیا کی جائے گی مگر جلد ہی ان کی رہائش کا مناسب انتظام بھی کر دیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آدیش عام منادی کروا دے اور قلعے کو فوری طور پر خالی کرنے کا حکم دے۔ ہم سب آج شام سے پہلے ہی اس قلعے کو خالی کر کے یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے۔" وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دربار برخاست کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

دربار میں چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔

"پتا جی نے جو بھی فیصلہ لیا ہے، آپ سب کی بھلائی کے لیے لیا ہے۔ میں آشا کرتی ہوں کہ آپ ان کے ساتھ تعاون کریں گے۔ آپ سب کی جانوں سے زیادہ قیمتی ہمارے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس دکھ کے سمے میں ہم آپ سے یہی امید رکھتے ہیں کہ آپ سب مہاراجا کے حکم کا پالن کریں گے۔" رتنا دیوی یہ کہہ کر رانی کا ہاتھ تھامے وہاں سے چلی آئی۔

مہاراجا کا حکم تھا، ماننا ضروری تھا لہٰذا فوری طور پر ہی قلعے کو خالی کرنے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور وہ جو امرتا کا کریا کرم کرنے کے بعد اپنے خیمے میں واپس لوٹا تھا آدیش کی منادی سن کر تیزی سے اپنے خیمے سے باہر نکل آیا۔

اگر مان سنگھ قلعہ خالی کر دیتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب کیسے ہوتا؟

وہ تیزی سے محل کے اندر داخل ہوا۔

"ٹھہرو..... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ محل کے مرکزی صحن میں کھڑے ہو کر گرجدار آواز میں بولا۔

اس کی آواز سن کر سب ہی اپنے کمروں سے باہر نکل آئے۔ اگر سنگھیا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس گستاخی پر اسے سخت سزا سنائی جاتی مگر راج گرو کے سامنے وہ سب مجبور تھے۔

"حضور! مہاراجا کا حکم ہے کہ قلعے کو فوراً خالی کر دیا جائے۔ یہ جگہ شراپت ہے۔" آدیش ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"ابھی..... راج گرو کے ہوتے ہوئے تم لوگ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟ میرے یہاں رہتے کوئی شکتی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ امرتا کی موت ایک دُرگھٹنا ہے۔ کوئی بھی محل کو خالی نہیں کرے گا۔" وہ رعب دار آواز میں بولا۔

"گرو جی! شما کیجیے مگر ہم اب اس قلعے میں نہیں رہ سکتے۔ یہ شراپت ہے یا نہیں، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے۔ یہ محل ہماری سپوتری کو کھا گیا ہے۔ ہم اپنے پریوار اور پرجا کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔" مان سنگھ نے سنگھیا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"مان سنگھ! ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنا آدیش واپس لو۔" سنگھیا تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"پتا شری! اپنا حکم واپس نہیں لیں گے اور نہ ہی ہم اس محل میں رہیں گے۔ آپ یہاں رہ کر اسے شراپ سے اور بری شکتیوں سے مکت کرتے رہیں مگر ہم یہاں سے آج ہی روانہ ہوں گے۔" رتنا دیوی کو اس کے گستاخانہ لہجے پر شدید غصہ آیا تھا۔ وہ اس کی گزشتہ رات والی حرکت بھی نہیں بھولی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ امرتا کی موت کے پیچھے سنگھیا کا ہاتھ تھا اور اس وقت وہ جس لہجے میں اس کے باپ سے بات کر رہا تھا، وہ رتنا دیوی کا خون کھولا گیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑی۔

مان سنگھ نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ گرو جی کا اپمان کر بیٹھی تھی۔

"تو نادان ہے کنیا! اس لیے ہم نے تجھے معاف کیا۔ مان سنگھ تم اپنا حکم واپس لو۔" سنگھیا نے اس کی اس اشٹتا کو ان دیکھا کر کے مان سنگھ کو دوبارہ حکم دیا جو رتنا دیوی کی اس حرکت پر پریشان کھڑا تھا۔ ایک بیٹی کو تو وہ کھو چکا تھا دوسری کو نہیں کھونا چاہتا تھا۔

"بنا گرو اپنا یہ ڈھونگ۔ تو راج گرو نہیں ہو سکتا۔ تو ایک بہروپیا ہے، تو نے ہی امرتا کا خون کیا ہے۔ اگر تو راج گرو ہوتا تو اس قلعے میں کوئی درگھٹنا نہ ہوتی۔ تو ہوس کا مارا ایک بہروپیا ہے بس۔" رتنا دیوی اس کی بات سن کر غصے سے چلائی۔ اس کی برداشت جواب دے چکی تھی۔

محل کے صحن میں جمع راج پریوار، وزیر، مشیر اور تمام سیوک اس کی باتیں سن کر دل ہی دل میں سنگھیا کو گالی دیتے اس کے خون میں ابال اٹھنا شروع ہو گئے ہوں۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"گرو جی! شما کیجیے..... وہ نادان ہے..... اپنی بہن کی مرتیو کے غم کی وجہ سے دکھی ہے..... شما کیجیے گرو جی.....!" پاروتی کو فوراً ہی اس کی غلطی کا احساس ہوا اور وہ ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے سنگھیا کے چرنوں میں جا گریں۔

سنگھیا نے قہر برساتی نظروں سے رتنا دیوی کو گھورا جس کے چہرے پر شرمندگی کا شائبہ تک نہیں تھا اور دوسری طرف اس کی ماں سنگھیا کے چرنوں میں گری رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"ہٹ.....!" سنگھیا نے پاروتی کو پیر سے زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ لڑھکتی ہوئی چند قدم دور جا گریں۔

تمام لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔ رتناوتی نے ایک نظر اپنی سسکتی بلکتی ماں پر ڈالی اور دوسری اس غلاظت میں لپٹے انسان پر جو ابھی ابھی اس کی ماں کو ٹھوکر مار کر غرور سے سینہ چوڑا کیے اسے ہی گھور رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا، وہ چلاتی ہوئی سنگھیا کی طرف بڑھی اور ایک زناٹے دار تھپڑ سنگھیا کے گال پر اپنی چھاپ چھوڑ گیا۔

وقت رک گیا تھا۔

وہ شیطان کا سب سے بڑا پجاری تھا۔

کوئی اسے چھونے کی غلطی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ تمہارے میزان میں بھاری پڑے گی۔" اس کے کانوں میں یہ الفاظ گونجے۔

وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ اس کے قہقہے بلند ترین ہوتے چلے جا رہے تھے۔ سب ساکت کھڑے تھے۔ مان سنگھ سمیت راج پریوار کے تمام افراد کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔

راج گرو کا اپمان ہوا تھا۔ وہ بھی ان کی سپوتری کے ہاتھوں۔ کہاں وہ قلعے کے شراپ سے بچ کر بھاگ رہے تھے اور اب اگر راج گرو انہیں کوئی شراپ دے دیتے تو وہ کئی صدیوں تک ان کے پریوار کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ انہیں رتناوتی سے اس حرکت کی امید نہیں تھی۔

اچانک سنگھیا کے قہقہے رکے۔ اس نے اپنی بند آنکھیں کھول کر ان سب کو گھورا۔ وہ سب اس کی آنکھوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ ان آنکھوں میں موت رقص کر رہی تھی۔

"اب تم اس قلعے تو کیا، اس محل سے بھی باہر نہیں نکل سکو گے اور یہ کنیا.....! اسے میں نروستر کر کے تم سب کے سامنے اس کی بلی چڑھاؤں گا۔ راج پریوار کل کا سورج نہیں دیکھ پائے گا۔ خون برسے گا خون۔ تم جانتے نہیں ہو سنگھیا کو۔" وہ ہذیانی انداز میں قہقہے لگاتا ہوا محل سے باہر نکل گیا۔

مان سنگھ نے رتناوتی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ذرہ برابر بھی خوف نہیں تھا۔

"رتناوتی! یہ کیا انرتھ کر دیا تم نے؟" پاروتی رونے لگیں۔

"ماتا شری! آپ کو چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس بہروپیے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ کو اس کی دھمکیوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چلنے کی تیاری کیجیے۔" وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اچانک محل کے باہر شور اٹھنا شروع ہوا۔ وہ سب بھاگتے ہوئے باہر نکلے مگر اگلے ہی لمحے واپس اندر آنے پر مجبور ہو گئے۔ قلعے پر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ جو بھی ان پتھروں کی زد میں آ رہا تھا، بری طرح زخمی ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان ان پر پتھر برسا رہا ہو۔

"انرتھ ہو گیا۔ انرتھ ہو گیا۔" مان سنگھ زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔

سنگھیا کا شراپ شروع ہو چکا تھا۔ ان پتھروں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار کا طوفان امڈ چکا تھا۔

"حضور! اندر چلیں۔ حضور..... جلدی چلیں۔ سب اندر چلیں۔" آدیش نے چلا کر سب کو اندر چلنے کا کہا۔

کم از کم محل کے اندر وہ محفوظ تو رہتے۔ وہ سب اندر چلے آئے اور ایشور کو یاد کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد پتھروں کی برسات رک گئی۔ آدیش، سینکوں کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے باہر نکلا۔ پرجا کی بڑی تعداد ان پتھروں کی زد میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ جگہ جگہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ حالات دیکھ کر واپس محل کے اندر چلا آیا۔

"حضور! پتھروں کی برسات رک چکی ہے۔ ہمیں ترنت یہاں سے نکلنا ہوگا۔" وہ مان سنگھ سے بولا۔

مان سنگھ اس کے کہنے پر فوراً ہی محل سے باہر نکلے۔ شاہی بگھیاں تیار کھڑی تھیں۔ اس وقت راج پریوار کی حفاظت سب سے زیادہ ضروری تھی۔ ان سب کے بگھی میں سوار ہوتے ہی کوچوان نے گھوڑوں کو چابک مارا اور وہ تیز رفتاری سے قلعے کے مرکزی دروازے کی طرف دوڑنے لگے مگر دروازے کے قریب پہنچتے ہی گھوڑے بے قابو ہو گئے اور ہنہناتے ہوئے دو پیروں پر اچھلنے لگے۔

"کیا ہوا، رک کیوں گئے؟" مان سنگھ نے بگھی سے سر نکال کر آدیش کو مخاطب کیا۔

"حضور..... وہ....." آدیش نے قلعے کی مرکزی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

مان سنگھ نے دیکھا..... محل کے مرکزی دروازے پر دیو قامت اژدھوں کا پہرہ تھا۔ دروازے کے بیچوں بیچ سنگھیا کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔ وہ ان کا نشٹ کرنے آ پہنچا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

سونا، چاندی ہمیشہ سے ہی انسانوں کے لیے لالچ کا سبب بنے ہیں... خزانوں کی تلاش میں جانے کتنے لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے مگر اس سے کسی نے کوئی سبق حاصل نہ کیا... وہ بھی ایسی ہی ایک مہم پر روانہ ہوا تھا۔ اسے اپنی بیوی کی بیماری کے علاج کے لیے ایک خاص پتھر ڈھونڈنا تھا... سونے کے پہاڑ بھی اس کے تجسس کو ہوا دے رہے تھے... مگر صحیح معنوں میں اسے کس چیز کی تلاش تھی... اس کا دارومدار اس کی نیت پر تھا۔

جان جوکھوں میں ڈال کر ایک مہم پر جانے والے نوجوان کی ناکامی

سونے کا راستہ

ماہ وش طالب

یہ اس زمانے کی بات ہے جب برازیل کی سرزمین پر مختلف عقائد کو ماننے والے لوگ لاکھوں کی تعداد میں رہا کرتے تھے۔ عیسائی اور یہودی بھی..... چاند، ستاروں اور سورج کو پوجنے والے بھی..... دو اور تین خداؤں کو ماننے والے بھی۔ یہاں پر بہت سے افریقی غلام لائے جاتے اور انہیں محدود اجرت پر محنت مشقت پر مجبور کیا جاتا۔

اس دور میں پرتگالی سلطنت نے اپنے عروج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سونے اور معدنیات کی نئی اور خفیہ کانوں کی تلاش میں کئی مہمات روانہ کیں۔

وہ بھی اسی میں سے ایک کی تلاش میں نکلا تھا..... مگر

https://www.urdutubes.com/
digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

کسی شاہ کی مہم کا حصہ بن کر نہیں بلکہ انفرادی طور پر۔

یہاں ستاروں بھرے کھلے آسمان کے نیچے میلوں تک پھیلا طویل اور گہرے دریا کا پانی اکثر اجنبیوں کو بھٹکا دیتا تھا مگر یہاں کے باسی رات کے اندھیروں میں ستاروں اور مہم جو کمپاس کی سوئیوں کی مدد سے منزل تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ بھی یہاں آ کر بھٹک گیا تھا ایسا کہ پھر خود کو بھی ڈھونڈ نہیں پایا۔ وہ اجنبی جو تھا۔ ڈوم میگوئل آلفونسو ..... ایک پرتگالی سیاح، ماہر نقشہ نویس اور مہم جو تھا۔ اسے "ریو دا ڈوویڈا" دریائے شک کے راستے کی تلاش تھی۔ ایک ایسا دریا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ جہاں ختم ہوتا ہے، وہاں دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ اس دریا کے بارے میں اور بھی بہت کچھ خاص تھا جو عام لوگوں کو نہیں معلوم تھا۔ وہ خاص تھا، اس لیے خفیہ طور پر اس دریا کی تلاش میں نکل پڑا۔

وہ فطرتاً سر پھرا تھا اور اس کی آنکھوں میں حکم عدولی کی جھلک نظر آتی تھی مگر فی الحال تو لکڑی کی کشتی پر سوار برازیل کے علاقے ماناؤس (Manaus) سے ہوتا ہوا وہ ان مشہور جنگلات کی طرف نکلا تھا۔ وہ پرتگالی سیاح اس عزم کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن تھا کہ اسے اپنی ہر الجھن، ہر پریشانی کا علاج وہیں سے ملے گا۔ وہ تیس پینتیس برس کا مضبوط ڈیل ڈول والا ایک جوان آدمی تھا۔ گندمی رنگت، نیلی آنکھیں اور بھورے بال۔ اس نے خاکی رنگ کی پتلون اور پورے بازوؤں والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر مضبوط ہیٹ اور بہترین قسم کے بوٹس پہنے وہ کشتی پر بیٹھا اپنی کمپاس کو دیکھ رہا تھا۔ کمپاس کا دھیان رکھنا بہت ضروری تھا کہ ایک مقامی لڑکے نے اسے بڑی واضح تنبیہ کی تھی۔ اکارا کا تعلق تپی قبیلے سے تھا۔ اس کا قد لمبا اور رنگت سیاہ تھی۔ افریقی لوگوں کے برعکس اس کے نقوش تیکھے تھے۔ ایک شام جزیرے پر کچھ دیر آرام کی غرض سے ڈوم نے جب کشتی کنارے پر لگائی تب اکارا گھنے جنگلات میں سے اچانک نمودار ہوا تھا۔ اس نے ڈوم سے اس کے سفر کا مقصد دریافت نہ کیا، بس اتنا کہا تھا کہ اگر تمہاری لگن سچی ہوئی تو تم وہ پالو گے جس کی خاطر میلوں کا سفر طے کر کے یہاں تک آئے ہو، ورنہ وہ دریا تمہیں نگل لے گا۔ جواباً وہ خوشگوار حیرت سے مسکرا دیا۔

یہ اوائل اکتوبر کے دن تھے۔ دریا کے اوپر ہلکی دھند تیر رہی تھی۔ دھند کے پردوں کے پیچھے ستاروں اور چاند کی ہلکی سی روشنی بھی چھپ کر رہ گئی تھی۔ ڈوم میگوئل کی کشتی آہستہ آہستہ بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔

دور کہیں کبھی طوطوں کی آوازیں، کبھی شیر کی چنگھاڑ اور کبھی خطرناک ترین سانپوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دیتی تھیں۔ ان جنگلوں میں پرندے گنگناتے نہ تھے بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مسافروں کو آنے والے خطرات سے خبردار کرتے ہوں۔

ڈوم میگوئل نے اپنا سنہری کمپاس ایک بار پھر دیکھا۔ سوئی ایک لمحے کو رک گئی اور پھر الٹی سمت گھوم گئی۔

"شاید میں خدائی دریا کے علاقے میں داخل ہو چکا ہوں۔" اس نے خود سے کہا۔ قریب ہی ایک اور چھوٹا سا جزیرہ تھا۔

وہ اب رکے بغیر جلد از جلد دریا تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ دریائے شک میں چھپے ان ٹیڑھے میڑھے راستوں کا پتا لگانا چاہتا تھا جن کی حد وہ خفیہ اور قیمتی دھات کے پہاڑ تھے جہاں پر آج تک کسی کی رسائی نہ ہو سکی تھی۔ اس کی وجہ صرف ایمازون کے خطرناک جنگلات نہ تھے بلکہ سیاحوں اور مہم جوؤں کی کمزور قوت ارادی تھی جو منزل کے بارے میں خوفناک کہانیاں سن کر راستے سے ہی واپس مڑ جاتے تھے۔ جن میں ہمت ہوتی، وہ خوراک کی قلت کا شکار ہو جاتے۔

ڈوم نے عازم سفر ہونے سے پہلے جنگلات اور دریا کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کی تھی اس لیے بارش کی وجہ سے جب کچھ گھنٹوں کا سفر دو دنوں پر چلا جاتا تو بھی وہ ہمت نہ ہارتا۔ اس نے اپنے لیے خشک خوراک کا بہت سا ذخیرہ جمع کیا ہوا تھا۔ مکئی، نمکین گوشت، کوکو بینز اور بہت سارے خشک پھل۔ اچھا اتفاق یہ تھا کہ تھوڑے سے سفر کے بعد ہی اسے اکارا نامی نوجوان لڑکا مل گیا تھا جس نے اسے حیرت انگیز طور پر کھانے پینے کی کچھ اشیا فراہم کی تھیں اور آنے والے یقینی خطرات کے بارے میں بھی آگاہ کیا تھا۔ ورنہ تو ان جنگلات کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ یہاں کے باسی سنگدل اور حیوانات آدم خور ہوتے ہیں، مگر وہ کم ہمت اور بزدل ہرگز نہ تھا۔ اس نے صرف اپنی خاطر ہی نہیں بلکہ اپنی بیوی کی صحت کی خاطر اپنی جان کو خطروں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی بیوی الزبتھ گزشتہ چھ ماہ سے ایک نامعلوم مگر سنگین بیماری میں مبتلا تھی۔ وہ سارا دن نقاہت کے باعث بستر پر لیٹی رہتی، ہر وقت تاپ چڑھا رہتا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک جاگ بھی نہ سکتی تھی۔ اس کی رنگت پیلی ہو چکی تھی۔ بظاہر وہ یرقان کا شکار لگتی تھی مگر اس کا علاج لسبن کے علاوہ بھی پرتگال کے کسی حکیم، کسی کیمیا دان کے پاس نہ تھا۔ وہ بیماری گھٹتی تھی، نہ بڑھتی تھی۔ بالآخر ہرموسز نے اسے ایک جگہ کا بتایا تھا جہاں سے اس کی بیوی کا علاج ممکن تھا۔ وہ ایک زیرک اور دور اندیش کیمیا دان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے والد کا دیرینہ دوست بھی تھا۔ پچاس

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

کے پیٹے میں داخل ہوتا ہرموسز ایک باوقار اور پراسرار شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کم بولتا اور زیادہ سوچتا تھا۔

"دیکھو، اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچنا، پھر تم جلد ہی قیمتی دھات کے ساتھ ساتھ اس نایاب پارس پتھر کو بھی پالو گے جس میں ہر بیماری سے ہمیشہ کے لیے نجات ہے۔۔۔ اور جو زندگی کو بڑھا دیتا ہے۔" ہرموسز نے جاتے سے ڈوم کو بس اتنا ہی کہا۔ اس کی باتیں سن کر اس کی آنکھوں میں امید کے بہت سے چراغ روشن ہو گئے۔

وہ اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتا تھا اور ہر قیمت پر وہ خاص دھات حاصل کرنا چاہتا تھا جو اسی دریائے شک کے کنارے سے نکلتی تھی، جہاں سونے جیسی دھات کے خزانے کے منہ کھلتے تھے، مگر اسے وہاں سونے کی موجودگی کا علم تھا، نہ اس سے کوئی سروکار۔

سفر پر نکلنے سے پہلے اسے کئی حکیم اور بزرگ بھی ملے تھے جو اسے اس عجیب و غریب مرض سے نجات کے طریقے بتاتے رہے۔ کسی نے کہا کہ کلونجی اور دارچینی کا سفوف صبح نہار منہ پیا جائے تو چوتھے دن مکمل چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔ کوئی کہتا کہ لیمو اور شہد کا محلول بنا کر صرف ایک دن پینے سے کسی قسم کا بخار پاس نہیں پھٹکے گا۔ ایک طبیب جو حجاز کا رہنے والا تھا، اس نے مشورہ دیا کہ بحیرۂ روم کے ساحل پر اگنے والی جڑی بوٹیوں کو لیمو کے ساتھ پکا کر صرف ایک بار پینے سے مریض بھلا چنگا ہو جائے گا۔ اگر صبح کو پیے گا تو شام تک ایسا لگے گا جیسے کبھی کوئی مرض تھا ہی نہیں اور اگر شام کو پیے گا تو صبح صادق تک اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگا۔

غرض یہ کہ جس کسی سے بھی اس نے اپنی بیوی کی بیماری کا ذکر کیا، سب نے اسے یرقان سمجھ کر اپنے اپنے تجربے اور مشاہدے کے مطابق نسخے اور علاج بتائے، مگر اسے ان میں سے کسی میں بھی دلچسپی نہ تھی۔ سو، تنگ آ کر اس نے کسی کو بھی اپنے ایمازون کی جانب سفر کی اصل وجہ بتانا ہی چھوڑ دی۔

اگر اس نے اسی قسم کا علاج کرنا ہوتا تو وہ اپنے گھر، اپنے وطن سے نکلتا ہی کیوں؟

وہ پچھلے چالیس دنوں سے سفر پر تھا۔ کبھی دریا سیدھا بہتا، کبھی ایسے مڑتا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اس کی سمت بدل دی ہو۔

ہر موڑ پر درخت گھنے ہوتے جا رہے تھے، جیسے جنگل اسے روکنے پر تلا ہو۔

ایک صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کی کشتی ایک کنارے پر رکی ہوئی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور حیران و پریشان ہوا کہ اکارا اب کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس کشتی کے دوسرے سرے پر چمڑے کے ٹکڑے کے اوپر ایک پتا درج تھا۔ وہ مزید سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے اس قدیم اور پراسرار جزیرے پر پہنچا تھا۔ یہ اس کی منزل تو نہیں تھی مگر پھر بھی اس کا رواں رواں یہی دعا کر رہا تھا کہ جس مقصد سے آیا ہے، وہ یہیں سے پورا ہو جائے۔ اس نے کشتی روک لی اور انہی جنگلات کے اندر اس کی تلاش میں نکل پڑا۔

☆☆☆

لکڑی کا دروازہ دھیرے سے کھلا۔ جوزف درمیانی عمر کا ایک میانہ جثے والا بلند قامت آدمی تھا۔ اس کی ڈاڑھی گھنی اور بڑھی ہوئی تھی۔ لمبے سیاہ بال جسے ایک جوڑے کی شکل میں سمیٹ رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت اور چالاکی ایک ساتھ جھلکتی تھی۔ ایسے جیسے بہت سے سوالوں کے جواب پہلے سے جانتا ہو، ایسے جیسے کسی خزانے کی چابی کا راز معلوم ہو۔

ڈوم اسے چند لمحے دیکھتا ہی رہا پھر اس نے اپنا تعارف کروانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ بلند کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، جیسے وہ پہلے ہی اس کی آمد کا منتظر ہو۔ پھر اس کے کہنے پر ڈوم اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ شاید لائبریری نما جگہ تھی۔ ہر طرف کتابیں، نیلم کے قلم اور سیاہی۔۔۔ مگر کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک تجربہ گاہ بھی ہے۔ وہاں لکڑی کی میزوں پر بہت سی شیشے کی چھوٹی چھوٹی بوتلیں تھیں جن میں مختلف رنگوں کے محلول تھے۔ داہنی طرف لوہے کے اسٹینڈ کے نیچے آگ جل رہی تھی جہاں سرخی مائل رنگ کی دھات پگھل رہی تھی اور قالین پر بے شمار چمڑے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ڈوم میگوئل آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

جوزف ایک صندوق کی طرف بڑھا اور وہاں سے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ واپس مڑا تو اس کے ہاتھ میں ایک کتاب نما جرنل تھا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ اس میں کیا ہے؟" جواباً ڈوم نے کندھے اُچکائے۔

"اس جرنل میں ہر طرح کی بیماری سے شفا حاصل کرنے کا راز ہے۔۔۔ مگر اس کے لیے جو اسے کھولنے میں جلدی نہ کرے۔" جوزف نے توقف کے بعد اپنا سبز چغہ ٹخنوں سے تھوڑا سا اوپر کیا اور نیلے قالین پر بیٹھ گیا۔

ڈوم کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

"جانتے ہو، مجھے کبھی کبھی انسان اس دھات کی طرح لگتے ہیں جو کسی بھی حال میں زیادہ دیر خوش نہیں رہتی۔۔۔ نہ مائع، نہ مرکب۔۔۔ زیادہ مل جائے تو اور کی چاہ اور اگر کم پڑ جائے تو بھی بے صبرا اور ناشکرا۔ اسی لیے انسان کو بھی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

احتیاط کرنی چاہیے اور اس دھات کو بھی حفاظت سے رکھنا چاہیے ورنہ ان دونوں کے ملنے سے بہت نقصان ہوسکتا ہے۔" جوزف کی نگاہیں بدستور مرکری (دھات) کی طرف تھیں جو دائیں جانب دیوار پر بنے روشن دان سے چھن کر آنے والی سورج کی شعاعوں سے چاندی ایسا چمک رہا تھا۔

"انسان ساری عمر دور سے چمکنے والی چیزوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک دن اسے مٹی ہوجانا ہے۔ اگر ایک عام شخص کو یہ معلوم ہوجائے کہ آپ....." جوزف نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے کتاب تھمائی۔ آدم اس کی باتوں کو سمجھ نہ سکا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا تھا۔

پھر اس نے آگے کے سفر کی تیاری شروع کردی۔ اس نے کتاب کو یوں سنبھال رکھا تھا جیسے بہت قیمتی متاع ہو۔

اگلی رات دریا کے پانی سے ایک مدھم سی نیلی روشنی ابھرنے لگی۔ آدم میگوئل نے کشتی روک دی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے پانی کے نیچے کوئی سانس لے رہا ہو۔

اس نے چراغ جلایا مگر روشنی میں کچھ دکھائی نہ دیا، سوائے ان تیز لہروں کے جو چاند کی روشنی میں جوش مارتی اسے گھور رہی تھیں۔

"یہ محض وہم ہے۔" اس نے خود کو تسلی دلائی مگر دریا کی سطح پر لہریں اب دائرے میں ناچ رہی تھیں، جیسے کوئی زندہ چیز اس کے نیچے حرکت کر رہی ہو۔

وہ بہت تھک چکا تھا اور آرام کرنا چاہتا تھا۔ سو درختوں کے اندر کیمپ لگا کر سو گیا۔

وہ کتاب کو کھول کر دیکھنا چاہتا تھا کہ نہ جانے کون کون سے راز اس کتاب میں رقم ہیں۔

"ایسا کیا ہوسکتا ہے اس کتاب میں؟ ابھی تو آگے بھی بہت سفر پڑا ہے، اس طرح تو بہت زیادہ وقت ضائع ہوجائے گا جبکہ مجھے تو بس اب جلد از جلد الزبتھ کی بیماری کا علاج شروع کرنا ہے ورنہ تو مجھے یہ کتاب کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ دن بھر اس عزم پر قائم رہتا کہ منزل کے قریب پہنچنے سے پہلے کتاب کو نہیں کھولے گا مگر رات ہوتے ہی اسے تجسس ہونے لگتا جو کبھی کبھی بیزاری میں بدل جاتا۔

نتیجتاً پوری کوشش کے باوجود اس نے کتاب کھولنے کا تہیہ کرلیا۔

دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے اس نے کتاب کے اوپر سے کپڑا ہٹایا۔ A voz das Aguas "پانیوں کی آواز" اس نے سنہری حروف میں لکھے عنوان کو غور سے دیکھتے ہوئے کتاب کے سرورق پر ہاتھ پھیرا..... اور پھر اگلے ہی لمحے کتاب کھول لی۔

پہلے چند صفحات میں اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ وہ کتاب بند کرنے ہی والا تھا جب اس کی نظر لفظ "سونے کے راستے" پر پڑی۔ اس نے مزید صفحات کھنگالے تو نہ صرف چند خفیہ راستوں کے بارے میں تفصیلات درج تھیں بلکہ نقشے کے ذریعے ان راستوں کی مکمل راہنمائی بھی موجود تھی۔ وہ حیران رہ گیا، پھر یہ حیرت خوشی میں بدل گئی اور اس کی گہری سبز آنکھوں کی چمک پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہوگئی۔ اس نقشے کو دیکھتے ہوئے چند دن بعد وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں دریا دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔

ایک راستے پر سیاہ پانی بہہ رہا تھا، دوسرے پر چمکیلا سبز۔

کمپاس کی سوئی پھر سے مسلسل گھوم رہی تھی مگر سمتیں غائب تھیں۔ اس نے جرنل میں دیے گئے نقشے کی مدد سے سیاہ دریا کا راستہ چنا۔

کشتی آگے بڑھتی جارہی تھی مگر فضا میں عجیب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی بھی پرندے کی کوک سنائی دیتی نہ ہوا کی سرسراہٹ۔ تب ہی اچانک آدم میگوئل نے دیکھا کہ دریا کے کنارے پر ایک پتھریلا صلیب کھڑا ہے، آدھا ڈوبا ہوا، جس پر کسی نے پرتگالی میں لکھا تھا۔

"جو یہاں تک پہنچتا ہے، وہ خود اپنا راستہ نہیں چنتا۔ دریا فیصلہ کرتا ہے۔" قبل اس کے کہ وہ اس بات کی گہرائی پر غور کرتا، اسے تھوڑے پرے دوسرے کنارے پر ایک قبائلی عورت پانی بھرتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اسے نظر انداز کرنا چاہتا تھا مگر کنارے پر بیٹھی خاتون کو وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا چہرہ لال رنگ کے کپڑے سے ڈھکا تھا۔ سوائے کالی بڑی بڑی آنکھوں کے وہ کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

'یہ آنکھیں کسی سے ملتی ہیں؟' اس نے سوچا۔

'یہ پہلے کہیں دیکھ رکھی ہیں؟' اسے بے چینی ہونے لگی۔ وہ آگے جاچکی تھی۔

وہ چونکا۔ اس کی آنکھیں بالکل الزبتھ جیسی تھیں۔ الزبتھ..... اس کی بیوی..... وہ کیسے بھول سکتا تھا ان آنکھوں کو۔ وہ بھی تو اتنی ہی حسین تھیں۔ جب تک اس نے دوبارہ مڑ کر دیکھا، بہت سی دھول اڑ چکی تھی۔ وہ اس قبیلے کی آخری عورت تھی جو پانی بھر رہی تھی مگر اب تاحدِ نگاہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنی کشتی سے اتر کر اس طرف بھاگا..... گرتا پڑتا، بہت دور تک۔ اس کی خاکی پتلون گھس چکی تھی مگر

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

اسے پروا نہیں تھی۔ وہ جتنی دور تک بھاگ سکتا تھا، بھاگا۔ مگر جب کوئی نشان نہ ملا تو مایوس ہوتے ہوئے جھک کر ہاتھ گھٹنوں پر رکھ دیے۔ اسے یکدم اس جزیرے اور اپنی کشتی کا خیال آیا۔ وہ اسی طاقت سے واپس بھاگا۔ کشتی کو اپنی جگہ پاکر اسے تسلی ہوئی۔

مگر وہ اس کی بیوی کیسے ہوسکتی تھی؟ وہ تو بستر مرگ پر لیٹی تھی۔ کتاب کھول کر دیکھنے کا خیال فی الحال اس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔

اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ واپس جانا چاہتا تھا، اسے ڈھونڈنے، اسے پانے ـــ حالانکہ اس کا دل بار بار یہ سرگوشی کررہا تھا کہ یہ الزبتھ نہیں ہوسکتی ـــ مگر پھر بھی ـــ!

اور جب وہ چار ماہ تک اس دلفریب آنکھوں والی دوشیزہ کی تلاش میں جنگلوں میں بھٹکتے رہنے کے بعد لوٹا تو کتاب کے راز جاننے کا اشتیاق اسے پھر سے ستانے لگا۔

اندر کہیں اسے محسوس ہوا تھا کہ اس میں وہ راز ہیں جس کے پیچھے اسپین، فرانس، برطانیہ اور جرمنی کے بہت سے ماہر حیاتیات، پادری، کیمیادان اور جوہری پڑے ہیں۔ اس کے اندر وہ خزانہ ہے جس کے پیچھے اپنی بیوی کی وجہ سے وہ اتنا طویل سفر طے کرکے آیا ہے۔ اگر اب اس نے یہ کتاب پڑھ کر نہ دیکھی تو وہ اپنی بیوی سے کیسے آنکھ اسے کیونکر دوبارہ تندرست حالت میں دیکھ سکے گا؟ اگر اس کتاب کی مدد سے ہر مراد کی تکمیل ہوسکتی ہے تو پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے بیک وقت وہ انجان عورت بھی مل جائے اور اپنی بیوی کی بیماری دور کرنے کا علاج بھی۔ یہ سوچتے ہی وہ لپکتے لپکتے سے اٹھ بیٹھا۔

اور جب اس نے اپنے سامان اور کشتی میں کتاب تلاش کی تو وہ اسے کہیں نہ ملی۔ اس کی بے چینی حد سے سوا تھی۔ پورے چھ ماہ ہوچکے تھے مگر اسے اپنی منزل کے نشان نظر نہیں آرہے تھے بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ہدف کے قریب پہنچنے کے بجائے مزید دور ہوگیا ہے۔ وہ سارا دن اس نے بھوکے رہ کر شدید مایوسی میں گزارا۔ رات بھی بغیر آرام کیے وہ چپو چلاتا رہا، جب اچانک اس کی نظر دریا کے کنارے ایک اور پتھریلے صلیب پر پڑی۔ پہلے والے کی طرح یہ بھی آدھا ڈوبا ہوا تھا۔ اس پر کچھ درج تو نہ تھا مگر اس کے قریب چمکتی شے نے ڈوم کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔ وہ جلدی سے اس کے قریب پہنچا اور اس کی خوشی و حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اسی کتاب کو دیکھ کر جسے کھو دینے کے ڈر سے وہ بے تاب ہوگیا تھا، وہ کتاب کنارے پر پانی کی سطح پر تیر رہی تھی۔ اس نے کشتی کنارے پر لگائی اور ہاتھ بڑھا کر گیلی ہوچکی کتاب کو اٹھالیا۔ حقیقتاً اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

☆☆☆

مگر اب "پانیوں کی آواز" نامی اس کتاب کو کھولنے کے بعد اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

یہ سب اس کی سوچوں کے برعکس تھا۔ اب جزیرے میں ایسا کچھ بھی لکھا نظر نہیں آرہا تھا جیسا پہلے وہ پڑھ اور دیکھ چکا تھا۔ اس کتاب میں بے حد عجیب الخلقت تصاویر بنی تھیں اور جو کچھ بھی لکھا تھا، وہ انتہائی غیر فہم زبان میں تھا۔ مایوسی، غصے اور طیش کی ملی جلی کیفیت لیے اس نے بیڑوں میں آئے چھوٹے سے کنکر کو پوری قوت سے اچھالا اور دوبارہ کشتی پر سوار ہوگیا۔

☆☆☆

اس نقشے میں بتائے جانے والے راز جاننے کے لیے بس دل کا صاف ہونا ضروری ہے۔

"قافلے میں اگر کوئی خاتون نظر آئے تو بھی تم راستے سے نہ ہٹنا۔" اسے ایک ایک کرکے اکارا کی نصیحت اور الفاظ یاد آرہے تھے۔ اکارا نے اس نقشے کا ذکر بھی کیا تھا جو اس سے ملاقات کے تقریباً ایک ماہ بعد جوزف نے اسے دیا تھا۔

"اس سے نہ صرف تمہاری بیوی شفایاب ہوگی بلکہ اس کتاب میں ایک ایسا نقشہ درج ہے جو تمہیں سونے کے پہاڑوں کا پتا دے گا۔" سفر کے دوران ملنے والے اس کیمیائی مسیحائی پادری نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کے بتانے پر ڈوم کی آنکھیں چمک سی گئی تھیں اور منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔

اور وہ خود بھی جانتا تھا کہ سیکڑوں میل کا سفر اس نے صرف اپنی بیوی کے لیے جڑی بوٹی کھانا تھا یا سونے کی چھپی ہوئی کانوں کا سراغ لگانے کے لیے؟

☆☆☆

اور پھر اس سے اگلی صبح دریائے ٹنک کے قریب کشتی خالی ملی تھی۔ دریا ہمیشہ کی طرح یوں خاموش تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ایمازون اور ٹنک کا دریا اب بھی بہتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کبھی کبھی چاندنی رات میں پانی کے اوپر ایک پرانی پرتگالی کشتی کا سایہ دکھائی دیتا ہے جو اپنے ملاح کے بغیر بھی چلتی رہتی ہے۔

✖✖✖

https://www.UrduNovels.com/

Scanned with CamScanner

پیش کار

مرزا امجد بیگ

خطا کسی کی ہو... سزا کسی اور کو ملے، یہ بہت ناانصافی ہے... اور اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ مجرم چالاکی و مکاری سے اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپنے میں کامیاب ہو جاتا ہے... لیکن اس کی وقتی کامیابی، ناکامی میں تب بدلتی ہے جب مرزا امجد بیگ جیسے قابل وکیل میدان میں اترتے ہیں۔

قتل کر کے اپنا جرم دوسرے کے سر ڈالنے والے مجرم کا قصہ

یہ بیسویں صدی عیسوی کے اواخر کا واقعہ ہے۔ سال انیس سو اٹھانوے اور مہینا دسمبر کا تھا۔ میں حسب معمول اپنے آفس میں بیٹھا قانونی ضرورت مندوں کے مسائل سن رہا تھا کہ میری سیکریٹری صبا نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی۔

"سر! ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں مگر انہوں نے پہلے سے آپ کا اپائنٹمنٹ نہیں لے رکھا۔"

"تو ان سے انتظار کرنے کو کہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر وقت سے پہلے ریگولر اپائنٹمنٹ والے کلائنٹس نمٹ گئے تو میں ان سے ملاقات کر لوں گا یا پھر وہ کل کا اپائنٹمنٹ لے لیں۔"

"میں نے یہ سب انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے سر، لیکن وہ آج ہی آپ سے ملنے پر مصر ہیں۔" سیکریٹری نے بتایا۔ "ان کا دعویٰ ہے کہ انہیں وہ آپ کے استاد رہے ہیں۔"

میری سیکریٹری صبا مجید کے آخری جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ "انہوں نے اپنا نام کیا بتایا ہے؟"

"پروفیسر مصدق حسین!" سیکریٹری نے جواب دیا۔ "وہ ایک مقامی کالج میں ہسٹری پڑھایا کرتے تھے مگر اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔"

پروفیسر مصدق حسین کا نام سن کر ماضی قریب میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ لمحے بھر میں، میں نے ان مشفق و دریا دل و درویش صفت معلم کو پہچان لیا جنہیں اپنی سیکریٹری سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔"

پروفیسر مصدق حسین کے لیے میرے دل میں موجود احترام اور عقیدت اس بات کے متقاضی تھے کہ میں باہر جا کر ان کا استقبال کروں۔ سو، میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور چیمبر سے نکل کر ویٹنگ روم میں آ گیا۔ اس وقت ویٹنگ روم میں صرف تین افراد کلائنٹ کی حیثیت سے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے جن میں ایک پروفیسر موصوف بھی تھے۔

https://www.urdutubes.com/
digest library
Scanned with CamScanner

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے بڑے ادب اور محبت سے پہلے ان سے معانقہ اور پھر پُرجوش مصافحہ کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"سر! آپ تشریف رکھیں۔ میں تھوڑی دیر میں آپ کو اندر بلاتا ہوں، پھر تفصیلی بات ہوگی۔"

میں اگر چاہتا تو پروفیسر صاحب کو دیگر دو کلائنٹس سے پہلے بھی اٹینڈ کر سکتا تھا لیکن یہ اخلاقیات کے منافی ہوتا۔ علاوہ ازیں میں مصدق صاحب کی فطرت اور عادت سے بھی بخوبی واقف تھا۔ وہ انتہائی ایماندار اور اصول پرست انسان تھے۔ میری یہ "حرکت" یقیناً انہیں پسند نہ آتی۔ سو، میں نے وہی کیا جو میرے پیشے کا تقاضا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! میں انتظار کرلوں گا۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔" انہوں نے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر مجھے جو عزت دی ہے، اس نے مجھے خوش کر دیا ہے اور اس بات کی تسلی بھی ہو گئی ہے کہ میں جس مقصد سے یہاں آیا ہوں، وہ بھی پورا ہو جائے گا۔ مجھے اپنے اسٹوڈنٹ پر ناز ہے۔"

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی تھی اور انہوں نے اپنی انگلی سے میری جانب اشارہ بھی کیا تھا۔ میں نے مصدق حسین کی آنکھوں میں بیچارگی اور بے بسی کا سمندر موجزن دیکھا۔ وہ کسی بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہونے کے بعد میرے پاس آئے تھے۔

"سر! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو یہاں سے مایوس نہیں لوٹاؤں گا۔ آپ تشریف رکھیں۔"

پروفیسر مصدق حسین نے سر کو اثباتی جنبش دی اور کرسی پر براجمان ہو گئے۔ میں اپنے چیمبر کی جانب مڑا تو ایک کلائنٹ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"بیگ صاحب! مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو میری جگہ اپنے سر کو اندر بلا سکتے ہیں۔ اگلا نمبر میرا ہی ہے۔"

اس کی دیکھا دیکھی دوسرا کلائنٹ بھی بول اٹھا۔ "اس تبدیلی پر مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں وکیل صاحب! میں بھی تھوڑا انتظار کرلوں گا۔"

اچھے اور برے عمل میں یہی بنیادی فرق ہے کہ جب آپ کوئی مثبت قدم اٹھانے جا رہے ہوتے ہیں تو دوسرے نہ صرف آپ کی ستائش کرتے ہیں بلکہ سبھی کا تعاون بھی آپ کو حاصل ہو جاتا ہے جبکہ برے عمل کے وقت شاید ہی کوئی آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہو، البتہ مذمت کرنے والوں کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ اگر اس موقع پر میں دیگر دو کلائنٹس کے جذبات اور حقوق کو نظر انداز کرتے ہوئے مصدق حسین کو ان سے پہلے اپنے چیمبر میں بلا لیتا تو میرے اس غیر اخلاقی بلکہ مبنی بر ناانصافی طرزِ عمل کو نہ صرف ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھا جاتا بلکہ اس پر کڑی تنقید بھی دیکھنے اور سننے کو ملتی یا کم از کم وہ دونوں کلائنٹس اپنے دل میں ضرور مجھے برا بھلا کہتے۔ بہرکیف، اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں۔

میں نے پروفیسر مصدق حسین کی توانضع کے لیے کافی اور بسکٹس وغیرہ منگوا لیے تھے۔ وہ بیک کافی شوق سے پیتے تھے لہٰذا اس معاملے میں، میں نے ان کی پسند کا دھیان رکھا تھا۔ اس دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ہمارے زمانے میں گریجویشن دو سال کا ہوا کرتا تھا جو بی اے، بی ایس سی، بی کام یا بی ایڈ وغیرہ کہلاتا تھا۔ میں نے وکالت کی پڑھائی یعنی ایل ایل بی کرنے سے پہلے بی اے کیا تھا اور میرے مضامین میں "ہسٹری" بھی شامل تھا۔ اس طرح مجھے مصدق صاحب کے علم اور تجربے سے استفادہ کرنے کا کماحقہ موقع ملا تھا۔

چند منٹ تک ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے کے بعد پروفیسر صاحب اپنے حالیہ مدعے پر آ گئے۔ "امجد بیٹا!" انہوں نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے انتہائی شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "ایک قانونی معاملہ مجھے آپ کے پاس لے آیا ہے۔ میں اس وقت ایک مصیبت میں گھرا ہوا ہوں۔"

"سر! آپ نے مجھے بیٹا کہا ہے تو ایک بیٹا سمجھ کر ہی اپنے دل کا احوال سنا دیں۔" میں نے رف پیڈ اور پین سنبھالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میرے بس میں جو بھی ہوگا، وہ میں آپ کے لیے ضرور کروں گا۔ آپ کی دی ہوئی تعلیم اور تربیت نے میری زندگی میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ کے کام آ کر مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ کہیں کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔" وہ دعائیہ انداز میں بولے۔ "پانچ سال پہلے میری شریکِ حیات کا انتقال ہو گیا تھا۔ ریحانہ کی ابدی جدائی نے مجھے بری طرح توڑ ڈالا تھا۔ بہرحال، وقت گزرنے کے ساتھ میں نے کوشش کر کے خود کو سنبھال لیا تھا مگر اب تصدق کا مسئلہ منہ کھڑا ہوا ہے۔"

میری معلومات کے مطابق پروفیسر صاحب کی تین

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

اولادیں تھیں۔ دو بیٹیاں رخسانہ و فرزانہ اور ایک بیٹا تصدق حسین۔ تصدق اپنی بہنوں سے چھوٹا تھا۔ رخسانہ اور فرزانہ کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ جب تک میں مصدق صاحب کے رابطے میں تھا، ان دنوں تصدق انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزر گئے اور میں نے پروفیسر صاحب کے خاموش ہونے پر تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''تصدق کو کیا ہوا ہے سر؟''

''پولیس نے میرے بیٹے کو گرفتار کر لیا ہے۔'' انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔

''کب کی بات ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''پرسوں یعنی دس دسمبر کو۔''

آج دسمبر کی بارہ تاریخ اور دن ہفتے کا تھا۔ اس حساب سے تصدق کی گرفتاری جمعرات کو عمل میں آئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''پولیس نے تصدق کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

''تصدق پر قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔'' پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔ ''گزشتہ روز پولیس نے اسے عدالت میں پیش کر کے ایک ہفتے کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہے۔ اس وقت وہ ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔''

''اوہ.....!'' میں نے متاسفانہ انداز میں ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''تصدق کس پولیس اسٹیشن میں بند ہے؟''

انہوں نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

''سر! اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ تصدق نے کسی انسان کی جان نہیں لی ہوگی۔'' میں نے پُروثوق ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کا صاحبزادہ واقعتاً کسی بھی حوالے سے گناہگار یا قصوروار ہوتا تو آپ اسے بچانے کے بجائے قابلِ تعزیر ٹھہرائے جانے کو پسند فرماتے۔ آپ جن اعلیٰ اخلاقی اقدار اور منصفانہ اصولوں کے داعی ہیں، انہیں سب سے پہلے اپنی ذات پر لاگو کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ مجھے آپ کے الفاظ اچھے سے یاد ہیں۔ ایک دن آپ نے لیکچر کے اختتام پر سوال و جواب کے سیشن میں کہا تھا..... انصاف کسی پرندے کا نام نہیں ہے جسے برڈ مارکیٹ سے خرید لائیں۔ جو شخص اپنا محاسبہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسے دوسروں کا احتساب کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے مگر افسوس کہ ہمارے ہاں یہ سب ہو رہا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانوں کی اکثریت کو ظلمت میں جاتے دیکھ کر لوگ اپنا قبلہ تبدیل کر لیں۔ کم از کم میں تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان الفاظ میں بات مکمل کر دی۔

''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ بگڑی صورت والے اس خانہ خراب معاشرے میں بھی اٹل اصولوں پر ڈٹے اپنے ہی قبلہ رُخ کھڑے ہوں گے۔''

''ہاں.....!'' وہ ایک طویل افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔ ''مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت تصدق کو اس معاملے میں الجھایا گیا ہے۔''

''سر! آپ مجھے مقتول کے بارے میں تفصیلاً بتائیں۔'' میں نے نوٹ پیڈ پر قلم چلانے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ آپ کے صاحبزادے کا مقتول سے کیا تعلق تھا؟''

''کوئی تعلق، واسطہ یا جان پہچان نہیں۔'' وہ بیزاری سے بولے۔ ''بس، ایک اتفاقیہ بدمزگی بھری ملاقات اور اس بدمزگی کا اصل سبب بھی میں ہی تھا۔'' انہوں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''مقتول کا نام ڈاکٹر جنید عالم ہے۔ وہ ایک معروف ماہرِ غدود یعنی اینڈوکرینالوجسٹ تھا۔ مقتول کا کلینک اور رہائش فیڈرل بی ایریا کے بلاک سولہ میں ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہم فیڈرل بی ایریا کے بلاک چودہ میں رہتے ہیں۔''

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ مجھے اس بدمزگی کے بارے میں کھل کر تفصیل سے بتائیں تاکہ میں اس وجہ نزع تک پہنچ سکوں جو تصدق حسین کی گرفتاری کی بنیاد بنی ہے۔''

آئندہ آدھے گھنٹے میں پروفیسر مصدق حسین نے میری مطلوبہ معلومات ایک دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی کی صورت مجھے فراہم کر دیں۔ اس افسوسناک کتھا کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

یہاں پر ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ اس داستان میں شامل بہت ساری چیزیں میں نے بعد ازاں اپنی کوشش اور تحقیق سے حاصل کی تھیں۔ اسی طرح میں نے پروفیسر صاحب کے بیان کے اندر سے کئی ایک معاملات کو دانستہ آپ سے چھپا لیا ہے۔ ان نکات کا تذکرہ عدالتی کارروائی

https://www.urdufutures.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

☆☆☆

پروفیسر مصدق حسین پرانے زمانے کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی صحت کا ہمیشہ بہت خیال رکھا تھا، اسی لیے ساٹھ کا ہندسہ عبور کرنے کے باوجود بھی وہ چالیس سے زیادہ کے نظر نہیں آتے تھے۔ ان کی اس قابلِ رشک اور مثالی صحت کا راز مکمل طور پر فطرت پر انحصار میں مضمر تھا۔ وہ آرگینک فوڈ کے استعمال پر یقین رکھتے تھے۔ ڈبا بند پروسسڈ فوڈ کو چھونا بھی وہ گناہ تصور کرتے تھے۔ وہ ہسٹری کے پروفیسر تھے مگر مطالعہ ہر شعبے کا کیا کرتے تھے، خصوصاً میڈیکل اور سائنس کا شعبہ ان کی توجہ کا خاص مرکز تھا۔ اگر انہیں کانفرنس کے لیے کسی میڈیکل بورڈ کی میٹنگ میں بٹھا دیا جائے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر نہیں ہیں۔

تصدق حسین نے سول انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک معروف کنسٹرکشن کمپنی جوائن کر لی تھی۔ "ایس بی" کنسٹرکشن کمپنی سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے لیے مشہور تھی مگر وہ لوگ دیگر نوعیت کی تعمیرات بھی کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اپارٹمنٹس بلڈنگز اور اسپتال، اسکول و کالج وغیرہ۔ تصدق پچھلے چار سال سے مذکورہ کمپنی میں کام کر رہا تھا اور مالکان کی نگاہ میں وہ ایک معتبر مقام رکھتا تھا۔ تین سال پہلے پروفیسر صاحب نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کر دی تھی لیکن بدقسمتی سے یہ معاشرتی بندھن محض ایک سال ہی چل پایا تھا۔ ثمینہ نے عدالت سے رجوع کر کے تصدق سے خلع لے لیا تھا۔ یہ تصدق کی زندگی کا ایک ایسا تلخ تجربہ تھا کہ اس کے بعد اس نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

انجینئر تصدق حسین نئے زمانے کا انسان تھا۔ باپ بیٹے کی عمروں میں دوگنا کا فرق تھا۔ تصدق اس وقت تیس سال کا ہو چکا تھا۔ قدرتی خوراک سے زیادہ وہ فاسٹ فوڈ کا شوقین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی صحت کا اس طور خیال نہیں رکھ پاتا تھا جو مصدق حسین کا ہمیشہ سے خاصہ رہا تھا۔ وقت بے وقت کھانا، ذرا ذرا سی تکلیف کے لیے ادویات کا استعمال کرنے کا عادی ہونا اور رات کو بھرپور نیند نہ لینے کے سبب وہ اپنی عمر سے زیادہ کا دکھائی دیتا تھا۔ اگر ان باپ بیٹے کو ایک ساتھ بٹھا دیا جائے تو وہ ایک ہی ایج گروپ میں لگتے تھے۔ بہرکیف، ان پروفیسر اور انجینئر صاحبان کے تقابلی جائزے کا بظاہر زیرِ نظر کہانی کے ساتھ کوئی تعلق نظر نہیں آتا مگر اس بحث کی ایک اہمیت ہے جو آگے چل کر آپ پر واضح ہو جائے گی۔

"ابو!" تصدق اکثر اپنے والد سے کہا کرتا تھا۔ "آپ نے ساٹھ کا نمبر کراس کر لیا ہے اور آپ ریٹائر بھی ہو چکے ہیں۔ اب آپ کو اپنی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ ہر چھ ماہ کے بعد یا سال میں ایک بار آپ کو اپنے تمام ضروری ٹیسٹ کروانا چاہئیں تاکہ اگر جسم میں کوئی گڑبڑ شروع ہو چکی ہو تو بروقت اس کا علاج کیا جائے۔"

"بیٹا جی! میں ملازمت سے ریٹائر ہوا ہوں، زندگی سے نہیں۔" باپ متحمل لہجے میں جواب دیتا۔ "جہاں تک اپنا خیال رکھنے کا معاملہ ہے تو اس حوالے سے میں نے کبھی غفلت نہیں برتی۔ الحمدللہ! اس عمر میں بھی میں توانا اور تندرست ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں اور دماغ جوانوں کی طرح چلتے ہیں اور تمام تر قویٰ بھی اپنی جگہ سلامت اور فعال ہیں۔ باقی اسپتالوں اور لیبارٹریوں سے میں نے زندگی بھر دور ہی رہنے کی کوشش کی ہے۔ میرے تجربے کے مطابق.....!" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے رکے پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تمام مراکز انسانیت کی خدمت کرنے سے زیادہ اپنی جیبیں بھرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ میرا تو یہ ماننا ہے کہ جب تک انسان کی صحت کو کوئی سنگین مسئلہ درپیش نہ ہو، کسی ڈاکٹر کو اپنی شکل بھی نہیں دکھانا چاہیے۔"

"ابو! آپ کا فلسفۂ حیات اپنی جگہ لیکن میں باز آنے والا نہیں ہوں۔" تصدق نے ضدی لہجے میں کہا۔ "بس، کل آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں، جنرل چیک اپ کے لیے۔"

پروفیسر صاحب اپنے بیٹے کی نیت اور خلوص کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ تصدق حسین یہ سب ان کی بھلائی کے لیے ہی کر رہا تھا۔ لہٰذا وہ اس کے اصرار پر مجبور ہو گئے۔ تصدق انہیں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ مذکورہ ڈاکٹر نے خون اور پیشاب کے چند ٹیسٹ لکھ دیے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ بلڈ پریشر کچھ بڑھا ہوا ہے، حتمی بات اس وقت کی جائے گی جب ان ٹیسٹ کی رپورٹس آ جائیں گی..... وغیرہا!

چند روز کے بعد وہ دونوں باپ بیٹا دوبارہ رپورٹس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو ڈاکٹر نے تمام رپورٹس کو دیکھنے کے بعد کہا۔

"مصدق صاحب! آپ کے بلڈ اور یورین کے ٹیسٹ کی رپورٹس کے مطابق ہیموگلوبن، یورک ایسڈ، وٹامن ڈی اور کولیسٹرول وغیرہ کا لیول تو نارمل ہے لیکن بلڈ گلوکوز

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

کافی اوپر ہے۔ اسی طرح بلڈ پریشر بھی زیادہ ہے۔ ان مسائل کے حل کے لیے میں آپ کو دو قسم کی گولیاں لکھ کر دے رہا ہوں۔ ایک بلڈ پریشر کے لیے اور دوسری شوگر کے لیے۔ اس دوا کے ساتھ روزانہ آدھا گھنٹا واک بھی کرنا ہے۔ آپ ایک ماہ کے بعد نئی بلڈ گلوکوز رپورٹ کے ساتھ میرے پاس آجائیں پھر میں ڈوز کی کمی بیشی کو دیکھ لوں گا۔"

مصدق حسین نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور وہ دونوں کلینک سے باہر نکل آئے۔ تصدق نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ سامنے میڈیکل اسٹور ہے، آپ دس منٹ رکیں میں آپ کی میڈیسنز لے کر آرہا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" مصدق حسین نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"کیا مطلب ابو؟" تصدق نے اُلجھن زدہ نظر سے اپنے باپ کو دیکھا اور کہا۔ "ڈاکٹر نے آپ کے لیے جو ادویات تجویز کی ہیں، وہ تو کھانا پڑیں گی۔"

"بیٹا جی! آپ جانتے ہوں، میں خوامخواہ دوائیاں کھانے کے حق میں نہیں ہوں۔" پروفیسر مصدق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب میرا بلڈ پریشر اور شوگر ٹھیک ہے تو پھر یہ گولیاں کس لیے؟"

"ابو! میں نے بھی آپ کی بلڈ گلوکوز کی رپورٹ دیکھی ہے۔" تصدق نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "آپ کی فاسٹنگ اور رینڈم دونوں شوگر نارمل رینج سے باہر ہیں۔ یہ ڈایابیٹز بہت ہی منحوس مرض ہے۔ ابو! اگر اسے سنجیدگی سے نہ لیا جائے تو پھر یہ گولیوں کی پکڑ سے باہر نکل جاتا ہے اور ڈایابیٹک شخص (شوگر کے مریض) کو انسولین پر آنا پڑتا ہے اور اس کے بعد ہر گزرتے مہینے اور سال کے ساتھ انسولین کی مقدار میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔"

"یہ سب میں بھی جانتا ہوں کہ شوگر بڑا ہی موذی مرض ہے۔" پروفیسر صاحب نے بیٹے سے کہا۔ "اور اس کا بروقت علاج شروع کر دینا چاہیے لیکن میں ابھی تک اس کا شکار نہیں ہوا۔ باقی جہاں تک لیبارٹری ٹیسٹ اور ان کی نارمل رینج کا معاملہ ہے تو.....!" لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش اور منظم دھوکا ہے۔ یہ لوگ اپنے مالی فائدے کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مریض بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ دواساز اداروں، ڈاکٹروں، لیبارٹری والوں اور میڈیکل ریسرچ سینٹرز کا ایک گٹھ جوڑ ہے۔ ایک خطرناک انسانیت مخالف چال۔ تمہیں ان لوگوں کے جھانسے میں نہیں آنا چاہیے۔"

تصدق اچھے سے جانتا تھا کہ وہ اپنے باپ سے بحث میں نہیں جیت سکتا۔ ایک طرف والد صاحب کے لیے اس کا احترام اور دوسری جانب پروفیسر صاحب کے مضبوط دلائل تھے لہٰذا ایک فرمانبردار اولاد کی طرح پسپائی اختیار کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ابو..... تو آپ کو یقین ہے کہ آپ شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض نہیں ہیں۔ ابھی ڈاکٹر نے جو کچھ بھی کہا، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟"

"بالکل۔ میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں آپ کے لیے فارمیسی سے میڈیسنز نہیں لے رہا۔" تصدق نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس کے جواب میں آپ کو بھی میری ایک بات ماننا ہوگی۔"

مصدق حسین نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کون سی بات؟"

"اگلے ہفتے میں آپ کے لیے ایک اسپیشلسٹ کا اپائنٹمنٹ لے رہا ہوں ابو!" تصدق نے معتدل انداز میں کہا۔ "اور آپ انکار نہیں کریں گے۔ میں اپنے ذہن کو کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹا جی!" مصدق حسین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگرچہ اس کا کوئی فائدہ تو نہیں ہے لیکن آپ کے اطمینان کی خاطر میں تیار ہوں۔"

باپ کی جانب سے "ہاں" سن کر تصدق خوش ہو گیا۔ ابھی اس نے پروفیسر صاحب کو ایک جنرل فزیشن سے ملوایا تھا۔ کسی اسپیشلسٹ کا خیال اس کے ذہن میں ایک خاص مقصد سے آیا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ والد گرامی جنرل فزیشن کی تشخیص اور تجویز سے خاطر خواہ مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ اسے امید تھی کہ اسپیشلسٹ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ایک ہفتے کے بعد وہ دونوں ڈاکٹر جمیل عالم کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ جمیل عالم ماہر امراضِ ذیابیطس اینڈوکرینالوجسٹ تھا۔ صبح میں وہ ایک پرائیویٹ میڈیکل سینٹر میں بیٹھتا تھا اور شام میں وہ اپنا کلینک کرتا تھا۔ اس کی بیوی ایمنا بھی دانتوں کی ڈاکٹر یعنی ڈینٹسٹ تھی جو دن کے پہلے حصے میں ایک پرائیویٹ ڈینٹل اسپتال میں مریضوں کو دیکھتی تھی اور اپنے شوہر کی طرح شام میں کلینک چلاتی تھی۔ دونوں کے کلینک گھر کے نیچے یعنی گراؤنڈ فلور پر تھے اور بالائی منزل

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

پر ان کی رہائش تھی۔ ان کی شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا مگر ابھی تک وہ اولاد ایسی نعمت سے محروم تھے۔

جنید عالم نے پروفیسر صاحب کا بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد لیبارٹری رپورٹس کو بغور دیکھا اور پوچھا۔

"کیا آپ بلڈ پریشر اور شوگر کے لیے کوئی دوا لے رہے ہیں؟"

"نہیں۔" مصدق حسین نے نفی میں جواب دیا۔

تصدق حسین نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! یہ تمام رپورٹس حال ہی میں کرائی گئی ہیں۔ اس سے پہلے ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ابھی علاج شروع نہیں کیا۔ ایک اور ڈاکٹر سے رجوع کیا تھا۔ آپ کی مستند رائے کے بعد ہی ہم ٹریٹمنٹ کی طرف آئیں گے۔"

"ایک چھوڑ دس ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کریں گے تو نتیجہ بدلنے والا نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے خشک لہجے میں کہا۔ "انہیں فوری طور پر علاج شروع کرنا ہوگا۔ میں ان رپورٹس کو دیکھ کر دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے والد صاحب پچھلے دو یا تین سال سے شوگر پیشنٹ ہیں۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر دوبارہ رپورٹس پر نگاہ ڈالنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"مصدق صاحب!" اب وہ براہِ راست پروفیسر صاحب سے مخاطب تھا۔ "فاسٹنگ میں بلڈ گلوکوز لیول سو سے سو کی گرم فی ڈیسی لیٹر نارمل مانا جاتا ہے اور ایک سو پچیس کے بعد کنفرم ڈایابیٹز..... آپ کی فاسٹنگ شوگر ایک سو تیس ہے۔ اسی طرح رینڈم گلوکوز لیول اسی سے ایک سو چالیس ملی گرام فی ڈیسی لیٹر نارمل ہے۔ ایک سو چالیس سے دو سو تک بارڈر لائن یا وارننگ زون سمجھ لیں اور دو سو سے اوپر صد فیصد شوگر پیشنٹ جبکہ آپ کی رینڈم شوگر دو سو تیں ہے۔ آپ کا بلڈ پریشر ایک سو چالیس ہائی پچاسی آرہا ہے۔ اسے کسی بھی صورت ایک سو بیس ہائی اسی سے آگے نہیں جانا چاہیے۔ سو، قصہ مختصر کہ دوا تو آپ کو ہر صورت کھانا پڑے گی۔"

تصدق حسین کی اب تک یہی کوشش رہی تھی کہ ڈاکٹر سے زیادہ بات وہی کرے اور اس مقصد میں وہ خاطر خواہ کامیاب بھی رہا تھا لیکن جب ڈاکٹر ڈائریکٹ پروفیسر صاحب سے مخاطب ہوا تو تصدق کے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ نے کس سال میں ایم بی بی ایس پاس کیا تھا؟" مصدق حسین نے معتدل انداز میں استفسار کیا۔

ڈاکٹر نے اُلجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور جواب دیا۔ "انیس سو اٹھتر میں۔ اس کے بعد چار سال اسپیشلائزیشن کے اور پچھلے سولہ سال سے میں اینڈوکرینالوجسٹ کے طور پر پریکٹس کر رہا ہوں۔"

"ماشاء اللہ! آپ کافی سینئر ماہر امراض غدود ہیں۔" پروفیسر صاحب نے اپنی انگلیوں پر حساب لگانے کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میرے محتاط اندازے کے مطابق آپ انیس سو ترپن میں پیدا ہوئے تھے اس لیے انیس سو ساٹھ کا زمانہ آپ کی یادداشت میں محفوظ نہیں ہوگا کیونکہ اس وقت آپ ایک چھوٹے بچے ہوا کرتے تھے اور بعد میں کسی نے آپ کو بتایا بھی نہیں۔"

"آپ نے میری پیدائش کے حوالے سے درست اندازہ لگایا ہے۔" ڈاکٹر نے متذبذب انداز میں کہا۔ "لیکن میں یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ انیس سو ساٹھ کے بارے میں کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"ابھی سمجھ میں آجائے گا۔" پروفیسر صاحب نے سرسری انداز میں کہا۔ "پہلے آپ میرے ایک سادہ سے سوال کا جواب دیں۔"

"جی پوچھیں۔" ڈاکٹر نے بیزاری سے کہا۔

پروفیسر صاحب نے پوچھا۔ "انسان کا نارمل ٹمپریچر کتنا ہوتا ہے؟"

"اٹھانوے اعشاریہ چھ درجہ فارن ہائٹ!" ڈاکٹر نے بتایا۔ "یعنی سینتیس درجہ سینٹی گریڈ!"

"کیا انیس سو ساٹھ میں بھی انسان کے جسم کا نارمل درجۂ حرارت یہی تھا؟"

"بالکل یہی تھا۔" ڈاکٹر نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"اور ہیں سو ساٹھ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"تب بھی انسان کے جسم کا نارمل درجۂ حرارت یہی رہے گا۔" ڈاکٹر نے پُرزور انداز میں کہا۔ "کیونکہ نارمل ویلیوز کبھی تبدیل نہیں ہوتیں۔ قدرت کا اٹل قانون یہی ہے۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب! لاء آف نیچر یعنی قانونِ قدرت کا حوالہ دے کر آپ نے میرا کام آسان کر دیا ہے۔" پروفیسر صاحب نے فاتحانہ انداز میں ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" ڈاکٹر نے اُلجھن زدہ نظر سے مصدق حسین کو گھورا۔

"ساٹھ کی دہائی میں انسان کے جسم کا نارمل درجۂ حرارت اٹھانوے اعشاریہ چھ (سینتیس درجہ سینٹی گریڈ) درجہ فارن ہائٹ ہوا کرتا تھا۔" پروفیسر صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اسی طرح بلڈ پریشر ایک سو

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

چالیس ہائی تو ہے نارمل مانا جاتا تھا۔ بلڈ گلوکوز فاسٹنگ کی رینج اسی سے ایک سو چالیس اور رینڈم کی رینج ایک سو تیس سے دو سو ساٹھ ملی گرام فی ڈیسی لیٹر نارمل تصور کی جاتی تھی اور پھر ۔۔۔!" انہوں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد نئی ریسرچ کے نام پر ڈاکٹر مافیا انسانی صحت پر حملہ آور ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے فارماسیوٹیکل انڈسٹری نے بھی ان کے ساتھ ہاتھ ملالیا۔ جدید ریسرچ کے بہانے بلڈ پریشر اور شوگر کی نارمل رینج کو نیچے لایا گیا تاکہ ان دونوں امراض کے مریضوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکے۔ اس وقت پوری دنیا میں شوگر اور بلڈ پریشر کے پچیس سے پچاس فیصد مریض ایسے ہیں جو اس بین الاقوامی سازش کا شکار ہیں۔ انہیں میری طرح دوا کھانے کی ضرورت نہیں مگر وہ اس قدر ڈرے اور سہمے ہوئے ہیں کہ دھڑا دھڑ دوائیں پھانک کر ڈاکٹروں اور دوا ساز کمپنیوں کی روز افزوں آمدنی کا سبب بن رہے ہیں۔ اگر کوئی بدنصیب چند سال تک اس فریب میں مبتلا رہا اور پھر کسی بھی وجہ سے اس نے اچانک دوا کھانا چھوڑ دی تو اس کی شوگر اور بلڈ پریشر ایسے شوٹ کرے گا کہ موت یقینی ہے۔ اس نوعیت کا کھلواڑ انسانی جسم کے نارمل ارتقائی عمل کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اسے چیک کرانے کے لیے کسی لیبارٹری کا رخ نہیں کرنا پڑتا۔ بس بدن کو چھونے سے پتا چل جاتا ہے کہ بندے کو بخار ہے یا نہیں۔ اسی لیے اس کی نارملیٹی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی۔"

ڈاکٹر جنید عالم کی برداشت جواب دے گئی۔ "آپ میرے سامنے بیٹھ کر یہ کس قسم کی بکواس کر رہے ہیں؟" اس نے بپھرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "ڈاکٹر آپ ہیں یا میں؟"

"ڈاکٹر تو آپ ہی ہیں مگر جاہل میں بھی نہیں ہوں۔" پروفیسر صاحب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میڈیکل کے بارے میں تھوڑا بہت میں نے بھی پڑھ رکھا ہے۔ آپ میں سچ سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔ آپ کی کیفیت کو دیکھ کر میں دکھے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت آپ کا ہائپوتھیلامس ٹھیک سے کام نہیں کر رہا جس کی وجہ سے سیروٹونین اور ڈوپامین نامی ہارمونز اپنا توازن کھو بیٹھے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ کے اندر خاص قسم کے پروٹین "گولجن" کی بھی کمی پائی جاتی ہے۔ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کے ساتھ ابلے ہوئے انڈے بھی کھایا....."

"آپ دفع ہو جائیں میرے کلینک سے۔" ڈاکٹر نے پروفیسر صاحب کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چیخ کر کہا۔ "ورنہ میں اپنے سیکیورٹی گارڈ کو اندر بلاؤں گا اور وہ دھکے دے کر آپ کو باہر نکالے گا اور ۔۔۔ اور میں ابھی پولیس کو بھی فون کرتا ہوں۔ پتا نہیں کیسے کیسے جانور منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں۔"

اپنے باپ کی بے عزتی ہوتے دیکھ کر تصدق کو بھی طیش آ گیا۔ قریب تھا کہ وہ دونوں دست و گریباں ہو جاتے، وہاں موجود دیگر لوگوں نے اندر آ کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر جنید عالم ان باپ بیٹے کو مسلسل برا بھلا کہنے کے ساتھ ہی خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔

کلینک سے باہر نکلتے وقت تصدق نے سنسناتی ہوئی آواز میں جنید عالم سے کہا۔ "ڈاکٹر! تمہیں تو میں اچھے سے دیکھ لوں گا۔"

اس افسوسناک واقعے کے چار روز بعد ڈاکٹر جنید عالم کو اس کے گھر کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ گھر سے باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا کہ ایک موٹر سائیکل سوار نے بے در یغ فائرنگ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

مقتول ڈاکٹر جنید عالم اور پروفیسر مصدق حسین کے درمیان یہ تلخ کلامی پانچ دسمبر کی شام میں ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے نہایت ہی مکمل انداز میں اپنا نقطۂ نظر مقتول کے سامنے رکھا تھا اور اس کے بیان میں کچھ بھی غلط نہیں تھا۔ من ساٹھ کی دہائی تک واقعتاً شوگر اور بلڈ پریشر کی نارمل ویلیوز وہی مانی جاتی تھیں جس کا ذکر پروفیسر صاحب نے کیا تھا۔ ہر انسان کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہے اور اس موقع پر مصدق حسین نے اپنا حق استعمال کیا تھا۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے مقتول کو اتنا شدید ردِعمل ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ معقول انداز میں جواب دینے کے بجائے وہ باقاعدہ گالم گلوچ پر اتر آیا تھا۔

مقتول کے اس نامناسب اور غیر شائستہ رویے کے تناظر میں پروفیسر صاحب کی رائے بالکل درست نظر آتی تھی۔ مقتول ڈاکٹر جنید عالم کے ہائپوتھیلامس کنٹرول سسٹم میں یقیناً کوئی بڑی گڑبڑ چل رہی تھی جس کے نتیجے میں سیروٹونین اور ڈوپامین ہارمونز کی مقدار کا توازن بگڑ گیا تھا۔ ایسی صورتِ حال سے دوچار انسان بہت جلدی غصے میں آ جاتا ہے۔ اپنے مزاج اور مرضی کے خلاف کوئی بات وہ برداشت نہیں کر پاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ آپے سے باہر نکل جاتا ہے۔ پانچ دسمبر کی شام مقتول جنید عالم نے کچھ اسی قسم کا

https://www.urdutunes.com/

Scanned with CamScanner

مظاہرہ کیا تھا۔

گھر آکر تصدق حسین نے اپنے ریٹائرڈ پروفیسر باپ سے کہا۔ ''ابو! آپ کو خوامخواہ ڈاکٹر سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے شوگر اور بلڈ پریشر کی دوا نہیں کھانا تو نہ کھائیں مگر دوسروں کے سامنے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا کریں۔ اگر کلینک میں لوگ بیچ میں نہ آتے اور معاملہ بڑھ جاتا تو بات دور تک جاسکتی تھی۔ ڈاکٹر آپ سے بدتمیزی پر اتر آیا تھا۔ میں آپ کی بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا ابو! اگر ڈاکٹر کی بدکلامی جاری رہتی تو میں لازمی اس سے بھڑ جاتا۔''

''بیٹا جی! پھر آپ میں اور اس سنکی ڈاکٹر میں کیا فرق رہ جاتا؟'' پروفیسر صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انسان کو ہر حال میں پُرسکون اور بااخلاق رہنا چاہیے۔''

''یہ بات آپ سب کو نہیں سمجھا سکتے ابو!'' تصدق نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ آپ کی طرح کے مکمل مزاج لوگ اس دنیا میں ایک فیصد سے زیادہ نہیں ہوتے۔''

''اور میرا ماننا یہ ہے کہ باقی کے ننانوے فیصد انسان ڈاکٹر جنید عالم جیسے غصہ ور اور جھگڑالو نہیں ہوتے۔'' پروفیسر صاحب نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس لیے ہمیں کوشش جاری رکھنا چاہیے۔ سچائی کو اجاگر کرنے اور جھوٹ کی مذمت کرنے کی کوشش۔''

تصدق حسین نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''آج والی کوشش کا نتیجہ آپ نے دیکھ لیا ہے نا؟''

''جب آپ درست سمت میں چل رہے ہوں تو پھر برے نتائج کی پروا نہیں کرنا چاہیے بیٹا جی!'' مصدق حسین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ایسی رکاوٹوں کو عبور کرنے کے بعد ہی منزل کا سراغ ملتا ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے ڈاکٹر سے ایک بھی غلط بات نہیں کی۔ جب وہ میڈیکل ہسٹری کا مطالعہ کرے گا تو اسے اپنے اس جارحانہ اقدام پر شرمندگی ہوگی۔''

اس کے بعد مزید بحث کی گنجائش نہیں نکلتی تھی چنانچہ تصدق حسین نے خاموشی اختیار کرکے خود کو فرمانبردار اولاد ثابت کردیا حالانکہ اس کے اندر کہیں بھی سناٹا نہیں تھا۔ اگر باپ کے بجائے اس کے سامنے کوئی اور ہوتا تو وہ سوال پر سوال اور اعتراض پر اعتراض کرکے اس کا ناطقہ بند اور سٹی گم کردیتا۔

دو روز بعد یعنی سات دسمبر کی رات تصدق حسین جب ڈیوٹی سے لوٹا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اس کی حالت دیکھی تو تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''بیٹا جی! خیریت تو ہے؟ آپ پریشان نظر آرہے ہیں۔''

''مجھے ڈاکٹر جنید کی بددعا لگ گئی ہے۔'' تصدق نے مایوسی بھرے انداز میں جواب دیا۔

مصدق حسین نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''ابو! میری بائیک چوری ہوگئی ہے۔''

تصدق کے پاس ہونڈا سی بی ٹی موٹر سائیکل تھی۔

''بیٹا جی! مردار خور چیل کوؤں اور کتوں کی بددعاؤں سے جانور نہیں مرا کرتے۔'' پروفیسر صاحب نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لہٰذا ان توہمات کو ایک طرف رکھ کر مجھے بتائیں کہ آپ کی بائیک کب اور کہاں سے چوری ہوئی ہے؟''

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں، آج کل میں گلشن اقبال والے سائٹ آفس میں کام کررہا ہوں۔'' تصدق حسین نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''بائیک کس وقت چوری ہوئی، اس بارے میں درست اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ میں چھٹی کرکے آفس سے باہر نکلا تو میری بائیک غائب تھی۔''

''کیا آپ نے اپنی بائیک کو کسی محفوظ جگہ پر پارک نہیں کیا تھا؟''

''ہمارے آفس کے سامنے پارکنگ ایریا ہے۔'' تصدق نے جواب دیا۔ ''سب کی بائیکس اور گاڑیاں وغیرہ وہیں کھڑی ہوتی ہیں۔ آج تک چوری کی ایسی واردات کبھی پیش نہیں آئی۔''

''کیا اس پارکنگ ایریا میں کوئی چوکیدار وغیرہ بھی ہوتا ہے؟''

تصدق نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''کیا آپ نے بائیک چوری کی رپورٹ درج کرادی ہے؟'' مصدق حسین نے پوچھا۔

''جی ابو!'' تصدق نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جب اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے اور لوگوں سے پوچھ تاچھ کرنے پر بائیک کی گمشدگی کے بارے میں کچھ پتا نہ چلا تو میں نے ایک دوست کے ساتھ متعلقہ تھانے جاکر رپورٹ درج کرادی ہے۔''

''شاباش میرے بچے!'' مصدق حسین نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''بیٹا جی! اب آپ میری بات دھیان سے سنیں۔''

تصدق حسین ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''آپ نے وہ موٹر سائیکل حق حلال کے پیسوں سے خریدی تھی۔'' پروفیسر صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اس کی گمشدگی پر آپ نے تھانے جاکر رپورٹ

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

بھی درج کرادی ہے۔ گویا، آپ نے قانونی تقاضا بھی پورا کردیا ہے۔ آپ نے اپنے حصے کا کام نمٹادیا، آپ کا اختیار یہیں تک تھا۔ اس کے بعد رب کا اختیار شروع ہوتا ہے لہٰذا سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیں۔ مجھے صرف امید ہی نہیں بلکہ پکا یقین ہے کہ ہمارا پروردگار آپ کی محنت کی کمائی کو ضائع نہیں جانے دے گا۔ جلد یا بدیر چوری شدہ بائیک کہیں نہ کہیں سے بازیاب ہوجائے گی..... ان شاء اللہ!"

پروفیسر مصدق حسین نے جس انداز میں اپنی اولاد کی تربیت کی تھی، اس ٹریننگ کا ماحصل اللہ کی ذات اور قدرت پر کامل یقین کی صورت برآمد ہوا تھا۔ رخسانہ، فرزانہ اور تصدق حسین اس فلسفے پر ایمان رکھتے تھے کہ ہر فائدہ اور نقصان اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے۔ سو، اپنی بائیک کی چوری پر تصدق یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ وہ سواری اللہ کی عطا تھی۔ اگر اس کی رضا ہوگی تو اس کے پاس دوبارہ وہی یا کوئی اور بائیک آجائے گی۔

محض زبانی کلامی ایسی ایمان افروز باتیں کرنا بہت آسان کام ہے لیکن تہ دل سے اس یقین پر ثابت قدم کھڑے رہنا معدودے چند ہی کو نصیب ہوتا ہے۔

چار روز بعد تصدق حسین کا صبر رنگ لے آیا۔ اس کی مسروقہ بائیک ایم اے جناح روڈ پر واقع ایک سینما کی پارکنگ میں کھڑی مل گئی تھی۔ مذکورہ موٹر سائیکل نشتر، اقبال والے سائٹ آفس سے بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کی پارکنگ میں کیسے پہنچی یا کس نے پہنچائی، اس حوالے سے کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہاں، البتہ بائیک کی بازیابی سے پہلے دو ایسے افسوسناک واقعات رونما ہوچکے تھے جن کے نتیجے میں تصدق حسین اس وقت پولیس کسٹڈی میں تھا۔

واقعہ نمبر ایک کے مطابق نو دسمبر کی صبح مقتول جنید عالم میڈیکل سینٹر جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلا تو اچانک ایک موٹر سائیکل سوار اس کی جانب بڑھا۔ موٹر سائیکل سوار نے اپنے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے اور اس کے سر پر ہیلمٹ بھی موجود تھا۔ جب مقتول اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا تو مذکورہ موٹر سائیکل سوار نے اس کے انتہائی قریب پہنچ کر گن نکال لی اور آناً فاناً میں مقتول پر تین گولیاں چلادیں، جن میں سے دو گولیاں ڈاکٹر جنید عالم کے سینے میں اور ایک گولی اس کی کھوپڑی میں پیوست ہوگئی تھی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں مقتول موقع پر ہی موت کے منہ میں چلا گیا تھا اور قاتل جس طرح آندھی اور طوفان کی رفتار سے آیا تھا، اسی برق رفتاری سے اپنا کام مکمل کرنے کے بعد وہ کرائم سین سے غائب ہوگیا تھا۔

واقعہ نمبر دو کے مطابق ایک روز بعد یعنی دس دسمبر کی سہ پہر پولیس نے ڈاکٹر جنید عالم کے قتل کے الزام میں تصدق حسین کو سائٹ آفس سے گرفتار کرلیا تھا۔ موقع پر موجود لوگوں میں سے ایک شخص نے حملہ آور کی موٹر سائیکل کا نمبر اچھے سے دیکھ لیا تھا۔ پولیس نے جب اس نمبر پلیٹ کے حوالے سے ریکارڈ کو چیک کیا تو وہ ہونڈا سیونٹی تصدق حسین کی ملکیت ثابت ہوئی چنانچہ تصدق حسین کی گرفتاری میں پولیس نے حیرت انگیز مستعدی کا مظاہرہ کیا اور اس کی بائیک کی بازیابی سے ایک دن پہلے ہی اسے اپنی تحویل میں لے کر عظیم کارنامہ انجام دے ڈالا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق مقتول ڈاکٹر جنید عالم کی موت نو دسمبر بروز بدھ کی صبح آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ مقتول پر چلائی جانے والی نائن ایم ایم کیلیبر کی تین گولیوں میں سے ایک اس کے پھیپھڑوں میں، دوسری اس کے دل میں اور تیسری اس کے دماغ میں اس بری طرح گزر گئی تھیں کہ اس کو دوسری سانس لینے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ دوسروں کی زندگیاں بچانے اور انہیں صحت مند رکھنے کے کام پر مامور اپنی زندگی کی بازی کھیلے بنا ہی ہار گیا تھا۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے سے پہلے میں نے متعلقہ تھانے جاکر ملزم تصدق حسین سے ایک تفصیلی ملاقات کرکے اس امر کا اطمینان کرلیا تھا کہ میں ایک بے گناہ کا کیس اپنے ہاتھ میں لینے جارہا ہوں۔ تصدق حسین کی سنائی ہوئی کہانی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ ڈاکٹر جنید عالم کی موت کا ذمے دار نہیں تھا۔

گزشتہ پینتالیس سال میں متعدد بار میں اس بات کی وضاحت کرچکا ہوں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت ممکن حد تک دشوار ہوتی ہے اور اگر کیس استغاثہ کو معتبر بنانے والے دو بنیادی تقاضے پورے کردے تو پھر ضمانت منظور ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس صورت میں ملزم بے گناہ ثابت ہونے کے بعد ہی قانون کی گرفت سے آزاد ہوپاتا ہے اور وہ بنیادی تقاضے ہیں..... قتل کا محرک معلوم ہوجانا اور آلۂ قتل یا ذریعۂ قتل کا دستیاب ہونا۔ بدقسمتی سے اس کیس میں یہ دونوں پوائنٹس استغاثہ کی مٹھی میں تھے۔ پانچ دسمبر بہ روز ہفتہ کی شام مقتول کے کلینک میں مصدق حسین اور

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

مقتول ڈاکٹر کے درمیان جو تلخ کلامی ہوئی تھی، اس کے کئی ایک عینی شاہد موجود تھے اور انہی شاہدین نے تصدق حسین کی دھمکی کو بھی سماعت کیا تھا۔ جب مقتول تصدق کے والد صاحب کی بے عزتی کر رہا تھا تو اس نے کلینک سے نکلتے وقت خطرناک انداز میں کہا تھا..... "ڈاکٹر! تمہیں تو میں اچھے سے دیکھ لوں گا!"

استغاثہ نے ملزم کے خلاف چارج شیٹ تیار کرتے وقت ان الفاظ کو خاص طور پر ہائی لائٹ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ملزم نے اپنے باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے ڈاکٹر جنید عالم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس طرح استغاثہ کی طرف سے قتل کے محرک کی وضاحت کی گئی تھی۔ دوسری جانب 9 ایم ایم۔ یعنی نائن ایم ایم کیلیبر کی گن بھی پولیس نے اسی گلی کے کوڑے میں رکھے کچرے کے ڈرم کے اندر سے ڈھونڈ نکالی تھی۔ مذکورہ گن کے کلپ میں سے تین گولیاں فائر کی گئی تھیں۔ یہ وہی گولیاں تھیں جو ڈاکٹر جنید عالم کی موت کا سبب بنی تھیں..... علاوہ ازیں قاتل نے اس لرزہ خیز واردات کے لیے جو موٹر سائیکل استعمال کی تھی، وہ ملزم تصدق حسین کی ملکیت تھی۔ ملزم مخالف اس تشویش ناک تناظر میں تصدق کی ضمانت کے تمام امکانات مسترد ہو کر رہ گئے تھے۔

اس کیس میں استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی جن میں سے دو تین گواہوں کی شہادتوں میں بس انیس بیس کا تضاد تھا۔ لہٰذا میں ان میں سے کسی ایک ہی کے بیان کا ذکر کروں گا تاکہ سسپنس ڈائجسٹ کے اہم صفحات اور آپ کے قیمتی وقت کا زیاں نہ ہو۔ البتہ ضروری اور کارآمد گواہوں کا بالتفصیل تذکرہ کیا جائے گا۔

☆☆☆

لگ بھگ دو ماہ عدالت کی ابتدائی کارروائیوں میں گزر گئے۔ مارچ کے وسط میں اس کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کر دیا۔ جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

"پراسیکیوشن.....!"

وکیل استغاثہ اکیوزڈ اسٹینڈ کے نزدیک چلا گیا اور ملزم تصدق حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔ "معزز عدالت میں کھڑے ہو کر تم نے اپنا بیانِ حلفی ریکارڈ کرایا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ تم اس کٹہرے میں موجود ہو کر صرف سچ بولو گے اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہو گے۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے نا.....؟"

ملزم نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "جی وکیل صاحب.....!"

"تمہارے پاس کون سی سواری ہے؟" وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

"موٹر سائیکل.....!"

"کون سی اور کس رنگ کی موٹر سائیکل؟"

"بلیک..... ہونڈا سیونٹی۔" ملزم نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"کیا تمہاری موٹر سائیکل کا نمبر تمہری ٹرپل نائن ہے؟"

"جی ہاں..... بالکل یہی نمبر ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم ایک سول انجینئر ہو.....!" وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ "اور آج کل گلشن اقبال والے سائٹ آفس میں تمہاری ڈیوٹی لگی ہوئی ہے..... میرا مطلب ہے، گرفتاری سے پہلے؟"

"جی، آپ درست کہہ رہے ہیں.....!"

"تم روزانہ صبح کتنے بجے سائٹ آفس پہنچتے تھے۔" وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔ "اور تمہاری چھٹی کب تک ہوتی تھی؟"

"میں صبح نو بجے اپنے آفس پہنچ جاتا تھا۔" ملزم نے بتایا۔ "اور چھٹی عموماً پانچ بجے ہو جاتی تھی لیکن اگر کام زیادہ ہو تو پھر کبھی رکنا پڑتا تھا.....!"

"یعنی صبح ڈیوٹی جوائن کرنے کا وقت مقرر تھا مگر واپسی کا کچھ ٹھیک نہیں؟"

"جی بالکل، ایسا ہی ہے!"

"دو، ڈھائی ماہ پہلے کا وقت اپنے ذہن میں تازہ کرو.....!" وکیلِ استغاثہ نے چالاکی بھرے انداز میں کہا۔ "میں نو دسمبر بروز بدھ کی بات کر رہا ہوں۔ اس دن صبح تم کتنے بجے اپنے آفس پہنچے تھے؟ اب یہ مت کہہ دینا کہ تم ٹھیک نو بجے اپنی سیٹ پر موجود تھے.....!"

"میں جھوٹ بولنے کو گناہِ صغیر سمجھتا ہوں، وکیل صاحب!" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اور میں نے ہمیشہ اس گناہ سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ نو دسمبر کی صبح میں دو گھنٹے تاخیر سے یعنی گیارہ بجے اپنے آفس پہنچا تھا۔"

"پوائنٹ نوٹڈ یور آنر!" وکیل استغاثہ نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کراری آواز میں کہا۔ "نو دسمبر دی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

تاریخ ہے جس صبح آٹھ اور نو بجے کے درمیان ڈاکٹر جنید عالم کو اس کے گھر کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل نے جس موٹر سائیکل پر سوار ہو کر یہ سنگین وارات کی، وہ بلیک ہونڈا سیونٹی تھی اور اس کا نمبر تھا تھری نائن نائن نائن..... یعنی ملزم کی موٹر سائیکل.....!" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر دوبارہ ملزم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ وقوعہ کے روز تم دو گھنٹے دیر سے اپنے آفس کیوں پہنچے تھے؟"

"پچھلی رات مجھے تیز بخار آ گیا تھا اور گزشتہ دو روز سے زکام بھی چل رہا تھا۔" ملزم نے جواب دیا۔ "اس لیے اگلی صبح میری دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ علاوہ ازیں میرے پاس بائیک بھی نہیں تھی۔ رکشا والے منہ بھر کر کرایہ مانگ رہے تھے لہٰذا میں دو بسیں بدل کر اپنے آفس پہنچا تھا۔ دو گھنٹے تاخیر کے یہی اسباب ہیں اور کچھ نہیں.....!"

"کیا تم اپنی اس تاخیر کا کوئی ٹھوس ثبوت پیش کر سکتے ہو؟"

"میرے والد صاحب اس امر کی گواہی دے سکتے ہیں کہ اس روز میں طبیعت کی خرابی کے باعث کم و بیش دس بجے صبح گھر سے نکلا تھا۔"

"گھر کی گواہی کام نہیں آئے گی.....!" وکیلِ استغاثہ نے خشک لہجے میں کہا۔ "تمہارا باپ تمہیں بچانے کے لیے غلط بیانی سے بھی کام لے سکتا ہے.....!"

"آئی ایم سوری وکیل صاحب.....!" ملزم نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

وکیلِ استغاثہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ "کس بات کی سوری؟"

"سوری اس لیے کہ میں آپ کے اطمینان اور معزز عدالت کی تسلی کے لیے ان دو بسوں کے ڈرائیورز اور کنڈیکٹر کو پکڑ کر گواہی کے لیے لانے سے قاصر ہوں۔" ملزم نے چبھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اور اگر اتفاق سے ایسا ناممکن کام معجزاتی طور پر ہو بھی جائے تو وہ لوگ میرے حق میں بیان کیوں دیں گے۔ میرے جیسے ہزاروں مسافر روزانہ ان کی بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ کسی مسافر کا چہرہ یاد نہیں رکھتے.....!"

"کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ پچھلے سال پانچ دسمبر کی شام تمہارا، مقتول کے ساتھ اس کے کلینک پر جھگڑا ہوا تھا؟"

"ہاں، میں انکار کرتا ہوں.....!"

"اس ناخوش گوار واقعے کے نصف درجن عینی شاہدین بھی موجود ہیں.....؟"

"یقیناً ہوں گے کیونکہ جھگڑا تو بہر حال ہوا تھا۔" ملزم نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "لیکن میرے اور ڈاکٹر کے بیچ نہیں بلکہ والد صاحب اور ڈاکٹر کے درمیان اچھی خاصی تلخ کلامی ہو گئی تھی۔"

"ایک ہی بات ہے.....!" وکیلِ استغاثہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "جب وہ تنازعہ بہت زیادہ بڑھ گیا تو وہاں موجود لوگوں کو بیچ بچاؤ کے لیے مداخلت کرنا پڑی اور تم نے کلینک سے رخصت ہوتے وقت مقتول ڈاکٹر جنید عالم کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔ تم نے مقتول سے کہا تھا، ڈاکٹر! تمہیں تو میں اچھے سے دیکھ لوں گا..... تم نے ایسا کہا تھا یا نہیں؟"

"میں اپنے الفاظ سے نہیں پھروں گا.....!" ملزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں، میں نے ویسا کہا تھا اور اس کا ایک خاص سبب تھا.....!" اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

متحدہ عرب امارات میں مقیم

اردو قارئین کے لیے خوشخبری

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)

کے چاروں رسائل

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،

ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

ایک فون کال کے فاصلے پر

آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔

اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر شارجہ پبلشنگ سٹی فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زائد آر ڈی، ای 311 شارجہ

971504805734

URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"والد صاحب نے ڈاکٹر کے سامنے ایک کڑوا سچ رکھ دیا تھا۔ اس سچ کا تعلق میڈیکل کے شعبے سے تھا۔ ڈاکٹر نے اس سفاک حقیقت کو نہ صرف ماننے سے انکار کر دیا بلکہ ردِعمل کے طور پر وہ والد صاحب پر چیخنے چلّانے بھی لگا تھا۔ ڈاکٹر نے خود کو درست ثابت کرنے کے لیے کسی ٹھوس دلیل کا سہارا لینے کے بجائے والد صاحب سے بدتمیزی شروع کر دی تھی۔ میں بھلا اپنے باپ کی بے عزتی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر کی بدکلامی سن کر میرا خون کھول اٹھا تھا اسی لیے میں نے کلینک سے نکلتے وقت وہ الفاظ کہہ دیے تھے۔ وہ میرا ایک جذباتی ردِعمل تھا.....!"

"تم نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تین دن انتظار کیا.....!" وکیلِ استغاثہ ملزم کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں بولا۔ "نو دسمبر کی صبح تم اپنی بائیک ہونڈا سیونٹی پر سوار ہو کر مقتول کے گھر کے سامنے پہنچے۔ اس وقت مقتول میڈیکل سینٹر جانے کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ تم نے پے در پے مقتول پر تین فائر کیے اور جائے وقوعہ سے غائب ہو گئے۔ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر تم نے گن کو کچرے کے ڈرم میں پھینکا اور ہوا سے باتیں کرتے ہوئے سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟"

"نہایت ہی افسوس کے ساتھ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے ڈاکٹر جنید عالم کا قاتل ثابت کرنے کے لیے جو کہانی سنائی ہے، اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔" ملزم نے معتدل انداز میں جواب دیا۔

وکیلِ استغاثہ چند لمحات تک کینہ توز نظر سے ملزم کو گھورتا رہا پھر میری جانب مڑتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ "یور ٹرن پلیز.....!"

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا پھر میں نے اپنے مؤکل کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ "تصدق حسین! ابھی تم نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی نو دسمبر کو تمہارے پاس بائیک نہیں تھی اس لیے تمہیں دو بسیں بدل کر گھر سے آفس تک جانا پڑا تھا۔ میں جانتا ہوں مگر عدالت کے ریکارڈ پر لانا بھی ضروری ہے اس لیے تمہیں بتانا ہوگا کہ اس دن تمہاری موٹر سائیکل کہاں تھی؟"

"سات دسمبر بہ روز پیر، سائٹ آفس سے میری بائیک چوری ہو گئی تھی۔" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اسی شام میں نے متعلقہ تھانے جا کر اپنی بائیک کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ اس رپورٹ کی کاپی میں آپ کو فراہم کر چکا ہوں۔ میرا مطلب ہے، والد صاحب نے وہ کاپی آپ کو دی تھی۔ گیارہ دسمبر بہ روز جمعہ پولیس نے بندر روڈ کے ایک سینما گھر کی پارکنگ سے میری بائیک کو بازیاب کر لیا تھا مگر اس سے ایک دن پہلے یعنی دس دسمبر کی سہ پہر پولیس نے مجھے ڈاکٹر جنید عالم کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ یہ ساری کتھا میں تھانے کی حوالات میں آپ کو سنا چکا ہوں.....!"

میں نے اپنی فائل میں سے مذکورہ رپورٹ کی کاپی نکال کر جج کے سامنے، میز پر رکھتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔

"یور آنر! یہ رپورٹ اس امر کی دلیل ہے کہ مقتول ڈاکٹر جنید عالم کے قتل میں میرے مؤکل کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ مقتول کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت موت کے گھاٹ اتار گیا ہے اور اس مقصد کے لیے قاتل نے ملزم کی بائیک چرائی تاکہ اس سنگین واردات کو ملزم کے کھاتے میں ڈالا جا سکے اور ایسا ہی ہوا بھی۔ مجھے یقین ہے اور آگے چل کر میں اسے ثابت بھی کر دوں گا کہ قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ ملزم اور مقتول کے، پانچ دسمبر والے جھگڑے سے بہ خوبی واقف ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس وقت مقتول کے کلینک میں موجود ہو۔ اسی لیے اس نے میرے مؤکل کو قربانی کا بکرا بنایا ہے..... دیٹس آل یور آنر!" میں نے ایک مختصر سا وقفہ لیا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

"اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہوں گا!"

جج نے معتدل انداز میں کہا۔ "پرمیشن گرانٹڈ.....!"

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر (تفتیشی افسر) کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ میری فرمائش اور جج کے حکم پر آئی او امداد حسین شاہ وٹنس اسٹینڈ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ وہ ایک ڈھیلا ڈھالا سب انسپکٹر تھا۔ اس کے بدن پر پولیس کی یونیفارم کچھ زیادہ جچ نہیں رہی تھی۔

میں گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا۔

"امداد حسین شاہ صاحب!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں پوچھا۔ "کیا میں آپ کو صرف شاہ صاحب یا شاہ جی کہہ سکتا ہوں۔"

"جی..... کہہ سکتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"شاہ جی! سب سے پہلے تو میں آپ کو مبارک باد

https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

digest library.com

دینا چاہوں گا کہ آپ نے بہت کم وقت میں اس کیس کے معاملات کو خوب صورتی بلکہ چابک دستی سے ہینڈل کرلیا ہے!" میں نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔

وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ "شکریہ وکیل صاحب!"

"شاہ جی! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اس کیس کا ملزم اور میرا موکل تصدق حسین چیچے کے اعتبار سے ایک سول انجینئر ہے۔" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کے خیال میں "ایس بی۔" کنسٹرکشن کمپنی والے اسے کتنی تنخواہ دیتے ہوں گے۔"

"اس میں خیال ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے وکیل صاحب!" اس نے توانا لہجے میں جواب دیا۔ "اس کیس کی تفتیش کے دوران میں، میں نے مذکورہ کمپنی کے منیجر وقار احمد سے پوچھ تاچھ کی تھی۔ وہ کنسٹرکشن کمپنی ملزم کو چھ ہزار روپے تنخواہ دے رہی تھی۔"

ستائیس سال پہلے کے چھ ہزار روپے آج کے کم از کم ساٹھ ہزار بنتے ہیں۔

"اللہ آپ کا بھلا کرے شاہ جی!" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ نے ملزم کی موٹر سائیکل کا تفصیلی جائزہ تو لیا ہوگا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "وہ بائیک قتل کی واردات میں استعمال ہوئی تھی اس لیے ہم نے ایک ثبوت کے طور پر اسے اپنی کسٹڈی میں لے رکھا ہے۔"

میں نے ازراہِ تفنن مگر سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا اس بلیک ہونڈا سیونٹی کے تمام پارٹس ابھی تک اپنی جگہ پر پائے جاتے ہیں؟ میں نے سنا اور دیکھا ہے کہ اگر کوئی انسان یا کوئی گاڑی تھانے کا چکر لگا آئے تو اس کے اسپیئر پارٹس یا اعضائے بدن کی سلامتی کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے وکیل صاحب!" آئی او جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "لوگوں نے خوامخواہ ہمیں بدنام کر رکھا ہے۔"

"شاہ جی! رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "خیر، آپ رائی اور پہاڑ والے معاملے کو ایک طرف رکھ کر معزز عدالت کو یہ بتائیں کہ ملزم کی بائیک کی موجودہ مارکیٹ ویلیو کیا ہوگی؟"

"دیکھیں جناب! ہونڈا سیونٹی ہر زمانے میں قیمت کے معاملے میں سب موٹر سائیکلوں سے اوپر ہی رہی ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ ایوریج دینے والی عوامی بائیک ہے۔" اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "اگرچہ ملزم کی بائیک ایک سیکنڈ ہینڈ پرانی موٹر سائیکل ہے۔ اس کے باوجود بھی اس وقت اس کی مارکیٹ ویلیو نئی اور پچیس کے درمیان ہوگی یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہی۔"

"نئی اور پچیس کیا؟" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

اس نے ترنت جواب دیا۔ "ہزار ــــا!"

"یعنی ملزم کی چار ماہ کی تنخواہ کے برابر؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم کی موٹر سائیکل چرانے والا شخص اصول پسند، کوئی بڑا اخلاقی اور دل والا ہے۔" میں نے پُرمعنی انداز میں کہا۔ "اگر وہ اس مسروقہ بائیک کو چور مارکیٹ میں فروخت کر دیتا تو اسے دس بارہ ہزار تو مل ہی جانا تھے مگر اس نے ہر قسم کے لالچ کو بالائے طاق رکھ کر اپنا کام نکالا اور چوری شدہ بائیک کو ایک مقامی سنیما ہاؤس کی پارکنگ میں چھوڑ دیا۔"

"یہ تو آپ کی تصوری ہے وکیل صاحب! کیونکہ آپ اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی جھوٹی سچی کہانی گھڑ سکتے ہیں۔" انکوائری آفیسر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"لیکن قانون آپ سے مختلف انداز میں سوچتا ہے۔"

"شاہ جی! میں قانون کی سوچ سے آگاہی چاہتا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں گے؟"

"جی، ضرور۔" وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "ہمارا خیال یہ ہے کہ ملزم وقوعہ کے روز اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر مقتول کے گھر پہنچا۔ گزشتہ تین دن میں ملزم نے مقتول کے روزمرہ کے معمولات کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مقتول پرائیویٹ میڈیکل سینٹر جانے کے لیے ہر روز گھر سے نکلتا ہے۔ سو، وہ عین اس وقت مقتول کے گھر کے سامنے پہنچ گیا جب مقتول اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ ملزم نے ڈاکٹر جنید عالم پر تین فائر کیے اور جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا۔ بعد ازاں اس نے آلۂ قتل کچرے کے ڈرم میں پھینکا اور بائیک کو سنیما ہاؤس کی پارکنگ میں کھڑا کر کے اپنے آفس چلا گیا تاکہ اس کا دامن ڈاکٹر جنید عالم کے خون کے چھینٹوں سے محفوظ رہے۔"

"معاف کیجیے گا شاہ جی! آپ کی بُنی ہوئی یہ کہانی انتہائی بوگس، بودی اور بچکانہ ہے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" وہ تڑپ کر مستفسر ہوا۔

جواباً میں نے کہا ضرور مگر انکوائری آفیسر سے نہیں بلکہ

https://www.urdufubes.com/

Scanned with CamScanner

مسندِ انصاف پر براجمان جج سے۔ ''جنابِ عالی!'' میں روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے گویا ہوا۔ ''ابھی میں نے معزز عدالت کی خدمت میں ملزم کی بائیک چوری ہونے کے حوالے سے متعلقہ تھانے میں درج کی جانے والی رپورٹ کی جو نقل پیش کی ہے، اس پر سات دسمبر بروز پیر کی تاریخ لکھی ہوئی ہے جبکہ ڈاکٹر جنید عالم کا قتل نو دسمبر بروز بدھ کی صبح ہوا۔ دونوں واقعات کی تاریخیں آپس میں میچ نہیں کرتیں۔ علاوہ ازیں.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اپنے مؤقف کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ابھی اس کیس کے انکوائری آفیسر جناب امداد حسین شاہ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم نے ڈاکٹر جنید عالم کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اپنی بائیک ہونڈا سیونٹی کو بندر روڈ پر واقع ایک سنیما گھر کی پارکنگ میں چھوڑ دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت نو دسمبر کی صبح آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی جبکہ اسی روز ملزم دو بسیں بدلنے کے بعد گیارہ بجے اپنے سائٹ آفس پہنچا تھا۔ ایک بات توجہ طلب ہے کہ وہ بدھ کا دن تھا یعنی اس روز سنیما کا کوئی مارننگ شو بھی نہیں تھا لہٰذا اس لوگوں کی... آمد و رفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دن مذکورہ سنیما میں روشن کے تین شو ہی چلے تھے یعنی تین سے چھ بجے نو اور نو سے بارہ۔ میں نے اپنے طور پر یہ معلومات حاصل کی ہیں اور مجھے پتا چلا ہے کہ وقوعہ کے روز صبح آٹھ سے دوپہر گیارہ بجے تک کسی بھی شخص نے اس سنیما کی پارکنگ میں اپنی بائیک کھڑی نہیں کی تھی۔ معزز عدالت چاہے تو اس امر کی تصدیق بھی کرا سکتی ہے۔'' میں نے ایک بار پھر لمحاتی توقف کر کے گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''اس تناظر میں یہ بات روزِ روشن کے مانند عیاں ہو جاتی ہے کہ میرے مؤکل کا ڈاکٹر جنید عالم کے قتل سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ کسی خطرناک سازش کے تحت اس شریف انسان کو قتل کے سنگین معاملے میں پھنسایا گیا ہے۔''

''آئی او صاحب!'' جج نے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر امداد حسین کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ ''آپ ڈیفنس کے اس اعتراض کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''یور آنر! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ.....!'' آئی او نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ملزم نے وقوعہ کی سہ پہر یا پھر شام میں اپنی موٹر سائیکل اس سنیما ہاؤس کی پارکنگ میں کھڑی کر دی ہو۔''

''ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے جنابِ عالی!'' میں نے دبنگ انداز میں کہا۔ ''لیکن اس کیس کے تفتیشی افسر جتنی بداحتیاطی کے ساتھ اپنے بیان کی پٹریاں بدل رہے ہیں، اس سے یہی محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی لمحہ جاتا ہے، استغاثہ کی ٹرین کو کوئی خوفناک حادثہ پیش آ جائے گا۔ بہرکیف، اس معاملے کو دوسرے پہلو سے بھی دیکھنا ضروری ہے۔'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک گہری سانس خارج کی پھر پیش کار (ریڈر) کے نزدیک رکھی میز کی جانب بڑھ گیا۔

مذکورہ میز پر وہ تمام اہم چیزیں موجود تھیں جن کا تعلق زیرِ سماعت کیس کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ میری اب تک کی جرح کے نتیجے میں جج نے محسوس کر لیا تھا کہ استغاثہ نے اس کیس کی تیاری اچھے سے نہیں کی تھی۔ ابھی آئی او نے جو پلٹا کھایا تھا، اس کے مابعد اثرات ہمارے حق میں جاتے تھے۔ میں نے چور کو اس کے گھر تک پہنچانے کی ٹھان لی تھی۔ سو، مذکورہ چوبی میز پر سے آلۂ قتل والا سلیونسر بیگ اٹھانے کے بعد میں دوبارہ وٹنس باکس میں کھڑے آئی او کے پاس آ گیا۔

''شاہ جی! آپ اسے تو اچھی طرح پہچانتے ہوں گے؟'' میں نے سلیونسر بیگ کو آئی او کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی بالکل!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''یہ وہی نائن ایم ایم سلنسر ہے جس سے تین فائر کر کے ڈاکٹر جنید عالم کو ہلاک کیا گیا تھا۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے سلیونسر بیگ کو آئی او کی نگاہ کی رینج میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''استغاثہ کے دعوے کے مطابق یہ گن آپ کو کچرے کے اس ڈرم کے اندر پڑی ملی تھی جو مقتول کی گلی کے نکڑ پر رکھا ہوا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا شاہ جی؟''

''نہیں۔'' اس نے لمحے میں گردن ہلا کر میرے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''اس حوالے سے استغاثہ کا دعویٰ درست ہے۔ یہ گن میں نے کچرے کے ڈرم کے اندر ہی سے برآمد کی تھی۔''

''تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ ملزم نے ڈاکٹر جنید عالم کو قتل کرنے کے بعد اس گن کو کچرے کے ڈرم میں پھینک دیا تھا؟''

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"پھر تو آپ کو اس گن پر سے زخم کے نشتر پرنٹس بھی ملے ہوں گے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"نہیں — اس گن پر کہیں بھی زخم کی انگلیوں کے نشانات موجود نہیں تھے۔" آئی او نے پُروثوق انداز میں جواب دیا۔ "کیونکہ زخم نے اپنے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔"

"زخم نے یا قاتل نے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ہی بات ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"آبجیکشن یور آنر!" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے چبھتے انداز میں کہا۔ "میرا موکل اس کیس میں زخم نامزد ہے۔ اس کا جرم ابھی ثابت نہیں ہوا لہٰذا اس کے لیے قاتل کا لفظ استعمال کرنا سراسر زیادتی اور انصاف کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔"

"آبجیکشن سسٹینڈ۔" جج نے ٹھوس انداز میں کہا پھر امداد حسین کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "آفیسر! آپ زخم اور مجرم کے فرق کا خیال رکھتے ہوئے ڈینس کے سوال کا جواب دیں۔"

آئی او نے غیر مطمئن بھرے لہجے میں کہا۔ "قاتل نے اپنے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔"

"آپ کو کیسے معلوم شاہ جی؟" میں نے تفتیشی افسر کی آڑے ہاتھوں لیا۔ "کیا آپ جائے وقوعہ پر موجود تھے؟"

"میں تو وہاں موجود نہیں تھا۔" اس نے بتایا۔ "یہ بات ہمیں موقع کے ایک گواہ کی زبانی پتا چلی تھی۔"

"اس گواہ کا نام کیا ہے؟"

"سہیل خان!" اس نے جواب دیا۔ "اس کا نام استغاثہ کے گواہوں کی لسٹ میں شامل ہے۔"

میں استغاثہ کے گواہوں کی فہرست کا بغور مطالعہ کر چکا تھا۔ سہیل خان وہی عینی شاہد تھا جس نے ڈاکٹر جنید عالم کے قاتل کی ہائیک کا نمبر بھی اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ جب سہیل خان گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہوگا تو میں اس سے دستانوں کے بارے میں پوچھ لوں گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور گن والا سیلفین بیگ ایک مرتبہ پھر آئی او کو دکھاتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا آپ اس پسٹل کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں؟"

"میرے خیال میں یہ گن بیس ہزار روپے تک کی ہوگی۔"

"شاہ جی! آپ نے آلۂ قتل کی قیمت کا تعین کرنے میں حد درجہ جلدبازی سے کام لیا ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "بہرکیف، اگر آپ کی بات کو درست بھی مان لیا جائے تو اس گن کی قیمت زخم کی کم از کم تین ماہ کی تنخواہ کے برابر ہوگی — ہاں یا نہ؟"

"ہاں۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا آپ کی نظر میں ایک سول انجینئر اس قدر بیوقوف ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی تین ماہ کی تنخواہ کی رقم سے ایک گن خریدے اور پھر اسے کچرے کے ڈرم میں پھینک کر چلتا بنے؟" میں نے درشت لہجے میں آئی او سے سوال کیا۔

"اس کے بجائے اگر وہ گن اپنے ساتھ لے جاتا تو آلۂ قتل تک آپ کی رسائی ممکن نہ ہو پاتی اور آپ ابھی تک اس کیس کا چالان تیار کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ ہوتے۔"

"اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لیے انسان ہر قسم کا نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔" اس نے احمقانہ انداز میں کہا۔ "زخم آلۂ قتل کو چاہے کہیں بھی چھپا دیتا، ہمیں زبان کھلوانا آتا ہے۔"

آئی او کے آخری جملے سے پولیس گردی کی بُو صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں نے چبھنے والے انداز میں کہا۔

"شاہ جی! تو کیا وہ لطیفہ مبنی بر حقیقت ہے کہ پولیس کی تفتیش کے دوران میں ایک شیر بھی یہ بیان حلفی دینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ایک گدھا ہے اور اس نے اپنے مالک دھوبی کمہار کو دولتی ماری ہے؟"

وہ لاجواب سا ہو کر ندامت بھرے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے اگلی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ اِز ایڈ جارنڈ!"

میں کرائے عدالت سے باہر آیا تو پروفیسر مصدق حسین میرے ساتھ تھے۔ کوریڈور میں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بیگ صاحب! اپنے ایک استاد کی حیثیت سے میں آپ کی لیاقت کو مانتا تھا لیکن آج میں آپ کی پیشہ ورانہ قابلیت اور تجربے کا بھی قائل ہو گیا ہوں۔ آپ نے بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ میرے بیٹے کا دفاع کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد تصدق اس جھمیلے سے نکل آئے گا۔"

"اِن شاء اللہ — بہت جلد۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"میری دعا ہے، اللہ آپ کی قانونی ہنرمندی کو اور نکھار عطا فرمائے تاکہ آپ عدالتوں کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے بے گناہ افراد کی دادرسی کا سبب بن سکیں۔" انہوں نے خلوصِ دل سے مجھے دعا دی۔ "کسی مجبور و لاچار اور بے بس انسان کی مدد کرنا ایک عظیم نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس عمل صالح کا بڑا اجر ہے۔ وہی سب سے بڑا نوازنے والا ہے۔"

"بے شک۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"بیگ صاحب! یہ تو ایک سامنے کی حقیقت ہے کہ ڈاکٹر جنید عالم کو نہایت ہی بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔" مصدق حسین نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور یہ بھی سچ ہے کہ تصدق کا ڈاکٹر کی موت میں کوئی ہاتھ نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنید عالم کی موت کا ذمے دار کون ہے؟"

"آپ نے بہت جاندار نکتہ اٹھایا ہے سر!" میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ "آج کل میں بھی اس نکتے پر غور کر رہا ہوں۔"

"پھر آپ کسی نتیجے پر پہنچے کہ نہیں؟"

"پہنچ چکا ہوں سر!" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

وہ محبت بھرے لہجے میں بولے۔ "میں بھی اس بارے میں جاننا چاہتا ہوں بیگ صاحب!"

"میں آپ کو کسی شخص کا نام تو نہیں بتا سکتا سر!" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ قاتل دو افراد میں سے کسی ایک کا دشمن ہے۔"

"اور وہ دو افراد کون ہیں؟" مصدق حسین نے دلچسپی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"نمبر ایک، مقتول ڈاکٹر جنید عالم۔ نمبر دو، ملزم تصدق حسین!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں میں سے کسی ایک کے دشمن نے یہ سنگین واردات کی ہے۔"

"میں مقتول ڈاکٹر کے دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں جانتا بیگ صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "البتہ اس بات کا مجھے یقین ہے کہ تصدق نے ایسا کوئی دشمن نہیں پال رکھا جو ڈاکٹر جنید عالم کو موت کے گھاٹ اتارے اور اسے اس کیس میں پھنسانے کے لیے اس کی موٹر سائیکل چوری کر کے قتل کی واردات کو انجام دے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "بہرکیف، اس معاملے کو چیک کرنا پڑے گا۔ اگر مقتول کا کوئی جانی دشمن میری نظر میں آ گیا تو اس کیس کو سلجھانے میں کافی آسانی ہو جائے گی۔"

"یعنی آپ تصدق کو بے گناہ ثابت کرنے کے ساتھ ہی مقتول کی موت کے اصل ذمے دار کو بھی بے نقاب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" مصدق حسین نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"آپ بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

انہوں نے پوچھا۔ "اس حوالے سے آپ کے ذہن میں کیا ہے؟"

"میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ڈاکٹر حضرات میں سے پچانوے فیصد خوش مزاج اور با اخلاق ہوتے ہیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "باقی پانچ فیصد میں غصے والے، چڑچڑے یا خاموش طبع ہو سکتے ہیں لیکن پانچ دسمبر کی شام ڈاکٹر جنید عالم نے آپ کے ساتھ جس بدتمیزی اور بازاری پن کا مظاہرہ کیا تھا، وہ کسی ڈاکٹر کا نارمل رویہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھے شک ہے کہ اپنی موت سے پہلے ڈاکٹر جنید عالم کسی شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ اگر اس دباؤ کا سبب تلاش کر لیا جائے تو مقتول کے قاتل تک رسائی سہل ہو جائے گی۔ میں اس سلسلے میں دو مقامات کو خصوصاً چیک کرنا چاہتا ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"نمبر ایک، وہ پرائیویٹ میڈیکل سینٹر جہاں ون کے پہلے حصے میں مقتول بیٹھا کرتا تھا۔ نمبر دو، وہ پرائیویٹ ڈینٹل اسپتال جہاں مقتول کی بیوی ایما صبح سے دوپہر تک اپنی پریکٹس کرتی ہے۔ ان میاں بیوی کے ساتھ کام کرنے والے دیگر ڈاکٹرز اس راز سے پردہ اٹھا سکتے ہیں کہ مقتول کے اتنی جلدی غصے میں آ جانے کی وجہ کیا تھی۔ یہ کام نہایت ہی احتیاط اور سمجھ داری سے کرنا ہوگا۔"

"اس پروجیکٹ کے حوالے سے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں بیگ صاحب!" مصدق حسین نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "وہ کیسے سر؟"

"میرا ایک اسٹوڈنٹ کرمنالوجی میں پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "اسے اپنا تھیسس مکمل کرنے کے لیے فیلڈ کے تجربات بھی شامل کرنا ہوں گے۔ اگر میں اسے یہ ٹاسک دے دوں تو اسے بہت فائدہ ہوگا اور اس طرح ہمارا کام بھی آسان ہو جائے گا۔"

"یہ تو زبردست آئیڈیا ہے سر!" میں نے ستائشی انداز

https://www.urdutubes.com
Scanned with CamScanner

digest library.com

میں کہا اور پوچھا۔ "اس ہونہار برخوردار کا نام کیا ہے؟"

"خاور علی!" پروفیسر صاحب نے بتایا۔

"ٹھیک ہے..... خاور علی کو میرے آفس بھیج دیں۔" میں نے کہا۔ "میں خود اسے سب سمجھا دوں گا۔ اس کے کرمنالوجسٹ بننے میں یہ کیس یقیناً ایک اہم کردار ادا کرے گا۔"

پروفیسر مصدق حسین نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد ہم دونوں کینٹین میں جا بیٹھے۔ میں نے چائے اور کیک سے ان کی تواضع کی اور نہایت ہی ادب و احترام سے انہیں رخصت کر دیا۔

☆☆☆

اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے چار گواہ پیش کیے گئے جن میں مقتول کا کیڈٹ رحمان علی، سیکیورٹی گارڈ فیصل نصیر، پڑوسی احسان اللہ اور ایک راہ گیر اور محلے دار سہیل خان شامل تھے۔ رحمان علی اور فیصل نصیر پانچ دسمبر والے جھگڑے میں بیچ بچاؤ کرانے والوں میں پیش پیش تھے۔ پڑوسی احسان اللہ اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا کہ اس نے مقتول کے کلینک میں غیر معمولی شور کی آواز سنی اور وہ صورتِ حال جاننے کے لیے اندر چلا گیا۔ اس طرح مقتول اور ملزم کے باپ کے مابین ہونے والی بدمزگی کا کچھ حصہ اس نے بھی دیکھا تھا۔ سہیل خان وہی شخص تھا جس نے قاتل کی موٹر سائیکل کا نمبر اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا تھا..... وغیرہم!

فیصل نصیر اور احسان اللہ کی گواہی میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ انہوں نے وہی سب دیکھا تھا جو تصدق حسین اور اس کے پروفیسر باپ کی زبانی مجھ تک پہنچ چکا تھا لہٰذا جب وکیل استغاثہ نے اپنے ان دو گواہوں پر جرح مکمل کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔ "یور ونس پلیز....." تو میں نے دونوں مرتبہ معذرت انداز میں ایک ہی مختصر جواب دیا۔

"نو کوئسچنز!"

مقتول کے ڈاکٹر رحمان علی کو وکیل استغاثہ نے پہلے دو گواہوں کی بہ نسبت زیادہ وقت دیا تھا۔ وہ اس قضیے کا اصل شاہد بھی تھا۔ وکیل کے سوالات اور گواہ کے جوابات سے معزز عدالت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ پانچ دسمبر والے معاملے میں مقتول کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ملزم کے باپ نے اپنی الٹی سیدھی باتوں سے ڈاکٹر جنید عالم کو غصہ دلا دیا تھا جس کے نتیجے میں ڈاکٹر نے روپیہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اپنی باری پر جج کی اجازت سے میں ونس اسٹینڈ کے قریب چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

"رحمان صاحب! میں نے آپ کے بارے میں تھوڑا ہوم ورک کیا ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میری تحقیق کے مطابق آج سے بارہ سال پہلے آپ نے انٹر سائنس کیا تھا۔ آپ ڈاکٹر بننا چاہتے تھے مگر بدقسمتی سے آپ کو میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں مل سکا تھا۔ آنے والے دو سال بھی آپ نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے بھرپور کوشش کی مگر اس مقصد میں آپ کو کامیابی نہ مل سکی۔ بالآخر آپ نے ڈسپنسر کا کورس کیا اور کمپاؤنڈر بن گئے۔ پچھلے سات آٹھ سال سے آپ یہی کام کر رہے ہیں اور میڈیکل کے معاملات کو بھی آپ اچھے سے جانتے ہیں۔ اگر میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہو تو آپ اس کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔"

"آپ نے میرے بارے میں جو بھی کہا، بالکل درست کہا ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے ڈسپنسنگ کورس کے دوران میں ہی کمپاؤنڈری شروع کر دی تھی۔ اس سے پہلے میں دو مختلف اسپتالوں میں بھی کام کر چکا ہوں۔"

"مقتول کے ساتھ آپ کب سے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"لگ بھگ پانچ سال سے۔" اس نے بتایا۔

"پانچ سال اچھا خاصا عرصہ ہوتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "اس دوران میں آپ نے مقتول کی عادات، فطرت اور مزاج کو تو اچھی طرح جان لیا ہو گا؟"

اس نے گردن کی اثباتی جنبش کے ساتھ جواب دیا۔

"جی بالکل۔"

"آپ نے مقتول کے رویے کو کیسا پایا تھا؟"

"وہ ایک نرم دل اور خوش مزاج انسان تھے۔" رحمان علی نے بتایا۔ "اپنے تمام مریضوں کے ساتھ وہ اچھے سے پیش آتے تھے۔"

"رحمان صاحب! گزشتہ سال پانچ دسمبر کی شام بروز ہفتہ، مقتول کے کلینک پر جو ناخوشگوار واقعہ پیش آیا، وہ آپ کے بیان کی نفی کرتا ہے۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "اپنے مزاج کے خلاف بات سن کر فوراً بھڑک جانے والے انسان کو خوش اخلاق اور شائستہ انسان نہیں بلکہ سنکی، خود پسند اور ذہنی مریض کہا جاتا ہے۔ ملزم کے باپ پروفیسر مصدق حسین نے اس کے سامنے ایک سچائی بیان کی تھی۔ اس پر اتنا چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس روز تو

https://www.urdufunbooks.com/

Scanned with CamScanner

مقتول نے بدتمیزی اور گھٹیا پن کی انتہا کردی تھی۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟"

لگ بھگ ایک ماہ پہلے میں نے کرمنالوجی میں پی ایچ ڈی کرنے کے خواہشمند ایک نوجوان کو کسی خاص مشن پر لگایا تھا۔ خاور علی نامی اس مستعد اور ذہین انسان نے میرے حسبِ منشا کام کردکھایا تھا۔ خاور علی کی فراہم کردہ معلومات اہم ہونے کے ساتھ ہی سنسنی خیز بھی تھیں۔ میں انہی معلومات کی روشنی میں استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے کمپاؤنڈر عثمان علی کو کھنگالنے میں لگا ہوا تھا۔

"میں خود بھی ڈاکٹر صاحب کے رویّے پر حیران رہ گیا تھا۔" عثمان علی نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ "وہ ایسے کبھی نہیں تھے لیکن....!"

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے پوچھا۔

"لیکن کیا؟"

"میں نے کچھ عرصے سے ان کے مزاج میں یہ تبدیلی دیکھی تھی۔" اس نے پُرسوچ انداز میں بتایا۔ "وہ چڑچڑے سے ہوگئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی خلاف طبع باتوں پر انہیں غصہ آنے لگا تھا مگر انہوں نے پانچ دسمبر کی شام ملزم کے باپ کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، وہ میرے لیے خلاف توقع اور حیران کن تھا۔"

"عثمان صاحب! معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ مقتول کے اندر پیدا ہونے والا یہ اخلاقی بگاڑ آپ کب سے دیکھ رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"کم و بیش چھ ماہ سے۔"

عثمان علی کا جواب خاور علی کی پیش کردہ رپورٹ کی تصدیق کرتا تھا۔ میں نے استغاثہ کے گواہ سے دریافت کیا۔ "عثمان صاحب! کیا آپ مقتول کی نفسیات میں پیدا ہونے والی اس منفی تبدیلی کا سبب یا محرک جانتے ہیں؟"

"آئی ایم سوری وکیل صاحب!" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"سوری کی ضرورت نہیں عثمان صاحب!" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "آپ نے میرے اور معزز عدالت کے ساتھ جو تعاون کیا، اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اس سے آگے کی معلومات میں مقتول کی بیوہ محترمہ ڈاکٹر انیتا جی سے حاصل کرلوں گا۔" پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے اپنی جرح ختم کرنے کا اعلان کردیا۔

"جنابِ عالی! مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

میں نے استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے کمپاؤنڈر عثمان علی پر جس نوعیت کی جرح کی تھی، اس سے جھلکتی اپنائیت اور رواداری نے وکیل مخالف کے کان کھڑے کردیے تھے۔ آئی او امداد حسین شاہ بھی میرے اس دوستانہ رویّے پر الجھن کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ وہ دونوں یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ عثمان علی استغاثہ کا گواہ تھا یا ڈیفنس کا۔

یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں آگے چل کر استغاثہ کی پوری ٹیم کے ہوش و حواس پر گرنے والی آسمانی بجلی گرانے والا تھا۔

اس کے بعد استغاثہ کے گواہ سہیل خان نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے پاس چلا گیا اور دو چار بنیادی سوالات کے بعد اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یور آنر پلیز!"

سہیل خان ایک گورا چٹا اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے چالیس اور پینتالیس کے درمیان قائم کیا۔ اس کے سر کے بالوں میں "ایم" واضح ہوچکا تھا۔

"خان صاحب! آپ اس مقدمے کے چشم دید گواہ کی حیثیت سے شامل کیے گئے ہیں۔" میں نے رسان بھرے انداز میں اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی گواہی پر اس کیس کی عمارت کھڑی ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ وکیل استغاثہ نے آپ کو اتنا وقت نہیں دیا جتنا آپ کا حق بنتا تھا۔ آپ اس بے مروتی کی وجہ بیان کرسکتے ہیں؟"

"کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ ہی میں اسے وکیل صاحب کی بے رخی سمجھتا ہوں۔" گواہ نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "میرا خیال ہے جتنا معلوم تھا، وہ مجھ سے پوچھ لیا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہوگیا۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا پھر سلسلۂ سوالات کو دراز کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ "سہیل خان صاحب! کیا آپ بھی فیڈرل بی ایریا کے بلاک سولہ ہی میں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں ڈاکٹر جنید عالم سے دو گلی آگے پارک کے سامنے والی گلی میں رہتا ہوں۔"

"وقوعہ کے روز یعنی نو دسمبر بروز بدھ کی صبح آپ مقتول ڈاکٹر کے گھر کے سامنے کیا کررہے تھے؟" میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ ٹکا کر سوال کیا۔ "آپ کل کی اس واردات میں آئی وٹنس ہیں۔ وہ المناک سانحہ آپ کی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

آنکھوں کے سامنے رونما ہوا تھا۔"

"میں باقاعدہ کوئی ارادہ کرکے وہاں نہیں گیا تھا وکیل صاحب!" اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "ڈاکٹر صاحب کی گلی کے سامنے والے حصے میں یعنی میری اور ڈاکٹر صاحب کی گلی کے بیچ والی گلی میں ایک پرائیویٹ اسکول ہے۔ میں اپنے بچے کو مذکورہ اسکول میں پہنچا کر واپس گھر آرہا تھا کہ میں نے فائرنگ کی آواز سنی۔ اس وقت میں ڈاکٹر کے کلینک سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں فوراً اس سمت بڑھا جدھر سے فائرنگ کی آواز آئی تھی۔ اسی وقت میں نے ایک موٹر سائیکل سوار کو افراتفری کے عالم میں وہاں سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ بلیک ہونڈا اسیونٹی پر سوار شخص نے اپنے سر پر ہیلمٹ لگا رکھا تھا اور اس ہیلمٹ کا بڑ بھی گرا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں دستانے بھی پہن رکھے تھے۔ اچانک موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ پر میری نگاہ پڑی تو وہ نمبر مجھے اتنا آسان لگا کہ فوراً میری یادداشت میں محفوظ ہوگیا۔ اس موٹر سائیکل کے نمبر کے بارے میں صرف میں ہی جانتا تھا اسی لیے مجھے ایک گواہ کی حیثیت سے اس کیس میں شامل کیا گیا ہے۔"

سہیل خان نے اپنے گھر اور مقتول کی رہائش کے جغرافیے کے ذیل میں گلیوں کی جو ترتیب اور تفصیل بیان کی تھی، اس سے میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اس معاملے میں خود بھی الجھن کا شکار نظر آرہا تھا۔ بہرکیف، اس کے بیان میں صرف ایک ہی کام کی بات تھی اور وہ یہ کہ ملزم والی ہونڈا سیونٹی کا نمبر اسے یاد رہ گیا تھا۔ میں نے بھی اسی پوائنٹ کو سینٹر آف گریوٹی مان کر استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔

"خان صاحب! آپ نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی نو دسمبر بروز بدھ کی صبح آپ نے ہیلمٹ پوش موٹر سائیکل سوار کو بلیک ہونڈا اسیونٹی پر جائے واردات سے فرار ہوتے دیکھا تھا اور مذکورہ بائیک کا نمبر آپ کی یادداشت میں محفوظ ہوگیا تھا۔ اب ذرا اپنی اسی فوٹو گرافک میموری پر دباؤ ڈال کر مجھے بتائیں کہ آپ نے مذکورہ موٹر سائیکل کی کون سی نمبر پلیٹ پر نگاہ ڈال کر اس نمبر کو حفظ کرلیا تھا۔ سامنے والی یا پیچھے والی نمبر پلیٹ؟"

"پیچھے والی نمبر پلیٹ۔" اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"آپ نے تھوڑی دیر پہلے یہ بھی بتایا ہے کہ موٹر سائیکل سوار کے ہیلمٹ کا بڑ گرا ہوا تھا۔ اگر آپ اسے فرنٹ سے بھی دیکھتے تو اس کا چہرہ آپ کی یادداشت میں خاطر خواہ اپنی جگہ نہیں بنا سکتا تھا۔" میں نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔ "موٹر سائیکل کی پچھلی نمبر پلیٹ پر آپ کی نظر پڑی تھی، اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ آپ نے ڈاکٹر جنید عالم کے قاتل کو پشت کی طرف سے دیکھا تھا؟"

"جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ میرے خیالات کی تصدیق کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے موٹر سائیکل سوار کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔"

"شکریہ خان صاحب!" میں نے استغاثہ کے گواہ سہیل خان کی طرف دیکھتے ہوئے تشکرانہ انداز میں کہا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"یور آنر! استغاثہ اب تک کسی بھی زاویے سے یہ ثابت نہیں کرسکا کہ نو دسمبر کی صبح مقتول پر فائرنگ کرنے والا قاتل میرا موکل اور اس کیس کا ملزم صدیق حسین ہی تھا۔ جہاں تک قاتل کے زیر استعمال موٹر سائیکل کا ذکر ہے تو ڈیفنس نے کسی بھی مرحلے پر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا کہ "تھری ٹریپل نائن" نمبر والی وہ بلیک ہونڈا اسیونٹی ملزم کی ملکیت نہیں تھی۔ بائیک کی چوری کے سلسلے میں تھانے میں درج کرائی جانے والی رپورٹ بھی یہی بتاتی ہے کہ ڈاکٹر جنید عالم کی موت میں میرے موکل کا کوئی ہاتھ نہیں۔ ہاں، البتہ ملزم کی مسروقہ بائیک قتل کی اس واردات میں ضرور استعمال ہوئی ہے اور اس کے لیے میرے موکل کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔" میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے رکا پھر اپنے دلائل کا پروٹوکول مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"دیٹس آل یور آنر!"

پھر عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر اس مقدمے کی کارروائی کے اختتام کا اعلان کردیا۔

"دی کورٹ از ایڈجرنڈ فار دی ڈے!"

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے یعنی وٹنس باکس میں مقتول کی بیوہ ڈاکٹر انیتا کھڑی تھی۔ انیتا کی عمر چالیس کے اریب قریب نظر آتی تھی۔ وہ ایک دراز قامت، حسین و جمیل اور پرکشش شخصیت کی مالک عورت تھی۔ ڈاکٹر انیتا کو ایک جاذب نظر اور دلکش خاتون کہا جائے تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔ میں نے مقتول کو نہیں دیکھا تھا لیکن عثمان علی کپاڈیہ کے مطابق ان میاں بیوی کا بظاہر کوئی میل نظر نہیں آتا تھا۔ مقتول شخصیت کے معاملے میں اپنی بیوی کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

ڈاکٹر انیتا نے اپنا بیان حلفی ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

"آپ دونوں میاں بیوی کے کلینک گھر کی زیریں منزل پر پہلو بہ پہلو تھے..... بلکہ ہیں۔" وکیل استغاثہ نے کہا۔ "پانچ دسمبر کی شام جب مقتول اور ملزم کے باپ کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا تو آپ بھی اپنے کلینک سے اٹھ کر وہاں گئی تھیں؟"

"جی، بالکل گئی تھی۔" انیتا نے اثبات میں جواب دیا۔ "اس وقت تک معاملہ تھم چکا تھا اور یہ دونوں باپ بیٹا جنید کے کلینک سے باہر نکل رہے تھے۔ اسی لمحے میں نے ملزم کو خطرناک نتائج کی دھمکی دیتے سنا اور دیکھا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ یہ کمینہ کچھ نہ کچھ ضرور برا کرے گا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے مضمحل لہجے میں کہا۔

"چار روز بعد ہی اس بدبخت نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا۔"

"جس صبح ڈاکٹر صاحب کا قتل کیا گیا، آپ نے کیا دیکھا تھا؟" وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔

"جنید تیار ہو کر میڈیکل سینٹر جانے کے لیے نیچے جا چکا تھا اور میں اپنے اسپتال جانے کی تیاری کر رہی تھی۔" استغاثہ کی معزز گواہ اور مقتول کی بیوہ ڈاکٹر انیتا نے جواب دیا۔ "اچانک میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ میں اپنے کمرے کی گیلری میں آئی تو میں نے جنید کو کار کے نزدیک زمین پر پڑے دیکھا۔ وہ اپنے ہی خون میں لت پت تھا۔ اسی وقت میں نے ایک ہیلمٹ پوش موٹر سائیکل والے کو وہاں سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ جنید کا قاتل یہی نامراد تھا جو اس وقت ملزموں والے کٹہرے میں کھڑا ہے۔" ذرا دیر کو رک کر اس نے اپنی انگلی سے ملزم تصدق حسین کی جانب اشارہ بھی کر دیا اور بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں فوراً نیچے گئی لیکن اتنی دیر میں جنید کی موت واقع ہو چکی تھی۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور پہلی فرصت میں اپنے علاقے کے تھانے فون کر کے اس سانحے کی اطلاع دے دی۔ آدھے گھنٹے میں پولیس میرے گھر پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد کے واقعات آپ سب کے علم میں ہیں۔"

مزید دو تین معمولی سوالات کے بعد وکیل استغاثہ نے جرح برخاست کر دی۔ اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔

"میڈم!" میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ کے نقصان کا مجھے دلی دکھ ہے۔"

"جھوٹی ہمدردی جتانے کا کوئی فائدہ نہیں وکیل صاحب!" وہ روکھے لہجے میں بولی۔

"آپ میری نیت پر شک کر رہی ہیں میڈم!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایک قاتل اینڈو کرینالوجسٹ کی موت کا مجھے سخت افسوس ہے۔ میں آپ کو یقین دلانے کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"میں آپ کی بات کا یقین کیوں کروں وکیل صاحب؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "آپ اس منحوس آدمی کی وکالت کر رہے ہیں جس نے بے دردی سے میرے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

"میں اپنے موکل کا دفاع اس لیے کر رہا ہوں کہ میری نظر میں وہ بے گناہ ہے۔" میں نے دانستہ الفاظ میں کہا۔ "کسی مظلوم اور بے قصور شخص کو انصاف دلانا میرے پیشے کا تقاضائے اول ہے لیکن یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ آپ کے مقتول شوہر کو بھی انصاف ملے۔"

"وکیل صاحب! آپ کے قول و فعل میں بڑا تضاد ہے۔" وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔ "میرے شوہر کے قاتل کو باعزت بری کروا کے آپ مقتول کو کون سا انصاف دلانے کا دعویٰ کر رہے ہیں؟"

"وہ انصاف جس کے بعد ڈاکٹر جنید عالم کے قاتل اور قاتل کے پشت پناہ کو اسی عدالت سے قرار واقعی سزا سنائی جائے گی۔" میں نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا وکیل صاحب کہ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "ایسی باتوں کو سمجھنے کے لیے سامنے والے کا پاگل ہونا ضروری ہے اور میں تندرست ہوں۔"

"آپ نے پانچ دسمبر کی شام اور نو دسمبر کی صبح جو دو مناظر دیکھے تھے، وہ کسی بھی زاویے سے یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ آپ کے شوہر کو ملزم تصدق حسین نے قتل کیا تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، البتہ اگر آپ میرے سیدھے سوالات کے سیدھے جواب دینے کا وعدہ کریں تو میں اسی کرائے عدالت میں سے ڈاکٹر جنید عالم کے قاتل کو نکال کر دکھا دوں گا، جیسے کوئی شعبدہ باز اپنے کوٹ کی جیب میں سے پھڑپھڑاتا ہوا سفید کبوتر نکال کر تماشائیوں کو حیران کر دیتا ہے۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے برہمی

https://www.urdutubes.com

Scanned with CamScanner

بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت عدالت میں ڈاکٹر جنید مرزا کیس زیر سماعت ہے اور میرے فاضل دوست شعبدہ گری کے چاؤ میں کورٹ روم کو پتا نہیں کون سی تماشا گاہ بنانا چاہتے ہیں۔''

''جناب عالی! میں نے تو مقتول کی بیوہ ڈاکٹر انیتا صاحبہ سے سچ بولنے کی درخواست کی ہے۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''اگر ہمارے سوال و جواب مقتول کے اصلی قاتل کو بے نقاب کردیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔''

''ڈیفنس! آپ جو کہہ رہے ہیں، وہ کر کے بھی دکھا سکتے ہیں؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''میں فریقین میں سے کسی کو بھی عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''میں سنجیدہ ہوں یور آنر!'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

مجھے اس موقع کا پچھلے دو ماہ سے شدید انتظار تھا۔ خاور علی کی فراہم کردہ قیمتی معلومات کو استعمال کرنے کا وقت آگیا تھا۔ وہ نوجوان کرمنالوجسٹ بڑا دوست کام دکھا کر میرے دل میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ اس کی دی ہوئی سنسنی خیز خبروں کے ساتھ میں نے اپنے ہتھکنڈوں کو بھی جوڑ لیا تھا۔ گویا، آج دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہونے کا دن تھا۔

''آبجیکشن اوور رولڈ!'' جج نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ڈیفنس! پلیز پروسیڈ فردر۔''

جج نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے ایک نادر موقع دیا تھا۔ سو، میں اس کے بھروسے پر پورا اترنے کے لیے میڈم انیتا کی جانب متوجہ ہوگیا اور اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔

''میں نے پچھلے دو ماہ میں اسلم بھائی کے بارے میں ریسرچ کی ہے اور میری اس محنت کے تمام مصدقہ ثبوت اس فائل کے اندر موجود ہیں۔ آپ تو اسلم بھائی کو اچھی طرح جانتی ہیں نا؟''

''میں کسی اسلم بھائی کو نہیں جانتی۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

''میں اس بھتا خور اسلم بھائی کی بات کر رہا ہوں، پچھلے سال پولیس نے جس کا ان کاؤنٹر کردیا تھا۔''

''پتا نہیں آپ کیا بکواس کر رہے ہیں۔'' وہ اٹھتے سے اکھڑ گئی۔ ''میں نے کہہ دیا تو بس کہہ دیا، میں اسلم بھائی کو نہیں جانتی۔''

''شاہ جی! آپ تو اسلم بھائی مرحوم کو جانتے ہوں گے؟'' میں نے آئی او کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ''آج کل اسلم بھائی کا رائٹ ہینڈ قادر بھائی، صاحب ثروت لوگوں سے بھتا وصول کر رہا ہے؟''

''میں نے اس اسلم بھائی کا نام سنا ہے جو پچھلے سال کے وسط میں پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔'' آئی او نے جواب دیا۔ ''اس کے گینگ کا کوئی آدمی اب بھی بھتا وصولی کا دھندا چلا رہا ہے، اس کا مجھے علم نہیں۔''

''لیکن مجھے پکا علم ہے کیونکہ میں نے دو ماہ جھک نہیں ماری۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''آپ لاعلمی ظاہر کر رہے ہیں تو اس میں آپ کی کوئی تکنیکی مجبوری ہوگی۔ خیر.....!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر انیتا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میڈم! کیا آپ اس حقیقت سے انکار کرسکتی ہیں کہ ڈاکٹر جنید ہر ماہ دس ہزار روپے بطور بھتا اسلم بھائی کو دیا کرتے تھے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

''کوئی بات نہیں، چند منٹ بعد بخوبی جان جائیں گی۔'' میں نے خاموش دھمکی کے انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا آپ اس بات سے بھی انکار کریں گی کہ مقتول اپنی موت سے چھ ماہ پہلے سے بہت زیادہ پریشان رہنے لگا تھا؟''

''ہاں..... وہ الجھا ہوا تو دکھائی دیتا تھا۔''

''آپ نے اس کی الجھن کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟''

''کئی بار کی تھی۔''

''پھر اس نے کیا جواب دیا تھا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''میں بتا دیتا ہوں۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''مقتول کی پریشانی کی دو وجوہات تھیں۔ نمبر ایک، اسلم بھائی نے ماہانہ بھتے کا سسٹم ختم کر کے اس سے ایک ساتھ تیس لاکھ روپے مانگ لیے تھے، اس وعدے کے ساتھ کہ وہ آئندہ کبھی مقتول کو تنگ نہیں کرے گا۔''

''لیکن ان بھتا خوروں کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''ان کے جتنے بھی مطالبات پورے کردو، یہ پھر کسی نئے مطالبے کے ساتھ سامنے آکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جنید بھتا مافیا کی نفسیات سے بخوبی واقف تھا اس لیے.....!''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی پھر گھبراہٹ بھری نظر سے اِدھر اُدھر تکنے لگی۔ میں نے زخم پر نمک چھڑکتے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

والے انداز میں کہا۔

"میڈم اگر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بے دھیانی میں آپ کی زبان سے سچ پھسل گیا ہے۔ اب آپ اس حقیقت کا اقرار کرلیں کہ آپ اسلم بھائی اور اس کے مذموم دھندے سے آگاہ تھیں۔ اس کے بعد ہی میں مقتول کی پریشانی کا دوسرا سبب معزز عدالت کے سامنے رکھوں گا۔"

وہ ان لمحات میں "پائے رفتن نہ جائے ماندن" ایسی صورتِ حال سے دوچار تھی۔ چند لمحات کی فکر انگیز سوچ بچار کے بعد اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"ہاں، یہ سچ ہے کہ جنید، اسلم بھائی کی بلیک میلنگ سے تنگ تھا۔ اگر یکمشت تیس لاکھ روپے دینے سے مسئلہ حل ہوجاتا تو شاید جنید یہ کڑوا گھونٹ بھی بھر لیتا مگر حالات تسلی بخش نہیں تھے۔"

"ہاں وہی، حالات تسلی بخش نہیں تھے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "لیکن جب اسلم بھائی پولیس مقابلے میں مارا گیا تو مقتول کے سامنے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔"

"کیسا مسئلہ؟" ڈاکٹر ایما نے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"اسلم بھائی مرحوم کے دستِ راست قادر بھائی نے مقتول کو چند تصاویر دکھا کر تیس لاکھ کا مطالبہ کردیا تھا۔"

یہ ساری اہم معلومات خاور علی نے مقتول کے رازدار دوست ڈاکٹر عرفان صدیقی کے اندر سے جس طرح نکالی تھیں، وہ ایک قابلِ ستائش کارنامہ تھا۔ مقتول جنید عالم اپنے دوست عرفان صدیقی سے ہر دکھ سکھ شیئر کرتا رہتا تھا۔ اس مرحلے پر میں نے ڈاکٹر موصوف سے ایک ملاقات بھی کی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو وہ عدالت میں آکر گواہی دینے کو بھی تیار ہے۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ اگلے ہی لمحے ایما کی استفساریہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"وکیل صاحب! آپ کن تصویروں کا ذکر کررہے ہیں؟"

"وہی تصاویر جو مقتول نے اپنے یار غار ڈاکٹر عرفان صدیقی کے پاس امانتاً رکھوادی تھیں۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "اب وہ تصاویر میری کسٹڈی میں ہیں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں وہ فوٹوز معزز عدالت کی خدمت میں پیش کردیتا ہوں تاکہ عدالت یہ جان جائے کہ مقتول کو چڑچڑا، بدمزاج اور قنوطی بنانے کا اصل سبب کیا تھا۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر ایما ضدی مگر کمزور لہجے میں بولی۔ "وہ فوٹوز آپ میرے حوالے کردیں۔ میں اس کے بدلے میں آپ کو منہ مانگا انعام دوں گی۔"

"میڈم! میں اس عدالت میں اپنے مؤکل کو انصاف دلوانے کے لیے محنت کررہا ہوں۔" میں نے اس کے کان کے کیڑے جھاڑتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ "آپ کے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈال کر انعام وصول کرنے کے لیے ہرگز نہیں۔ اگر آپ نے معزز عدالت کے سامنے اقبالِ جرم نہیں کیا تو پھر میں آپ کی بے وفائی کا ناقابلِ تردید ثبوت یہ شرمناک تصاویر عدالت کے سپرد کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور یہ فوٹوز۔" وہ آپے سے باہر ہوگئی اور حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "جنید جیسے انسان نما لنگور کے ساتھ مزید زندگی گزارنا میرے بس میں نہیں رہا تھا اور میں نے ڈینئل اسپتال کے مالک سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔"

"میڈم! آپ کس مرد کو چھوڑ کر کس مرد کو اپنانا چاہتی تھیں، یہ میرا موضوع نہیں ہے۔" میں نے شائستگی کا دامن چھوڑے بغیر کہا۔ "میری ساری کوشش اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے بارے میں ہے۔ اگر آپ شرافت سے اس بات کا اقرار کرلیں کہ جنید عالم کو آپ نے ایک بھاری رقم کے عوض قادر بھائی کے توسط سے موت کے گھاٹ اتروا کر میرے مؤکل کو قربانی کا بکرا بنایا ہے تو میرا کام ختم ہوجائے گا۔"

"تم نے جو کرنا ہے، کرلو۔" وہ ہٹ دھرمی آمیز بدتمیزی سے بولی۔ "میں تم سے ڈرتی ہوں اور نہ ہی مجھے کسی کورٹ کچہری کی پروا ہے۔"

میں نے بہت ہی خاموشی کے ساتھ ایما کی نازیبا تصاویر والا لفافہ جج کے حوالے کردیا۔

اب تک میں نے جس اعتماد کے ساتھ اس کیس کو آگے بڑھایا تھا، اس کی روشنی میں عدالت نے آنجہانی ڈاکٹر ایما پر میرے مؤکل کو ناکافی ثبوتوں کی بنا پر اس مقدمے سے باعزت بری کردیا تھا اور ڈاکٹر ایما کو شاملِ تفتیش کرنے کے احکامات صادر کردیے تھے۔

پولیس نے مقتول کی بیوہ کی زبان کھلوانے میں کس حد تک کامیابی حاصل کی، یہ ایک الگ اور دلچسپ داستان ہے جس کا ذکر پھر کبھی سہی۔

اس کیس کے خاتمے پر پروفیسر مصدق حسین نے مجھے "پیش کار" کا ٹائٹل دے دیا تھا..... دوسروں کی مدد کرنے والا۔

(تحریر: حسام بٹ)

digest library.com https://www.urdutubes.com
Scanned with CamScanner

میں نے زیرلب گالی دی۔ اسٹیئرنگ کو پوری قوت سے گھماتے ہوئے گاڑی کو یوں سنبھالا کہ ایک ہولناک کھائی محض چند انچ کے فاصلے پر رہ گئی۔ بال بال بچنے پر سینے میں اٹکی سانس خارج کرکے میں اندھی موسلا دھار بارش میں گاڑی دوڑاتا چلا گیا۔

پانی میں بھیگی مٹی کی سڑک پر گاڑی کبھی ایک طرف پھسلتی، کبھی دوسری طرف لڑکھڑاتی رہی۔ میں کیچڑ سے اٹے شیشے کے پار جھانک کر دیکھ رہا تھا، اس امید میں کہ اب

بلائے ناگہانی

عائشہ نور

کبھی کبھی کوئی افتاد اچانک آجاتی ہے... اور مزے کی بات یہ کہ آنے والی مصیبت جس کی وجہ سے آتی ہے، اس سے آپ کا دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا... وہ بھی کچھ اسی طرح پھنس گیا تھا... ایک ناکردہ فعل اس کے سر تھوپا جارہا تھا اور موت سر پر منڈلا رہی تھی... اس کی جان بچتی یا نہیں... یہ تو اس کی قسمت پر منحصر تھا۔

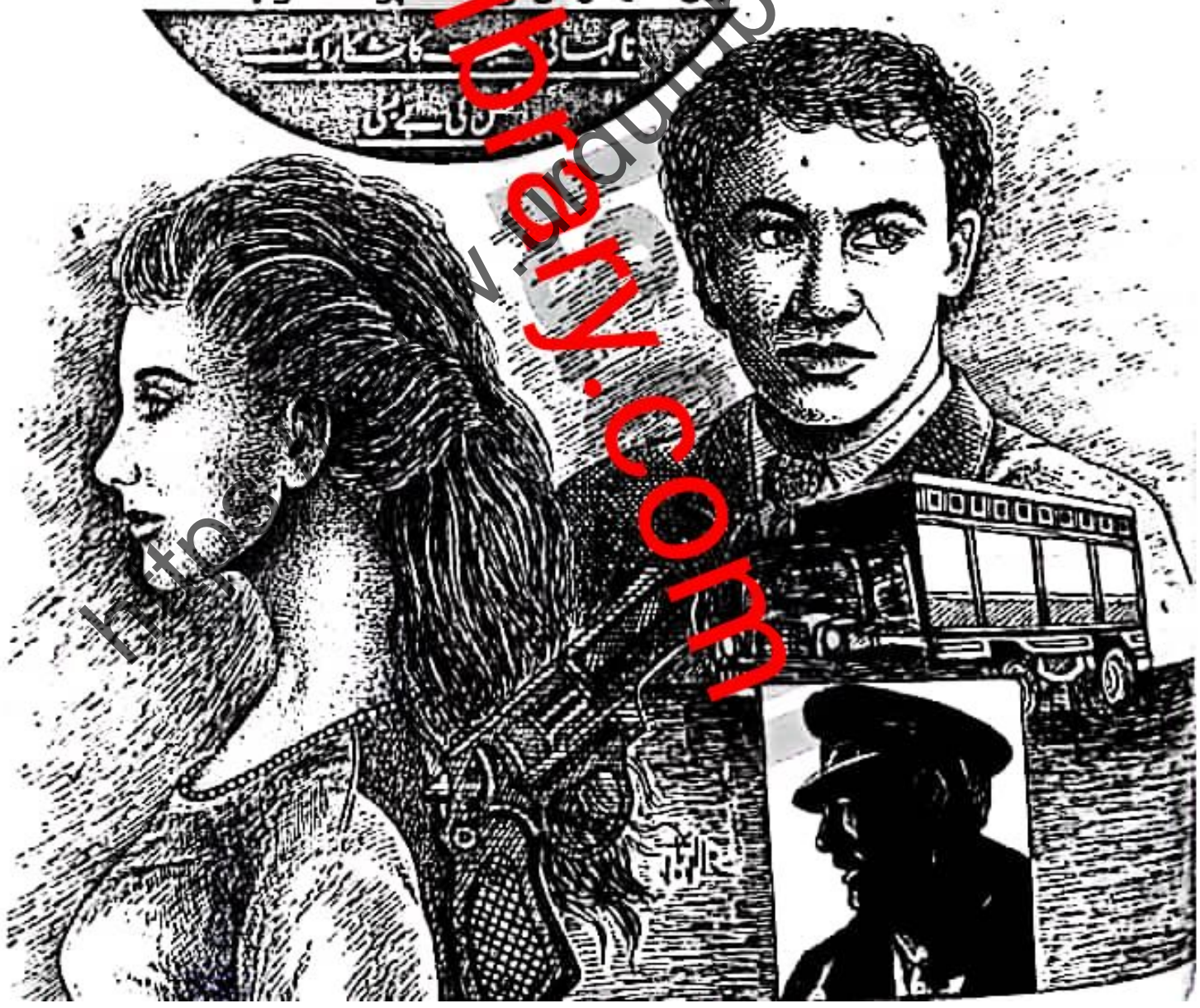

https://www.paksociety.com

Scanned with CamScanner

منزل نظر آ ہی جائے گی۔ آخرکار جب مجھے لگنے لگا کہ اب ایک میل بھی گاڑی چلانا میرے بس میں نہیں، تو دور کہیں شہر کی روشنیاں نمودار ہوگئیں۔

گرم غسل، تازہ کھانا، نرم بستر اور عناصرِ فطرت سے طویل کشمکش کے بعد ملنے والا وہ سکون و اطمینان مجھے اپنی طرف کھینچ رہے تھے، بے خبر اس انجام سے جو میری زندگی کے خاتمے کا پیش خیمہ بننے والا تھا۔ میں تھکا ہوا تھا، بھوکا تھا، اعصاب جواب دے چکے تھے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ اس شہر میں میرا کیا چیز انتظار کر رہی ہے تو میں خوشی خوشی پوری رات گاڑی چلاتا رہتا۔

سیلز مین کے پاس ان شہروں اور قصبوں میں اپنے پسندیدہ ہوٹل ہوتے ہیں جہاں وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ چونکہ اس علاقے کی ذمے داری مجھے دیے دو برس سے زائد ہو چکے تھے اور میں تمام ہوٹلوں سے واقف تھا، اس لیے میں اسی ہوٹل کی طرف گیا جہاں ہمیشہ ٹھہرتا تھا۔ گاڑی پارک کر کے بیگ سنبھالتے ہوئے بل بوائے کے حوالے کیے اور لابی میں داخل ہوا۔ یہ میری عادت تھی کہ اندر آتے ہی چند لمحوں کے لیے سگار کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی سے گپ شپ ضرور کرتا۔

"کیسی ہو؟" میں نے مسکرا کر کہا۔ "آج کل کی تازہ گوسپ کیا ہے؟"

"قتل!" اس نے سرگوشی کی۔ "چند گھنٹے پہلے ہوا ہے۔"

سفر کرنے والے تاجر، مس لیزی کے معمول کے للیفوں اور ہلکی پھلکی باتوں سے خوب واقف ہوتے ہیں، اس لیے میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا، اس انتظار میں کہ ابھی اس کی مخصوص کھلی مسکراہٹ نمودار ہوگی مگر اس کا چہرہ سنجیدہ ہی رہا۔

"یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "اسٹیو ہالٹن نے آج دوپہر اپنی بیوی کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ ہائے، مجھے اس پر ترس آ رہا ہے..... اور عجیب بات ہے، مجھے اسٹیو ہالٹن پر بھی ترس آ رہا ہے۔"

"اور یہ اسٹیو ہالٹن کون ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ "اس نے اپنی بیوی کو کیوں مارا؟"

"لگتا ہے تم اسٹیو کو نہیں جانتے۔" اس نے وضاحت کی۔ "وہ ایک چھوٹی سی پینٹ کی دکان چلاتا ہے اور تم لوگ پینٹروں سے واسطہ ہی نہیں رکھتے۔ اس نے اپنی بیوی کو اس لیے مار ڈالا کہ اسے پتا چل گیا تھا وہ اس سے بے وفائی کر رہی ہے۔ دراصل وہ تم ہی جیسے کسی سیلز مین کے ساتھ چکر میں پڑ گئی تھی۔"

"خیر، اب تو وہ اس کی سزا پائے گا۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ پکڑا گیا تو۔" اس نے فوراً جواب دیا، پھر بولی۔ "اچھا ہے میں پولیس میں نہیں، ورنہ میں تو اسے پکڑ ہی نہیں پاتی۔ اسٹیو کا غصہ بہت خطرناک ہے۔"

سگریٹ کا ایک پیکٹ خرید کر میں نے اسے چھوڑا، استقبالیے پر جا کر اندراج کروایا، پھر اس لڑکے کے پیچھے پیچھے چل پڑا جو میرا سامان اٹھائے اس کمرے کی طرف لے جا رہا تھا جو میرے نام الاٹ ہوا تھا۔ چونکہ میں ہالٹن خاندان کو نہیں جانتا تھا اس لیے اس سانحے کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کمرے کی تنہائی میں، میں نے غسل کی تیاری کی، سفری بیگ کھول کر نہانے کا سامان اور کپڑے نکالے اور ٹب میں پانی کھول دیا۔

ابھی میں نے پانی بند کیا ہی تھا اور ٹب میں قدم رکھنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز دے کر پوچھا کہ کون ہے، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے غسل کا گاؤن پہنا اور دروازہ ذرا سا کھول کر جھانکا کہ دیکھوں کون آیا ہے۔ یکایک کسی نے دروازہ زور سے اندر کی طرف دھکیلا اور میں لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا گرا۔ بڑی مشکل سے توازن سنبھالا اور ایک ایسے آدمی کے سامنے آ کھڑا ہوا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے تیزی سے دروازہ بند تو کر دیا مگر لاک لگانا بھول گیا۔

"آخر تم مجھے مل ہی گئے۔" وہ غرایا۔ اس کی آواز بھاری، بھدی اور سرگوشی نما تھی۔

اس کی اچانک آمد نے مجھے سن کر دیا تھا، خوف کے مارے زبان گنگ تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اس دیوہیکل آدمی کو دیکھا جو مجھ پر سایہ کیے کھڑا تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی نہ تھی، گھنے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ سرخی آنکھیں سکڑی ہوئیں اور نفرت سے دہک رہی تھیں۔ ہونٹ کے کونے سے خون کی باریک دھار بہہ رہی تھی، سانس اکھڑا اکھڑا تھا۔ پھٹی ہوئی بھوری قمیص کے نیچے اس کا بالوں بھرا سینہ جذبات کے طوفان میں تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے آخرکار ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں!" وہ کھردری آواز میں بولا۔ "تم نے میرا گھر اجاڑا ہے تو مجھ سے یہ امید مت رکھنا کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا۔"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

اس کی آواز میں ایسی ٹھنڈی دھمکی تھی کہ میرا خون منجمد ہو گیا، زبان تالو سے چپک گئی اور یوں لگا جیسے سوچنے سمجھنے کی ساری قوت سلب ہو گئی ہو۔ میں جان گیا تھا کہ میں موت کے سامنے کھڑا ہوں مگر بات تو مجھے کرنی ہی تھی۔ میں نے بکھرے ہوئے حواس پر قابو پانے کی پوری کوشش کی، اس یقین کے ساتھ کہ تیز اور حاضر دماغی ہی مجھے سرِ بازار قتل ہونے سے بچا سکتی ہے۔

"نن ـــ نہیں، پلیز! گولی مت چلانا۔ میں نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"ٹال مٹول ـــ جھوٹ پر جھوٹ۔" وہ کف اڑاتا ہوا چلایا۔

"خدا کے لیے گولی مت چلانا۔" میں نے فریاد کی، جب میں نے دیکھا کہ اس کی انگلی ٹریگر پر اور سخت ہو رہی ہے اور دباؤ سے اس کی انگلیاں سفید پڑتی جا رہی ہیں۔ "تم غلط آدمی کو پکڑے ہوئے ہو۔ میں وضاحت کر سکتا ہوں۔"

"کوئی وضاحت نہیں۔" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ "اسٹیو ہلٹن کو کوئی وضاحت نہیں دی جا سکتی۔"

اچانک بجلی کے کوندے کی طرح وہ بات یاد آ گئی جو کچھ دیر پہلے سگار کاؤنٹر والی لڑکی نے مجھے سنائی تھی۔ میں ایک قاتل کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک ایسا آدمی جس نے چند گھنٹے پہلے ہی اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔ وہ بھلا مجھے گولی مارنے میں کیوں ہچکچاتا۔

یہ بات بے معنی تھی کہ وہ میری شناخت میں غلطی کر رہا تھا کیونکہ وہ اب کسی دلیل، کسی بات چیت، حتیٰ کہ کسی منطق کے بھی دائرے سے باہر جا چکا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح وقت گزاروں، اس امید کے ساتھ کہ شاید کسی صورت مدد آن پہنچے۔ ہر لمحہ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اب اس کے ریوالور سے سیسہ اگلنا شروع ہو جائے گا۔

"میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں وہ آدمی نہیں ہوں جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔" میں چیخ پڑا۔ "میں....."

"چپ رہو۔" وہ بھڑکا۔ "تم نیلی شیورلیٹ چلاتے ہو، صابن بیچتے ہو۔ جب تم ہوٹل کے سامنے آئے تھے تو میں نے تمہاری گاڑی پر لگا بورڈ دیکھ لیا تھا۔ تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ تم نے مجھ سے میری بیوی چھین لی، اب انجام بھگتو۔"

"میں واقعی ایسی ہی گاڑی چلاتا ہوں اور صابن ہی بیچتا ہوں۔" میں نے مان لیا۔ "مگر میں تمہاری بیوی کو جانتا تک نہیں۔ مجھے ثابت کرنے دو۔"

"جھوٹ۔" وہ گرج کر ٹہلنے لگا مگر پستول کا رخ ہنوز میری طرف تھا۔ "تم بالکل اسی آدمی کی شکل و صورت رکھتے ہو جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم ہی وہ ہو۔"

"مجھے کچھ خط دکھانے دو، مجھے ثابت کرنے دو کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔" میں ٹھنڈے پسینے میں نہا چکا تھا۔

"تمہارا نام میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔" اس نے بے رحمی سے جواب دیا اور ایک قدم میری طرف بڑھا۔

میں دیوانہ وار اس ناگزیر انجام کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "اگر تم نے مجھے مار دیا تو تم پھانسی چڑھو گے۔" میں نے بوکھلاہٹ میں کہا۔ "ہو سکتا ہے اپنی بیوی کے قتل پر تمہیں کوئی رعایت مل جاتی، کوئی عذر قبول ہو جاتا مگر ایک بے گناہ آدمی کا قتل تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔"

"تو تم کہتے ہو کہ تم صحیح آدمی نہیں ہو؟" اس نے تمسخر سے کہا۔ آنکھوں میں مکاری کی چمک تھی۔ "پھر تمہیں میری بیوی اور اس کے ساتھ جو میں نے کیا، اس سب کا پتا کیسے ہے؟ اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ تم ہی وہ شخص ہو۔"

اس کی کھردری، سرد ہنسی میرے وجود کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے ایک ہولناک غلطی کر دی تھی۔ یہ مان کر کہ مجھے کچھ معلوم ہے۔ مایوسی میں میرے ذہن میں خیال آیا کہ اس پر جھپٹ پڑوں، اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کروں مگر میں رک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری ذرا سی بھی جارحانہ حرکت فوراً گولی بن کر لوٹے گی۔ میں ساکت کھڑا رہا، بالکل بے بس۔ تمام حیلے ختم ہو چکے تھے۔

اب وہ گولی چلانے میں عجلت نہیں دکھا رہا تھا بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے اذیت دینا چاہتا ہو۔ "تمہیں میری بیوی چاہیے تھی..... احمق!" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "اور تم نے اسے پا بھی لیا۔ میں نے آج دوپہر اسے جہنم روانہ کر دیا۔ اب میں تمہیں بھی اس کے پاس بھیجنے والا ہوں۔" وہ ایک لمحے کو رکا، شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گھورا پھر بولا۔ "اب یہاں مزید تماشا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے بات ختم کر دی جائے۔"

میں جان گیا تھا کہ اب میرا انجام قریب ہے۔ گولی چلنے کے انتظار میں، میں ہزار بار مر چکا تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا تو دروازہ بند کر کے چند قدم آگے بڑھ آیا تھا۔ میں موت کے انتظار میں کھڑا تھا کہ بے اختیار میری نظر

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

اس کے پیچھے دروازے پر پڑی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ دروازے کا ہینڈل ہل رہا تھا۔ بے اختیار ہو کر میں نے دیکھا کہ وہ آہستہ آہستہ گھوم رہا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ دروازے کے پیچھے کھڑا شخص وقت پر اسے کھول دے اور میری جان بچ جائے۔

دروازہ ذرا سا کھلا، پھر چرچراہٹ ہوئی۔ ہلٹن نے آواز سن لی۔ ایک پل کے لیے اس کے ہاتھ میں پکڑا ریوالور لڑکھڑایا۔ میں خود کو روک نہ سکا، میری چیخ نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے ایک اندھا کر دینے والی چمک ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے دہکتی ہوئی سیخ میرے سر کے آر پار گزر گئی ہو اور پھر ہر طرف تاریکی چھا گئی۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو کمرے کے بستر پر پایا اور ایک سفید کوٹ پہنے ڈاکٹر میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

"بس سر میں ہلکی سی خراش آئی ہے۔" میں نے اسے کہتے سنا۔ "چند منٹ میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

میرا پہلا خیال یہی تھا کہ واقعی زندہ بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر سر چکرایا اور مجھے دوبارہ تکیے پر ڈھیر ہونا پڑا۔ کمرا لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ فرش پر ایک زخمی پولیس افسر پڑا تھا۔ اسے اسٹریچر پر لٹا کر باہر لے جایا گیا۔

ایک خوش لباس نوجوان میرے بستر کے پاس آیا اور کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا تعارف ایک رپورٹر کے طور پر کروایا اور فوراً سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ میں نے تجویز دی کہ اگر وہ مجھے یہ بتا دے کہ میرے زخمی ہونے سے پہلے اور بعد میں کیا ہوا، تو میں اسے اپنی پوری کہانی سنا دوں گا۔ وہ ہنستے ہوئے اس سودے پر راضی ہو گیا۔

جب میں نے کمرے میں پیش آنے والے تمام واقعات سنا دیے تو اس نے بتایا کہ کسی نامعلوم شخص نے پولیس کو فون کر کے اطلاع دی تھی کہ اس نے ہلٹن کو چوری چھپے ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ فوراً پوری عمارت کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا اور تلاشی شروع کر دی گئی۔

ہر منزل پر دو دو پولیس اہلکار تعینات کیے گئے تھے اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ ایک ایک کمرا چیک کریں۔ جس منزل پر میں تھا، وہاں کمروں کی تلاشی لیتے ہوئے ایک پولیس والے نے ہلٹن کی آواز سن لی اور پہچان بھی لی۔ میری نازک حالت کو بھانپتے ہوئے، باتیں سن کر اور یہ جانتے ہوئے کہ مدد بلانے کا وقت نہیں، اس نے اکیلے ہی ہلٹن کو پکڑنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ اچانک حملہ ہی اس کا واحد ہتھیار تھا اور دروازہ کھلا دیکھ کر اس نے خاموشی سے اندر داخل ہونے کی کوشش کی..... مگر بدقسمتی سے دروازہ چرچرا گیا اور اس کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔

پھر بھی بجلی کی تیزی سے حرکت میں آ کر وہ پولیس والا اندر لپکا۔ ہلٹن، جو مجھے مارنے پر تلا ہوا تھا، اس نے جان بوجھ کر مجھ پر گولی چلائی مگر عین اسی لمحے پولیس افسر کے جھپٹنے سے اس کا نشانہ بگڑ گیا۔ پولیس والا چھلانگ لگاتے ہوئے اپنا توازن کھو بیٹھا اور سنبھلنے سے پہلے ہی ہلٹن نے اسے گولی مار دی، پھر وہ میری طرف دوبارہ فائر کرنے ہی والا تھا کہ اسی منزل پر موجود دوسرا پولیس اہلکار اس پر جھپٹ پڑا اور گولیوں کی آواز سن کر پہنچنے والے دیگر اہلکاروں کی مدد سے اسے قابو میں کر لیا گیا۔ اب وہ جنوبی ریاست کی ایک جیل میں عمر قید کی سزا کاٹے گا۔

رپورٹر نے یہ بھی بتایا کہ جس شخص کو ہلٹن دراصل قتل کرنا چاہتا تھا، وہ پورے وقت اسی ہوٹل میں موجود تھا جب پولیس ہلٹن کی تلاش میں مصروف تھی۔ محض ایک عجیب اتفاق یہ تھا کہ وہ بھی میری ہی طرح کی گاڑی چلاتا تھا اور صابن ہی بیچتا تھا۔ اس کے سوا ہماری کوئی مماثلت نہ تھی۔

ایک گھنٹے کے آرام کے بعد میں نے خود کو خاصا بہتر محسوس کیا، چنانچہ کپڑے بدل کر لابی میں آ گیا۔ سگار کاؤنٹر کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ مس ٹیری نے مجھے لفٹ سے اترتے دیکھا تو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔

میں قریب پہنچا تو وہ زور سے بولی۔ "دیکھو بھئی، ہیرو آ گیا۔ اب ہم یہ کہانی براہِ راست سنیں گے۔"

"اس بابت تم بھی اتنا ہی جانتی ہو جتنا میں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم سے تو کوئی بات چھپتی ہی نہیں..... نظر باز۔"

"بالکل درست۔" وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ "مگر تمہاری خوش قسمتی یہی ہے کہ میں اس جگہ ہونے والی ہر حرکت پر نظر رکھتی ہوں۔ میری یہی تیز نظر تھی جس نے ہلٹن کو پچھلے راستے سے چوری چھپے داخل ہوتے دیکھا اور میں نے فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو آج تم زندہ نہ ہوتے۔ تم میرے قرض دار ہو لڑکے..... اور مجھے چاکلیٹ بہت پسند ہیں۔"

میں نے اسی وقت اسے پانچ پاؤنڈ کا ایک چاکلیٹ کا ڈبا گفٹ کیا۔ کچھ بھی تھا، مجھ پر آئی اس بلائے ناگہانی کو ٹالنے میں اس کا بھی حصہ تھا۔

✖✖✖

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

پُختہ عزم

اے آر راجپوت

بسا اوقات انسان ایسی غلطی کر جاتا ہے جس کا خمیازہ اسے تاحیات بھگتنا پڑتا ہے... اس سے بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا... مشرقی اور اسلامی ماحول میں پرورش کے باوجود اس کے قدم تھوڑے بہک گئے اور اس کی دوستی ایک لڑکے سے ہوگئی... پھر اچانک ایسا ہوا کہ زندگی کا دھارا ہی بدل گیا... مگر مشکلات کے باوجود وہ اپنے عزم پر قائم رہی۔

محبت میں دھوکا کھانے والی ایک لڑکی کی کتھا

بظاہر وقت چیونٹی کی طرح رینگ رہا ہوتا ہے لیکن جب پیچھے مڑ کر دیکھو تو جیسے پلک جھپکتے ہی بیت گیا ہو۔ یہی زنیرہ کے ساتھ ہوا تھا۔

آج جب وہ دریائے ٹیمز کے کنارے ایک سردی خوشگوار شام میں اس انڈین ائر ریسٹورنٹ میں فائر کے ساتھ کرسیاں ڈالے بیٹھی تھی، دیسی کباب (بیف کباب) کھاتے ہوئے وہ ذرا دیر کے لیے اپنے ماضی میں کھو گئی تو اسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔

digestlibrary.com
http://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

ماضی چند برسوں کا ہی سہی لیکن بیتا ایسے ہی تھا جیسے وقت کا پرندہ اُڑ چلا ہو۔

اسے وہ وقت یاد تھا جب وہ پاکستان میں اپنی لیمل آباد والی وسیع و عریض آبائی حویلی میں بالکل تنہا رہ گئی تھی جو شہر کے بالکل نواح میں واقع تھی۔ تب اس کی عمر بس سولہ سال ہی تو تھی۔ بے شک پرانے چند نوکر چاکر تھے لیکن وہ اپنے تو نہیں تھے نا، جن سے وہ بات کرتی، جن سے وہ سہارا محسوس کرتی۔

زنیرہ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ سب شادی شدہ تھے۔ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ تین بھائی لندن میں آباد ہو گئے تھے۔ بڑا بھائی ڈاکٹر تھا، دوسرے نے اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا اور کامیاب رہا تھا۔ تیسرا بھی کمپیوٹر سافٹ ویئر میں ہائر ڈگری کے لیے کوشاں تھا، ساتھ ہی ایک جگہ اچھی جاب بھی کر رہا تھا۔ بہن کی بھی وہیں شادی ہو چکی تھی۔

زنیرہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ اپنی آبائی حویلی میں رہ گئی۔ ماں باپ تھے تو اسے بہت سہارا تھا مگر اسی دوران ماں کو بیٹوں نے علاج کے لیے لندن بلوا لیا۔ تقدیر کی ظرفہ کاری تھی کہ وہاں ان کا اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ چالیس سال کی رفاقت اور پھر یوں اچانک جدائی نے زنیرہ کے باپ کو غم سے نڈھال کر دیا۔ اس قدر کہ وہ بیمار رہنے لگے۔ یہاں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو بیٹوں نے انہیں بغرض علاج لندن بلوا لیا۔

یوں زنیرہ حویلی میں بالکل تنہا رہ گئی۔ اس کی عمر ہی کیا تھی اس وقت — صرف سولہ، سترہ سال۔ اتنی بڑی حویلی میں اسے ہول آتا۔ سب لوگ اسے شکاری بھیڑیوں کی طرح نظر آنے لگے۔ وائے نصیب کہ اسی دوران اسے بھائیوں نے باپ کے مرنے کی بھی اطلاع دے دی اور ساتھ ہی اسے بھی تاکید کر دی کہ وہ بھی اب لندن انہی کے پاس آنے کی تیاری کرے، ہم ایسا لسر شپ اور ٹکٹ روانہ کرنے والے ہیں۔ رہی حویلی، تو کبھی وقت ملا تو آ کر خود ہی فروخت کرا لیں گے، وغیرہ۔

ظاہر ہے اب وہ کیا کرتی یہاں تنہا رہ کر۔ سو، اس نے ویزا کے لیے اپلائی کر دیا۔ چھ ماہ بعد اب وہ بھی لندن میں تھی۔ یہاں آ کر اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی اور بھتیجے، بھانجے سب ہی یہاں کی تہذیب میں رنگے ہوئے تھے۔ بقول ان کے، جیسا دیس ویسا بھیس۔ تاہم ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی روایات اور اسلامی اقدار قائم رکھی ہوئی تھی۔

یہاں اس نے اسکول اور پھر کالج جوائن کر لیا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات فائز سے ہو گئی۔ اس کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ اچھا، وجیہہ اور سلجھا ہوا لڑکا تھا، با اخلاق بھی تھا۔ زنیرہ کو وہ پسند تھا اور اس سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ کالج میں اس سے ایک سال سینئر تھا، اسی نے ہی اسے یہاں کے نشیب و فراز سمجھائے تھے اور چند ہی دنوں میں وہ مکمل مل گئے تھے۔ تاہم ابھی تک زنیرہ اس کے خاندانی پس منظر سے ناآشنا تھی۔

"آج ہم نائٹ کلب جائیں گے۔" اس روز دریائے ٹیمز کے کنارے ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے فائز نے اچانک اس سے کہا تو زنیرہ چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگی، پھر جب اس کے استفسار پر اس نے شبینہ کلبوں کی تفصیل بتائی تو زنیرہ کا جیسے اندر "ترخ" گیا۔ وہ فائز کو کیا سمجھی تھی اور وہ کیا نکلا۔ دونوں کی دوستی کے درمیان معاملہ ابھی دل تک تو نہیں پہنچا تھا مگر انسیت اور پسندیدگی موجود تھی۔ فائز بھی اسے ابھی تک اچھا اور با اخلاق ہی لگا تھا لیکن آج زنیرہ کو ایسا لگا جیسے اس کے وجیہہ چہرے سے نقاب اتر گیا ہو۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور نفرت بھرے لہجے میں فائز سے بولی۔

"تم سے مجھے اس قدر گندگی کی امید نہ تھی فائز —! تم اس قدر گھٹیا نکلو گے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" اس کا خیال تھا کہ فائز بھی اسے ایسا ہی کڑا جواب دے کر نکل جائے گا مگر وہ شرمسار ہو گیا اور اس سے معافی مانگتا رہا، اس وقت تک جب تک زنیرہ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو گیا۔

"پلیز، مجھے غلط مت سمجھو زنیرہ! میں نے تو یہ محض یاروں میں کہا تھا، ایک ذکر کیا تھا۔ یقین کرو، میں کبھی وہاں نہیں گیا۔ چند گورے فرینڈز سے ہی سنا تھا۔ بس ایک تجسس سا تھا۔ سوری، آئندہ کبھی تم سے ایسا نہیں کہوں گا۔"

زنیرہ نے اس کی پہلی اور آخری غلطی جان کر اسے معاف کر دیا۔ تھوڑی دیر روٹھنے کے بعد وہ مان گئی۔ کچھ دور ایے میں ان دونوں نے ایک ایک کلاس پاس کر لی۔ زنیرہ نے اب تک اپنے اور فائز کے درمیان ایک معقول فاصلہ رکھا ہوا تھا۔

کچھ وقت فائز کی سنگت میں اسی طرح بیت چلا۔ یوں ایک روز دونوں سیر کو نکلے، بگ بین اور پارلیمنٹ کی

https://www.urdufunbooks.com

Scanned with CamScanner

digest library.com

عمارتیں دیکھیں، دریائے ٹیمز کی سیر کی۔ شام ہو چلی تھی، دونوں ایک ریسٹورنٹ ہال میں آن بیٹھے۔ زنیرہ مینیو پڑھنے لگی۔ فائز نے ویٹر کو آواز دی۔ زنیرہ نے بے خیالی میں سر اٹھایا تو ویٹر پوچھ رہا تھا۔

"سر اسٹارٹر کے بعد کیا لینا پسند کریں گے، کافی یا چائے؟"

فائز نے مستفسرانہ نظروں سے زنیرہ کی طرف دیکھا۔

"چائے۔" اس نے کہا۔

زنیرہ کی بھوک زوروں پر تھی۔ اس نے پیٹ بھر کر کھایا۔ کھانے کے بعد چائے پی اور مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ ویٹر کو بل دینے کے بعد فائز نے زنیرہ سے مسکرا کر پوچھا۔

"کھانا کیسا تھا؟"

زنیرہ نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "بڑا لذیذ اور اچھا پکا ہوا تھا۔"

اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "کیوں نہ ہوتا، سب سے مہنگا پورک (خنزیر کا گوشت) جو تھا۔"

یہ سنتے ہی زنیرہ جیسے آپے سے باہر ہو گئی۔ اس سے رہا نہ گیا اور اس نے ایک زوردار تھپڑ فائز کے منہ پر رسید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے ابکائیاں آنے لگیں۔ منہ پر رومال لپیٹ کر بیسن کی طرف بھاگی اور سارا کھانا الٹ دیا۔

اس وقت وہ پسینے سے شرابور ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ پلٹ کر دیکھا تو سارا ہال حیران تھا۔ فائز اس کے قریب ہی سٹا کھڑا تھا۔ ہال کے لوگ اتنی سے زیادہ تھپڑ کی آواز پر چونکے تھے اور ششدر ہو کر دیکھ رہے تھے۔ زنیرہ باہر نکلی۔ اتفاق سے ایک سکھ ڈرائیور کی ٹیکسی اس کے قریب آن رکی۔ وہ اس میں بیٹھ گئی اور ڈرائیور سے کہا۔

"نیکسٹ سٹریٹ۔"

ٹیکسی والا سے باتیں کرنے لگی۔ ڈرائیور اس کا سوا بھائپ چکا تھا۔ سارے راستے وہ بڑبڑاتی رہی۔

"میری ماں میرے دل میں زندہ ہے، میرا باپ مجھ میں زندہ ہے، میرا خدا مجھ میں موجود ہے۔ میں اس خنزیر کی اولاد کو قتل کر دوں گی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

زنیرہ کو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ مصلے پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہو۔ تخت پوش پر والد صاحب تسبیح لیے بیٹھے ہیں اور وہ بھی دھو کر دی ہے۔ اذان اس کے کانوں میں گونج رہی ہے۔

☆☆☆

زنیرہ پورا ایک مہینا فائز سے دور رہی۔ وہ اس راہ پر سے بھی نہ گزرتی جہاں وہ دکھائی دیتا، وہ بھی اسے دور سے دیکھتا رہتا اس نے قریب آنے کی کوشش کی بھی تھی لیکن زنیرہ کے تیور دیکھ کر ایک طرف کو کھسک جاتا۔

دن اسی کشمکش میں گزرتے رہے۔ زنیرہ ایک دو وقت نماز بھی پڑھنے لگی۔ دین اس کی فطرت میں تھا لیکن اس کی زندگی کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اس کے یہاں گھر کا ماحول کسی انگلش گھرانے کا سا تھا۔ دونوں بڑے بھائی ساتھ ہی رہتے تھے۔ ایک ہی گھر تھا، اوپر نیچے۔ نہ مصلے نہ تسبیح اور نہ ہی ایسی کوئی چیز جس سے گمان ہو کہ یہ کسی مسلمان کا گھرانا ہے۔ البتہ لائبریری کی الماری میں کئی ایک قرآن مجید موجود تھے جو لائبریری دکھاتے وقت کسی مہمان کو فخریہ دکھائے جاتے تھے۔ ان میں انگریزی، جرمن اور فرنچ ترجمہ شدہ بھی تھے۔

بڑے بھائی اسے لیکچر دیتے وقت ضرور کہا کرتے تھے کہ سب کچھ چلا جائے تو فکر نہ کرنا مگر اپنے کیریکٹر کو کسی صورت برباد نہ کرنا..... اور وہ سوچتی رہتی کہ مذہب گیا تو کیریکٹر بھی گیا۔

ایک روز زنیرہ کا فری پیریڈ تھا اور وہ لان میں بنچ پر بیٹھی انہی سوچوں میں گم تھی کہ اتنی دوری اور نفرت کے باوجود فائز میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا؟ شاید اسے مجھ سے محبت ہے۔ پھر سوچتی کہ مجھے اس دشمنِ دین و ایمان کی یاد کبھی کبھی کیوں آ جاتی ہے؟ شاید مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی ہے۔ ابھی وہ انہی خیالوں سے پیچھا نہ چھڑا سکی تھی کہ ایک سایہ سا لہراتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

یہ فائز تھا۔ پل بھر میں کیا سے کیا ہو گیا، کوئی گلہ رہا نہ کوئی شکوہ..... زنیرہ بنچ کے سامنے سحر زدہ ہو کر کھڑی ہو گئی، کتابیں یکدم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئیں۔ اس کے کان سُن ہو رہے تھے۔ وہ بولا۔

"زنیرہ ڈیئر! مجھے دلی افسوس ہے کہ میں نے تمہیں بڑا دکھ دیا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ تم مجھ سے ملو نہ ملو، تعلق رکھو یا نہ رکھو لیکن اتنا کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ میں ضمیر کی بھٹی میں جل رہا ہوں۔ اس کی تپش میں ہر روز تڑپتا ہوں۔ تم مجھے معاف کر دو گی تو مجھے سکون مل جائے گا۔"

نہ جانے اس کے لہجے میں کیا تھا کہ بے اختیار زنیرہ رو دی اور اپنا سر اس کے کندھے سے لگا کر سسکیاں لینے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

گئی۔ جب وہ جدا ہوئے تو ہلکے پھلکے تھے پھر ہنستے مسکراتے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔

وقت گزرتا رہا۔ فائز اب بڑا ہی محتاط ہو گیا تھا۔ زنیرہ کو اس کی ذات سے محبت تھی لیکن اس کے کرتوتوں سے نفرت تھی۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا مرد تھا جس نے اسے متاثر کیا تھا۔ نہ صرف متاثر کیا بلکہ دامِ محبت میں گرفتار بھی کر لیا تھا لیکن اسے یہ خوف بھی تھا کہ وہ اللہ کی بتائی ہوئی راہِ مستقیم سے بھٹک رہی ہے۔

یوں زنیرہ عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھی مگر وقت کہاں رکتا ہے۔ موسم بدلتے اور گزرتے رہے۔ وہ بڑی ہی یادگار شام تھی جب وہ دونوں ایک ڈراما شو دیکھ کر تھیٹر سے نکلے۔ زنیرہ پر اس وقت ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ رفتہ رفتہ وہ خود کو اس ظالم شخص سے ہارا ہوا ہی محسوس کرنے لگی تھی۔ شاید محبت اسے ہی کہتے ہیں کہ پیارا شخص جیسا بھی ہو بس اچھا لگتا ہے۔ اس کی خوبیوں سے ہی نہیں، برائیوں سے بھی پیار کرنا پڑتا ہے کہ یہی تو اصل پیار ہوتا ہے۔ زنیرہ جب بھی اس کے ساتھ ہوتی، خود میں بے اختیاری سی محسوس کرنے لگتی۔ اس کا دل چاہتا کہ اس کے دامن میں سمٹ جائے۔

وہ دونوں ایک قریبی پارک میں چلے گئے اور درمیان میں بنی ہوئی سڑک پر ٹہلتے ہوئے ہلکے پھلکے موڈ میں باتیں کرنے لگے۔ زنیرہ نے اس سے پوچھا۔

"اسٹڈی مکمل کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے، کیا کرو گے؟ یہیں رہو گے یا وطن جاؤ گے؟"

فائز نے ایک ہنکاری لی اور جواب میں بولا۔

"شادی کروں گا اور یہیں رہوں گا۔ میں آزاد خیال مسلمان ہوں۔ تمہارے ڈاکٹر بھائی اسد کی طرح انسانیت کی عظمت پر یقین رکھنے والا انسان ہوں۔ میرے والدین دقیانوسی خیالات کے ہیں۔ میری کوشش ہے کہ میں نافرمان نہ بنوں، ان کا دل نہ دکھاؤں۔ میرے نزدیک دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے اور پھر اپنے ماں باپ کو دکھ دینا تو کسی طور بھی جائز نہیں ہے۔"

زنیرہ یہ سن کر حیران سی ہوئی اور اسی انداز میں مستفسر ہوئی۔ "اگر تم دل دکھانے کو اتنا بڑا گناہ سمجھتے ہو تو یہ اصول بغیر خدا کے ماننے کے کیسے قائم کر سکتے ہو؟ مذہب بھی کچھ سکھاتا ہے۔" جس وقت زنیرہ یہ کہہ رہی تھی تو اس وقت خود اس کا دل کہہ رہا تھا کہ "تم خود کون سی صحیح مسلمان ہو۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں خدا کو مانتا ہوں مگر بے جا پابندیوں کا پاس کرنا میرے بس کی بات نہیں۔"

زنیرہ اس کا جواب سن کر خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد وہ رُکا اور بڑے عزم کے ساتھ بولا۔ "میں تم سے شادی کروں گا۔"

جانے اس کے لہجے میں والہانہ پن تھا یا پھر جنونِ وفا، زنیرہ یہ سنتے ہی مسرور سی ہو گئی۔ وجہ یہی تھی کہ اس نے پہلا سوال فائز سے اسی نیت سے ہی تو پوچھا تھا۔

یوں وہ دونوں بڑے اطمینان کے ساتھ شب و روز گزارتے رہے۔ فائز نے بری حرکتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔ حیرت کی بات تو زنیرہ کے لیے یہ تھی کہ پینا پلانا تو کجا، وہ سگریٹ نوشی تک نہیں کرتا تھا۔ جمعے کی نماز بھی ادا کرنے لگا تھا۔ اب زنیرہ کی غیرتِ اسلامی نے اسے بھی جھنجوڑ ڈالا اور اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔

اس نے خود اپنے گریبان میں بھی جھانکا اور خود سے سوال کیا کہ میں کس قسم کی مسلمان ہوں؟ اسے تو صحیح مسلمان بنانا چاہتی ہوں مگر خود کیا ہوں؟ اس سوچ نے اس میں انقلاب پیدا کر دیا اور اس نے باقاعدہ نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اس کی دیکھا دیکھی بڑے بھائی اسد، چھوٹے بھائی منیر اور بھابیاں بھی کبھی کبھی نماز پڑھنے لگے، مگر ان کی اولادیں جو اسی سرزمین پر پیدا ہوئی تھیں، ان کے برعکس اطوار بدلنا زنیرہ کے بس میں نہ تھا۔

ایک روز وہ دونوں بہت اچھے موڈ میں تھے۔ فائز نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا اور کہا۔ "تم حلفیہ مجھ سے عہد کرو کہ تم مجھ سے ہی شادی کرو گی۔"

زنیرہ نے بلا تامل اثبات میں جواب دیا اور دونوں نے کہا کہ ہم اللہ کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ ہم آج سے ایک دوسرے کے ہیں اور ہم شادی بھی ایک دوسرے سے ہی کریں گے۔

یوں دونوں روز ہی ملتے تھے مگر اب ایک دوسرے کے گھر بھی آنے جانے لگے۔ زنیرہ کے ڈاکٹر بھائی اسد تو اسے جانتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے اس کی اور اس کی فیملی کی بہت تعریف کی تھی اور زنیرہ کے اس کے ساتھ ملنے جلنے سے اندازہ کر کے کہا تھا کہ اگر ان دونوں کی شادی ہو جائے تو یقیناً یہ دونوں بڑی مطمئن زندگی گزاریں گے۔

☆☆☆

فائز نے ایک روز زنیرہ کو اپنے گھر بلایا۔ اس روز اس کی ساری فیملی ہالی ڈے پر ایبٹ آباد روانہ ہو چکی تھی۔ وہ گھر میں اکیلا تھا۔ ان دونوں نے کچن میں اپنے ہاتھوں سے کھانے

https://www.urdutube.com/
Scanned with CamScanner

پکائے، پھر زنیرہ ستانے کے لیے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ فائز نے چائے دم کی اور ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

زنیرہ نے چائے پی تو بے ہوش ہو گئی۔ پھر کیا ہوا، اسے کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ ہوش میں آنے پر احساس ہوا کہ وہ لٹ چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور گھر چل دی۔ جاتے ہوئے اس نے فائز کی طرف دیکھا تو وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ۔"

دوسرے دن زنیرہ اس سے مسکراتے ہوئے ملی کیونکہ اس نے بقیہ ساری رات سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سے انتقام نہیں لے گی بلکہ اپنے اخلاق اور صبر سے اس کے دل کو پاک کر کے اسے فتح کرے گی۔ اس کا فائز سے بہتا سب سے بڑا اور بہترین انتقام ہوگا۔ شاید وہ اسے ضائع نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اسے اپنی پہلی اور آخری محبت کو سنوارنا تھا۔ اس کا داغ دھونا تھا۔

لہٰذا اس سے ملتے ہی اس نے کہا۔ "فائز! اس جلد بازی کی کیا ضرورت تھی، میں تو تمہاری تھی، تمہاری ہوں اور تمہاری ہی رہوں گی۔ ذرا صبر کرتے تو میں خدا اور معاشرے کے سامنے بھی شرمسار نہ ہوتے لیکن چونکہ انسان خطا کا پتلا ہے اس لیے میں درگزر کرتی ہوں، مگر تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا کہ شادی سے پہلے تم دوبارہ کوئی ایسی ناشائستہ حرکت نہیں کرو گے۔"

یہ سن کر وہ اتنا خوش ہوا جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ اس نے فرطِ مسرت سے زنیرہ کے پاؤں چھو لیے اور دونوں ہاتھ باندھ کر معافی مانگی۔ زنیرہ نے بھی اسے سچے دل سے معاف کر دیا۔

یوں دونوں حسبِ سابق اور حسبِ معمول ہنسی خوشی ملتے رہے لیکن زنیرہ نے اب تنہائی میں ملنے سے ہمیشہ گریز ہی کیا اور اس کے گھر کبھی نہ گئی۔ کالج میں اور دن کی روشنی میں پارک میں ملتے رہے۔ اس نے بھی کوئی غلط حرکت نہ کی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ اسٹڈی ختم کرنے کے بعد آئندہ گرمیوں میں شادی کر لیں گے۔

پھر زنیرہ کے بھائی ڈاکٹر اسد نے اس کے ماں باپ سے بات کی تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے سنا کہ زنیرہ صوم وصلوٰۃ کی پابند اور اسلامی روایات کی دلدادہ ہے تو انہوں نے فوراً ہامی بھر لی۔

مہینہ، سوا مہینہ گزرا تو اسے احساس ہوا کہ وہ ناکردہ گناہ کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ وہ فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچی اور

امریکا رے امریکا

شادی کے تیسرے ہفتے نام سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر اس نائٹ کلب میں چلا گیا جہاں وہ شادی سے قبل باقاعدہ جانے کا عادی تھا۔

کلب میں داخل ہوتے ہی بیوی کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے ایک لڑکی آئی، اس نے نام کا کوٹ اتارتے ہوئے پیار سے اس کے بال بکھیر دیے، پھر دوسری لڑکی آئی اور اس نے نام کے بال سنوار دیے۔ آخر میں آرڈر لینے کے لیے بار میڈ آئی اور نام کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "بہت دنوں کے بعد آئے ہو ڈارلنگ!"

بیوی کلب کی لڑکیوں کی حرکات برداشت نہ کر سکی اور اٹھ کر تیزی سے باہر کی طرف چل دی۔ اسے منانے کی کوشش کرتا ہوا نام بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔ باہر نکل کر اس نے ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ نام نے وضاحت کرنا شروع کر دی۔ "یہ ساری باتیں ماضی کی ہیں۔ اب میں اپنے ماضی کو دفن کر چکا ہوں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔"

"لیکن ڈارلنگ! میری بات تو سنو۔"

"نہیں۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

نام دیر تک اسے "میری بات تو سنو" کہتا رہا اور وہ جواب میں "نہیں، نہیں" کی رٹ لگائے رہی۔

اچانک ٹیکسی ڈرائیور نے بریک لگائے اور پیچھے گھوم کر بولا۔ "آج تم کتنی بے ہودہ اور بدتہذیب لڑکی کو پکڑ لائے ہو نام! اسے ٹیکسی سے نیچے دھکیل دو۔ میں تمہیں دوسری لڑکی کے پاس لیے چلتا ہوں جو تمہاری ہر بات سنے گی اور ہر بات پر "ہاں، ہاں" کرے گی۔"

(مرسلہ: خالد بٹ، لاہور)

https://www.urdufunbes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

اپنا معائنہ کروایا۔ اس نے بھی اس کے خیال کی تصدیق کردی۔ وہاں تو وہ سنجیدہ رہی لیکن گھر آکر وہ اپنا کمرا بند کرکے بہت روئی۔

اس دن وہ کالج بھی نہ گئی۔ ایک بار اس نے پھر ایک عزم کرلیا کہ وہ فائز سے مل کر اس مسئلے کو حل کرے گی۔ لہٰذا بڑی آس لے کر وہ کالج کھلنے سے کافی دیر پہلے گیٹ پر جا پہنچی اور انتظار کرنے لگی۔ بالآخر فائز کو آتا دیکھ کر اس کی طرف لپکی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر قریبی بینچ پر جا بیٹھی۔ یہاں کوئی کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔ یوں اس نے بغیر تمہید کے کہنا شروع کیا۔

"فائز.....! چاند پر گہن لگ گیا ہے۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ ہم جلد شادی کرلیں۔"

اس کی بات سن کر فائز پر جیسے بجلی سی گری اور اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "یہ نہیں ہوسکتا..... تم اس بلا سے جان چھڑالو۔ یہاں یہ کوئی اتنا اہم نہیں بلکہ رومین کیس ہے۔"

زنیرہ نے یہ سن کر اس کی طرف دیکھا تو اسے اس کی خوبصورت شکل کے بجائے ایک ایسے انسان کی شکل نظر آئی جو درندہ نما تھا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور اس سے کہا۔

"میں اس بچے کا قتل نہیں کروں گی۔ اس کے سوا تم جو قربانی مانگو گے، میں دینے کو تیار ہوں۔"

تب ہی فائز نے جھٹ سے کہا۔ "یہاں کوئی قربانی کام نہیں کرتی۔ تم میرا کہا مان لو، اپنی محبت کا ثبوت دو۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح رہیں گے۔ شادی میں کیا رکھا ہے۔"

زنیرہ یہ سن کر سر سے پاؤں تک لرز گئی لیکن ہمت نہ ہاری اور بولی۔ "ایسا نہ کہو فائز! تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ میرا کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔ یہ صرف تمہاری بھول ہے مگر میں اسے بھلادوں گی۔ تمہیں تاج بنا کر سر پر سجالوں گی۔ یہاں شادی ممکن نہیں تو ہم پاکستان چلتے ہیں۔ یہ بھی منظور نہیں تو ہم اسپین نکل چلتے ہیں..... وہاں ہمارے ہم وطن اور دوست ہیں جہاں ہم بہ آسانی شادی کرلیں گے۔"

یہ سن کر وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بڑے اطمینان سے بولا۔ "کل سوچ کر بتاؤں گا۔" اس کے بعد اپنا ہاتھ ہلا کر کلاس میں چلا گیا۔ وہ بیٹھی دیکھتی رہ گئی۔ پھر وہ کلاس کے بجائے گھر روانہ ہوگئی۔ تاہم اسے یقین نہ تھا کہ وہ اس کی بات مانے گا کیونکہ وہ پہلے بھی کئی بار عہد شکنی کرچکا تھا۔

نہ جانے پھر زنیرہ کے جی میں کیا سمائی کہ اس نے گھر آتے وقت ایک اسٹور سے اسٹیل کی تیز چھری لی۔ ارادہ تو اس کا یہی تھا کہ اگر کل اس نے انکار کردیا تو وہ اس کی جان لے لے گی۔ انہی سوچوں میں گم وہ گھر پہنچ گئی۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور ذرا سی دیر کو لیٹ گئی۔ ظہر کا وقت ہوا تو نماز پڑھی اور قرآن لے کر وقت سے پڑھتی رہی، روتی رہی، خود کو مجرم گردانتی رہی کہ آخر اس نے کیوں ایک غیر محرم کے ساتھ ناتا جوڑا، اس سے تنہائی میں ملی اور خود کو آگ کے حوالے کردیا۔ زنیرہ نے ہزار بار توبہ کی اور گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگتی رہی۔

"اے میرے خدا—! مجھے راہِ فلاح دکھا.....!"

دل ہلکا ہوا تو پھر سجدہ کیا اور اٹھ کر چائے بنانے کچن میں آگئی۔ چکنی چوبچے پر چڑھائی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے فائز کھڑا تھا— چہرے پر مسکراہٹ لیے ہوئے۔

☆☆☆

"زنیرہ.....!" وہ اسے دیکھ کر محبت سے بولا۔ "چلو، ذرا گھومنے چلیں، کچھ باتیں بھی کرلیں گے۔"

زنیرہ کے اندر امید کا دیا جلا۔ سمجھی کہ اس کی بگڑی بننے والی ہے لیکن پھر بھی اس کے ذہن میں چھری ساتھ رکھنے کا خیال فلش لائٹ کی طرح کوند گیا۔ اس نے کہا۔

"تم ذرا رکو، میں ابھی آئی۔"

پھر وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔ کوٹ پہنا، پرس لیا اور چھری کوٹ کی بیرونی جیب میں رکھ کر دوڑی دوڑی آگئی۔ فائز کار لایا تھا۔ اس نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھ گئی تو کار چل دی۔ اس کا رخ بیکھم پارک کی طرف تھا۔ پارک پہنچ کر وہ دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ وہ خاموش تھی۔ فائز نے خود ہی بات کی ابتدا کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"آج امی، ابو نے مجھے تمہارے بارے میں کہا تو میں نے انکار کردیا۔ دیکھو نا، زنیرہ.....! اگر شادی ہوجائے تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ وہ تمہاری تعریف کررہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ تمہارے بھائی سے اقرار کرچکے ہیں لیکن کل یہی لوگ کہیں گے کہ یہ لڑکی بدکردار ہے۔ اب تم ہی انکار کردو تو یہ بہتر رہے گا۔ بے شک میں نے تم سے شادی کا عہد کیا تھا مگر اب میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔"

زنیرہ نے یہ سن کر اپنی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لیے بڑے صبر اور حوصلے سے کہنا شروع کیا۔

"اگر میں اس مجبوری سے جان چھڑالوں جو تمہاری نشانی کے طور پر میرے وجود کا حصہ بن رہا ہے تو پھر کیا تم مجھ سے شادی کرلو گے؟"

https://www.urdufunbooks.com/

Scanned with CamScanner

"تم اس جھنجٹ میں کیوں پڑ رہی ہو؟ زنیرہ—— ہم ایک فیملی——"

فائز یہاں تک ہی کہہ پایا تھا کہ جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ زنیرہ کا ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے چلنے لگا۔ وہ نہتا بھی تھا، چور بھی تھا اور بے ایمان بھی، اسی لیے بزدل تھا۔ اس نے سوائے شور مچانے اور "ہیلپ..... ہیلپ" کی آواز نکالنے کے سوا کچھ نہ کیا اور غیر ارادی طور پر چھری والا ہاتھ پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر زنیرہ پر اس وقت جنون سوار تھا۔

فائز کا جسم لہولہان ہو گیا۔ اس کے جسم سے خون تیزی سے بہنے لگا، وہ گر گیا لیکن زنیرہ کی تو جیسے آتشِ انتقام سرد ہونے کو ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے گرے ہوئے فائز پر کئی ضربیں لگائیں۔ اتنے میں کافی لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ زنیرہ نے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور چھری ایک انگریز کو دے دی جو اس سے ہاتھ روکنے کی التجا کیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

فائز مر چکا تھا..... پولیس پہنچ گئی۔ انہوں نے آناً فاناً فائز کو اسپتال پہنچایا اور اسے قریبی پولیس اسٹیشن لے گئے۔ اخباری نمائندے، ٹی وی چینلز، سوشل میڈیا کے ولاگرز، کچھ بھی نہ جانے کہاں کہاں سے وہاں آن پہنچے تھے۔

زنیرہ کی آتشِ انتقام بجھ چکی تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے پولیس کے سامنے اعتراف کر لیا اور اس رات جیل میں سکون سے سوئی۔

دوسرے دن لندن کے سارے اخباروں، چینلز اور سوشل میڈیا پر یہ کہانی چل رہی تھی۔ مقدمہ چلا۔ ایک ماہ کے اندر اندر فیصلہ ہوا اور اسے سات سال کی سزا ہو گئی۔

وکیلوں کی ضد تھی کہ وہ ایسا بیان دے جو جج اور جیوری کے احساسات کو اپیل کرے اور وہ بری ہو جائے لیکن اس نے کوئی ایسی بات نہ کی۔ اتنا ضرور کہا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

جیل کے اندر اس کا بیٹا پیدا ہوا۔ اسے نہ تو قید میں تکلیف دی گئی نہ ہی بچے کی پیدائش کے بعد کوئی تکلیف ہوئی۔ اگر کوئی تکلیف ملی تو وہ اسے ضمیر کے ہاتھوں ملی۔ پھر اس کے دونوں بھائیوں کی کوششوں سے جنہوں نے اس کے لیے ایک اچھے قابل وکیل کا بندوبست کیا تھا، کیس میں اتنی پیشرفت ہوئی کہ اُسے "ریمانڈ میٹری" منتقل کر دیا گیا، تاہم زنیرہ کو اس کی بھلائی کی خاطر اسے ایک سال کے لیے "ریمانڈ میٹری" رکھا جانا تھا جہاں باہر آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

یوں جیل میں بھی اور ریمانڈ میٹری میں اس سے ملنے کے لیے بعض فیچر نگار اور سوشل میڈیا کے ولاگرز اس کی کتھا چھاپنے کے لیے آئے اور اس سے واقعے کی تفصیل جاننا چاہی لیکن زنیرہ نے سب کو جواب دے دیا۔

جیل اور ریمانڈ میٹری میں بہت سے نوجوانوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تھی جن میں کچھ مسلم لڑکے بھی تھے لیکن زنیرہ نے کسی کو بھی ایک حد سے آگے گزرنے نہ دیا۔ اس کے بھائی، بھابیاں اور ان کے سب بچے ہمیشہ ملنے اس سے وہاں بھی آتے رہے لیکن ان کے چہروں پر اس کے لیے نفرت کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ جب بھی آتے، اسے عبادت کرتا ہی پاتے تھے۔

☆☆☆

دو ماہ بعد ہی اس کی مکمل رہائی کے آرڈر آ گئے۔ بھائی، بھابیاں خوش تھیں۔ اس کی رہائی کا جشن منایا گیا مگر زنیرہ بجھی بجھی رہی۔ وہ اپنے اور اپنے بچے کے مستقبل کے حوالے سے کچھ سوچ رہی تھی۔

لڑکے کا نام اس نے آصف رکھا تھا۔ اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا—— اٹل فیصلہ..... جس پر وہ کاربند رہی۔ بھائیوں اور بھابیوں کو اس کے اس فیصلے سے ادا سی تو ہوئی لیکن وہ شاید اسی کی مرضی میں اس کی بھلائی کو سمجھ رہے تھے۔

ایک ماہ بعد زنیرہ اپنے ننھے منے بیٹے آصف کے ساتھ واپس پاکستان آ گئی اور اپنی فیصل آباد والی آبائی حویلی میں آن بسی۔ شوہر کی حویلی کو ابھی تک فروخت نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس کے دونوں بھائیوں کو اس کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ نوکر وہی پرانے تھے، دونوں ادھیڑ عمر میاں بیوی جو اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ آصف کے بارے میں زنیرہ نے یہی بتایا تھا کہ اس کا باپ اس کے پیدا ہوتے ہی ایک جانکاہ حادثے میں مر گیا تھا۔

زنیرہ یہاں آ کر بہت سکون محسوس کرنے لگی تھی جیسا کہ اس نے سوچا تھا۔ اس نے حویلی کا ایک پورشن کرائے پر اٹھا دیا تھا جس سے اس کی گزر بسر اچھی ہونے لگی۔

اب اس کا خواب فقط آصف ہی تھا اور اس کی اچھی پرورش۔ کم از کم اسے وہ فائز جیسا "شیطان" بننے دینا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کا پختہ عزم تھا۔

***

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

محفلِ شعر و سخن

⊛ سہیل احمد.....بھکر

میں وہ نہیں ہوں جس سے کہ روشن جہان ہو
مٹی کا ایک دیا ہوں مجھے بھول جایئے

⊛ عیوق بخاری.....ساؤتھ پنجاب

جلتی سی آنکھوں میں اک انتظار ہے
مضطرب سی زندگی ، دل بے قرار ہے
تعبیر ملنے کا پختہ یقین ہے کر
ایک ہی سپنا ، دیکھا بار بار ہے

⊛ محمد خالد.....نواب شاہ

جل رہے ہیں نہ بجھ رہے ہیں دوست
کس کے سینے کا داغ ہیں ہم لوگ

⊛ فراز بخاری.....ٹنڈو جام

ہائے مجبوریِ آدابِ محبت اے دوست
پاس آ بھی نہ سکوں تجھ کو بلا بھی نہ سکوں

⊛ ثمرین عزیز..... ٹنڈو الہیار

کس طرح عمر کٹے گی جو یہی حال رہا
ہم سے روٹھا ہے وہی جس کے لیے جیتے ہیں

⊛ عنبرین احمد.....فیصل آباد

یادیں بھی ہیں ، امید بھی ہے بے بسی بھی ہے
اے دوست کیا نہیں ہے ہماری نگاہ میں

⊛ کاوش علی.....کوٹ غلام محمد

ہم بھی جلے تھے ، رات کسی آنچ کی طرح
کچھ آشنا سے ہوگئے پھر زندگی سے ہم

⊛ شاہدہ رحمان.....پنڈ دادن خان

بچھڑنے والا بھلا کیسے جی رہا ہوگا
یہی تو سوچ کے دل کو جلا رہا ہے کوئی

⊛ جاوید ہاشم.....ہری پور

چراغ بجھ بھی چکے ہیں مگر پسِ چلمن
یہ آنکھ اب بھی تیرا انتظار کرتی ہے

⊛ شہلا نیاز..... پتوکی

اب بھی اوجھل ہے نگاہوں سے نشانِ منزل
زندگی تو ہی بتا کتنا سفر باقی ہے؟

⊛ احسن رضا.....کراچی

چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فراز
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کرے

⊛ شبیر عاصی.....ملتان

دل تیری یاد میں آج پھر پریشان کیوں ہے
میری صورت میں تیرا عکس نمایاں کیوں ہے

⊛ شگفتہ سحر.....مری

حالت سے مری اس کو سروکار نہیں تھا
کیا دل کا کروں اس پہ بھی بے زار نہیں تھا
سنگینیِ حالات تو تھی اس کی بدولت
تسلیم وہ کرلینے پہ تیار نہیں تھا

⊛ کرن زوہیب.....دبئی

میری بے لوث وفائیں تجھے یاد آئیں گی
جب تیری ذات کے صحرا سے نکل جاؤں گا

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

❁ آصف شریف.....میانوالی

ہم ان کے دیکھنے کو سمجھتے ہیں زندگی
ان کا یہ حال ہے کہ اِدھر دیکھتے نہیں

❁ شعیب صدیقی.....منڈی بہاؤالدین

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لیے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے

❁ آفتاب حیدر.....جہانیاں منڈی

اتنی ہے صرف میری محبت کی داستان
اک شخص تھا جو زخم شناسائی دے گیا

❁ عزیز الاسلام.....واہ کینٹ

ترے احساس کو ڈستے رہے جیتے لمحات
میری ہر رگ میں سلگتی رہیں یادیں تیری

❁ ہما راجپوت.....کراچی

جذبے سارے کے سارے بے نام ہوئے جاتے ہیں
قصے رسوائی کے اب عام ہوئے جاتے ہیں
ہم ہیں معصوم یہاں کون کرے گا تسلیم
بے سبب سورد الزام ہوئے جاتے ہیں

❁ حمیرا شاہین.....جھنگ

سلگ رہے ہیں الاؤ سے تیرے ہجر بھی
بجھی نہ پیاس مری بارشوں میں رو کر بھی

❁ اشرف علی.....کوئٹہ

اب تو اشکوں کے ستارے بھی نہیں پلکوں پر
کن چراغوں کو جلائیں گے سحر ہونے تک

❁ فیصل ملک.....لاہور

حادثے کیا کیا تمہاری بے رخی سے ہوگئے
ساری دنیا کے لیے ہم اجنبی سے ہوگئے

❁ منیر علی.....حافظ آباد

لٹا ہے کارواں جب آچکی ہے سامنے منزل
کہاں ٹوٹی ہیں امیدیں، کہاں تقدیر بگڑی ہے

❁ یعقوب منظر.....چیچہ وطنی

بھول کر بھی کبھی پلکیں نہ جھپکنے پائیں
اس قدر نیند کو آنکھوں سے بچڑا ہم نے

❁ مظہر خان.....راجن پور

بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی
لوگ بے وجہ اداسی کا سبب پوچھیں گے

❁ علی اختر.....جیکب آباد

یہ میری شام غم یہ سسکیاں لیتے ہوئے تارے
چلے آؤ کہ شام زندگی کم ہوتی جاتی ہے

❁ مہتاب خان.....بدین

مہر و وفا، خلوص و محبت کے باوجود
کیوں جل گئی زمین وفا سوچتا ہوں میں

❁ اقبال احمد.....ساہیوال

انجان نگاہوں کی یہ مانوس سی خوشبو
کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے ہیں

❁ اختر حسین.....لاہور

لمحہ بھر کو ہے ساتھ سانسوں کا
اور پھر عمر بھر ہے تنہائی

❁ حرا اطہر.....کراچی

میں تجھ کو مانگ رہا ہوں قبول کر کہ نہ کر
یہ بات تیری مری ہے اسے دعا نہ سمجھ

❁ نازیہ خان.....سرگودھا

مرے ضمیر نے قاتل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

❁ شوکت علی.....رحیم یار خان

تیری صورت کو جب سے دیکھا ہے
میری آنکھوں پہ لوگ مرتے ہیں

❁ قاسم علی.....ملتان

کوئی تو بات ہے اس میں فیض
ہر خوشی جس پہ لٹا دی ہم نے

❁ عائشہ احمد.....روہڑی

کیا کہوں اس سے جو بات سمجھتا ہی نہیں
وہ تو ملنے کو ملاقات سمجھتا ہی نہیں

❁ ہما بخاری.....سکھر

سفر پیچھے کی جانب ہے قدم آگے ہے میرا
میں بوڑھا ہوتا جاتا ہوں جواں ہونے کی خاطر

❁ چودھری پرویز.....لاہور

خود سے ملنے کا ذرا سا بھی روادار نہیں
کیا کروں روز کوئی کام نکل آتا ہے

❁ نازش خان.....کوئٹہ

دو قدم کی رفاقت بہت ہے یہاں
دور تک ساتھ جانا ضروری نہیں

❁ امتیاز احمد.....پھالیہ

میں سوچتا ہوں بہت دوسروں کے بارے میں
کبھی کبھی مجھے اپنا خیال آتا ہے

❁ راحیل نصیر.....پھلیلی

رگوں میں زہر بھرتے جا رہے ہیں
مرے سب لوگ مرتے جا رہے ہیں

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

❁ لبنیٰ وکیل.....کوئٹہ

شہر کی بھیڑ سے خود کو تو بچا لاتا ہوں
گو سلامت مرے اعصاب نہیں آتے ہیں

❁ جنید ملک.....کراچی

خواب رخصت ہوئے آنکھوں سے مری
اور پھر سب مرے ارمان گئے

❁ عاصم جہانزیب.....لیہ

پاؤں رکھ تو دیا بے وفائی میں
کہکشاں مہتاب نہ ہو پائی میں

❁ منیر شگفتہ.....وہاڑی

آج ہم خواب میں مل سکتے ہیں
نیند کرنے کی مشقت کرلو

❁ ذوہیب ملک.....کراچی

ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے نہ بہلاؤ مجھے
ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے چلن جانتا ہوں

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

کبھی کبھی کوئی ایسا مسافر آتا ہے
رستے اپنے آپ سنورتے جاتے ہیں

❁ شاہ عالم.....راولپنڈی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گرد حیات
اداس نقش گرو اب مجھے نکھارو کبھی

❁ طیب اسد.....ڈی جی خان

تلاشِ حسن کہاں لے چلی، خدا جانے
امنگ تھی کہ فقط زندگی کو اپنائیں

❁ سلیم قادر.....میانوالی رانجھا

اجل کی رہزنی سے ہر طرف طاری ہیں سناٹے
سرودِ زندگی کو نیند سے چونکانے آئے ہیں

❁ نادیہ ریاض.....نواب شاہ

جانے کس روپ میں مقتل کو سجائے تم ہو
مجھ کو کیا قتل کرو گے مرے سائے تم ہو

❁ شاہد علی.....فیصل آباد

اب تو مجھ کو بھی ندامت ہے وفا پر اپنی
لطف کتنا زمانے سے چلن میرا تھا

❁ سائرہ نواب.....پشاور

ڈھونڈتا پھرتا ہوں لوگوں میں شباہت اس کی
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیالوں جیسی

❁ نعیم احمد.....بہاولپور

اب دیکھ یہ حسرت بھری اجڑی ہوئی آنکھیں
دنیا ترے بارے میں مرے خواب بہت تھے

❁ صبا حمید.....ٹنڈو الہیار

تیز سورج میں چلے آتے ہیں میری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا کا شجر جانا ہے

❁ عاصم خان.....کراچی

ان صورتوں کو ترسے گی چشمِ جہاں کہ آج
کمیاب ہیں تو کل ہمیں نایاب دیکھنا

❁ عمران شیروانی.....لاہور

ایک مرکز ہو تو جچتا ہے تجسس، لیکن
ان گنت دائروں میں گھومتی رہتی ہے زمیں

❁ حنظلہ خان.....گوادر

میرے بدل جانے پر تم کو حیرت کیوں ہے
میں نے یہ بہروپ تمہارے سنگ بھرا ہے

❁ محمد الیاس.....لسبیلہ بلوچستان

ان کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

❁ محمد جاوید.....تحصیل علی پور

اڑتا پھرتا ہوں اب غبار سا میں
خود کو سمجھا تھا آسماں ہوں میں

❁ ولید رضا.....ساہیوال

گرم رکھتا ہے لہو کو خواہشوں کا سلسلہ
دھوپ کے صحرا سے لے کر سایۂ اشجار تک

❁ نوروز خان.....کوئٹہ

اے حسن خود پرست ذرا سوچ تو سہی
مہر و وفا سے تجھ کو ملے ہیں جو گن

❁ محمد طلحہ.....کراچی

سبز جنگل میں پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں
وقت چھوڑ آیا ہمیں گزرے زمانوں میں کہیں

محفلِ شعر و سخن

نام: _____

پتا: _____

کوپن برائے شمارہ مارچ 2026

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

مارچ کا وہ دن اچھی امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا مگر شام تک نمی اور ٹھنڈ نے اسے اداس بنا دیا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ غالب کون آیا، بارش یا دھند؟ بس کے نچلے حصے میں سفر کرنے والوں کو باتونی کنڈیکٹر نے بتایا کہ شہر پر دھند اتر آئی ہے اور اوپر بیٹھے ہوئے مسافروں کو اس نے یقین دلایا کہ موسم معمول سے زیادہ سرد ہو گیا ہے۔

لیکن مسافر تو موسم کی ان شرارتوں کے عادی ہو چکے تھے، اس لیے کسی کے دل پر بوجھ نہ بنا، نہ ان کے چہروں سے شگفتگی غائب ہوئی۔ خراب موسم ہمیشہ گپ شپ کے لیے خاص موضوع رہا ہے۔ اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے بھی اس سلگتے مسئلے پر گفتگو کرنے کو معیوب نہیں سمجھتے۔ مزید یہ کہ کنڈیکٹر اپنے پیشے کے اکثر لوگوں کی طرح غیر معمولی طور پر

دوردیس کا مہمان

جاوید بسام

کبھی کسی مجرم کا کیا گیا جرم اس کے ضمیر کو جھنجوڑتا رہتا ہے... سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے خیالات کی یلغار پر اسے حقیقتی ہونے کا گمان ہوتا ہے... مگر یہ خواب و خیال کبھی حقیقت بن کر سامنے آجائیں گے... اس کا پتا نہیں ہوتا... اور پھر واقعی میں سب سچ ثابت ہو جاتا ہے۔

ایک مرتے ہوئے شخص کا اپنے قاتل سے انوکھا انتقام

www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

ہاتوئی تھا۔

بس سارا دن سڑکوں پر دوڑتی رہی تھی۔ اب دن اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ وہ لندن کے قلب میں اپنا آخری چکر لگا رہی تھی۔ نیچے کی نشستوں پر آدھی جگہ خالی تھی۔ اوپر جیسا کہ کنڈیکٹر کی چھٹی حس نے اسے بتایا تھا، اب بھی ایک مسافر موجود تھا جو یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ نیچے بس خالی ہے، نیچے نہیں آیا تھا۔ یا تو وہ ضبط کا پتلا تھا یا محض کاہل۔ بس تیزی سے چلی جا رہی تھی کہ کنڈیکٹر نے لوہے کی سیڑھیوں پر سرسراہٹ سنی۔ کوئی شخص نیچے اتر رہا تھا۔

''اوپر کوئی اور بھی ہے؟'' کنڈیکٹر نے اندھیرے میں ابھرتی چھتری کی لوک اور برساتی کے کنارے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''میرے خیال میں کوئی نہیں ہے۔''

''میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں آپ پر یقین نہیں کرتا مگر بہتر ہے کہ میں خود جا کر دیکھ لوں۔'' کنڈیکٹر نے نہایت شائستگی سے کہا اور ہاتھ بڑھایا۔

اس نے پہلے بھی بدتر حالات دیکھے تھے۔ کبھی کبھار تو وہ اپنے اوپر شک کرنے لگتا تھا کہ وہ جو دیکھ رہا ہے وہ وہم ہے یا حقیقت؟ لمبے تھکا دینے والے دن کے اختتام پر ایسے خیالات اس پر حملہ آور ہوتے اور وہ حتی المقدور ان سے مقابلے کی کوشش کرتا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ کمزوری کی علامت ہے۔ وہ خود کو تسلی دیتا کہ دماغ شاید تھک گیا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اب اس نے مسافر کو اندر چڑھاتے ہوئے یہ سوچنے سے گریز کیا کہ اوپر کوئی ہے یا نہیں لیکن دل میں ابھر آنے والی بے نام گھبراہٹ ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آخر وہ بڑبڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وہ اوپر جا کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی، جب اس کی پیشگوئی درست نکلی۔ وہ فتح مندی کے ساتھ آخری سیڑھی پر پہنچا تو اس نے سامنے دائیں جانب کی نشست پر ایک مسافر کو بیٹھے دیکھا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا چوغہ پہنا ہوا تھا، ٹوپی ماتھے پر جمی ہوئی تھی، کالر اٹھا ہوا تھا اور ٹوپی اور کالر کے درمیان ایک شکن آلود سفید مفلر کا ابھار نظر آ رہا تھا۔ یہ واضح تھا کہ اس نے کنڈیکٹر کے آنے کی آہٹ سن لی تھی۔ وہ سامنے دیکھ رہا تھا لیکن اس کی برابر نشست پر پھیلے ہوئے ہاتھ میں انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ ایک سکہ چاندی کی توس کی طرح چمک رہا تھا۔

''شام خاصی سرد ہے۔'' کنڈیکٹر نے بات برائے بات کہا۔ مسافر نے کوئی جواب نہ دیا مگر پیسے اس کی استخوانی انگلیوں میں ذرا سی سرک گئی۔

''میں کہہ رہا ہوں آج کی بہت زیادہ ہے۔'' کنڈیکٹر نے کچھ جھنجلاہٹ سے دہرایا۔ یہ خاموشی اس کے اعصاب پر بوجھ ڈال رہی تھی۔ پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

''آپ کہاں جائیں گے؟'' اس نے ایسے لہجے میں پوچھا جیسے اسے یقین ہو کہ ایسا آدمی کسی بھی معقول مقام کا رخ نہیں کر سکتا۔

''کیرک اسٹریٹ۔''

''کہاں؟''

اگرچہ کنڈیکٹر نے صاف سنا تھا مگر مسافر کے ادائیگی کے عجیب انداز نے اسے دوبارہ پوچھنے کا جواز دے دیا تھا۔ شاید اس کے ذریعے وہ اس ڈھیٹ مسافر کی تھوڑی سی تحقیر بھی کرنا چاہتا تھا۔

''کیرک اسٹریٹ۔''

''یوں کہو کیرک اسٹریٹ۔'' کنڈیکٹر بڑبڑایا اور ٹکٹ چھید دیا۔

ایک لمحے بعد مسافر نے پھر کہا۔ ''کیرک اسٹریٹ۔''

''ہاں، ہاں ٹھیک ہے، اتنی بار بتانے کی ضرورت نہیں۔'' کنڈیکٹر نے برا مان کر کہا اور اس کے ہاتھ سے پیسے لینے لگا لیکن وہ اوپر سے پکڑ نہیں پا رہا تھا۔ سکہ بہت نیچے سرک گیا تھا۔ آخر اسے نیچے سے کھینچ کر نکالنا پڑا۔

سکہ بالکل ٹھنڈا تھا۔ وہ حصہ بھی جو انگلی کی انگلیوں میں دبا تھا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔

''سنٹ کہاں رکھوں؟''

''یہاں رکھ دو۔''

''کہاں؟''

''جہاں پیسے تھے، میری انگلیوں کے درمیان۔'' مسافر نے وضاحت کی۔

کنڈیکٹر نے عجیب سی ناگواری سے جس کی وجہ وہ خود بھی سمجھ نہ پایا تھا، مسافر کی بات مان لی۔ اس کے بے حس ہاتھ نے کنڈیکٹر کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑا دی تھی۔ یا تو وہ ہاتھ سن تھا یا مفلوج۔ اوپر کا موسم بھی ہاتھوں کو گرم رکھنے والا نہیں تھا۔ ٹکٹ بار بار مڑ جاتا تھا۔ آخر وہ جھک کر دونوں ہاتھوں سے ٹکٹ کو اس استخوانی خلا میں ٹھونسنے میں کامیاب ہوا۔

''لیجیے جناب سلطان بلی۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔

مسافر کو اپنی جسمانی کمزوری کا یہ لطیف اشارہ پسند نہیں آیا یا شاید وہ الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھ

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

سے اب مزید بات نہ کریں۔"

"یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ڈی سے کون بات کرتا ہے؟" کنڈیکٹر طیش میں آکر بولا پھر کچھ بڑبڑاتے ہوئے نیچے اتر گیا۔

کیرک اسٹریٹ کے نکڑ پر خاصا ہجوم جمع تھا۔ ہر شخص دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں تھا مگر میدان تین عورتوں نے مارا جو ایک ساتھ بس میں چڑھ گئیں۔ کنڈیکٹر اس شور شرابے میں بلند آواز میں چلایا۔ "آہستہ..... آہستہ۔ دھکا دینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کوئی نیلامی تو نہیں ہو رہی۔ میڈم! ذرا دھیان رکھیے، خدا کے لیے، آپ اس بوڑھے آدمی کی جان لے لیں گی۔"

ایک منٹ کا شور تھم گیا۔ کنڈیکٹر دروازہ بند کرنے لگا تو اسے اوپر والا مسافر یاد آیا جسے کیرک اسٹریٹ پر اترنا تھا۔ اس کا اسٹاپ نکل رہا تھا مگر وہ دوبارہ اس کم گو آدمی سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر اس کی فطری نرمی حاوی آگئی۔ وہ سیڑھیاں چڑھا اور اوپر منہ کرکے چلایا۔ "کیرک اسٹریٹ..... کیرک اسٹریٹ!"

وہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ہمت نہ کرسکا مگر اس آواز کا کوئی اثر نہ ہوا، کوئی جواب نہ ملا۔ منہ کوئی نیچے اترا۔

"خیر، اگر اسے اوپر ہی رہنا ہے تو میں اسے کیسے نیچے تو نہیں لاسکتا، چاہے وہ معذور ہی کیوں نہ ہو۔" کنڈیکٹر نے دل ہی دل میں کہا مگر وہ کچھ رنجیدہ ہوگیا۔ بس آگے چل دی۔

پھر اسے خیال آیا جب وہ تینوں "اولیسائی دیویاں" بس پر چڑھنے کے لیے دھاوا بول رہی تھیں، وہ ضرور میرے پیچھے سے نکل گیا ہوگا۔

☆☆☆

اسی شام، اس واقعے سے ٹھیک پانچ گھنٹے پہلے ایک ٹیکسی کیرک اسٹریٹ پر مڑی اور ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ گلی سنسان تھی۔ بظاہر تو یہ گلی بے حد دکھائی دیتی تھی مگر آخری سرے پر ایک گلی اچانک تیر کی طرح اسے چیرتی ہوئی سوہو کی طرف نکل جاتی تھی۔

"بس جناب اتر گیا سامان۔" ڈرائیور نے کہا جو کئی چکر ٹیکسی اور ہوٹل کے درمیان لگا چکا تھا۔

"کتنے بیگ ہیں؟"

"دو، صاحب!"

"ڈرائیور! تمہارا سارا سامان تو بیگوں میں سما جائے گا؟"

"آرام سے میرے لیے تو دو بیگ ہی کافی ہیں۔"

"اچھا، ذرا دیکھ لو کچھ رہ تو نہیں گیا؟"

ڈرائیور نے سیٹوں کے درمیان جھانکا۔ "کچھ نہیں صاحب! بالکل خالی ہے۔"

"اور اگر کچھ نکل آیا؟" اجنبی نے تجسس سے پوچھا۔

"تو وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ پہنچا دیں گے۔" ڈرائیور نے فوراً جواب دیا۔

"اسکاٹ لینڈ یارڈ؟" اجنبی نے دہرایا۔ "اگر برا نہ مانو تو ذرا ماچس جلاؤ، میں خود بھی دیکھ لوں۔"

مگر اسے بھی کچھ نہ ملا۔ تسلی کرکے وہ اپنے سامان کے پیچھے ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

جونہی اس نے ہوٹل میں قدم رکھا، ایک ہجوم نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ ہوٹل کا مالک، اس کی بیوی، وہ بے شمار نوکر اور راہ جو کسی وزارت کے نہیں ہوتے مگر ہر ہوٹل میں مل جاتے ہیں، بیل بوائے، پورٹر، لفٹ چلانے والا، سب اس کے گرد جمع ہوگئے۔

"ارے مسٹر وکٹر رمبولڈ! اتنے برسوں بعد؟ ہم تو سمجھے تھے کہ آپ ہمیں بھول گئے۔ عجیب بات ہے کہ جس شام آپ کا تار آسٹریلیا سے آیا، ہم آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ میرے شوہر نے کہا، مسٹر رمبولڈ کی مگر نہ کرو، وہ ایک دن امیر آدمی بن کر لوٹیں گے۔ اس کا مطلب تھا لکھ پتی بن کر۔ ویسے تو آپ پہلے بھی غریب نہ تھے۔"

"انہوں نے صحیح کہا تھا۔ میں واقعی لکھ پتی بن گیا ہوں۔" مسٹر رمبولڈ نے دھیرے سے کہا۔

"کہا، میں نے کہا تھا نا۔" ہوٹل کے مالک نے فخر سے کہا۔ "اور آپ کا ہمیں شرفِ میزبانی کے لیے چننا یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ مغرور نہیں ہوئے۔"

"بات یہ ہے کہ میں کہیں اور جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مجھے اپنائیت اور اپنے گھر جیسا ماحول لگتا ہے۔" رمبولڈ نے کہا اور لابی پر نظر دوڑائی۔ وہی پرانے مانوس در و دیوار تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ اس کی چھوٹی دھندلائی ہوئی آنکھیں اس کے پکے ہوئے چہرے پر اور بھی بے رونق لگ رہی تھیں۔ اس کے گال قدرے دھنسے ہوئے تھے اور ناک کے کناروں پر گہری جھریاں تھیں۔ ہلکی، پتلی، بھوسے کے رنگ کی مونچھیں عمر کا اندازہ لگانے میں ایک طرح کی رکاوٹ تھیں۔ شاید وہ پچاس کے آس پاس تھا، گردن کی لچک جلد ہی بتاتی تھی مگر اس کی چال میں نوجوانوں جیسی پھرتی اور حوصلہ مندی تھی۔

"میں ابھی لاؤنج میں بیٹھوں گا۔" اس نے مالکن کے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

سوال پر جواب دیا۔ "کلسم کہاں ہے، اب بھی یہیں کام کرتا ہے؟ اچھا ہے، اس سے کہو میرا سامان کھول دے۔ رات کے لیے جو چیز چاہیے، وہ اسے سبز سوٹ کیس میں مل جائے گی۔ میں ڈسپیچ باکس اپنے پاس رکھوں گا اور لاؤنج میں شیری بھجوا دیں۔"

اگر فضا سے دیکھا جائے تو راسلز ہوٹل اتنا بڑا نہ تھا مگر اس کے وہ پیچ دار، نیم تاریک، ایک دوسرے میں گم ہوتے، کبھی تہ خانوں کی سیڑھیوں میں ڈوبتے راستے، کبھی کچن کے موڑوں میں غائب ہوتی راہداریاں جو وہاں کے رہنے والوں کو بے حد عزیز تھیں، اسے خاصا طویل بنا دیتی تھیں۔

اگر کوئی شخص ان سایہ دار محرابوں یا تہ خانے کی سیڑھیوں کے قریب کھڑا ہوتا تو وہ یقیناً مسٹر رمبولڈ کے پورے وجود سے پھوٹتی ہوئی خوشی کو محسوس کر لیتا۔ ان کے کندھے ہلکے سے جھکے ہوئے تھے، جیسے تھک گئے ہوں، بازو بے پروائی سے جھول رہے تھے، جیسے وہ انہیں بھول ہی گئے ہوں اور ان کی ٹھوڑی جو ہمیشہ تنی رہتی تھی، اتنی آگے نکلی ہوئی تھی کہ اس میں رعونت کا نہیں بلکہ ایک بے چارگی کا سا رنگ جھلک رہا تھا۔ نادیدہ تماشائی ضرور ان پر رشک کرتا..... شاید خفا بھی ہو جاتا۔ کیسا مطمئن تھا وہ آدمی، کیسی متانت اور رضامندی سے وہ حال اور مستقبل دونوں کو قبول کر رہا تھا۔

ایک ویٹر جس کا چہرہ مسٹر رمبولڈ کے حافظے میں محفوظ نہ تھا، انہیں مشروب دے گیا۔ انہوں نے آہستگی سے گھونٹ لیا پھر رسمی انداز کو ترک کرتے ہوئے اپنے پاؤں چولہے کی سنگی محراب پر رکھ دیے۔ یہ گستاخی قابلِ اعتراض نہیں تھی کیونکہ لاؤنج بالکل خالی تھا۔

سوچیے ان کی حیرت کیسی رہی ہوگی، جب وہ اس آسودگی بھرے ماحول میں ٹانگیں پھیلائے اپنے مشروب سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک سر کے بالکل اوپر دیوار سے ایک آواز ابھری۔ یہ ایک مہذب آدمی کی آواز تھی، شاید ضرورت سے زیادہ مہذب۔ کچھ بھاری مگر شائستہ، الفاظ نہایت سنبھل کر ادا کیے گئے۔ مسٹر رمبولڈ نے چونک کر ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کوئی اندر تو نہیں آیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ آواز جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ سب ان کے شعور تک پہنچ رہا تھا۔ آواز گویا انہی کو مخاطب کر رہی تھی لیکن اس میں ایک الہامی سا رنگ تھا۔ گویا ایک بڑے مجمعے کے لیے بول رہی ہو۔ یہ ایک ایسے شخص کی آواز تھی جو جانتا تھا کہ مسٹر رمبولڈ اسے سن کر خوشی کو مقصد کے ساتھ جوڑ دیں گے۔

"یہ بچوں کی محفل ہے۔" آواز نے ایک ایسی بے رنگ ہموار لے میں اعلان کیا جو پسند اور ناپسند، جوش اور اکتاہٹ کے درمیان نازک توازن قائم رکھے ہوئی تھی۔ "چھ چھوٹی لڑکیاں اور چھ لڑکے، ہمارے ریڈیو اسٹیشن نے انہیں چائے پر مدعو کیا ہے۔ ہم چاہیں گے کہ آپ بھی ان کی خوشیوں میں شریک ہوں۔" آخری لفظ پر آواز دھیمی ہو گئی۔

"سب بچے ناشتا کر چکے، ہے نا بچو؟" اس نہایت اہم سوال کے جواب میں بچوں نے بے سری جماعتی آواز میں "ہاں" کہا۔

"افسوس ہے کہ آپ نے ہماری میز پر ہونے والی گفتگو نہیں سنی۔ اگرچہ اسے گفتگو کہنا بھی مشکل ہے، بس سب کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ خوب سیر ہو کر کھانا ہے۔ خیر، ہم آپ کو بتا تو سکتے ہیں کہ انہوں نے کیا کھایا۔ پرسی ابتاؤ آج مینیو میں کیا تھا؟"

ایک چڑچڑی سی آواز لڈو، پیسٹری، کیک اور نہ جانے کتنی چیزوں کے نام گنوانے لگی۔ مسٹر رمبولڈ نے سوچا۔ 'یہ بچہ جلد بدہضمی کا شکار ہو جائے گا۔'

دوسرے بچوں نے بھی فہرست میں چیزیں شامل کیں۔

"دیکھا آپ نے۔" آواز نے نصیحت بھرے انداز میں کہا۔ "ہم نے بڑی مزیدار چیزیں کھائی ہیں۔ اب باری ہے کھیلوں کی، ہاں بچوں کے دلچسپ کھیل۔"

ایک مختصر سا وقفہ ہوا جسے ایک لڑکی کی سرگوشی نے توڑا۔ "رونا بند کرو فلپ! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

اچانک ایک تیز گڑگڑاہٹ ابھری جیسے کہیں کوئی چنگاری اڑی ہو۔ رمبولڈ نے سوچا، آتش بازی جیسی آواز..... بلکہ جلتی لکڑی کی چڑچڑاہٹ ہے۔ پھر اس شور کے اندر بچوں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

"الیک! تمہارے پاس کیا ہے؟"

"پستول۔"

"مجھے دو۔"

"نہیں دوں گا۔"

"تھوڑی دیر کے لیے دے دو۔"

"کیوں چاہیے؟"

"میں جمی کو مارنا چاہتا ہوں۔"

مسٹر رمبولڈ چونک اٹھے۔ انہیں اس شور کے پیچھے ایک عجیب سی چٹک کی آواز سنائی دی تھی۔ کیا یہ میرا تخیل تھا یا

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

چک کی آواز نے واقعی ساری ہلچل کو ختم کر دیا ہے۔
میزبان کی آواز پھر سے گونجی۔ ''اب ہم نیا کھیل شروع کریں گے۔ پہلے رنگ اے رنگ اے روز یہ کھیلا جائے گا۔''

بچے ہچکچا رہے تھے۔ کوئی بھی گانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ آخر ایک تیز بچہ گانے لگا مگر بہ مشکل ایک آدھ مصرع بولا، پھر راہنما کی پختہ آواز نے اسے سہارا دیا اور کچھ دیر میں بچے بے تکلفی سے گانے لگے۔ ان کی باریک اور ذرا لرزتی ہوئی آوازیں بے حد متاثر کن تھیں۔ رمبولڈ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

پھر ''اور مجز اینڈ لیمنز'' کا کھیل شروع ہوا۔ یہ نسبتاً پیچیدہ تھا، چل نہ سکا ناکام ہوا، پھر چل نکلا۔ مسٹر رمبولڈ بچوں کو اپنے تصور میں دیکھنے لگے۔ وہ پرانی طرز کا چوکڑی ناچ، ناچ رہے تھے۔ کچھ بچے واضح طور پر کوئی اور کھیل چاہتے تھے۔ بچے ہوتے ہی نخرے والے ہیں۔ جہاں اس کھیل کے ڈرامائی موڑ اکثر بچوں کو بھاتے، کچھ ڈر بھی جاتے۔ ان کی جھجک کے باعث خلل پیدا ہو رہا تھا جو مسٹر رمبولڈ کو بور کرنے لگا تھا کیونکہ وہ خود بچپن سے اس کھیل کے دلدادہ تھے۔

اور جب بچے پاؤں سے ٹھک ٹھک کرتے ہوئے ایک مانوس دھن مدھم سر میں گنگنانے لگے تو مسٹر رمبولڈ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دھیان سے سن رہے تھے کہ آخری سطریں کب شروع ہوں گی، مگر پیش لفظ طویل ہوتا جا رہا تھا، جیسے بچے چاہ رہے ہوں کہ اس روشن سیر کو ممکنہ حد تک بڑھا دیں۔ اس سے پہلے کہ چرچ کا عظیم الجثہ گھنٹا بے رحمی سے اس کا گلہ گھونٹ دے، جو کسی خوشی کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرتا تھا۔

مسٹر رمبولڈ کے خیالات بدلنے لگے۔ آخر کھیل ختم کیوں نہیں ہوتا؟ اس کا یہ منحوس انجام کیوں لازم ہے؟ لیکن مسٹر رمبولڈ کی خواہش کے باوجود کھیل حسب روایت آگے بڑھتا رہا۔

ہم نے مزے کر لیے
اب قیمت چکاؤ
یہ لو شمع، راستہ دکھانے کو
یہ لو کلہاڑا، کاٹنے کے لیے!
چک..... چک..... چک.....

کسی بچے کی چیخ گونجی، پھر سناٹا چھا گیا۔
مسٹر رمبولڈ خاصے مایوس نظر آ رہے تھے لیکن جب بچوں نے ہچکچاتے ہوئے ''اور مجز اینڈ لیمنز'' دو تین بار پھر کھیل لیا تو لیڈر نے اعلان کیا۔

''اب ہم ایک اور کھیل کھیلیں گے۔ ''وی وینٹ فار شس ان مے۔''

تو انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ کم از کم اس میں کوئی نحوست نہیں ہوتی۔ ایک شاندار دیہی کھیل، جس میں مئی میں بادام چننے جیسی دلکش غلطی ہے۔ مئی میں گری دار میوے، سردیوں، بہار اور خزاں کی تمام دلکشی پر مشتمل ہے۔ گری دار میوے اور مئی کی قربت، حالات سے اوپر اٹھنے کی خواہش، وجہ اور اثر کیسا چیلنج ہے اور موقع کی فتح۔ آخر کار وجہ اور اثر عام طور پر ہمارے خلاف ہوتے ہیں، گانے میں اولڈ بیلی کی گھنٹیوں کی کہانی اس کا واضح ثبوت ہے لیکن موقع ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمیں سکھاتا ہے کہ قسمت کو پیچھے چھوڑنا اور ایک ہی دریا میں دو بار قدم رکھنا ممکن ہے۔ موقع کا ہاتھ واقعی طاقتور ہے، آیئے اسے پکڑ لیں اور اسے کبھی نہ چھوڑیں۔

اسی دوران مسٹر رمبولڈ نے موسیقی کی لے پر ہاتھ ہلائے اور پاؤں سے تال ملائی۔ بچے مزید بے باک ہو گئے، وہ زیادہ ہم آہنگی اور آزادانہ طور پر گا رہے تھے۔ کھیل روانی اور زور شور سے جاری تھا۔ لاؤنج کو جوش، جذبہ اور توانائی نے بھر دیا تھا۔ جہاں مسٹر رمبولڈ بیٹھے تھے، آواز کی لہریں گھنے دھوئیں کے مانند اندر امڈ آئیں، ہر شے کو لپیٹ میں لیتی، دماغوں کو خوشبوؤں سے نشہ آور کرتیں اور اندر ایسی تڑپ آندھیاں بھڑکانے لگیں جن سے رمبولڈ کے دل میں الہام کا احساس جاگ گیا۔ ان کی سماعت تیز ہونے لگی۔ باقی حواس ماند پڑ گئے اور وہ نئے نئے نغمے سننے لگے۔

کھیل جاری تھا۔ اس بار بچوں کی آوازوں میں بے تابی تھی۔ اب دو طاقتور پہلوان آمنے سامنے تھے۔ لمحہ ایک جنگی للکار میں بدل گیا تھا۔

''کسے چنیں ہم اپنے لیے قربانی
اپنے لیے قربانی، اپنے لیے قربانی
کسے چنیں ہم اپنے لیے قربانی
اس سرد، برفیلی صبح میں؟
ہم اسے چنیں گے.....
وکٹر رمبولڈ.....
وکٹر رمبولڈ.....
وکٹر رمبولڈ.....

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

کتنے انتقامی تھے ان کے سر
کیا وہ واقعی اس کے خون کے پیاسے تھے؟
کسے بھیجیں ہم اپنی قربانی
اپنی قربانی، اپنی قربانی
کسے بھیجیں ہم اپنی قربانی
اس سرد برفیلی صبح میں؟
بگل کی پکار اور جنگی نعروں کے ساتھ جواب آیا۔
"ہم جمی ہیگرڈ کو شکار پر بھیجیں گے،
اپنی قربانی کے لیے
اپنی قربانی کے لیے
ہم جمی ہیگرڈ کو شکار پر بھیجیں گے
ایک غم اور دھندلی شام میں۔"
شاید آخری مصرعے کو موسم کے مطابق بدل دیا گیا تھا تاکہ حقیقت سے قریب ہو جائے۔

☆☆☆

مسٹر رمبولڈ چونک کر جاگ اٹھے۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔
"یہ لیجیے جناب!" اسی وقت ویٹر کھانے کی پلیٹ اور بوتل لے آیا۔
انہوں نے گھوم کر اسے دیکھا اور بولے۔ "کلسم! یہاں کوئی آیا تھا؟"
"نہیں جناب! اس وقت کون آئے گا؟"
"شکریہ کلسم!" مسٹر رمبولڈ نے پہلا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا پھر بھنی ہوئی مرغی کی طرف متوجہ ہوئے۔
"معذرت، میری آنکھ لگ گئی تھی، میں لیٹ ہو گیا۔"
"کوئی بات نہیں سر! آپ آج کچھ اکھڑے اکھڑے نظر آ رہے ہیں۔ امید ہے کوئی بری خبر نہیں ہو گی؟" ویٹر نے پوچھا۔
"نہیں، بس سفر کی تھکن ہے۔"
ویٹر بات چیت کر کے مسٹر رمبولڈ کا دل بہلانے لگا۔ اس نے پوچھا۔ "جناب! آپ آسٹریلیا سے روانہ ہوئے تو موسم کیسا تھا؟"
"یہاں سے بہتر تھا۔" انہوں نے دوسرا گلاس خالی کرتے ہوئے جواب دیا۔
بارش مسلسل شیشے کی چھت پر برس رہی تھی۔
"اچھا موسم سب کچھ نہیں ہوتا، سیر کرنا اچھا ہے لیکن گھر سب سے بہتر ہے۔" ویٹر نے کہا۔
"تم نے ٹھیک کہا۔"
"دنیا میں بہت سے علاقے ہیں جو اچھی بارش کے لیے ترستے ہیں۔" ویٹر نے پراعتماد لہجے میں کہا۔
"یقیناً۔" مسٹر رمبولڈ نے گفتگو سے لطف لیتے ہوئے کہا۔
"آپ وہاں مچھلیوں کا شکار کرتے تھے؟" ویٹر نے سوال کیا۔
"کبھی کبھی۔"
"وہاں مچھلیوں کے شکار پر پابندی نہیں ہے؟"
"نہیں، بعض موسموں میں لگائی جاتی ہے، جیسا کہ یہاں بھی ہوتا ہے۔"
"اگر کوئی اس موسم میں شکار کرے تو قانون حرکت میں آتا ہے؟"
"ہاں، مگر کم ہی لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ بس معاملہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔"
"یعنی اگر کوئی پکڑا گیا تو وہ مجرم قرار پائے گا اور اسے سزا ملے گی، ورنہ نہیں؟"
"ہاں۔"
"یہ تو کوئی بات نہیں۔ آپ اسے قانون تو نہیں کہہ سکتے۔" ویٹر نے انہیں چھیڑا۔
"یہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ قانون سے کیا مطلب لیتے ہیں۔"
"فرض کریں آپ نے آسٹریلیا میں کسی کو قتل کر دیا، تو پکڑے جانے پر آپ کو پھانسی ہو گی؟"
مسٹر رمبولڈ نے چمچ کے چپٹے سرے سے مشروب کو ہلاتے ہوئے ایک گھونٹ لیا اور بولے۔ "اگر ثبوت اور عینی شاہد مجھے مجرم ثابت کر رہے ہوں تو پھانسی دی جا سکتی ہے۔"
"اور اگر کوئی ثبوت نہ ہو؟"
"پھر بچ سکتا ہوں۔"
"یعنی قانون نافذ کرنے والے اگر آپ کا سراغ نہیں لگا پائے تو آپ کو سزا نہیں ملے گی۔ میں "آپ" مثال کے طور پر کہہ رہا ہوں، بات واضح کرنے کے لیے۔"
"ہاں، میں سمجھتا ہوں۔"
"اگر یہی اصول لاگو ہے تو پھر آپ کو پکڑنے کی ذمے داری کسی بھی آدمی پر آ سکتی ہے۔ کوئی بھی، میں بھی ہو سکتا ہوں۔" ویٹر نے پھرتی سے مرغی کی باقیات میز سے صاف کرتے ہوئے کہا۔
"مگر تم مجھے کیوں پکڑنے لگے؟" مسٹر رمبولڈ نے پوچھا۔ "میں نے تمہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا؟"
"یہ ضروری ہے جناب!"

digest.library.com/
https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

"کیوں؟"

"اگر قاتل آزاد پھر رہا ہو تو کوئی اپنے بستر پر سکون سے کیسے سو سکتا ہے؟ وہ کسی اور کو بھی قتل کر سکتا ہے۔"

"اور اگر کوئی نہ ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"فرض کرو کہ جس آدمی کو قتل کیا گیا ہو، اس کا کوئی عزیز نہ ہو، کوئی دوست نہ ہو، بس وہ غائب ہو گیا ہو اور کسی کو علم نہ ہو کہ وہ مر چکا ہے؟"

ویٹر نے معنی خیز انداز میں پلک جھپکائی۔ "تو پھر جناب، اسے خود ہی آپ کا پیچھا کرنا پڑے گا۔ وہ اپنی قبر میں چین سے نہیں بیٹھے گا۔"

"ایک اور بوتل لاؤ، بغیر برف کے۔" مسٹر رمبولڈ نے گمبھیر آواز میں کہا۔

ویٹر نے میز سے خالی بوتل اٹھائی اور روشنی کی طرف دیکھا۔

"ہاں، یہ مر چکی ہے سر!"

"مر چکی؟"

"جی جناب! یعنی ختم، خالی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، یہ واقعی مر چکی ہے۔" مسٹر رمبولڈ نے تائید کی۔

☆☆☆

تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ لاؤنج مکمل طور پر مسٹر رمبولڈ کے قبضے میں تھا۔ وہ خیالات میں گم تھے۔ قسم کسی بھی لمحے کافی لے کر آ رہا تھا۔ آگ ان کے جوتوں کے تلوؤں کو گرم کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے، کھانا بہترین تھا۔ قسم جلد ہی کافی لے آئے گا۔ وہ بڑا پیارا انسان ہے، پرانے طرز کا ایک شاہکار بندہ — پرانے طرز کا ایک شاہکار ہوٹل۔ شراب نے مسٹر رمبولڈ کو مدہوش کر دیا، ان کے خیالات اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے تھے۔

"آپ کی کافی، جناب!" قسم نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"شکریہ، قسم! میں بہت ممنون ہوں۔" مسٹر رمبولڈ نے بڑے ادب سے کہا۔ شراب نے ان کی شائستگی بڑھا دی تھی۔ "تم واقعی لاجواب آدمی ہو۔ کاش اور لوگ بھی ایسے ہوتے۔"

"میں گاہک کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہوں جناب!" قسم نے کہا۔

"مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا۔ کیا ہوٹل میں زیادہ مہمان نہیں ہیں؟" مسٹر رمبولڈ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"بہت ہیں جناب! تمام سوئٹ بک ہیں اور عام کمرے بھی۔ ہمیں روز لوگوں کو واپس بھیجنا پڑتا ہے۔ آج ہی ایک صاحب نے فون کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ بعد میں پھر معلوم کریں گے، شاید قسمت ان پر مہربان ہو۔"

"میں ان لوگوں کے لیے ہمدردی محسوس کرتا ہوں جو ایسی شاموں میں لندن میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اگر میرے کمرے میں اضافی بستر ہوتا تو میں اسے جگہ دے دیتا۔" مسٹر رمبولڈ نے خلوص کے ساتھ کہا۔

"آپ کے کمرے میں ہے۔" ویٹر نے کہا۔

"سچ — میں کتنا احمق ہوں۔ درحقیقت مجھے غریبوں اور تمام بے گھر لوگوں پر ترس آتا ہے۔"

"میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔" نیک دل ویٹر نے کہا۔

"اور وہ ڈاکٹر جو آدھی رات کو مریضوں کی تیمارداری کر رہے ہوتے ہیں؟ ان کی زندگی بھی آسان نہیں۔ قسم! کیا تم نے کبھی سوچا کہ ایک ڈاکٹر کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟"

"مجھے یہ خیال نہیں آیا جناب!"

"ان کی زندگی آسان نہیں ہوتی۔ یقین کرو۔"

"آپ کو صبح ناشتے کے لیے کب اٹھاؤں؟" ویٹر نے پوچھا۔

"مجھے اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ میں لمبی نیند سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ میں خود جاگوں گا۔ اچھی نیند سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟" مسٹر رمبولڈ نے جلدی کہا۔

"بالکل ٹھیک، جناب! رات بھر آرام سے سوئیں۔ کوئی آپ کو پریشان نہیں کرے گا۔"

"شب بخیر قسم! تم واقعی لاجواب آدمی ہو، میں یہ بات دوسروں کو بھی بتاؤں گا۔"

"شب بخیر، جناب!"

مسٹر رمبولڈ کرسی میں ڈوب گئے۔ وہ ابھی کچھ دیر اور وہاں بیٹھنا چاہتے تھے۔ کرسی نے نرمی سے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ انہیں سکون دے رہی تھی اور صرف وہ نہیں بلکہ لاؤنج میں موجود آتش دان، گھڑی، میز اور پردے سب ان پر مہربان تھے۔ سب ان کے دوست تھے۔ اب وہ ایک نئی جگہ تھے۔ ماضی کا سایہ کہیں بہت دور رہ گیا تھا۔ اب کوئی رکاوٹ کوئی خوف نہیں تھا۔ باہر سڑک سے اکّا دکّا گاڑی گزر جاتی تھی ورنہ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آخر مسٹر رمبولڈ سو گئے۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

☆☆☆

انہیں خواب آیا کہ وہ دوبارہ بچہ بن گئے ہیں اور اپنے پرانے دیہاتی گھر میں رہ رہے ہیں۔ انہیں خواب میں ایک ناقابلِ مزاحمت خواہش نے گھیر لیا کہ لکڑیاں جمع کرنی ہیں، جہاں کہیں سے بھی ملیں۔ خزاں کا موسم تھا۔ وہ لکڑی کے شیڈ میں تھے، خواب وہاں سے شروع ہوا۔ دروازہ آدھا کھلا تھا، روشنی اندر آرہی تھی لیکن انہیں یاد نہیں کہ وہ وہاں کیسے پہنچے۔ چھال اور باریک ٹہنیاں فرش پر بکھری ہوئی تھیں لیکن آگ جلانے کے لیے کوئی موزوں لکڑی نہیں تھی۔ وہ اکیلے شیڈ میں بے چینی محسوس کررہے تھے لیکن وہ واپس نہیں گئے، ہر کونے میں تلاش کرتے رہے۔ آخر وہ باغ میں نکل گئے۔ بائیں انہیں ایک لمبے درخت کی شاخ نظر آئی جس کی جڑ گھاس سے گھری ہوئی تھی۔ وہ گھر کے قریب اکیلا کھڑا تھا۔ اسے حال ہی میں تراشا گیا تھا۔ تنا آدھا ننگا تھا، پتیوں کا جھرمٹ اوپر تھا۔ وہاں ایک لمبی، پرانی سوکھی شاخ تھی جس کی چھال جھڑ چکی تھی۔ انہوں نے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ یہ بہت آسان تھا۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے آخر وہ اس سوکھی شاخ تک پہنچ گئے۔ اب شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا، رات چھا گئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے۔ وہ قریبی دوسری شاخ پر بیٹھے اور پیروں سے اس سوکھی شاخ کو دھکیلنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ شاخ چرچرانے لگی، وہ زور لگاتے رہے پھر اچانک ان کی نظر نیچے زمین پر پڑی۔ وہاں انہیں کوئی سفید چادر بچھی نظر آئی۔ وہ غور سے اسے دیکھنے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ انہیں پکڑنے کے لیے پھیلائی گئی ہو۔ آخر ان کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کفن ہے۔ اسی وقت شاخ چٹخنے کی آواز آئی اور وہ شاخ سمیت نیچے کفن پر جا گرے۔

مسٹر رمبولڈ ہڑبڑا کر جاگ اٹھے۔ وہ سرد پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ کچن کے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے اندر جھانک کر آواز لگائی۔ "ویٹرا پندرہ منٹ میں میرے کمرے میں کافی لے آؤ۔ میرا نام رمبولڈ ہے۔"

ہال مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، صرف ایک نیلی گیس کا برنر روشن تھا جس کے نیچے طاق پر موم بتیوں کا ڈھیر نظر آرہا تھا۔ انہیں یاد آیا کہ اس ہوٹل میں روایتی طور پر تاریک ماحول رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے دو موم بتیاں جلائیں اور انہیں لے کر اندھیرے ہال سے گزرے تو اچانک بڑبڑائے۔ "یہ رہی موم بتی، راستہ روشن کرنے کے لیے۔" پھر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اسی دوران ہوٹل کی تیز گھنٹی بغیر وقفے کے تین بار بجی۔

"کسی کو بے صبری ہے۔" نائٹ انچارج آہستہ سے بڑبڑایا۔

"شاید کوئی اپنی چابیاں بھول گیا ہے اور جلدی میں ہے۔"

اس نے جواب دینے میں عجلت نہیں کی، وہ بھول جانے والے مہمان کو تھوڑا سبق سکھانا چاہتا تھا۔ انچارج کی حرکات اتنی سست تھیں کہ جب وہ لابی عبور کرکے بیرونی دروازے تک پہنچا، گھنٹی دوبارہ بج چکی تھی۔ اس نے منہ بنایا اور جان بوجھ کر اپنی جگہ واپس پلٹ آیا۔ اس نے پہلے اخباروں کے ڈھیر کو سیدھا کیا پھر جا کر جلد باز مہمان کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ کوئی اجنبی تھا۔

ایک لمبے چوغے میں، جو ایک کندھے سے ڈھلکا ہوا تھا اور دوسری طرف سے باہر نکل رہا تھا، جیسے اس کے بازو کے نیچے ٹوکری دبی ہو۔ اپنے اس عجیب حلیے کی بنا پر وہ ٹوٹے ہوئے پروں والا کوا لگ رہا تھا۔ ایک گنجا کوا، پورٹر نے سوچا۔ کیونکہ سفید لینن کے اسکارف اور ٹوپی کے درمیان گردن کی جلد دکھائی دے رہی تھی۔

"گڈ ایوننگ، جناب!" اس نے کہا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

اجنبی نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے سائڈ ٹیبل کی طرف گیا اور دائیں ہاتھ سے اخباروں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔

"کیا آپ نے میرے لیے کچھ چھوڑا تھا؟" انچارج نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے رات کے لیے ایک کمرا چاہیے۔" اجنبی نے جواب دیا۔

"کیا آپ وہی ہیں جنہوں نے شام کو فون کیا تھا؟"

"ہاں۔"

"اس صورت میں، مجھے کہا گیا ہے کہ آپ کو بتاؤں کہ افسوس ہم آپ کو جگہ نہیں دے سکتے۔ ہوٹل کے تمام کمرے بھرے ہوئے ہیں۔"

"کیا آپ کو یقین ہے؟ اچھی طرح سوچیں۔" اجنبی نے پوچھا۔

"میں حکم پر عمل کررہا ہوں جناب! سوچنے کی کوئی بات نہیں۔"

اسی لمحے نائٹ انچارج کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ بنا

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

سوچے سمجھے بولا۔ "بہرحال میں ایک دفعہ اور معلوم کرتا ہوں۔" اس نے ویٹر کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

جیسے ہی اس نے یہ کہا، ویٹر خود کسی کام سے وہاں چلا آیا اور بولا۔ "سنو، بل! مسٹر رمبولڈ کس کمرے میں ہیں؟ انہوں نے کافی کا آرڈر دیا تھا لیکن میں کمرا نمبر پوچھنا بھول گیا۔"

"نمبر تیئیس، ڈبل بیڈ۔" انچارج نے فوراً کہا۔

اسی وقت یخ بستہ ہوا کا جھونکا وہاں چلا آیا اور اجنبی غائب ہو گیا۔

"اوہ خدایا! وہ کہاں گیا؟ ابھی ایک اجنبی یہاں موجود تھا۔" انچارج چلایا۔ "کیا میں نے جاگتے میں خواب دیکھا ہے؟"

ویٹر بھی آنکھیں پھاڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے دیکھا کہ فرش پر ایک چھوٹا سا برف کا ٹکڑا پڑا تھا جس کے اردگرد پانی پھیل رہا تھا۔

"ارے! یہ یہاں کیسے آیا؟" حیران ویٹر چیخا۔

"شاید وہ لے کر آیا ہو۔" انچارج نے جواب دیا۔

وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جب تمباکو نوشی کے کمرے میں گھنٹی بجی تو یہ حیرت خوف میں بدل گئی۔

"کلسم وہاں ہے، وہ دیکھ لے گا۔" انچارج نے آہستہ کہا۔

کلسم اپنی ٹائی اتار چکا تھا اور سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ تہ خانے میں سوتا تھا۔ گھنٹی سن کر وہ بڑبڑایا۔ "اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" وہ اپنی جیکٹ پہنتے ہوئے اوپر گیا۔

آتش دان کے پاس اس نے وہی شخص دیکھا جس کی آمد نے انچارج کو اتنا خوفزدہ کر دیا تھا۔

"جی سر؟" اس نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ مسٹر رمبولڈ کے پاس جائیں اور پوچھیں کہ وہ اپنے کمرے میں کسی دوست کو اضافی بستر دینے کے لیے تیار ہیں؟" اجنبی نے کہا۔

کچھ دیر بعد کلسم واپس آیا۔ "مسٹر رمبولڈ آپ کو سلام کہتے ہیں سر اور جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟"

اجنبی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی میز کے قریب گیا۔ وہاں ایک آسٹریلوی اخبار پڑا تھا جس پر کلسم نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔ مسٹر رمبولڈ کا ممکنہ مہمان صفحات پلٹنے لگا۔ پھر اپنے ناخن کی نوک سے جو کلسم کو غیر معمولی حد تک تیز لگ رہی تھی، اس نے ایک بزنس کارڈ کے سائز کا ایک مستطیل تراشہ کاٹا اور ویٹر کو پڑھنے کا اشارہ کیا۔

راہداری میں لٹکتے گیس برنر کی روشنی میں کلسم نے تراشہ پڑھا۔ یہ کوئی اطلاع نامہ تھا، اس نے سوچا لیکن مسٹر رمبولڈ کو یہ جاننے میں دلچسپی کیوں ہوگی کہ مسٹر جمی ہیگرڈ کی لاش اس حالت میں ملی ہے جو پرتشدد موت کا اشارہ دیتے ہیں؟ اس نے سوچا۔ پھر باہر نکل گیا۔

اس بار کلسم دیر سے واپس آیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور ہلکے سے خوف کا تاثر تھا۔

"مسٹر رمبولڈ آپ کو سلام کہتے ہیں سر لیکن وہ اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتے۔"

"تو پھر پوچھیں، کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں خود ان کے پاس آؤں یا وہ میرے پاس نیچے آئیں گے؟" اجنبی نے کہا۔

کلسم تیسری بار اجنبی کا پیغام لے کر گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے تمباکو نوشی کے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا بلکہ باہر سے ہی چلایا۔ "سر! مسٹر رمبولڈ کہتے ہیں کہ آپ جہنم میں جائیں جو آپ کا ٹھکانا ہے اور یہ بھی کہ اگر ہمت ہے تو اوپر آ کر دکھائیں۔" یہ کہہ کر وہ دوڑ گیا۔

کچھ ساعتوں بعد جب وہ تہ خانے میں بیٹھا تھا، اس نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ اس کے اندر کوئی پرانا جذبہ جاگ اٹھا، دلیری کا یا شاید خطرے کی پروا نہ کرنے کا۔ وہ کبھی زندگی میں اتنا تیز نہیں دوڑا تھا جتنا اس دن دوڑا۔ راہداری میں اس کا پاؤں مسٹر رمبولڈ کے جوتوں سے ٹکرایا۔ خواب گاہ کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اندر جھانکا۔ کمرا برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا اور بالکل خالی تھا۔ تقریباً ہر چیز الٹی پڑی تھی۔ تکیہ وہ پہلی چیز تھی جس پر کلسم کی نظر پڑی۔ اس پر گولیوں کے پانچ نشان تھے اور بستر پر ہر طرف خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن جس منظر نے اس کا دل دہلا دیا اور اسے نیچے جانے میں تاخیر ہوئی۔ وہ کھڑکی کی دہلیز پر رکھا برف کا نکیلا پنجہ تھا۔ ایک پتلا سا برفانی ناخن جس میں گوشت کا ایک لوتھڑا اٹکا ہوا تھا۔ یہی وہ آخری چیز تھی جو کلسم نے مسٹر رمبولڈ کے حوالے سے دیکھی۔

لیکن کیرک اسٹریٹ پر گشت کرتے ہوئے ایک پولیس اہلکار نے کچھ اور بھی دیکھا۔ لمبا سیاہ چوغہ پہنے ایک آدمی کو جس کے بازو کی وضع سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی بھاری چیز اٹھائے ہوئے ہو۔ اہلکار نے اسے آواز دی اور دوڑ کر اس کے پیچھے گیا۔ بظاہر وہ آہستہ چل رہا تھا لیکن اہلکار اسے پکڑنے میں ناکام رہا۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بھٹی

اڑتالیسویں قسط

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرافا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے زہر میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خون آشام سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

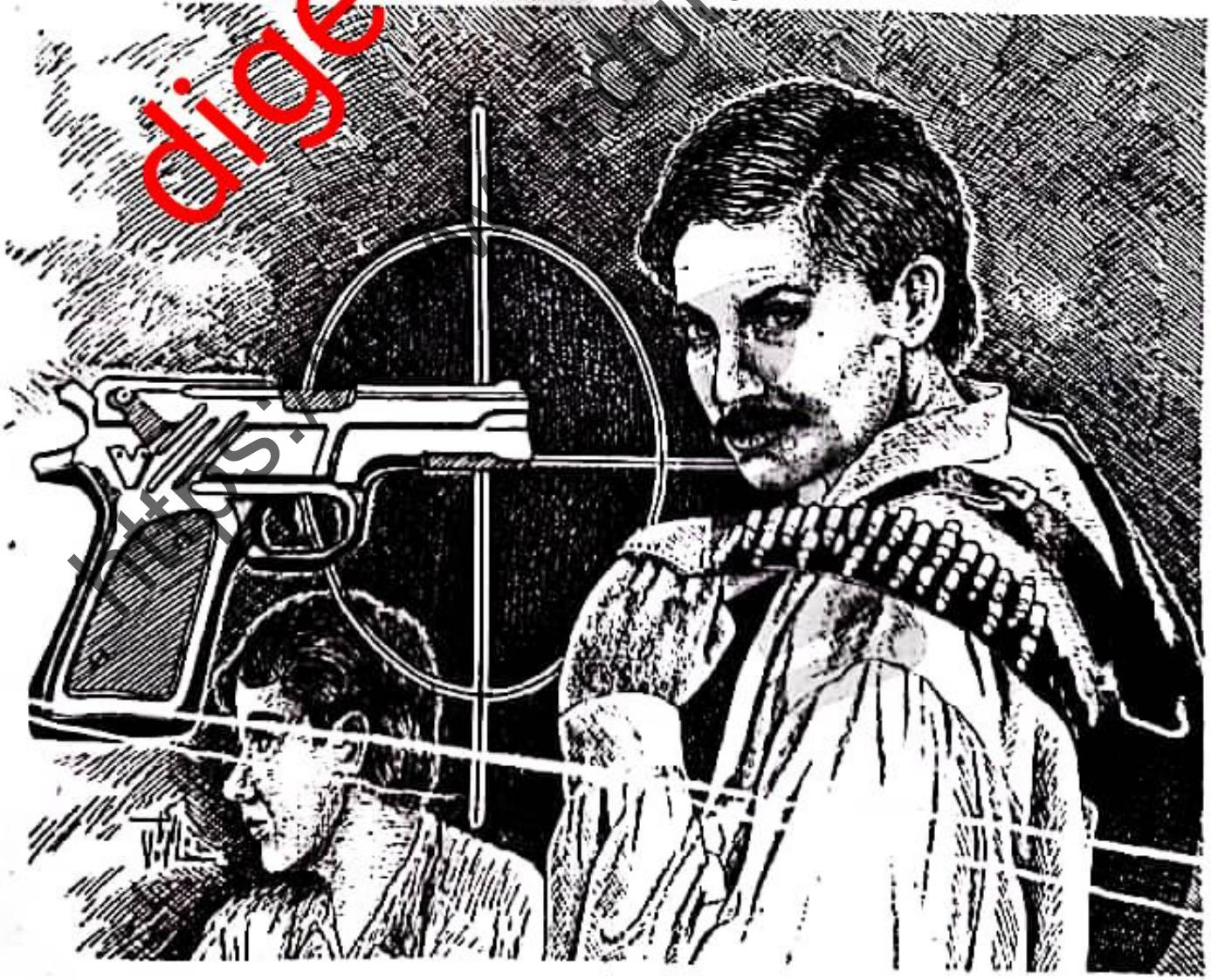

digest library.com
https://www.youtubes.com/

Scanned with CamScanner

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی ... نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن میں اب بھی اسے ایک "بہن" کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس "سنبھلنے" کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلہ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا "باس" کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں کو لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے "باس" اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری "نمک حلالی" سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر کا سالا سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ میں لاک اپ ہوا تاہم رہا ہو گیا۔ باس اقبال، سلیم چھا لیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر "چودھری جی برادران" کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ نادو کو درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن گیا۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اس کا بنگلا تھا۔ ایک خفیہ گروہ "کالی لہر" سے میرا ٹاکرا ہو گیا۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ تھا۔ عدیل جوک جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلہ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میلہ مچھی سے میری دشمنی عروج پر تھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی بانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کر دیے۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ پھر مجھے حالت بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ تب ہی لیلیٰ مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے در بدر کر دیا تھا۔ اماں میرے علاج کے لیے سرحد پار سے خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کر دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور استاد جوجی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور راڈ ان کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانگا سے ٹاکرا ہوا۔ رانگا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کر دیا۔ میں نے رانگا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانگا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔ میں زخمی بھی ہو گیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کر دیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چودھری برادران نے مجھ سے مفاہمت کر لی۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ جگنو کو مار دیا گیا تھا۔ میں نے تیمور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی "شے" لے کر کہیں جا رہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے سر پر

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

چوٹ لگنے سے میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا راجا تیمور اور ڈرائیور ہلاک ہو چکے تھے اور کینوس سے ڈھکی شے غائب تھی۔ راجا تیمور کا ایک ساتھی زندہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ معلومات پر پتا چلا کہ کسی گروہ نے انہیں ہلاک کیا تھا اور بومبورگا نامی قدیم مجسمے لے اڑے تھے۔ میں نے میڈم مچھی تک پہنچنے کے لیے ان کا پیچھا کیا اور ان کے ساتھیوں کی کشتی میں سوار ہو گیا۔ ہم انڈین حدود میں داخل ہو گئے۔ بومبورگا کا مجسمہ بھی انہی کے پاس تھا۔ کشتی میں صرف دو افراد بچے۔ ایک میں اور دوسری شینا۔ میں نے شینا کو الٹی سیدھی کہانی سنا کر اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ ہماری کشتی ندی کی طغیانی کے باعث تباہ ہو گئی۔ ہم ایک جگہ پہنچ گئے۔ شینا زخمی ہو گئی۔ وہاں موجود میاں بیوی نے ہماری مدد کی۔ ہم ان کے گھر آ گئے تاہم وہاں مخالف گروہ کے لوگ آ گئے۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ میں واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں مخالف گروہ کا باس اور ایک لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ باس البرٹ رمنڈو اور اس کی ساتھی بومبورگا کے مجسمے کے چکر میں تھے۔ میں اور شینا انہیں جل دے کر نکل گئے۔ ایک جگہ جنگل میں باس کے ساتھی مارے گئے اور وہ ہمیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میں اور شینا ایک بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں شینا کے ساتھی میری طرف سے مشکوک ہو گئے۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں مجھے کچھ انگریز ملے۔ گورا پارٹی ایک سرکس کمپنی سے تعلق رکھتی تھی اور وہ وہاں ایک گوریلا کو پکڑنے آئے تھے۔ وحشی قبیلہ ان کا دشمن ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مدد کا کہا۔ میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ دشمنوں کی تحویل سے گاڑیاں نکالنے کے چکر میں ماریا کا باپ مارا گیا۔ ماریا نے گرگینڈوا کو قابو کر لیا اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم ماریا کے سرکس والی جگہ پر پہنچ گئے۔ میں وہاں سے رانگا مانی روانہ ہو گیا۔ میں ایک آبادی میں پہنچ گیا۔ میرا وہاں دشمن کے گروہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ میں نے انہیں زیر کر دیا۔ دشمن کے علاقے میں رمنڈو سے میرا سامنا ہو گیا۔ وہ بومبورگا کے مجسمے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شینا کو بھی اغوا کر لیا تھا۔ رمنڈو کو مجسمہ چاہیے تھا اس لیے اس نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں اس مشن میں زخمی ہو گیا اور مچھی کے چنگل میں پھنس گیا۔ اچانک وہاں کسی گروہ نے حملہ کر دیا اور میڈم مچھی فرار ہو گئی۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا تاہم میرے کہنے پر فوزیہ کو رہا کروا لیا گیا۔ ہم رمنڈو کے پیچھے گئے۔ گروہ کے کچھ ساتھیوں کو رمنڈو نے ہلاک کر دیا۔ رمنڈو کی گاڑی تباہ ہو گئی۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تاہم میں فوزیہ کے ہمراہ بچ نکلا۔ بومبورگا کے تنازعے سے میں ایک صحافی جمیلہ سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا مگر جمیلہ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک لبنانی رپورٹر ملی۔ میں مائرہ کے ساتھ بومبورگا کے مجسمے کو تباہ کرنے نکلا۔ مائرہ ماری گئی۔ واپسی پر مجھے مچھیروں نے پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے نکل بھاگا اور واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ ہم کراچی آ گئے۔ میری ایک خاتون سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مشہور اداکارہ روبی تھی جو خود کو جگنو کی بہن بتاتی تھی۔ اسے اپنے بھائی کا کچھ ذاتی سامان حاصل کرنا تھا اور میری مدد درکار تھی۔ ہم نور پور روانہ ہو گئے۔ راحیلہ کسی نوید نامی شخص کی آلۂ کار بن گئی تھی۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے نادو کو کچھ لوگوں کی تحویل میں دیکھا۔ وہ چودھری کے گماشتے تھے اور انہوں نے نادو کو اختیار سے طلاق دلوا دی تھی۔ میں نے نادو کو آزاد کرا لیا تاہم وہ خود چودھری کے پاس چلی گئی۔ سدرہ کو سجاد بیگ نے اغوا کر لیا تھا۔ میں نے سدرہ کو اس کے چنگل سے نکال لیا۔ میں نے سلیم چھالیا کا پیچھا کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ روبی کو بازیاب کرانے جا رہا تھا۔ ہم نظام شاہ کے فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں کچھ لوگ آ گئے اور مارا ماری ہوئی۔ دلاور شاہ مارا گیا جبکہ وہ لوگ روبی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دلاور شاہ کے قتل کا الزام مجھ پر آیا اور مجھے لاک اپ کر دیا گیا۔ نظام شاہ کے راتب خور انسپکٹر نے مجھے حوالات میں ختم کرانے کی کوشش کی تاہم میں بچ گیا۔ میں نے نئے SHO کو اعتماد میں لے لیا۔ مجھے بری کر دیا گیا۔ فوزیہ اور میری شادی ہو گئی۔ روبی زخمی حالت میں سدرہ کے گھر پہنچ گئی۔ میں روبی سے ملنے پہنچا۔ روبی نے بتایا کہ جگنو کو نظام شاہ اور لاکھا نے مارا تھا۔ میں نے انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کا عہد کر لیا۔ میں نوید چھچھرا کے ولا میں پہنچ گیا۔ میں نے نوید کو زخمی کر دیا اور اس سے پنج گرائیں کی فائل پر دستخط کرا لیے۔ میں وہاں سے نکل پڑا۔ راستے میں راحیلہ سے سامنا ہوا تاہم نوید کے آدمیوں نے راحیلہ پر گولی چلا دی۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی۔ میں نے نوید کے گماشتوں کو ختم کر دیا۔ میں راحیلہ کو جوجی کے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ میں نظام شاہ اور لاکھا سے حساب چکتا کرنے کے لیے نور پور فارم ہاؤس پر پہنچ گیا۔ لاکھا وہاں پہنچا تو فوزیہ اس کے قبضے میں تھی۔ اس نے مجھے زخمی کر دیا۔ وہاں زبیر پہنچا اور ہماری مدد کی۔ میں نے لاکھا سمیت اس کے کئی ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیا۔ شگفتہ آنٹی کو ان لوگوں نے ختم کر دیا تھا۔ فوزیہ کی حالت بری تھی۔ ہمارا بچاؤ نہیں رہا تھا۔ میں دفتر جا رہا تھا۔ میں نے مچھی کو دیکھا۔ میں اس کا پیچھا کرتا ہوا ان کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہاں نگہت سے میری ملاقات ہو گئی۔ بھانڈیل سائیں کے گماشتوں نے ہمیں دیکھ لیا اور وہ ہمیں ڈھونڈنے لگے۔ ہم وہاں سے نکل کر ایک ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں بومبورگا کے حصول کے لیے بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کے کارندے موجود تھے۔ وہاں دھینگا مشتی ہوئی اور ہم دونوں کارندوں کو اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔ ان کے ساتھ وسیم بھی تھا۔ ہم نے انہیں ڈرایا تو وسیم نے اندر کی باتیں بتانا شروع کر دیں۔ ایک کارندہ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم بومبورگا کے حصول کے لیے وسیم کو لے کر نکلے۔ وہاں مارا ماری ہوئی۔ وسیم نے دھوکے سے ہمارے ایک آدمی کو مروا دیا اور خود نکل بھاگا۔ وہاں مچھی کے ساتھیوں سے ٹاکرا ہوا اور اس کا چیلا ہمیں قابو کر کے اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ میں نے وہاں چالاکی دکھائی اور مچھی کو وسیم سے بدظن کر دیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے دھاوا بول دیا اور مارا ماری میں نگہت کو گولی لگ گئی۔ تاہم نگہت کی جان بچ گئی۔ میں نے لکے چودھری کی گاڑی کا پیچھا کیا۔ انہوں نے سلیم کو اٹھا لیا تھا اور اسے مارنے والے تھے کہ میں نے اسے بچا لیا۔ میں اور سلیم، وسیم اور سجاد بیگ کی تلاش میں نکل پڑے۔ اچانک راستے میں کچھ لوگوں نے ہمیں چھاپ لیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

digest library.com
https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

خرد کا یارا ہونے تک نہ جانے کتنی دیر بیت چلی تھی، اس کا بروست مجھے اندازہ نہ ہو سکا لیکن میری آنکھ تاریکی کے دبیز پردے میں ہی کھلی تھی۔

شکر تھا کہ میں خود کو زندہ محسوس کر رہا تھا اور ہوش میں بھی کہ آنکھ کھلتے ہی مجھے سب یاد آتا چلا گیا تھا۔ زیادہ دیر سوچنے، یاد کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔

شام کے دراز ہوتے سائے تلے میں اور سلیم بائیک پر وسیم (یا سجاد بیگ) کی تلاش میں گرین سٹی کی طرف جا رہے تھے۔ وہاں سے ناکامی کی صورت میں ہمارا ارادہ چودھری برادران کے ایک اور خفیہ ٹھکانے کی طرف نکلنے کا تھا جو ہالا ایک کے مضافات میں کہیں واقع تھا (اس کا علم سلیم کو تھا) لیکن راستے میں تین سیاہ پوش افراد نے ہمارا سیڈان گاڑی میں تعاقب کیا اور پلک جھپکتے ہی ہم دونوں کو بے بس کر کے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

"سلیم کدھر تھا؟" یہ سب سوچنے کے بعد مجھے اس کا خیال آیا۔

"سلیم ——!" میں نے گھور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے ہولے سے پکارا۔

"آہ ——!" قریب ہی اس کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں آواز کی جانب لپکنا ہی چاہتا تھا کہ عقدہ کھلا کہ میرے پاؤں بندھے ہوئے تھے اور میں ٹھنڈے ٹھار فرش پر پڑا تھا۔ غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھوں کو جنبش دی تو خوشی ہوئی کہ ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔

میں گھسٹتا ہوا اس کی جانب بڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اچانک ہی میرے بندھے ہوئے پیروں کو جھٹکا سا لگا اور بے اختیار میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

ان نامعلوم افراد نے میرے دونوں پاؤں نہ صرف کسی فولادی چین سے باندھ رکھے تھے بلکہ چین کا دوسرا سرا کسی اور جگہ یا شاید دیوار پر نصب کسی آہنی ہک سے اٹکایا گیا تھا تاکہ میں دو تین فٹ سے زیادہ آگے پیش قدمی نہ کر پاؤں۔

تب ہی مجھے اپنے سر کے پچھلے حصے میں ٹیس سی محسوس ہوئی۔ ہاتھ رکھ کر محسوس کیا تو وہاں زخم کا ابھار تھا۔ ادھ جمی مجھ پر دھوکے سے وار کر کے بے ہوش کیا گیا تھا۔

"سہراب ——! کیا تیری حالت بھی میرے ہی جیسی ہے؟" معاً ہی سلیم کی سرگوشی ابھری۔

اب کے اس کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ بھی ہوش میں آنے کے بعد کافی حد تک سنبھالا لے چکا تھا۔

"ہاں، میرے دونوں پاؤں بندھے ہوئے ہیں اور شاید دیوار سے منسلک کنڈے سے پاؤں کی زنجیر بندھی ہوئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا بھی یہی حال ہے۔" وہ بولا۔ "مگر تم کیسے قابو میں آ گئے؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیوں —— میں کیوں نہیں قابو میں آ سکتا تھا؟" میں نے طنزیہ کہا۔ "کیا میں کوئی بھوت ہوں؟ تمہاری طرح کا ہی ایک انسان ہوں۔"

"ہاہا —— صحیح کہا۔" سلیم زندہ دلی کے ساتھ قہقہہ مار کر بولا۔ "پر ہیں کون لوگ یہ ——؟ کچھ اندازہ ہو پایا ہے تجھے؟" اس نے آخر میں سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"ظاہر ہے ہم دونوں پر اتنی آسانی سے ان لوگوں نے قابو پا لیا ہے تو خطرناک ہی ہوں گے اور دوست تو بہرحال بالکل بھی نہیں۔" میں نے بھی اسی انداز سے جواب دیا۔

"چٹ ——"

اچانک ابھرنے والی اس آواز کے ساتھ ہی ہم دونوں یکدم خاموش ہو گئے اور بیساختہ آنکھیں چندھیا گئیں، اس قدر کہ ہمیں آنکھوں پر بازو رکھنا پڑا۔

"شواپ ——" پانی کا زوردار چھپاکا ہمارے چہروں پر پڑا۔ ہم ٹھٹھر گئے۔ مقصد آنکھوں سے بازو ہٹانا ہی تھا ان نامعلوم لوگوں کا، جن کے قدموں کی آواز اندر آتی محسوس ہوئی۔

اب وہ ہمیں دیکھ رہے تھے لیکن ہم دیکھنے سے قاصر تھے۔ تیز روشنی تھی جو ہماری آنکھوں کو ہنوز چندھیائے ہوئے تھی۔ ہم بار بار اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے اور بازو رکھتے جواب میں پھر ہم پر ٹھنڈا ٹھار پانی پڑتا۔ ہم تڑپ جاتے۔ پانی سردی کی وجہ سے ٹھنڈا نہیں تھا بلکہ وہ برف والا پانی تھا۔

ہم نے سرد پانی کے ریلے کے آگے دوبارہ چہرے پر بازو نہ رکھا مگر آنکھیں ضرور جھپکانے لگے۔ یہ کوئی لائٹ تھی شاید جو ایک طرح کا "ٹارچر" ہی تھی۔

"تم لوگ کون ہو؟" سلیم نے ہی بالآخر کہا۔ جواب میں اسے وحشیانہ غراہٹ سے کسی نے اپنا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اپٹ فیر تھی زبان میں تھی۔

"سوال صرف ہم کریں گے، جواب کے لیے تمہیں منہ کھولنا ہوگا، اس کے علاوہ نہیں۔ گاٹ اٹ؟"

چند لمحوں کی خاموشی کا وقفہ ہوا، اس کے بعد وہی غراتی آواز دوبارہ ابھری۔

"مسٹر سہراب! یہ تمہارا کوئی ساتھی ہے؟ کیونکہ اسے

https://www.urdutube.com
Scanned with CamScanner

digest library.com

ہم نہیں پہچان پا رہے ہیں۔" اب کی بار براہِ راست مجھے مخاطب کیا گیا تھا اور میں اندر سے چونک گیا۔ گویا یہ لوگ مجھے بخوبی پہچان رہے تھے۔

"ہاں، یہ میرا دوست ہے اور....."

"بس۔" مجھے مزید بولنے سے روک دیا گیا۔ "جتنا پوچھا جائے، اتنا ہی جواب دینا ہے۔"

"بہتر۔" میں نے بھی ہولے سے کہا۔

"ہمارے پانچ ٹاپ ایجنٹوں کے بارے میں بتاؤ، جنہیں تم نے یہاں کے حساس اداروں کے حوالے کیا تھا۔" غرآتی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"میں نے.....؟" میرا انداز سوالیہ تھا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے دوست!"

"شٹ اپ۔" ایک زوردار کوڑا نما شے میرے چہرے پر پڑی اور بے اختیار تکلیف کی شدت سے میرے منہ سے بلبلاتی چیخ خارج ہوگئی۔ وہ کوئی عام کوڑا نہ تھا، اس پر اسٹیل یا فولاد کے نٹ لگے تھے۔ مجھے اپنا آدھا چہرہ بری طرح چھلتا ہوا محسوس ہوا۔ اس قدر کہ میری ایک آنکھ پر فوراً اس جاں شکن ضرب سے سوجن بھی اتر آئی۔

سلیم بے چین ہوگیا۔ وہ حلق کے بل دہاڑا۔ "کمینے، کتے، بزدل! سنتے پر وار کرتے ہو۔ کھولو میرے ہاتھ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ..... آہ.....!" سلیم کی للکارتی ہوئی آواز یکدم ہی معدوم ہو کر ختم ہوگئی۔ اس پر شاید کسی نے بھاری یا کند شے سے کوئی وار کیا تھا جسے میں دیکھنے سے قاصر رہا لیکن میں تڑپ گیا تھا۔

سلیم کو یقیناً انہوں نے کوئی کاری وار کر کے جسمانی طور پر ہی خاموش کر ڈالا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب میرے اندر تشویش اور دکھ کی لہر اٹھی۔ اس خدشے سے کہ کہیں خدانخواستہ سلیم کو ہلاک تو نہیں کر دیا گیا، کیونکہ سلیم بہرحال ان کے لیے اہمیت کا حامل نہیں تھا۔

"اس کی لاش لے جاؤ اور بھٹی میں ڈال کر جلا ڈالو۔" وہی غراتی ہوئی سفاک آواز ابھری اور میں جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ میرا دل کسی نے جیسے دو بھاری سلوں کے درمیان دبا دیا ہو۔ کئی لمحوں تک تو میرے حلق سے آواز تک نہ نکل پائی۔

نہ جانے کس شے سے سلیم پر وار کیا گیا تھا، اس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ کم از کم وہ سائلنسر لگا پستول تو نہیں تھا، کوئی سنسناتی ہوئی لیکن بہت ہی ہلکی سی آواز تھی۔ یا شاید کوئی تیز شے اس کی جانب پھینکی گئی ہو۔ کوئی چاقو یا خنجر۔

میں نے اس طرف دیکھنے کی بہت کوشش کی تھی کہ یقین کروں، ابھی ذرا دیر پہلے ہی جیتا جاگتا اور للکارتا ہوا سلیم چھالیا واقعی اس دنیا میں نہیں رہا، مگر میں نہ دیکھ سکا۔ تب ہی میرے اندر کے اترتے ہوئے سناٹے آسیبی آوازوں کی طرح چلا اٹھے۔

"کمینو، کتو.....! اگر واقعی میرے ساتھی کو تم نے ہلاک کر ڈالا ہے تو یاد رکھو، بہت بھیانک حشر کروں گا تمہارا میں۔" میں جی جان سے تڑپ کر ان سے بولا تھا، اس قدر اونچی اور بلند آواز میں کہ مجھے میرا حلق پھٹتا ہوا سا لگا۔

"شٹ اپ.....!" ایک بار پھر وہی کوڑے نما شے مجھ پر پڑی اور میں درد سے چیخا۔ اس بار کوڑا چہرے پر نہیں، میری پیٹھ پر پڑا تھا۔ اس پر واقعی فولادی کیلیں نصب تھیں جس سے مجھے اپنی کمر بری طرح چھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں درد سے ہانپنے لگا۔

اسی وقت میری سماعتوں نے ایک سے زائد بھاری قدموں کی آواز سنی جیسے کہ وہ کسی بھاری شے کو فرش پر گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے ہوں۔ میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ وہ شاید اس غرآتی ہوئی آواز والے کے حکم پر سلیم کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے کہیں ٹھکانے لگانے کے لیے لے جا رہے تھے۔

میرا دل رک رک کر دھڑک رہا تھا۔ مجھے اپنی جسمانی اذیت کی بالکل پروا نہ تھی۔ سلیم کے یوں پلک جھپکتے ہی موت کے گھاٹ اتر جانے سے میرا دل غم سے بیٹھ چکا تھا، جی اس قدر ہلکان تھا کہ بولنے کا بھی یارا ختم ہوتا محسوس ہونے لگا۔ یوں جیسے خاموش رہ کر غم سہہ رہا ہو۔ اُف۔

میرے بچپن کے تین دوستوں میں ایک سلیم ہی تو باقی بچا تھا۔ بڑا کمبخت نکلا، دل کا بھی عجیب تھا میرا اور دوست تو ایسا کہ دل کے کسی کونے میں اس نے اپنے تعلق اور رشتے کی جوت جگا رکھی تھی۔ پھر اب تو وہ بار بار میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر اور میرے پاؤں پکڑ کر فریاد کرنے لگا تھا کہ اب اس زندگی سے تائب ہو چکا ہے، جو مجھے کبھی پسند نہیں رہی تھی۔

"تم لوگوں نے یہ اچھا نہیں کیا..... یہ..... یہ میرے بچپن کا دوست تھا اور مجھے بے حد عزیز بھی۔" میں نے جسمانی ضربات سہنے کے باوجود ٹھہرے ٹھہرے لیکن ایسی دھمکاتی آواز میں ان سے کہا جیسے ان لوگوں کے سروں پر میرا ناقابلِ تلافی ادھار پڑ چکا ہو۔

"فضول باتیں چھوڑو اور میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دو، ورنہ تمہارا حشر بھی ایسا ہی ہوگا۔" وہی غراتی ہوئی آواز میری سماعتوں میں پڑی۔ اس کریہہ آواز سے

https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

مجھے دل کی گہرائیوں سے نفرت ہو چکی تھی۔ میں اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" بالآخر مجھے کہنا پڑا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر ان کا مقصد کیا ہے اور نیز یہ کہ میں ان کے لیے کس قدر "اہمیت" کا حامل ہوں یا پھر یہ لوگ میرا بھی سلیم چھالیا جیسا حشر کریں گے؟

"گڈ! اب تم پٹڑی پر آئے ہو۔" غراتی ہوئی آواز میں بھی زہریلا طنز گھلا ہوا تھا جس نے میرے اندر نفرت کی لہر سوا ہی کر ڈالی۔

وہ آگے بولا۔ "ہمارے پانچ ٹاپ ایجنٹوں کو تم نے جن لوگوں کے حوالے کیا ہے، ان کے بارے میں تفصیل بتاؤ۔"

کسی حد تک میرا خدشہ ان کے بارے میں درست ہی نکلا کیونکہ جس انداز اور سرعت سے انہوں نے ہم پر قابو پایا تھا، وہ ان کی انتہا درجے کی "تربیت" کا دخل تو بہرحال تھا ہی۔

"وہ محکمہ کیرائی کے لوگ تھے۔" میں نے بتا دیا۔

"خوشی ہوئی تمہارے اس سچ پر۔" غراتی ہوئی نفرت انگیز آواز میں طنز نہیں بلکہ اعتراف تھا لیکن میں اندر سے جانے کیوں چونک سا گیا۔ یوں جیسے ابھی یہ مردود سفاک کوئی اہم انکشاف کرنے والا ہو۔

"یہاں تک ہمیں علم تھا، ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ تم ہم سے کتنا سچ بولتے ہو لیکن اب جو میں پوچھنے والا ہوں، وہ بھی اسی طرح کا سچ ہونا چاہیے۔" بڑی گمبھیر آواز میں کہا گیا جس میں مہیب سی تہدید مخفی تھی۔

"پوچھو۔" میں نے بوجھل سے لہجے میں کہا۔ اس سوال جواب کی "محفل" کے سب لائٹ ہلکی کر دی گئی تھی تاکہ میں اب کچھ سکون محسوس کروں۔

"ان لوگوں نے انہیں گرفت میں لینے کے بعد آگے کن لوگوں کے حوالے کیا ہے؟" پوچھا گیا۔

میں اندر سے سنسنا گیا۔ تاہم بولا۔ "آگے ان کا کام تھا، بھلا اس کا مجھے کیا معلوم؟"

"تم معلوم کر سکتے ہو کیونکہ مسٹر شیراز اور ان کی منگیتر شاہینہ کمال تمہارے نہ صرف بہترین دوست ہیں بلکہ محسن بھی ہیں کیونکہ تم نے ہمارے جن پانچ اہم ساتھیوں کو ان کے حوالے کیا ہے، اس کا کریڈٹ اس پیل نے خوب کمایا ہے۔"

اس بدبخت کی اس قدر معلومات پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی لیکن تشویش کا پہلو یہ تھا کہ کہیں یہ ان دونوں کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔ یہ بات مسلمہ ہو چکی تھی کہ یہ لوگ راز اور موساد کا کوئی نیا مشترکہ جتھا ہی ہو سکتا تھا جنہیں یوبورو (بلیک اسٹون) کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنے ان پانچ ٹاپ ایجنٹوں کو بھی چھڑانے کا ٹاسک دیا گیا تھا جنہیں حساس اداروں کے حوالے کر دیا گیا تھا اور یہ فریضہ اس جوڑے نے بخوبی اب تک نمٹا دیا تھا۔ یہ لوگ پورا "ہوم ورک" کر کے میدان میں اترے تھے۔ اسی لیے مجھے بہت دھیان سے جواب دینا تھا تاکہ صورت حال مزید میرے سامنے واضح ہوتی رہے، لہٰذا بولا۔

"ہاں، تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔ انسپکٹر شیراز اور اس کی منگیتر شاہینہ کمال میرے محسن ہی ہیں کیونکہ انہوں نے ایک پیچیدہ قانونی معاملے میں میری مدد....."

"فضول گوئی بالکل نہیں۔" یکایک اس نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ میری بات کاٹی۔ بہت کائیاں شخص تھا۔ سمجھ رہا تھا میں باتوں کی "لیپا پوتی" میں انہیں بھٹکانے کی کوشش میں تھا۔ میں یکدم خاموش ہو گیا۔

اس نے پھر کہا۔ "تم ہمیں پہلے یہ بتاؤ گے کہ تم کس طرح محکمہ کیرائی کے اس انسپکٹر شیراز سے ہمارے ساتھیوں کی معلومات لے سکتے ہو؟"

"میرا نہیں خیال کہ وہ تمہیں اس بارے میں کچھ بتا سکے گا۔" میں نے جمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "کیونکہ ملکی تحفظ، ملکی سالمیت کے کئی ادارے یہاں کارفرما ہیں اور ان کے بارے میں کوئی بھی زیادہ تفصیل نہیں جانتا۔"

"ہم۔" اس وحشی انسان نے ہنکاری بھری پھر بولا۔ "گویا تم پھر پٹڑی سے اتر رہے ہو یا پھر میرے سوال کا مقصد نہیں سمجھ سکے ہو۔ آخری بار پوچھ رہا ہوں، غور سے سنو اب۔" رکتے ہوئے وہ خبیث لمحے بھر کو رکا پھر بولا۔

"تم مجھے بتاؤ گے کہ وہ کیا طریقہ اپنا سکتے ہو، جس سے تم انسپکٹر شیراز کی زبان سے یہ اگلوا سکو کہ ہمارے ساتھیوں کو اس نے کس محکمے کے افراد کے حوالے کیا ہے، نیز انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟ یہ سچ ہے کہ اگر اسے کہیں بھی معلوم تو وہ پتا کروا سکتا ہے۔ تم کیسے اسے اس اہم کام کے لیے مجبور کر سکتے ہو؟"

میرے اندر یکایک اتھل پتھل ہونے لگی۔ اب میرے دل کو نامعلوم کیا بے چینی لگ گئی۔ یوں جیسے کچھ سامنے آنے والا ہو، ایسا کچھ جس کی مجھے توقع نہ تھی۔

"میرا خیال ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر تم کوئی ترکیب بتاؤ تو میں کچھ کرنے کی کوشش کر پاؤں۔" میں نے اپنے تئیں محتاط انداز میں جواب دیا تھا۔ اس پر چند

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

ثانیے کے لیے سکوت طاری رہا پھر اس نے کہا۔

"ہاں، یہ ممکن ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہوگا کہ تمہارے سامنے تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کیا جائے تاکہ تم بہ آسانی ہمارے کام آسکو۔"

اس کے یوں ڈرامائی انداز میں یہ کہنے پر میرے اندر کی نامعلوم سی بے چینی مزید سوا ہونے لگی۔ میں گم صم سی کیفیت میں رہا۔ یکدم لائٹ آف کردی گئی۔

میرے چہار سو اب گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی۔ سلیم چھالیا کے مرنے کا غم مجھے سخت افسردہ کیے ہوئے تھا اور ایک نئی اور عجیب سی مصیبت سر پر آن پڑی تھی۔

نہ جانے اب کیا ہونے چلا تھا؟ یہ لوگ مجھے کون سی تصویر کا دوسرا رخ دکھانا چاہتے تھے؟ میں بہرحال دھڑکتے ہوئے دل سے اس کا منتظر رہا۔

معاً ہی دوبارہ روشنی ہوگئی۔ تاریکی کا پردہ اب پوری طرح چیر دیا گیا تھا کیونکہ اب اسپاٹ فلش لائٹ کے بجائے پورا ماحول روشن ہوگیا۔ میری آنکھیں جو پہلے چندھیائی ہوئی تھیں، کھول کے میں نے انہیں دیکھنے کے قابل کیا۔

یہ ایک ہال کمرا ہی تھا۔ میں ایک کمرے کے کونے میں پڑا ہوا تھا۔ سامنے ہی وسط میں مجھے وہی تینوں سیاہ پوش کھڑے دکھائی دیے۔ ان میں ایک نسبتاً لمبا تڑنگا شخص جو شاید مجھ سے مخاطب رہا تھا، کھڑا میری طرف نقاب کے دو سوراخوں سے گھور رہا تھا۔ باقی اس کے دونوں ساتھی دائیں بائیں مستعد کھڑے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں رسن بستہ تھا، ان کے چوکنے پن میں کوئی کمی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔

بے اختیار پھر میں نے اس طرف گردن موڑ کے دیکھا جدھر میرے اندازے کے مطابق سلیم کو بھی اسی حالت میں رکھا گیا تھا اور جس سے میں کچھ دیر پہلے تک مخاطب رہا تھا۔ وہ جگہ خالی تھی لیکن وہاں فرش پر مجھے کوئی ایسی شے دکھائی نہ دی، جیسی مانع یا خون۔ جبکہ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ سلیم کو اچانک ہلاک کرنے کے لیے انہوں نے خاموش ریوالور کی گولی داغی ہوگی۔ ممکن تھا خون صاف کردیا گیا ہو۔ سلیم کی لاش بھی شاید ٹھکانے لگا کر اس کے دونوں ساتھی لوٹ آئے تھے۔

"اس طرف دیکھو۔" دفعتاً ہی اس مذکورہ تنومند شخص کی تحکمانہ آواز ابھری۔ وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا۔ اس نے ہال کی جنوبی دیوار کی سمت اشارہ کیا تھا۔ وہاں ایک دروازہ تھا، سنگل پٹ کا دروازہ۔ وہ کھلا، اندر سے کسی کو وہیل چیئر پر لایا گیا۔ لانے والا یا والی بھی سرتاپا سیاہ پوش تھی۔ اس کے جسمانی خطوط سے اس کے عورت ہونے کا پتا چلتا تھا۔

لیکن پھر میری نظریں وہیل چیئر پر نڈھال اور نیم مردہ سے بیٹھے وجود پر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا اور تب ہی مجھ پر لرزہ خیز انکشاف ہوا۔

وہ بھی عورت ہی تھی جو ان کے رحم و کرم پر اس حال کو پہنچائی گئی تھی کہ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ چہرے کی رنگت پھیکی اور بال کھچڑی تھے۔ جسم سمیت اس بدنصیب عورت کے ہاتھ پیر بھی تشدد زدہ نظر آئے۔ حالانکہ وہ ایک جوان عورت تھی لیکن اس کی حالت زندہ لاش جیسی ہو رہی تھی۔

میں اسے پہچان کر ہی دہلا تھا۔ وہ انسپکٹر شیراز کی خوبصورت منگیتر جواں سال لیڈی انسپکٹر شاہینہ کمال تھی۔

☆☆☆

"خوب! پہچان گئے تم اپنے دوست کی منگیتر کو۔" غراتی آواز کے لہجے میں فتح کا نشہ تھا۔ "ویسے تو سب سے پہلے تمہاری اسی خاتون انسپکٹر سے شناسائی ہوئی تھی، جب تم دلاور شاہ قتل والے کیس میں اپنی محبوبہ فوزیہ سمیت قانون کے شکنجے میں پھنس گئے تھے۔ اسی نے تو تمہاری مدد کی تھی اور یقیناً اب تم اپنی محسنہ کو اس حال میں دیکھنا تو بالکل پسند نہیں کرو گے۔"

بڑے ہی خبیثانہ انداز میں اس تنومند سیاہ پوش نے یہ بات کہی تھی اور کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ بدطینت نظام شاہ نے خود ہی اپنے چھوٹے بھائی دلاور شاہ کو مروا کر اس کا الزام میرے سر تھوپنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس وقت کا ذکر تھا اور مجھے حیرت ہوئی کہ را اور موساد کی یہ نئی "پود" کن خطوط پر اپنے دیرینہ مشن کا اعادہ کرکے آئی تھی۔ یوں انہی حالات میں شاہینہ اور بعد میں اس کے منگیتر انسپکٹر شیراز نے میری اور فوزیہ کی مدد کی تھی بلکہ ابھی تک یہ دونوں میرے اہم مددگاروں میں سے تھے۔ اب اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ان رذیلوں نے میری دکھتی رگ کو دیکھتے ہوئے ایسے ساتھی کا انتخاب کرکے اسے تختۂ مشق بنا کر میرے سامنے پیش کیا تھا جسے دیکھ کر میرا اندر سے تڑپ جانا لازمی تھا۔

میں نے اپنے اندر کی اتھل پتھل ہوتی کیفیت پر قابو پایا۔ میرا دل پہلے ہی سلیم چھالیا کی ناگہانی اور اچانک موت پر بوجھل تھا اور اب یہ ایک نیا امتحان میرے سامنے تھا۔ سلیم بیچارہ تو خود بھی اب میرے ساتھ اس مشن میں شامل ہونے کا پختہ عزم کرچکا تھا کہ وہ ان خبیثوں (بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس) کو اپنے کسی بھی ناپاک منصوبے میں کامیاب نہ

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

ہونے دے گا اور مزید یہ کہ وہ ان کا اپنی پاک دھرتی سے صفایا کر کے ہی رہے گا لیکن افسوس، اس کی تقدیر میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ اب شاہینہ ایسی قابلِ رحم حالت میں میرے سامنے تھی۔ میں نے کوشش کی کہ زیادہ جذباتی پن ظاہر نہ کروں لیکن میرے چہرے پر کرب کے تاثرات مترشح ہوتے رہے۔ ایسی صورت میں کوئی چالاکی میرے لیے ممکن نہ ہوتی، اسی لیے میں نے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ چہرے کے تاثرات نارمل رکھے۔ اس کے بعد میں نے اس تنومند شخص کی طرف دیکھ کر بظاہر سکون سے اور مسکرا کر کہا۔

"قانون اور دیگر ایسے کئی معاملات میں بہت سے افراد نے میری مدد کی ہے۔ چیدہ چیدہ تو میں کچھ کو ہی جانتا ہوں، ان میں ایک یہ خاتون بھی ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم لوگوں کو اس بیچاری پر اس قدر تشدد کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں۔" وہ سفاکی سے غرا کر بولا۔ "تم اچھی طرح جان چکے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہمارے پانچ ٹاپ ایجنٹوں کی آوازیں اس خوب صورت عورت شاہینہ کمال کے مگیتر کے ہی ہاتھوں میں ہے۔"

"تو پھر مجھ پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے تم نے اسی سے رابطہ کیوں نہ کر لیا؟" میں نے بھی طنز سے کہا۔ جبکہ میرا دل شاہینہ کمال کی حالت اور ایسی قابلِ رحم بیت گذائی پر کڑھ رہا تھا۔

"کیا تھا رابطہ۔ اس نے کوئی پروا نہ کی۔" اس نے بتایا تو اس کے لہجے کے غرور کو اس بار شکست خوردگی کھا گئی۔ وجہ یہی تھی کہ شیراز نے اپنی مگیتر کو اپنے عظیم مقصد اور وطنِ عزیز کے اہم مقاصد پر قربان کر دیا تھا۔ یہی ان کی شکست تھی لیکن جانتا تھا کہ نچلا وہ بھی نہیں بیٹھا ہوگا۔ اپنی مگیتر اور ان مردودوں کی تلاش میں وہ بہادر نوجوان نکل کھڑا ہوا ہوگا۔

یہ سب سوچتے ہی میرے اندر کے جنگ باز آدمی نے انگڑائیاں لینا شروع کر دی تھیں کیونکہ شاید یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا کہ انہوں نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تھا اور یہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ انہوں نے ایسا کر کے اپنی موت کو ہی آواز دی تھی۔

جنوبی سمت کی وہ دیوار جس کے دروازے سے شاہینہ کو نیم مردہ حالت میں وہیل چیئر پر میرے سامنے لایا گیا تھا، ہنوز کھلا ہوا تھا۔ بلاشبہ شاہینہ کو اس حالت میں دیکھ کر میرا دل بری طرح سے کٹ رہا تھا۔ کوشش یہی تھی کہ اپنے چہرے کے تاثرات سے اپنی دلی کیفیات کو ظاہر نہ ہونے دوں۔

مجھے لگا یہ صرف یہاں تین نہیں ہیں۔ ان کے اور ساتھی بھی یہاں موجود تھے۔ کتنے ؟ اس کا ابھی مجھے اندازہ نہ ہو سکا تھا۔

"لیکن تم اس کی پروا کرو گے۔" اس نے جیسے آخر میں اپنا جملہ مکمل کیا اور میرے اندر اس کا یہ جملہ سنتے ہی مسرت چمکی تھی۔ یعنی وہ مجھے "طالع آزما" سمجھے ہوئے تھا۔ اس کی مجھ سے یہی "امید" مجھے کوئی گل کھلانے کا موقع فراہم کر سکتی تھی۔ گویا اسے مجھ سے توقع تھی کہ میں اپنی محسنہ کو اس حال میں دیکھ کر یقیناً ان کی بات ماننے کی کوشش کروں گا اور یہیں سے میری چالبازی کی ابتدا ہو سکتی تھی۔

لہٰذا میں نے چالاکی سے کہا۔ "اگر اپنی جان بچانے کا کوئی راستہ تم دکھا سکتے ہو تو مجھے اس پر چلنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"تمہیں انسپکٹر شیراز کے منہ سے یہ اگلوانا ہوگا کہ ہمارے پانچ ساتھیوں کو اس نے کن لوگوں کے حوالے کیا ہے؟" تنومند شخص نے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"ہے — ممکن ہے، بلکہ تم سے ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے۔" تنومند شخص نے مکاری سے کہا۔ سیاہ پٹی میں ڈھکا ہوا اس کا چہرہ مجھے مکارانہ انداز میں مسکراتا ہوا ہی محسوس ہوا تھا جس کی جھلک اس کی نقاب سے جھانکتی تیز آنکھوں سے بھی عیاں ہوتی تھی۔

"اس لیے کہ تمہاری مدد اور وساطت سے ہی ہمارے پانچ ساتھی انسپکٹر شیراز کے سپرد کیے گئے تھے اور تم کسی بھی چالاکی سے شیراز کے منہ سے اگلوا سکتے ہو۔ یہ بات وہ تم سے بالکل نہیں چھپائے گا کیونکہ اسے تم پر کسی بات کا شک نہیں ہوگا کہ تم یہ اہم بات کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"غلط — وہ چونک سکتا ہے میرے اس سوال پر۔" میں نے اس کے خیال کی نفی کی۔ "اس لیے اگر تم یہ کام اس کی مگیتر کو اغوا کرنے سے پہلے کروانے کی کوشش کرتے تو اور بات تھی۔ اب یوں میرے پوچھنے پر وہ چونک سکتا ہے اور مجھ پر بھی اسے شبہ ہو سکتا ہے۔"

"تم پھر چالاکی سے کام لے رہے ہو۔" تنومند شخص بھیڑیے کی طرح غرایا۔

"لو بک سمجھنے کی کوشش کرو مسٹر!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔ "تم شاہینہ کو

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

چھوڑ دو، بلکہ اسے خود ہی فرار ہونے کا موقع دو تا کہ شیراز کو یہی گمان ہو کہ اس کی منگیتر موقع ملتے ہی بہادری کے ساتھ فرار ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ہی میں شیراز سے مل کر.....''

''مل کر نہیں، ادھر ہی سے فون پر رابطہ کرو گے تم۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''لیکن اسے یہ نہیں بتانا ہوگا کہ تم ہماری قید میں ہو۔ رہی بات شاہینہ کو چھوڑنے کی تو یہ ابھی ناممکن ہے کیونکہ اسی ایک شکار کی وجہ سے تو تم ہماری بات ماننے پر مجبور ہو گے۔ اس لیے کہ اس کے منگیتر کو تو اس کی پروا نہیں لیکن تم ضرور اپنی محسنہ کی فکر کرو گے۔''

''میرے لیے بھی یہ اہم نہیں ہے۔'' میں نے بے اختیار کہہ ڈالا۔ اگرچہ میں نے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ واقعی ایسا ہی تھا، مگر اندر سے ظاہر ہے میں کب چاہتا تھا کہ شاہینہ ان کی قید میں رہے۔ میری کوشش یہی ہوتی کہ میں اپنی جان پر کھیل کر شاہینہ کی جان ان سفاک بھیڑیوں سے بچانے کی کوشش کرتا۔

''تو ٹھیک ہے پھر.....!'' تنومند شخص نے سنسناتے لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ تمہارے لیے اہم نہیں ہے تو پھر ہمارے لیے بھی نہیں۔'' کہتے ہی اس نے اپنی پشت پر ہاتھ گھمایا اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں سیاہ نال والا بھیانک پستول تھا۔

اس کی نال اس نے وہیل چیئر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں بیٹھی شاہینہ کی طرف کر دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ زیادہ چالاکی خطرناک ثابت ہونے لگی تھی۔ میں یکدم چلّایا۔

''نہیں۔'' میں نے ٹھنڈے فرش پر لیٹے لیٹے اپنا ایک ہاتھ اسے فائر کرنے سے روکنے کے لیے اٹھا دیا۔ تب ہی اس خبیث نے فاتحانہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہم کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے اور سوچ سمجھ کر وہی قدم اٹھاتے ہیں جس کی کامیابی پر سو فیصد ہمیں یقین ہوتا ہے مسٹر سہراب!''

یہ اس کے غرور کی انتہا تھی جس سبب وہ اپنی کامیابی کو سو فیصد یقینی سمجھے ہوئے تھا۔

''ہم جانتے تھے کہ تم کبھی اپنی محسنہ کو یوں مرتا نہیں دیکھ سکو گے۔'' وہ بولا۔ ''لہٰذا تم اب وہی کرو گے جو ہم کہیں گے۔''

''میں نے انکار کب کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''لیکن فون والی بات سے میں اب بھی متفق نہیں ہوں۔ اگر تم صحیح طریقے سے یہ کام مجھ سے کروانا چاہتے ہو تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ تم مجھے چھوڑ دو۔ شاہینہ تو تمہاری قید میں ہے ہی، میں تمہارے کہنے کے مطابق شیراز سے رابطہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے وہ مجھ سے اپنی منگیتر کے سلسلے میں ضرور بات کرے گا مگر میں بھی خود کو اس کے سامنے لاعلم رکھوں گا اور اسی بہانے رواروی میں اس سے مجھے تمہارے ساتھیوں کے بارے میں بھی پوچھ لینے کا موقع مل جائے گا۔ یوں اسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہوگا۔ تم غور کر لو ٹھنڈے دماغ سے۔ یہی بہتر طریقہ ہے۔''

اسے شاید واقعی میری بات غلط نہیں لگی تھی کیونکہ وہ ذرا دیر کو سوچنے لگا، پھر مجھ سے مزید کچھ کہے بغیر جانے کے لیے پلٹ گیا۔ اس کے عقب میں اس کے باقی دونوں ساتھی بھی چل دیے۔ میں نے دیکھا، تینوں اسی جنوبی سمت کے دروازے سے ہی نکلے تھے جدھر سے شاہینہ کو وہیل چیئر پر لا کر مجھے دکھایا گیا تھا۔

دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے غور سے آنکھیں سکیڑ کر دروازے کو دیکھا۔ وہ بالکل سپاٹ تھا۔ یعنی ائر ٹائٹ، جس پر کوئی کنڈا، لاک یا ایسا کوئی آلہ نصب نہ تھا جس سے اس پر بادی النظر میں دروازے کا گمان ہوتا ہو۔ یوں وہ دیوار کے ساتھ دیوار بن چکا تھا۔

ایسے خودکار نظام کی حامل جگہ کے بارے میں مجھے سوچنا پڑا کہ ان کا یہ ٹھکانا چند دنوں کی بات نہیں۔ یہ سب بندوبست کرنے کے لیے انہیں کئی دن لگے ہوں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ نیا گروپ اپنے مشن پر عمل پیرا ہونے سے کئی دن پہلے یہاں اپنے ٹھکانے کے لیے سرگرداں رہا ہوگا۔

ایک خیال اور بھی میرے ذہن میں اُبھرا تھا۔ وہ یہ کہ کیا ان کی پشت پناہی میں کسی مقامی سہولت کار کا ہاتھ ہو سکتا تھا یا پھر مختصر سے عرصے میں ان لوگوں نے یہ کام انجام دیا ہوگا؟ فی الحال تو میں ایک ہی ہال نما کمرے کا قیدی تھا۔ باقی اس جگہ کا محل وقوع کتنا اور کیسا تھا، اس کا فیصلہ کرنے سے میں ابھی قاصر ہی رہا۔

شیراز، شاہینہ اور پھر سلیم کے متعلق سوچنے کے دوران میری نظریں بار بار اس سمت کو اٹھ جاتی تھیں جدھر سے تھوڑی دیر پہلے تاریکی میں، میں نے سلیم سے سرگوشیوں میں باتیں کی تھیں لیکن اب وہاں کوئی نہ تھا۔ سچی بات تھی کہ ابھی تک میرا دل تسلیم کرنے سے قاصر تھا کہ سلیم اتنی جلدی مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکا ہے؟ ابھی تو وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ چند گھنٹے پہلے تک میرے پاؤں پکڑ رہا تھا، اپنے تائب ہونے کی قسمیں کھا رہا تھا۔ میری مار بھی اسے برداشت تھی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

دکھ سے میرا دل بھر آیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ نفرت اور انتقام سے میرا رواں رواں پھڑکنے لگا۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے ہاتھوں کی زنجیریں توڑ کر ان سب کو بھیانک موت سے ہمکنار کر ڈالوں۔

تاہم ایک بات کا خیال بار بار میرے ذہن میں ابھر رہا تھا جو میں اس تنومند شخص سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن دورانِ گفتگو اس کا موقع نہ مل پایا۔ وہ یہ کہ اگر میں ان کی خواہش کے مطابق شیراز سے ان کے پانچ ٹاپ ایجنٹوں کے بارے میں پوچھ بھی لیتا اور انہیں بتا بھی دیتا تو یہ لوگ ان کی رہائی کے لیے کیا کر سکتے تھے؟ ظاہر ہے شیراز نے انہیں حکومتی اہلکاروں کے حوالے تو نہیں کیا ہوگا، ملکی حساس ادارے کے ہی حوالے کیا ہوگا۔ تو کیا ان میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ان کے اپنے ساتھیوں کو چھڑا سکتے؟ یہ ناممکن تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ شیراز کو بھی علم نہ ہوگا کہ ان پانچوں ملک دشمن عناصر کو کہاں رکھا گیا ہوگا اور کہاں ان سے تفتیش وغیرہ کی جا رہی ہوگی۔ ایسے خطرناک غیر ملکی مجرموں کے بارے میں کسی کو بھی ہوا تک نہیں لگنے دی جاتی ہوگی۔ پھر اس شخص کو کیوں اتنا یقین تھا کہ ایک بار ان کے ساتھیوں کا سراغ مل جانے کے بعد وہ انہیں چھڑا لیں گے۔ یہ بعد کی باتیں تھیں، نہ ہی میں ان کے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہونے دے سکتا تھا۔ میں ان کا انتظار کرنے لگا۔

اس دوران میں نے ہال کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کی چھت زیادہ بلند نہ تھی۔ دیواریں بظاہر سپاٹ ہی نظر آتی تھیں، جیسے یہاں کوئی دروازہ نہ ہو۔ کوئی روشن دان بھی نہیں دکھائی دیا۔ نہ جانے کیا وقت ہوا ہوگا۔ جس وقت انہوں نے سلیم اور مجھ پر ہاتھ ڈالا تھا، تب رات شاید نصف بیت چکی تھی۔ اگر ہم دو ایک گھنٹا بھی بے ہوش رہے ہوں، تو بھی ابھی صبح دور تھی۔

اس کے بعد میں نے اپنے پیروں کی زنجیر اور اس دیوار کی طرف دیکھا جس پر نصب ایک آہنی کنڈے سے زنجیر کا دوسرا سرا منسلک تھا جبکہ میرے پاؤں میں کوئی کڑا نہیں تھا، زنجیر ہی لپیٹ دی گئی تھی جس کے سبب میری پنڈلی پر بل پڑنے سے زخم بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ البتہ میری دوسری ٹانگ آزاد تھی۔ ہاتھ بھی کھلے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی فرنیچر نام کی ایک شے بھی نہ تھی۔ خود میں بھی فرش پر بیٹھا تھا۔

نہ جانے اب یہ لوگ اچانک کدھر چلے گئے تھے۔ تنومند شخص نے میری بات کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ کیا وہ غور کرنے گئے تھے، سر جوڑ کر میری صلاح پر کوئی آپسی گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ شاید یہی بات تھی کیونکہ چند منٹوں بعد ہی دوبارہ اسی سمت کا دروازہ کھلا۔

میں نے دیکھا، وہی تینوں دوبارہ نمودار ہو رہے تھے۔ پھر اسی پوزیشن پر میرے سامنے آن کھڑے ہوئے جس طرح پہلے تھے۔ یعنی تنومند شخص دونوں پاؤں پھیلائے کھڑا تھا جبکہ اس کے دونوں ساتھی اس کے عقب میں دائیں بائیں مستعد کھڑے ہو گئے۔

میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا، پھر تنومند آدمی نے کہا۔

"ہم نے تمہاری بات سے اتفاق کر لیا ہے لیکن ہمارا ایک آدمی تمہارے ساتھ سائے کی طرح رہے گا اور ہمیں ہر آدھے گھنٹے کے بعد سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دیتا رہے گا۔ اگر آدھے گھنٹے بعد ہمارے ساتھی کی رپورٹ موصول نہیں ہوئی تو ہم سمجھ جائیں گے کہ تم نے اس کے ساتھ کوئی دھوکا کیا ہے۔ پھر شاہینہ کو بیدردی کے ساتھ ہلاک کر دیا جائے گا۔ بعد میں ہم تم سے اور انسپکٹر شیراز سے نمٹ لیں گے۔"

اس کی بات سن کر پہلے تو میرے اندر مسرت چمکی لیکن پھر پوری بات سن کر میں اندر سے تھوڑا فکرمند ہوا۔ یہ لوگ بہت چالاک اور ہوشیار تھے۔ بغیر بھروسا کیے، احتیاط کا پہلو ان کے پیشِ نگاہ ہوتا۔ چونکہ یہ میری ہی "تجویز" تھی اس لیے فوری جواب دینا ضروری تھا ورنہ یہ مجھے متردد یا شک میں پڑ سکتے تھے۔

"مجھے منظور ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ کسی مخصوص موقع پر مجھے اگر شیراز سے تنہائی میں ملاقات کرنا پڑے تو تمہارے ساتھی کا اس وقت میرے ساتھ موجود ہونا اسے شک میں مبتلا کر سکتا ہے اور یوں وہ کچھ بتانے سے کترا بھی سکتا ہے۔"

میں نے آخر میں ایک تیر تکا بھی پھینکنا ضروری سمجھا تھا لیکن اس بدبخت نے سپاٹ لہجے میں یوں کہا جیسے اسے میری اس بات کا پہلے سے اندازہ ہو۔

"ہاں، اس کی اجازت ہے، مگر یہ تم سے دور نہیں ہوگا، پھر بھی اگر ایسی کوئی مجبوری آئے تو مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا پہلے۔ میں اس مجبوری کی نوعیت سننا ضروری سمجھوں گا، اس کے بعد ہی تم کوئی اگلا قدم اس سلسلے میں اٹھانا۔"

میں ایک گہری سانس نے کر رہ گیا۔ مہلت اتنی ہی ملی تھی۔ یعنی آدھا گھنٹا۔

☆☆☆

میں آزاد کر دیا گیا لیکن اس طرح کہ ان کے خفیہ ٹھکانے سے نکلتے وقت میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

ایک گاڑی میں مجھے سوار کرایا گیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ تینوں بھی اس کار میں مجھ سمیت سوار تھے۔

شاید ہمیں کسی مخصوص مقام پر چھوڑ کر تنومند شخص اپنا ایک آدمی میرے ساتھ اتار دیتا۔ اس کے بعد اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ اسی کار میں ہی واپس لوٹ جاتا۔

میرے ذہن میں اس وقت فقط ایک ہی لفظ کی گردان ہو رہی تھی۔

''آدھا گھنٹا..... آدھا گھنٹا..... آدھا گھنٹا!''

یہی آدھا گھنٹا میرے لیے بہت اہم تھا۔ اگر میں اس قلیل مدت میں ان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تو یقیناً کامیابی میرا مقدر ہوتی، بصورتِ دیگر ایک ذرا سی تاخیر شاہینہ کو دائمی موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے ان کے خفیہ ٹھکانے سے نکلنے اور اس مقام تک رکنے کا وقت ہی نہیں بلکہ اپنے ذہن میں احتیاط ''شمار'' کے مطابق موڑ بھی گنے تھے۔

بیس سے پچیس منٹ کا یہ سفر جاری رہا تھا اور راستے میں پہلا موڑ گاڑی نے دائیں جانب اس کے بعد دوسرا اور تیسرا موڑ بائیں طرف کا تھا۔ آخری چوتھا موڑ ایک مختصر سا یوٹرن تھا، جس کے بعد گاڑی رکی تھی۔ مجھے نیچے اتارا گیا۔

پھر اس کے فوراً بعد ہی مجھے گاڑی کی واپس روانگی کی آواز سنائی دی جس کے معدوم ہوتے ہی میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ یہ پٹی کھولنے والا فقط وہی ایک اکیلا آدمی تھا جو تنومند شخص کے دونوں ساتھیوں میں سے ہی ایک تھا۔

آنکھوں سے پٹی ہٹتے ہی میں نے جان بوجھ کر اپنی آنکھیں یوں بار بار پٹپٹائیں جیسے تاریکی چھٹنے کا منتظر ہوں لیکن میں کن انکھیوں سے پیش گرد کا جائزہ لیتا رہا، کیونکہ میں نے فوراً ہی ایکشن لینا تھا..... فاسٹ ایکشن۔

ہم شہر کے مضافاتی علاقے میں ہی کہیں موجود تھے اور جہاں کھڑے تھے، یہاں شہر بھی مجھے کچھ زیادہ دور نہیں لگتا تھا۔ اردگرد، دور قریب میں کچھ پختہ و نیم پختہ گھر بھی دکھائی دیے۔ تب ہی میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ یہ تو نظام شاہ کے نور پور والے فارم ہاؤس کے اریب قریب کا علاقہ تھا۔

''ہمیں یہاں سے کتنی مسافر بس یا گاڑی میں شہر جانا ہوگا۔'' میں نے اس آدمی سے کہا جو بڑے غور سے میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ اس کا قد درمیانہ، جسم پھرتیلا، رنگت زردی مائل گوری تھی۔ آنکھیں چھوٹی اور گول جبکہ سر گنجا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس نسل کا تھا جس سب مجھے اندازہ ہوتا کہ آیا وہ انڈین تھا یا اسرائیلی، جس کا جلد ہی مجھے ادراک ہو گیا کہ وہ اسرائیلی تھا۔ یعنی ریڈ فاکس یا موساد کا کوئی ایجنٹ۔

بہرکیف، پہلی بار وہ بغیر نقاب اور ''سیاہ پوشی'' کے میرے سامنے تھا۔ ظاہر ہے اب اسے یہ بھیس بھرنے کی مطلق ضرورت نہیں تھی کیونکہ اب اس نے بھی میرے ساتھ عام انسانوں کی طرح رل مل کر چلنا اور رہنا تھا۔ یہ وقت دن کا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق لگ بھگ دس گیارہ بجے ہوں گے۔ گویا پہر رات میں نے انہی کے خفیہ ٹھکانے پر گزاری تھی۔

''جو کرنا ہے جلدی کرو۔'' اس نے مختصر مگر تحکمانہ درشتی سے کہا۔

''کیا اچھا ہوتا کہ اگر تمہارے ساتھی ہمیں، میرے ہی ٹھکانے پر اتار دیتے۔ اس طرح وقت بچ جاتا۔'' میں نے چالاکی سے کہا۔ دس منٹ بیت چکے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ اگلے بیس منٹ بعد اس نے اپنے تنومند ساتھی کو ''سب ٹھیک ہے'' کی رپورٹ دینا تھی جو یقیناً ان کے پاس متوقع طور پر موجود وسیع رینج والے خفیہ ٹرانسمیٹر کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتی تھی۔

''یہ سب ضروری تھا۔ باس ہم سے زیادہ بہتر سمجھتا اور جانتا ہے۔'' وہ کڑک دار لہجے میں بولا۔

''تو چلو پھر کوئی سواری لیتے ہیں۔'' میں نے طنزیہ کہا۔

مقررہ میعاد میں منٹ گزارنا تھا جس کے بعد اس نے اپنے گروپ لیڈر (تنومند شخص) کو رپورٹ دینا تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ''سب ٹھیک ہے'' کی رپورٹ دیتا ہے۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میری بات پر اس نے ہونٹ بھینچ لیے پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

''یاد رکھنا، اگر تم کسی قسم کی چالاکی کا سوچ رہے ہو تو یہ خیال بھی اپنے ذہن سے نکال دو۔ مجھے ذرا بھی شبہ ہوا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا اور تمہاری وہ ساتھی بھی جو ہماری قید میں ہے، اسے بھی بیدردی کے ساتھ ہلاک کر دیا جائے گا۔'' آخری اشارہ اس کا شاہینہ کی طرف تھا جس کے تذکرے پر میرے اندر ایک بار پھر نفرت و انتقام کا لاوا ابلنے لگا۔ سلیم کی موت پر پہلے ہی میں ان پر اندر سے آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

''میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔'' میرے لہجے میں حد درجے سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ ''تم ذرا میری بات پر ٹھنڈے دماغ.....''

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"بکواس بند کرو۔" وہ غرایا۔ "سواری کہاں سے ملے گی؟" اس نے یکدم درشتی سے میری بات کاٹ دی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، قریب مجھے ایک چھوٹا سا چوراہا نظر آیا۔ اسی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "ہمیں یہاں سے کوئی سواری مل سکتی ہے، آؤ۔" کہتے ہوئے میں نے مذکورہ سمت قدم بڑھا دیے۔ وہ بھی میرے عقب میں چل دیا۔ دس منٹ مزید بیت چلے۔

میں نے اپنے چلنے کی رفتار دانستہ آہستہ رکھی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے مزید دس منٹ گزر گئے۔ تب ہی وہ ایک کونے کی طرف کھسک گیا۔ وہاں ایک کیکر کا درخت تھا۔ میں کن انکھیوں سے اس کی طرف تکنے لگا۔ اس کی نظریں بھی مجھ پر جمی تھیں لیکن ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی بائیں کلائی منہ کے قریب کر رکھی تھی۔

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی۔ وہ یقیناً اپنے اس تنومند شخص کو "سب ٹھیک ہے" کی رپورٹ دے رہا تھا۔ میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن نے فوری منصوبے کے تار و پود پہلے سے ہی بننے شروع کر دیے تھے۔ اس کے رابطے کے بعد میرے پاس تیس منٹ بچے تھے۔

یوں میرے ذہن میں دو ہی طریقے آئے تھے۔ پہلا تو یہ کہ میں اس آدمی پر قابو پا کر اسے "سب ٹھیک ہے" کی رپورٹ دینے کے لیے مجبور کرتا رہوں اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے ٹھکانے تک جا پہنچوں۔ بعد میں اسے جہنم واصل کر ڈالوں۔ دوسرا لائحہ عمل یہ تھا کہ اسے ادھر ہی اغوا/قتل کر کے کسی گاڑی میں ان کے ٹھکانے تک تیس منٹوں کے اندر اندر جا پہنچوں لیکن اس میں بڑا رسک تھا (اگرچہ پہلے والا لائحہ عمل بھی رسکی ہی تھا)۔ میں نے صرف اندازہ لگایا تھا ان کے ٹھکانے کا، پوری طرح مجھے پتا نہ تھا۔ "شار" کیے گئے راستے پر چل کر میں وہاں تک پہنچ بھی جاؤں تو کون سا گھر ہوگا؟ اس کا کھوج لگانے کے لیے مجھے وقت درکار ہوتا اور ظاہر ہے وہ تیس منٹوں سے زیادہ کا ہوتا۔

یوں مجھے پہلے والا منصوبہ ہی درست لگا۔ یعنی اس گماشتے پر قابو پا لیا جائے۔ اس میں رسک تھا۔ یہ کوئی عام آدمی نہ تھا، دشمن ملک کا انتہائی تربیت یافتہ ایجنٹ تھا۔ یہ اپنی جان دے سکتا تھا مگر میرا کہا نہیں مانتا، بجز اس کے کہ میں اس پر ایسا تشدد کرتا کہ یہ میری بات ماننے پر رضامند ہو جاتا لیکن یہ سب بھی مجھے تیس منٹوں کے اندر اندر انجام دینا تھا۔

لہٰذا اسی قلیل موقع کے دوران ہی میری تیزی سے گردش کرتی نظروں نے قریب ہی ایک گاڑی تاڑ لی تھی۔ وہ ایک کالے رنگ کی ٹیکسی تھی جس کا ڈرائیور شاید کسی قریبی چھپر ہوٹل میں چائے وغیرہ پینے گیا ہوا تھا۔

میں بظاہر اسے دکھانے کے لیے کسی سواری کی تلاش میں اِدھر اُدھر اپنا سر گھماتا رہا اور ساتھ ہی اس شخص کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنی بات ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر ختم کر دی تھی اور اب ہاتھ سیدھا کیے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ میں اس پر اچانک دھاوا بولنے کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔ آس پاس کچھ زیادہ لوگ نہ تھے۔ جو تھے، وہ کافی فاصلے پر نظر آئے۔ میں اسے زدوکوب کرنے کے لیے اسی درخت کے قریب گھسیٹ لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا جہاں وہ کھڑا تھا۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں اس کے قریب آنے کا منتظر تھا، پھر جیسے ہی وہ میرے نزدیک آیا، میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس پر ہلا بول دیا۔

اسے شاید مجھ سے اس کی توقع رہی ہو کیونکہ میرے وجود کی تیز جنبش پر ہی وہ بدکا تھا اور دفاع کرنے کی بھی اپنی سی کوشش کی تھی مگر میرا زور چل گیا۔

اس کی گردن کے گرد اپنا ایک بازو کسی شکنجے کی طرح جکڑ کر اور دوسرا ہاتھ اس کی پیٹھ کی جانب مروڑ کر میں اسے تیزی کے ساتھ مذکورہ درخت تلے لے آیا۔ قریب پہنچ کر دیکھا کہ درخت کی دوسری جانب نشیب تھا۔ وہاں کسی کھیت کی حد بندی کی گئی تھی اور اس سمت لیوب ویل تھا۔ قریب میں اینٹوں کا چھوٹا سا بھٹہ تھا جو خالی نظر آیا۔

میں وہاں سے اسے اسی سمت ہی گھسیٹتا ہوا لے جانے لگا۔ کیونکہ وہاں اور کوئی نہ تھا، قریب میں ہمارے سوا کوئی ذی نفس بھی نہیں دکھائی دیا۔

وہ میری آہنی گرفت سے خود کو چھڑانے یا نکالنے کی سرتوڑ کوشش میں تھا لیکن میں نے اسے بری طرح بے بس کر رکھا تھا اور اس کے ہلنے جلنے کے سبب خود اس کی اپنی سانسیں میرے بازو کے شکنجے میں جکڑے رہنے سے اکھڑنے لگتی تھیں مگر مردود پھر بھی سخت جان تھا اور اپنی ہی کوشش میں لگا رہا۔

میں بھی کم نہ تھا، اس کی گردن جکڑے ہی رکھی۔ وہ اپنے حلق سے غراتی سی آوازیں بھی خارج کرنے لگا۔ میں جانتا تھا وہ مجھے دھمکانے کی کوشش میں تھا، تب ہی میں نے دانت پیستے ہوئے اس سے کہا۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"زیادہ چلنے کی کوشش کرو گے تو منکا ٹوٹ جائے گا۔ آج تک میرے اس لاک سے کوئی نہیں نکل سکا ہے ماسوائے لٹکتی لاش کی صورت میں۔" میرے سرد لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ اس نے یکلخت ہی چلنا چھوڑ دیا۔ اس پر دہشت طاری کرنے میں، میں کامیاب رہا تھا۔

میں اسے گھسیٹتا ہوا کیبن کے اندر آ گیا۔ یہ چوکور کیبن تھا اور اندر کاٹھ کباڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ شاید ہی یہ کسی انسان کے لیے اب تک استعمال ہوا ہو کیونکہ اندر خودرو گھاس اور انسانوں اور جانوروں کا فضلہ بھی نظر آیا۔

ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس کی چھت بلند تھی۔ میں نے اس سمیت اندر گھستے ہی سب سے پہلے ایک ہاتھ سے اس کی جامہ تلاشی لے کر پستول اور ایک چاقو برآمد کر لیا تھا۔ اس کی رسٹ واچ بھی اتار لی جس پر خفیہ مائیکرو ٹرانسمیٹر نصب تھا۔ اس کے بعد اسے اپنے بازو کی آہنی گرفت سے آزاد کر کے دیوار کی جانب دھکیل دیا اور پستول تان لیا۔

وہ چند ثانیے اپنی گردن سہلانے اور لمبے لمبے سانس لینے لگا، پھر میری طرف خونی نظروں سے گھورنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ہانپتی آواز میں غرا کر بولا۔

"تم ایک فاش اور خطرناک غلطی کر رہے ہو جس کی تمہیں کبھی کامیابی نہیں ہو گی اور مارے بھی جاؤ گے۔"

"تم کس طرح میرے کہنے پر چلنا پسند کرو گے؟" میں نے اس کی بجائے کو ان سنا کرتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"آسانی سے یا پھر خود کو زندگی کے عذاب میں مبتلا کر کے، کیونکہ ابھی میں تمہیں منوانے کے لیے جو طریقہ آزمانے لگا ہوں، اس سے پتھروں کو بھی زبان لگ جاتی ہے۔"

میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ درشتی اور تیزی جو اس کی آنکھوں اور چہرے سے ذرا دیر پہلے مترشح تھی، وہ اب معدوم ہو گئی تھی۔

"وقت نہیں ہے میرے پاس، جواب دو تاکہ میں اپنا کام شروع کر دوں۔" میں نے کہا۔

"کیا منوانا چاہتے ہو؟" اس نے کہا۔

"یہی کہ مشن بلڈ تم نے اپنے ساتھی کو سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دینا ہو گی، جب تک میں تمہیں لے کر تمہارے ٹھکانے تک نہ پہنچ جاؤں۔"

"یہ خوابوں میں ہو سکتا ہے۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا تو میرا دماغ اس کی اضافی پرچے ایک دم بھنا گیا۔ دانت پیستے ہوئے میں باز کی طرح اس پر جھپٹا اور یہی میری غلطی تھی، جس سے اس نے فائدہ اٹھایا اور یکدم دیوار کے ہی سہارے وہ نیچے بیٹھا اور ایک خاص ٹرک سے اپنی ایک ٹانگ بھی چلا دی۔

ٹانگ میرے پستول والے ہاتھ پر پڑی، جس کے سبب وہ میرے ہاتھ سے نکل کر پرے جا پڑا۔ دوسرا وار اس نے پلک جھپکتے میرے پیٹ پر کرنا چاہا مگر بس، اب میں اسے مزید کوئی موقع دینے کے موڈ میں نہ تھا۔ اس کا وار میں نے اپنے گھٹنے سے روکا، اس کا توازن بگڑا لیکن فوراً ہی اس نے کیبن کی مختصر حدود میں اپنے جسم کو پھرکی کی طرح گھمایا۔ قبل اس کے کہ وہ رائٹ کک میرے چہرے پر رسید کرتا، میں نے یکدم گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بایاں ہک یعنی کنی اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان رسید کر دی۔

اس کے حلق سے بڑی بھیانک کراہ خارج ہوئی، کیونکہ میں نے اس وار میں اپنی پوری زور آوری دکھا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سانس لیے بغیر ہی ڈھیلا پڑ گیا۔

یکلخت میرے ہوش اڑ گئے، چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھالا۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا مگر اگلے ہی لمحے مجھ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کی گردن کی شہ رگ کہیں پھڑک رہی تھی جس پر میں نے دو انگلیاں رکھ کر محسوس کیا۔ ذرا ہی دیر بعد اس کی باچھوں سے خون کی لکیریں بہہ نکلیں۔

آن کی آن میں میرا چہرہ فق ہو گیا اور ہوائیاں اڑنے لگیں، کیونکہ اس کی موت کا مطلب تھا "سب ٹھیک ہے" کی رپورٹ بروقت نہیں جائے گی اور دوسرا مہیب مطلب انتقاماً شاہین کے ہیرے کا ہمیشہ موت تھی۔ پل کے پل مجھے چیختی چلاتی ہولناکیوں نے زہریلے سانپوں کی طرح پھنکارتے ہوئے گھیر لیا۔ مجھ پر ہراسانی طاری ہونے لگیں۔ صرف دس منٹ تھے "سب ٹھیک ہے" کی رپورٹ دینے میں، مگر یہ رپورٹ دینے والا دنیا سے گزر چکا تھا۔ رایا موساد کا وہ خوفناک اور بھیڑیے جیسا سفاک آدمی شاہین کا جو حشر کرنے والا تھا، اس کا میں چشم تصور سے مہیب نظارہ کرنے لگا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں؟ اپنی غیر معمولی طاقت سے بھی اگر میں دوڑتا ہوا ان کے ٹھکانے تک پہنچ بھی جاتا تو درست جگہ کو تلاش کرنا اتنا جلد ممکن نہ ہوتا۔ اس طرف اور بھی گھر ہو سکتے تھے۔ دفعتاً ہی ایک موہوم سی امید میرے اندر جاگی۔ کیا خبر وہ ٹھکانا الگ تھلگ کوئی چھوٹی یا بڑی عمارت ہو۔

میں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگائی اور کیبن سے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

باہر نکلتے ہی گولی کی طرح سڑک کی جانب لپکا اور یوں دوڑنے لگا جیسے رن وے پر کوئی جہاز ٹیک آف کرنے کے لیے طوفانی رفتار سے دوڑتا ہے۔

اندازے سے راستوں کا جو شمار میں نے کیا تھا، وہ ٹھیک ٹھیک رہا لیکن جیسے ہی میں مقررہ مقام پر پہنچا تو مایوسیوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہاں تو قطار اندر قطار رہائشی بنگلے اور کوٹھیاں بنی نظر آئیں۔ اب ان میں مطلوبہ جگہ کو کھوجنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ تب تک یہ دس منٹ جس میں اب بمشکل دو چار منٹ ہی بچے ہوں گے یا اس سے بھی کم ـــ میں کیا کر سکتا تھا؟ یہی سوچ سوچ کر میرے اعصاب شل اور دماغ جھنجھنانے لگا۔ ایک ہی گردان میرے دماغ میں بلکہ پورے وجود میں گونجنے لگی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا..... اب شاہینہ کو دردناک موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

یکایک میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ خدا تو موجود تھا۔ وہ قادر المطلق ہے۔ مارنے والے سے زیادہ بچانے والا طاقتور ہے۔ وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے۔

تب میں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا۔ جگنو کی موت، شگفتہ خاتون جیسی مہربان عورت کی دائمی جدائی، حالات کی کشاکشی میں اپنے ہونے والے بچے سے ہمیشہ کے لیے محرومی، پھر سلیم کی اچانک اور ناقابلِ یقین موت، اب شاہینہ ـــ اف میرے خدا! رحم کرنا اس پر۔ ملک و قوم کے لیے اس جیسی بہادر پولیس افسر کو زندہ رہنا چاہیے۔

اچانک ایک عجیب سی آواز میری گم صم سی سماعتوں سے ٹکرائی۔ یہ ہلکی بیپ کی آواز تھی۔ عقدہ کھلا کہ یہ اسی واچ ٹرانسمیٹر سے برآمد ہو رہی تھی جو میری جیکٹ کی جیب میں موجود تھی۔ یکلخت میں سن ہو کر رہ گیا۔ یقینی طور پر اسی تنومند شخص نے اپنے اس واصلِ جہنم ساتھی سے رابطہ کیا ہوگا کہ اس نے تیس منٹ گزر جانے کے بعد رپورٹ کیوں نہیں دی۔

میں نے تیزی سے کچھ سوچا۔ آخری قدم میرا ان حالات میں کیا ہو سکتا تھا، وہ فوری سوچا اور واچ ٹرانسمیٹر جیب میں ہاتھ ڈال کر نکال لیا۔ اسے اپنی کلائی پر باندھا اور اس کی پن کھینچ کر گھمائی۔ بیپ آنی بند ہوئی، ہلکی سرسراہٹ کے بعد ہی کان سے لگانے پر گمبھیر آواز ابھری۔

"زیرو ون فور ـــ گرانڈی ـــ گرانڈی! کیا تم سن رہے ہو؟ ابھی تک رابطہ کیوں نہیں کیا؟ سب خیریت تو ہے نا ـــ؟ اوور۔"

میں سکتے میں آ گیا۔ یہ وہی رذیل اور سفاک آدمی تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"یس، میں سہراب بات کر رہا ہوں۔ تمہارا آدمی مر چکا ہے لیکن اس میں میری نہیں، اس کی اپنی غلطی تھی ـــ اوور۔" دوسری جانب اچانک سناٹا طاری ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی غراہٹ سے مشابہ آواز آئی۔

"تو تم نے وہی کیا جس کا مجھے پہلے سے ہی شبہ تھا ـــ اوور۔"

"بات سمجھنے کی کوشش کرو مسٹر! بھلا میں اپنی ساتھی کی زندگی کو کیسے خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ تمہارے اپنے ساتھی نے جلد بازی اور بلاوجہ شک کا مظاہرہ کیا اور مجھ سے ہاتھا پائی کی۔ میں بھی اپنے طیش پر قابو نہ پا سکا کیونکہ مجھ پر اپنے دوست کی تم لوگوں کے ہاتھوں ہلاکت کا انتقام بھرا ہوا تھا۔ خیر، اگر یہ جھوٹ ہوتا تو میں کیوں تم سے اس وقت بات کر رہا ہوتا۔ میں تمہارے ہی علاقے میں کھڑا ہوں، چاہو تو آ جاؤ یا کسی کو مجھے لینے کے لیے....."

اسی وقت دوسری جانب سناٹا طاری ہو گیا۔ کال ڈراپ کر دی گئی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ ٹرانسمیٹر کو بھی چند سیکنڈوں بعد ہی "ڈیڈ" یعنی بیکار کر دیا گیا تھا۔ یہ اب ایک ناکارہ پرزے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

اب بدنصیب شاہینہ کو تقدیر کے حوالے کرنے کے سوا کوئی چارہ میرے پاس نہ رہا تھا لیکن ہار میں نے بھی نہیں مانی تھی۔ میں نے ان کا کھوج لگانے کا پورا تہیہ کر رکھا تھا۔ اب جبکہ میں انہیں اپنی یہاں (آس پاس) موجودگی کے بارے میں بتا ہی چکا تھا تو مجھے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ وہ یا اس کا کوئی ساتھی یہاں پلک جھپکتے میں کسی وقت بھی پہنچ سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں ان کے لیے اب بیکار ثابت ہوا ہوں اور اب یہ کوئی اور گیم کھیلنا چاہیں گے، کیونکہ ایسے افراد کبھی بھی کسی گیم کو "ری وائنڈ" کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ ناکامی کی صورت میں فوراً "ٹریک" چینج کر لیتے ہیں۔

لیکن شاہینہ ـــ اف خدایا! اس کی حفاظت فرمانا۔ اس کا خیال آتے ہی بے اختیار میرے لبوں سے اس کے لیے دعائیہ کلمات برآمد ہوئے تھے۔ نچلا بیٹھنے والا میں بھی نہ تھا۔ میں نے محتاط انداز میں جو شمار (کیلکولیشن) کی تھی، اس کے مطابق ان کا ٹھکانا سامنے والے دو بنگلوں کے درمیان والی قطار کی عقبی سمت بنتا تھا۔

میں چھپتا چھپاتا ہوا اسی طرف جا نکلا۔ یہاں آ کر مجھے اپنے محتاط اندازے والی وہ عمارت دکھائی دے گئی۔ اسے "جوا" کھیلنا تو نہیں کہا جا سکتا تھا البتہ اندازے کی غلطی

Scanned with CamScanner

الگ بات تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اب تک میرے اندازے سو فیصد نہیں تو اسی فیصد درست ہی ثابت ہوتے آئے تھے۔

میں نے اسی بنگلے کی عمارت میں نقب لگانے کی ٹھانی اور محتاط روی سے ایک قدم آگے بڑھایا۔

میں شاہینہ کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا، اسے صرف دعا ہی بچا سکتی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ میں ایسے ہی واپس پلٹ جاتا۔ بھانڈا تو میرا پھوٹ ہی چکا تھا۔ اب میں انہیں بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

یہاں آس پاس سناٹا تھا اور سب لوگ آپس میں مگن لگتے تھے۔ صبح کا وقت ہونے کے سبب شاید زیادہ تر مرد باہر تھے۔ یوں بھی یہ کچھ اتنا زیادہ آبادی والا علاقہ نہ تھا۔ بس، ہرے بھرے سبزے اور درختوں میں گھرا یہ مختصر علاقہ تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنگلے اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ گم صم سا ماحول تھا جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ لوگ خود تک ہی محدود رہنے کے عادی تھے۔

بہرکیف، اس کی جنوب مشرقی دیوار سے گزرتا ہوا میں اس کے فرنٹ گیٹ پر آیا۔ مجھے یہاں کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی۔ تاہم بنگلے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ سردی تھی، لوگ باگ اندر گرم ہیٹر لگائے آرام میں مگن ہو سکتے تھے لیکن اس بنگلے کی ویرانی مجھے کھٹکنے لگی۔ ممکن تھا کہ اگر یہی میرا مطلوبہ بنگلا تھا تو یہ لوگ میری تلاش یا کسی اور مشن پر کہیں نکل گئے ہوں گے۔ یہاں ان کا کوئی ایک آدھ ساتھی اندر ضرور ہو سکتا تھا۔

میں "فرنٹ" کا جائزہ لیتا ہوا عقبی سمت کی جانب آ گیا۔ یہاں درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ دیوار سے چپک کر میں نے ایک کھڑکی سے اندر جائزہ لیا مگر ناکامی ہوئی کیونکہ کھڑکی بند تھی اور اندر سے پردہ بھی گرا ہوا تھا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ بنگلا شاید برسوں سے خالی پڑا ہو اور یہ میرا مطلوبہ بنگلا نہ ہو۔

میرا اندر نقب لگا کر داخل ہونا چنداں مشکل نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں اس کی بالکونی کی ریلنگ سے لٹک کر اندر کاریڈور میں جا کودا۔ چند لمحے کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر دبیز قامت گملوں کی آڑ میں دبکا رہا۔ اس کے بعد مرکزی دروازے تک پہنچا جو مجھے بند ملا۔ اسے میں نے چھوا بھی گوارا نہ کیا اور اسی طرح دیوار سے چپکا ہوا دائیں جانب کی دیوار کی آڑ لیے آہستہ روی سے آگے بڑھا اور اب یہاں مجھے لمبی لمبی گرل والی ایسی کھڑکیاں نظر آئیں جو کہ کسی وسیع و عریض لاؤنج میں ہوتی ہیں لیکن اس کے پٹ نہیں ہوتے۔ ان پر ائرٹائٹ شیشے نصب تھے۔

میں نے ایک جیب سے کار بائڈ والا موئے قلم نکالا۔ یہ شیشے کو بڑی صفائی سے بے آواز کاٹتا تھا۔ کھڑکی کے لینسی اسٹائل کے تین پٹ تھے، ہر پٹ آدم گزار تھا۔ اس لیے میں نے ایک ہی پٹ کا شیشہ کاٹنا ضروری سمجھا۔ چھوٹی ٹیوب نکالی، یہ ڈراپر نما تھی، اس کے اندر پیٹرول تھا۔ اس کی لکیر کھینچ کر میں اس پر گلاس کٹر چلانے لگا۔

ذرا دیر بعد ہی شیشہ بے آواز کٹ کر میرے ہاتھوں میں آ گیا جسے بڑی احتیاط سے دیوار سے ٹکا دیا۔ آگے پردہ تھا۔ اسے میں نے تھوڑا سا سرکایا، اندر جھانکا۔ وسیع و عریض لاؤنج خالی پڑا تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے ایک ٹانگ اندر داخل کی اور پھر پورا اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی میں سب سے پہلے قریب رکھے دبیز قامت خوبصورت ڈیوائڈر کی آڑ میں چلا گیا اور یہاں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ انہیں بالکل بھی توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ میں اس طرح یہاں داخل ہونے کی کوشش کر سکتا ہوں کیونکہ مجھے یہ لوگ بے ہوشی کی صورت میں لائے تھے اور آنکھوں میں پٹی باندھ کر لے کر گئے تھے۔

ان کی اسی بے خبری سے مجھے فوری فائدہ اٹھانا تھا۔ اچانک میں ایک آواز پر ٹھٹکا۔ کوئی اندر سے باتیں کرتا ہوا لاؤنج کی طرف آ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اس کی آواز پہچان گیا۔ وہی طرح بدکا۔

یکلخت مجھے اندر نفرت و انتقام کی لہر بھڑک اٹھی۔ اپنی کامیابی پر اور مطلوبہ شکار کی آواز پہچان کر میری رگ رگ میں لاوا ابلنے لگا۔ جب وہ سامنے آیا تو یہ وہی خوفناک بھیڑیا صفت آدمی تھا جو مذکورہ اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے مجھے اور سلیم چھالیا کو بے بس کر کے یہاں لایا تھا۔

اپنے اصل شکار کو اس قدر جلد اپنے سامنے دیکھ کر مجھ پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ یہ میری فراست اور ٹھنڈے ٹھنڈے کیلکولیشن تھی کہ میں اس تک اور اس کی توجہ کے باوجود ہی برخلاف اس کے قریب تر پہنچ چکا تھا۔

اس وقت وہ اصل شکل و صورت میں میرے سامنے تھا۔ لمبا تڑنگا، کسرتی جسم، جلد کی رنگت زردی مائل سرخ، بال کریو کٹ، بھویں تنی ہوئیں اور کونے ملے ہوئے۔ آنکھیں چھوٹی تھیں مگر ان میں تیز چمک تھی۔ وہ سوٹ کوٹ میں تھا۔ نسلاً مجھے یہودی ہی لگا یعنی اسرائیلی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"نریندر راتم اور ڑومین اس آدمی کو ہر قیمت پر تلاش کرو گے۔" وہ یہ کہتا ہوا لاؤنج میں ایک صوفے پر دھنس کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کلائی منہ کے قریب کر رکھی تھی اور وہ یقیناً واچ ٹرانسمیٹر پر اپنے کسی ساتھی سے تحکمانہ انداز میں مخاطب تھا۔

"میں سہراب کی تلاش میں نکل رہا ہوں جو گرانڈی کو ہلاک کر کے فرار ہو چکا ہے۔ تم اس کے ساتھی کا ہر صورت میں تعاقب کر کے اسے ہلاک کر ڈالو اور خیال رہے کہ شاہینہ کو زندہ گرفت میں لینا ہوگا..... اوور۔"

اس کی بات نے مجھے سرتاپا حیرت آمیز مسرت سے دوچار کر ڈالا۔ میرا ساتھی..... شاہینہ..... یہ سب میں کیا سن رہا تھا؟ مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ کون ساتھی میرا؟ وہ تو سلیم تھا جسے انہوں نے مار ڈالا تھا۔ پھر کون تھا جو یہاں سے فرار ہوا تھا بلکہ شاہینہ کو بھی ان کے چنگل سے چھڑا کر لے گیا تھا؟

"سلیم چھالیا.....؟"

ایک ہی نام میرے سرتاپا بھرے ذہن و دماغ میں ابھرا تھا۔ مگر کیسے.....؟ یہ حقیقت تھی کہ میں نے اپنی کھلی آنکھوں سے سلیم کو مرتے کب دیکھا تھا؟ اس وقت تو ہماری آنکھوں پر تیز فلش لائٹ تھی۔ سلیم کے للکارنے پر تنومند شخص یا اس کے کسی ساتھی نے اس پر وار کیا تھا۔ اس کے بعد سلیم کی آواز خاموش ہو گئی تھی۔ پھر اسی تنومند شخص کا اپنے ساتھی سے تحکمانہ کہنا کہ "اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دو" جس کا مطلب اس کے سوا اور میں کیا سمجھ سکتا تھا کہ سلیم اب دنیا میں نہیں رہا تھا۔

لیکن..... پھر.....؟ اگر تنومند شخص اس وقت ٹرانسمیٹر پر اپنے دونوں مذکورہ ساتھیوں نریندر اور ڑومین کو مخاطب کر کے یہ ہدایت دیتے ہوئے میرا ذکر نہ کرتا تو میں یہ سب اپنے بارے میں ہی سمجھتا، مگر میرا ذکر بھی بالکل واضح تھا اور پھر شاہینہ کے تذکرے نے تو سلیم کے زندہ ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔

پل کے پل میرے ذہن نے آخر میں یہی تجزیہ کیا تھا کہ سلیم ہلاک نہیں ہوا ہو، بے ہوش ہو گیا ہو۔ یہ اسے مرتا سمجھ کر کہیں ڈال آئے ہوں گے۔ سلیم ہوش میں آنے کے بعد انہیں نہ صرف جُل دے کر بھاگ نکلا بلکہ شاہینہ کو بھی ان کی گرفت سے لے اڑا تھا۔

اگر سلیم چھالیا نے یہ سب کیا تھا تو اس کی جواں مردی کو دیکھتے ہوئے میں اس کی پچھلی ساری غلطیوں کو نہ صرف معاف کر دینے کو تیار تھا بلکہ اسے سینے سے بھی لگانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

اپنے ساتھیوں سے بات ختم کرتے ہی تنومند شخص نکلنے کی تیاری میں تھا کہ میں کسی لاوا اگلتے آتش فشاں کے مانند ابلا اور چیتے کی طرح اس پر جست لگا دی۔

تنومند شخص کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اس کی ناک کے نیچے موجود تھا۔ وہ بدکا لیکن جب تک میں اس پر جھپٹ چکا تھا۔ اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ہی میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک مکا رسید کر دیا۔ ضرب غیر معمولی اور زوردار تھی جس کے سبب اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ ابھری لیکن اس کمبخت نے اپنے حواسوں کو مختل ہونے نہ دیا اور چوٹ کھانے کے باوجود اس نے دندانہ دار میرے پیٹ پر رائٹ ہک رسید کر ڈالی۔

یہ میری جنگ باز تربیت کا وتیرہ ہی تھا کہ میں حریف مقابل پر حملہ کرتے ہی اپنے جسم، بالخصوص پیٹ کے پٹھوں کو اکڑا لیا کرتا تھا تاکہ جوابی ضرب زیادہ محسوس نہ ہو اور مجھے بے حال نہ کر دے۔

یہی وجہ تھی کہ اس ضرب کو میں سہہ گیا اور خود کو گرنے نہ دیا اور جواب میں دوسرا وار بھی کر ڈالا جو میری دائیں ٹانگ کے گھٹنے کی زوردار ضرب کی صورت میں تھا۔ نشانہ اس کا قدرے جھکا ہوا چہرہ اور ناک تھی۔ وہ الٹ کر صوفے پر جا گرا۔ تب بھی وہ سخت جان ثابت ہوا اور صوفے پر گرتے ہی کسی وحشی درندے کی طرح غراتا ہوا سنبھلا اور پھرتی سے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

اس سے پہلے کہ وہ جیب کے اندر سے کوئی ہتھیار برآمد کرتا، میں اس پر دوبارہ جھپٹ کر چکا تھا اور صوفے سمیت ہی ہم دونوں الٹ گئے۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی اس نے پستول نکالنے کی پوری کوشش کی تھی اور تقریباً نکال ہی چکا تھا کہ میں نے اس کے چہرے پر ایک اور مکا جڑ دیا۔ اس نے مجھے دھکیلنے کے لیے یونہی اندھا فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ گولی ہوا ہو گئی۔ دوسرا ہاتھ میرا اس کے پستول پر پڑا، وہ دور جا گرا۔ اس نے بھیڑیے جیسی غراہٹ کے ساتھ مجھ پر حملہ کیا، مگر اب اس میں دم خم جاتا رہا تھا۔ پچکی ناک سے بدستور خون بہے جا رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو دبوچ کر جھٹکا دے کر گھمایا۔ اس کا منکا ٹوٹ گیا اور اس نے وہیں ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔ میں اسے ہلاک تو نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر وہ قابو میں نہ آ رہا

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

تھا۔ پھر میرے پاس وقت بھی کم تھا۔ یہ گروپ لیڈر تھا۔ اس کے مرنے سے اس کے باقی ساتھیوں کی ہمت اور حوصلہ ٹوٹ جاتا۔ اب میں یہاں تنہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی یہاں کی تلاشی لینا شروع کردی، اوپری منزل پر بھی گیا۔ یہ ون یونٹ ٹائپ کا بنگلا تھا۔ بادی النظر میں یہ عام سا رہائشی ہی محسوس ہوا۔ بیڈ روم بنے ہوئے تھے، کچن تھا، ٹیرس، گیراج سب کچھ تھا اور سب سے بڑی بات جو میرے لیے قدرے حیران کن تھی وہ یہ کہ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ روز پہلے ہی یہاں کوئی فیملی بھی رہتی ہو کیونکہ الماریاں، کمرے، یہی تاثر دے رہے تھے۔

لیڈیز، جینٹس اور بچوں کے کپڑے، کھلونے، ایک الماری میں نصب تجوری کے اندر جیولری، نقدی اور بانڈز وغیرہ سب ہی کچھ موجود تھے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ اس بنگلے میں بالکل بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ یہاں کوئی جرائم پیشہ لوگ رہتے ہوں گے۔ نہ ہی رایا موساد سے متعلق کوئی شے یہاں میرے ہاتھ لگی تھی۔ کچھ سوچ کر میں نے بھویں سکیڑ لیں۔

بات بظاہر عام سی تھی لیکن کھٹک مجھے اس بات پر تھی کہ یہ بنگلا کسی ایسے آدمی کی ملکیت ہو سکتا تھا جو یہاں کچھ روز پہلے اپنی فیملی سمیت رہائش پذیر تھا۔

''سہولت کار.....'' ایک ہی لفظ میرے بھٹکے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ میں پلٹ کر دوبارہ اس تنومند شخص کی لاش کے قریب آیا اور جلدی جلدی اس کی جامہ تلاشی لینا شروع کردی۔ اس کے پاس سے کوئی شے بھی ایسی برآمد نہ ہوئی تھی جس سے اس کی کوئی اصل شناخت ہوتی، ماسوائے اس کی بائیں کلائی پر بندھی دستی واچ (خفیہ ٹرانسمیٹر) کے، جس کی فریکوئنسی مجھے معلوم نہ تھی۔ یعنی میں اس کے کسی ساتھی کو کال نہیں کر سکتا تھا البتہ کال اٹینڈ کر سکتا تھا۔

کچھ سوچ کر میں نے واچ اتار کر اپنی کلائی پر باندھ لی اور پرسوچ انداز میں چند لمحے ہونٹ بھینچے کھڑا کچھ سوچتا رہا، پھر اچانک ہی مجھے قریب فینسی اسٹینڈ پر دھرے ٹیلی فون سیٹ کا خیال آیا۔

میں اس طرف بڑھا۔ پہلے میں نے اس سیٹ کا جائزہ لیا۔ اس پر فون نمبر درج تھا جو یقیناً اسی بنگلے کا ہو سکتا تھا۔ نیچے ٹیلی فون ڈائریکٹری رکھی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ اسموتھ ٹون سنائی دے رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ فون ڈیڈ نہ تھا۔

میں نے جو جی کے ٹھکانے کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے زبیر نے کال اٹینڈ کی۔

''ہیلو! کون بول رہا ہے؟''

''زبیر! یہ میں ہوں سہراب۔'' میں نے لہجہ پرسکون رکھتے ہوئے کہا تو دوسری جانب سے زبیر کی چونکتی ہوئی آواز آئی۔

''ارے آپ سہراب بھائی! خیریت سے تو ہیں نا؟ رات سے ہی غائب ہیں، استاد بہت فکرمند ہو رہے تھے اور فوزیہ بھابی بھی پریشان ہو رہی تھیں لیکن آپ بول کہاں سے رہے ہیں؟'' وہ ایک ہی سانس میں اتنے سوال کرتا چلا گیا۔

''کسی کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر اسے مختصراً موجودہ حالات کے بارے میں آگاہ کیا جسے وہ بڑے غور سے سنتا رہا۔

''سلیم تو نہیں پہنچا وہاں؟'' میں نے کسی خیال کے تحت آخر میں پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں جواب دیا۔

''بھانڈیل سائیں کی ریکی کرنے کون گیا تھا؟''

''راحیلہ اور میں۔''

''کیا رہا؟''

''وہاں ہمیں کچھ خاص دیکھنے کو نہیں ملا۔''

''کیا مطلب؟''

''بھانڈیل سائیں بستر پر ہے۔ پچھمی کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد وہ اپنی حویلی میں ہی مستقل طور پر موجود رہنے لگا ہے۔ علاقے کے ڈاکٹر، حکیم اس کے علاج معالجے میں مصروف ہیں۔''

''کیا کوئی خاص بڑے زخم آئے تھے اسے؟'' میں نے پوچھا۔

''لگتا تو ایسا ہی تھا مگر وہ روبہ صحت ہے۔ اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔''

''کسی جانے پہچانے یا مشتبہ آدمی کو تو وہاں اس کے پاس موجود نہیں دیکھا گیا؟''

''نہیں سہراب بھائی!''

''راحیلہ تمہارے ساتھ تھی؟''

''ہاں، لیکن.....'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوا۔

''لیکن کیا؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''جب ہم دونوں گڑھ مولا سے سرشام واپس لوٹ رہے تھے تو وہ مجھ سے یہ کہہ کر جدا ہو گئی تھی کہ تم چلو، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ پھر وہ میرے گھر پہنچنے کے بعد رات گئے واپس لوٹی تھی۔''

''اچھا.....!'' میں تھوڑا چونکا۔ ''کچھ بتایا اس نے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

کہ وہ کہاں گئی تھی؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

"یہی کہ وہ سلیم چھالیا کے ٹھکانے پر گئی تھی۔ اس پر استاد جی اس پر ذرا ناراض ہوئے تھے۔" زبیر بتانے لگا۔ "استاد نے راحیلہ سے کہا تھا کہ جب زبیر تمہارے ساتھ تھا تو اکیلے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس پر راحیلہ نے جواب دیا تھا کہ وہ سلیم سے اکیلے میں ہی ملنا چاہتی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ ٹھکانے پر موجود چودھری جی برادران وغیرہ زبیر کو اس کے ساتھ دیکھ کر شک میں پڑ سکتے تھے۔"

"ہم — بات تو اس کی ٹھیک ہے۔" میں گومگو سے انداز میں بولا۔ "لیکن اس نے کچھ بتایا پھر سلیم کے متعلق؟" میں نے آخر میں پوچھا۔

"کچھ نہیں بتایا لیکن ایک خبر ضرور دی۔" زبیر بولا۔

"وہ کیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"درحقیقت جب راحیلہ رات گئے لوٹی تھی تو اس کی حالت ایسی ہی نظر آ رہی تھی جیسے کسی نے زدوکوب کرنے کی کوشش کی ہو۔ اسی بنا پر استاد نے راحیلہ کو ڈانٹا تھا۔ تاہم راحیلہ نے یہ خبر دیتے ہوئے تفصیل بتائی تھی کہ جب وہ وہاں پہنچی تو اسے سلیم نہیں ملا تھا۔ کال کرنے پر اسے ان کے نالائق والے ٹھکانے پر دونوں بھائی چودھری جی برادران اپنے کچھ گرگوں کے ساتھ موجود ملے اور ان کی گفتگو سے راحیلہ کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ سلیم پر ہی نہیں، تم پر بھی سخت خفا تھے۔ وہ شاید سلیم کو جان سے مارنے والے تھے لیکن تم نے اچانک درمیان میں انٹری مار کر ان کا یہ منصوبہ ناکام بنا دیا اور سلیم کو ان کے چنگل سے چھڑا کر کہیں نکل گئے تھے۔ راحیلہ یہ ساری گفتگو چھپ کر سنتی رہی تھی اور جب پلٹنے والی تھی تو اچانک وسیم اور سجاد بیگ کے ذکر پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ وسیم نے ان سے سجاد بیگ کی شکایت کی تھی کہ اس نے بوسیدہ کا مجسمہ چوری کیا ہے۔ وہ اسے سجاد بیگ سے واپس دلایا جائے۔ لہٰذا طے پایا کہ دونوں کو یہاں بلایا جائے۔ وہ آئے بھی تھے لیکن سجاد بیگ نے صاف کہہ دیا کہ وسیم اس پر بلاوجہ محض شک کی بنیاد پر چوری کا الزام لگا رہا ہے۔ اس پر وسیم اور سجاد بیگ کی آپس میں گرما گرمی بھی ہوئی۔ اگر وہ چودھری جی برادران کی مہمت کے نیچے نہ ہوتے تو یقیناً ان کے درمیان ہاتھا پائی ہو جاتی۔ بہرحال، وسیم جب سجاد بیگ کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا غصے سے پاؤں پٹخ کر وہاں سے جانے لگا تو سجاد بیگ نے پستول نکال کر اس پر گولی چلا دی لیکن عین وقت پر قریب کھڑے ایک گرگے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ گولی چلی، وسیم کو تو نہ لگی البتہ اس کھڑکی کی چوکھٹ پر ضرور جا لگی جس سے لگی راحیلہ ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

گولی اسے تو نہ لگی لیکن غیر ارادی طور پر اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ سب چونک گئے۔ گرگے اسے پکڑنے کو دوڑے۔ دو ایک نے اسے باہر نکلنے سے پہلے چھاپ بھی لیا لیکن راحیلہ نے ان کا مقابلہ کیا اور بڑی مشکلوں سے جان بچا کر بھاگ نکلی۔"

زبیر اتنی صراحت سے بتانے کے بعد چپ ہو رہا۔ میں نے اس کی بات غور سے سنی، پھر بولا۔

"راحیلہ گھر پر ہی ہے نا اب؟"

"جی ہاں۔" دوسری جانب سے زبیر نے کہا۔ "کیا بلاؤں؟"

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم ایک کام کرو زبیر!"

"جی جی، حکم کریں سہراب بھائی!" وہ بولا۔

"یہ ایک نمبر نوٹ کرو پہلے، پھر میں تمہیں بتاتا ہوں آگے۔" کہتے ہوئے میں نے اسے اس بنگلے کا نمبر دے دیا۔ اس زمانے میں سی ایل آئی سسٹم نہیں تھا۔ صرف چار یا پانچ ڈیجٹ کے نمبر ہوتے تھے ٹیلی فون وغیرہ کے، وہ اس نے ذہن نشین کر لیا۔

"اس نمبر کی معلومات حاصل کر کے بنگلے کا پتا نوٹ کرو اور اس کی ریکی کرتے رہو۔ ممکن ہو تو یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کرو کہ یہ بنگلا کس کی ملکیت ہے؟ میں اس وقت اسی بنگلے سے بول رہا ہوں لیکن مجھے اندازہ نہیں ہو پا رہا کہ یہ کس علاقے میں ہے، مگر اتنا ضرور لگتا ہے کہ یہ نور پور والے فارم ہاؤس کے آس پاس ہی واقع ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، میں کہیں جا رہا ہوں۔ سب کو میری خیریت کی اطلاع دے دینا۔"

اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں تھوڑی دیر تک کھڑا رہا پھر جلدی سے کار پورچ میں آیا۔ ان کی سیاہ سیڈان نہیں کھڑی تھی لیکن ذرا ادھر ادھر نظر دوڑانے پر مجھے میری بائیک ون ٹو فائیو نظر آ گئی۔ اپنی (استاد جی کی) بائیک دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں اس پر سوار ہوا اور ابھی کک مار کر اسٹارٹ کرنے ہی لگا تھا کہ اچانک ایک مخصوص آواز سن کر چونک پڑا۔

ہلکی "ہپ" کی آواز میری اسی دستی گھڑی سے برآمد ہو رہی تھی جو میں نے تنومند آدمی کی کلائی سے اتاری تھی، جو درحقیقت ایک وسیع رینج والا خفیہ ٹرانسمیٹر تھا۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ضرور یہ اس کے ان دونوں ساتھیوں میں سے کسی ایک کی کال ہوگی جس سے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تنومند شخص کو بات کرتے ہوئے سن رہا تھا۔ ایک تو زبیدر تھا اور دوسرا ٹرومین، جو سلیم کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے اور اب اپنے گروپ لیڈر کو اپنی کامیابی یا ناکامی کی اطلاع دینا چاہتے ہوں گے۔

اب تک میں تنومند آدمی کا لب ولہجہ جان چکا تھا۔ اس جیسی آواز یا لہجہ تو پوری طرح اختیار نہیں کرسکتا تھا میں لیکن ملا جلا لب ولہجہ اختیار کرنے کا ایک ''تکا'' ضرور چلانا چاہتا تھا۔ یوں بھی ویسے اس قسم کے لاسلکی ٹرانسمیٹر میں آواز میں ''تبدیلی'' کا اثر نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ خفیہ ٹرانسمیٹر ایجنسیوں کی خاص پرائیویٹ ''پراپرٹی'' اور ''پرائیویسی'' ہوتی ہے۔ یہی نہیں دوسری جانب سے مخاطب ہونے والے فرد کے لیے کافی ہوتا ہے لیکن پھر بھی دو ایک مشکلات تھیں۔ ایک تو مجھے اس تنومند لیڈر کا نام نہیں معلوم تھا، پھر وہ مخاطب ہوتے وقت کیا کوڈ استعمال کرتا تھا یا کرتا بھی تھا یا نہیں۔ تاہم مجھے یاد تھا جب تنومند شخص کا ماتحت ساتھی ایجنٹ گرانڈی میرے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا تو اس کا ٹرانسمیٹر میرے قبضے میں آگیا تھا، پھر اسی تنومند شخص کی کال آئی تھی۔ اس نے گرانڈی کو نام سے مخاطب کرتے ہوئے زیرو ون فور کہا تھا مگر یہ اس صورت میں کہا تھا جب اس نے خود رابطہ کیا تھا۔

لہٰذا اس امید پر میں نے ٹرانسمیٹر کا مخصوص بٹن پش کردیا لیکن بولا کچھ نہیں اور سر دست خود کو ''سامع'' کی حد تک محدود رہنے دیا۔

دوسری جانب ہلکے شور کے بعد آواز صاف ہوگئی اور کوئی تیزی سے کراہتی آواز میں کہنے لگا۔

''سپیریئر تھری! اٹ از نائن سیون زبیدر کمار---- اسپیکنگ ---اوور۔''

''ہاں، کہو سن رہا ہوں---- اوور۔'' میں نے غراتی آواز میں کہا۔ دوسری جانب صرف ایک دو لمحے کے لیے خاموشی رہی پھر وہی کراہتی ہوئی زبیدر کی آواز ابھری۔

''قیدی نمبر ٹو کو ٹرومین اور میں نے ٹریس کرکے گھیرے میں لے لیا تھا لیکن بدقسمتی سے ہم اس پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ وہ نہ صرف ہمارے چنگل سے نکل بھاگا بلکہ ٹرومین اور مجھے بھی سخت زخمی کرگیا ہے---اوور۔''

''یو ایم فول---- یہی بتانے کے لیے تم نے مجھے کال کی تھی۔'' میں غصے سے بپھرے لہجے میں بولا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس اطلاع پر میرے اندر مسرت کی لہریں دوڑنے لگی تھیں اور دل ہی دل میں ''سلیم زندہ باد'' کا نعرہ لگایا تھا۔

''تم نے اس کا تعاقب کیوں نہیں کیا؟---اوور۔''

''کیا تھا جناب! لیکن---وہ---آہ---مگر وہ ایک بار بردار ٹرک میں ہمارے قیدی سمیت فرار ہوگیا۔ میری دائیں کلائی ٹوٹ گئی اور ٹرومین کی بائیں ٹانگ کی ہڈی۔ اب کیا کریں جناب؟---اوور۔''

''ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر واپس بنگلے پر پہنچو۔ میں ادھر ہی تم دونوں کا منتظر ہوں---اوور۔''

''او کے جناب!---اوور اینڈ آل۔'' دوسری طرف سے زبیدر نے کہا۔

میرے چہرے پر بے اختیار زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی۔ اس میں فخر بھی تھا اور بے پایاں مسرتیں بھی۔

یہ ماضی کی بات تھی۔ مجھے یاد تھا اور میں اپنی اس داستان میں ابتدا میں اس کا ذکر بھی کرچکا ہوں۔ ہم چاروں دوستوں یعنی میں، سلیم، راجو اور ماجد کی جب باس اقبال کی تنظیم میں شمولیت ہوئی تھی تو ہمیں نامعلوم مقام پر لڑائی بھڑائی اور جنگجوانہ انداز کی ٹریننگ دی گئی تھی اور اس مقام پر ہم چاروں کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا تھا۔ مطلب کہنے کا یہ کہ وہ کوئی معمولی ٹریننگ نہ تھی، جس کا فائدہ آج تک میں اٹھا رہا تھا اور سلیم بھی۔

سلیم نے مردانہ وار ہی ان خطرناک ایجنٹوں کا مقابلہ کیا ہوگا اور نہ صرف خود کو بلکہ شاہینہ کو بھی نکال لے گیا تھا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ سلیم کے ساتھ ہوا کیا تھا اس وقت جب وہ میرے ساتھ تاریکی میں قید تھا۔ اسے ایسی کیا شے ماری گئی کہ اس کی للکاریں مارتے سلیم کی آواز یکدم معدوم ہوگئی تھی۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ خدانخواستہ وہ مرچکا، کیونکہ بعد میں اس جنم داتا تنومند شخص نے اسے ''لاش'' کہہ کر اپنے ساتھی کو اسے وہاں سے اٹھوانے کا حکم دیا تھا، جس سے سلیم کی موت کی تصدیق بھی ہوئی لیکن پھر ایسا کیا ہوا؟

ذرا غور کرنے پر مجھے اس کے سوا اور کوئی توجیہ سمجھ نہ آسکی کہ سلیم ممکن ہے وقتی طور پر بے ہوش ہوا ہو، یا پھر اس نے مرنے کا اداکار چاہا ہو اور بعد میں اس نے موقع ملتے ہی اپنی بہادری کے جوہر دکھا دیے۔ البتہ ایک تشویش میرے غور کرتے ذہن میں ضرور تھی کہ سلیم بھی ہوسکتا ہے زخمی ہو لیکن وہ ابھی تک استاد جوجی کے ٹھکانے پر نہیں پہنچا تھا۔ ممکن تھا تاخیر ہو۔ اب یہ سلیم ہی بتا سکتا تھا کہ آخر اسے

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

ایسی کون سی شے ماری گئی تھی کہ اس پر مرنے کا گمان مجھے ہی نہیں، تنومند شخص کو بھی ہوا تھا۔

☆☆☆

میں اب صوفے پر بیٹھ کر نریندر اور ٹرومین کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اچانک ہی میری چھٹی حس بری طرح پھڑکی۔ دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ ایک آہٹ..... بہت ہی موہوم سی آہٹ، جو میری غیر معمولی اور حساس سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اب یہ میری غیر معمولی بڑھی ہوئی حسیات کی اثر پذیری تھی یا پھر چھٹی حس کا شاخسانہ کہ میرے اندر کوئی چیخا۔

"ہوشیار باش! یہاں میرے علاوہ اور بھی کوئی ہے۔"

میں یکا یک روشنی کی سی رفتار سے تڑپا۔ یہی وہ وقت تھا جب کوئی ٹھوس آہنی شے عقب سے صوفے پر پڑی تھی، جس جگہ میں ذرا دیر پہلے ہی براجمان تھا۔ وہ شے صوفے کی پشت گاہ سے ٹکرائی تھی اور اگر مجھے وہاں سے اپنا سر ہٹانے میں لمحہ بھر کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ میرا سر زخمی کر سکتی تھی۔

یہ لوہے کی سریا تھا شے کی جس کے سرے پر فولادی موٹائی ایسی ہی تھی جیسے ہتھوڑا ہو۔ اسی "کلک جھپک" پر میری نگاہ اس دبلے پتلے اور پھرتیلے سے نکرانے والے سیاہ پوش پر بھی پڑی تھی۔ وہ صوفے کے عقب میں مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی مستعد سا کھڑا تھا۔

عین وقت پر اور بالکل ہی غیر متوقع طور پر اپنا نشانہ خالی جاتے دیکھ کر ایک لمحے کو تو وہ بھی ہکا بکا سا رہ گیا تھا۔ اس کے ساکت ہونے کے انداز سے ایسا ہی لگا جیسے وہ مجھے کوئی آسیب یا بھوت ہی سمجھا ہو۔

دوسرے پل میں اس نے پھرتی سے پشت پر ہاتھ گھمایا۔ شاید اب وہ کوئی اور ہتھیار نکالنا چاہتا تھا کہ میں جو اس سے دو ایک پل پہلے ہی چوکنا چیتے کی طرح اچھلا تھا، سیدھا اس پر جا پڑا۔

اسے رگیدتا ہوا میں فرش پر آ رہا۔ وہ پستول تھا جو اس کے ہاتھ میں آ چکا تھا مگر میرے ٹکرانے کے سبب وہ چھوٹ کر پرے جا گرا تھا۔ اس پر سائلنسر لگا تھا کیونکہ اس کی نال خاصی لمبی تھی۔ تب ہی اس نے تڑپ کر مجھ پر لیٹ تک رسید کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اس کی گردن کو "آرم لاک" میں دبوچ کر بے بس کر دیا۔

"اگر ذرا بھی حرکت کی تو منکا ٹوٹ جائے گا تمہاری گردن کا۔" میں بھیڑیے جیسی سفاکی سے غرایا۔

پل کے پل میں اس کی جامہ تلاشی لے کر تسلی کرنے کے بعد اس سے بولا۔

"تم میرے سوالات کا جواب دو گے یا پھر اپنے اس گروپ لیڈر جیسا حشر دیکھنا چاہتے ہو؟" کہتے ہوئے میں نے اسے گھما کر اس طرف کیا جدھر فرش پر خون میں لت پت اس تنومند کی لاش پڑی تھی۔

"کک..... کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس نے بالآخر پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ پلک جھپکتے ہی اس کے لہجے سے میں سمجھ گیا کہ وہ انڈین اور "بلیک کیٹس" (را) کا ایجنٹ تھا۔

"یہ بنگلا تم لوگوں کو کس نے ہائر کر کے دیا ہے؟"

"مم..... میری سانس رک رہی ہے، بب..... بات نہیں ہو پا رہی۔" اس نے پھر اسی آواز میں کہا۔ میں نے دباؤ تھوڑا کم کیا مگر شکنجے میں کسے رکھا۔

تب ہی ایک ذرا موقع ملتے ہی اس نے پھر رائٹ ہک رسید کر دیا جو میری پسلیوں پر پڑا۔ میرے لیے اس کی حرکت غیر متوقع نہ تھی اسی لیے پہلے ہی ایسے مواقع پر میں اپنے جسم کو اکڑا لیتا تھا اور اسی سبب مجھے کم ہی تکلیف کا احساس ہوا لیکن پھر میں نے اسے نہیں چھوڑا اور دوسرے ہاتھ سے تابڑ توڑ اس کے چہرے پر مکے برسا برسا کر اسے ادھ موا کر کے ہی شکنجے سے آزاد کیا۔ جب تک وہ سنبھلا، میں قریب فرش پر دھرا اس کا سائلنسر لگا پستول اٹھا کر اس پر تان چکا تھا۔

اس نے سنبھالا لیتے ہی دوبارہ جارحانہ حرکت کی کوشش کی تھی کہ میں نے ٹریگر دبا دیا۔ "چز" کی آواز سے گولی نکلی اور اس کے دائیں گھٹنے پر لگی۔ وہ چیخ مار کر جھکا۔ دوسری بار میں نے اس کے بائیں بازو پر داغی۔ وہ جھکتے جھکتے فرش بوس ہی ہو گیا اور کراہنے لگا۔

"تم نے مجھے آخر کھاس کھایا ہوا کیوں سمجھ رکھا ہے؟" میں نے زہریلے لہجے کے ساتھ کہا۔ "دیکھ نہیں رہے تمہارے لیڈر کا میں نے کیا حشر کیا لیکن میں تمہیں ہلاک نہیں کروں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ ہاں، یہ الگ بات ہے کہ تم خود تشدد سے اس قدر ادھ موئے ہو جاؤ کہ مجھ سے موت کی تمنا کرنے لگو تو اور بات ہے، مگر پھر بھی زندگی کو تمہارے لیے میں اذیت ناک بنا دوں گا اور موت کو لطیف، جو تمہارے نصیب میں ابھی نہیں ہو گی۔ اب کیا کہتے ہو؟"

میرے لہجے کی قطعیت اور سفاکی نے اسے اندر تک ہلا دیا۔ وہ ہانپتی ہوئی آواز میں فرش پر جھکے جھکے بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ اوپر والوں نے ہی ہم سے اس بنگلے میں ٹھکانا بنانے کا حکم دیا تھا۔ پلیز، میری پٹی تو کر دو۔"

وہ پھر مہلت ملنے کے چکروں میں تھا۔ میرے ہونٹوں پر

https://www.urdufubes.com/

Scanned with CamScanner

زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی۔ اسی لہجے میں بولا۔

"تمہارے زخموں پر میں نمک پاشی کروں گا، مرہم پٹی نہیں۔ کچن قریب ہی ہے، وہاں وافر مقدار میں سرخ مرچیں اور نمک موجود ہے۔"

"م..... میں نے بتایا نا..... مجھے اس ٹھکانے کا نہیں معلوم، بلکہ میرے کسی ساتھی کو بھی پتا نہیں تھا، سوائے ڈریڈ کے۔"

"ڈریڈ کون؟ یہ تمہارا گروپ لیڈر؟" میں نے فرش پر پڑی تنومند شخص کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے، کسی مقامی شخص سے تمہارا کوئی رابطہ..... یا کسی کو جانتے ہو؟ میری مراد سہولت کار کی ہے؟"

"کوئی نہیں۔"

"ٹھیک ہے، ابھی نریندر اور ٹرومین آرہے ہیں یہاں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں اسے بتایا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ "ان سے بھی مجھے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ جب تک میں تمہاری مرہم پٹی کر دیتا ہوں لیکن یہاں سے تم ایک انچ بھی حرکت نہیں کرو گے۔ میں تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں، ورنہ تیسری گولی تمہاری دوسری ٹانگ کو بھی معذور کر دے گی۔"

"تت..... تمہارا شکریہ، جلدی میری مرہم پٹی کر دو۔" اس نے منت کی۔ مجھے اس کے لہجے سے مکاری کی بو آرہی تھی لیکن میرا نہیں خیال تھا کہ مرہم پٹی کا سن کر وہ ابھی کوئی غلط حرکت کرنے کی حماقت کرے گا۔

یہی ہوا۔ میرا رخ واش روم جانے کے بجائے کچن کی طرف تھا۔ واپس آیا تو میرے ہاتھوں میں ایک نمک اور دوسرا پسی ہوئی سرخ مرچ کا ڈبا تھا۔ کچھ تیز قسم کی چھوٹی والی ہری مرچیں بھی اٹھا لایا تھا۔ اس کا سائلنسر لگا پستول میں نے اپنی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔

وہ پھٹی پھٹی اور ہوائیاں اڑاتی آنکھوں سے میری طرف تکنے لگا پھر کپکپاتی آواز میں بولا۔

"یہ کیا..... تت..... تم تو مرہم پٹی کا سامان لا رہے تھے؟"

"ہاں، وہ بھی لا رہا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ پھر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے فقط "گاز پیس" اٹھا لایا جو مرہم لگا کر اوپر سے پٹی باندھنے کے کام آتا ہے۔

"ی..... یہ..... یہ تو پٹی ہے، مرہم کہاں ہے؟" اس نے ہونق سے لہجے میں پوچھا۔

"مرہم یہ ہے نا!" میں نے نمک مرچ کے ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تت..... تم..... ذلیل، خبیث..... امیں نے تمہیں سچ تو بتا دیا ہے۔" وہ تکلیف اور اذیت کی شدت سے چلایا۔ اس کی ٹانگ اور بازو سے مسلسل خون بہے جا رہا تھا۔ اس کی بے بسی اور اذیت آمیز بوکھلاہٹ دیکھ کر میں استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

"تم نے مجھے ہلکا لے لیا، یہ بھی بھول گئے شاید کہ میں اس سے پہلے بھی تمہاری اس مشترکہ شیطانی ٹیم کو غارت کر چکا ہوں۔ گروپ لیڈر کیا ہوتا ہے، میں بھی یہ اصطلاح جانتا ہوں۔ ایجنٹوں کی مختصر گوریلا ٹیم میں ضرورت پڑنے پر ہر ممبر گروپ لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے سب پتا ہوتا ہے لیکن تم نے میری بات پر توجہ نہ دی کہ میں تمہیں کہہ چکا ہوں، مجھے گھاس چرا ہوا سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔"

انتہائی سرد لہجے میں یہ کہتے ہوئے میں لحظہ بھر کو رکا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "وقت کم ہے میرے پاس، سچ بولو گے یا نمک مرچ والی پٹی باندھ کر تمہیں باتھ روم میں خارش زدہ کتے کی سی حالت کر کے چھوڑ دوں؟"

میں نے دیکھا، پہلی بار اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرائے تھے، پھر وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح بولا۔

"یہ بنگلا نادر خاں نامی شخص کی ملکیت ہے اور وہی ہمارا سہولت کار ہے۔" بالآخر وہ کھلا۔

"یہ نام میرے لیے اجنبی ہے، کچھ اور بتاؤ تاکہ میرے اندر جو یقین کی حد تک شبہات ہیں، انہیں تقویت مل سکے اور تمہاری بھی گلوخلاصی ممکن ہو۔" میرا انداز ڈرامائی تھا۔ "تم لوگ کسی مقامی آدمی کی مدد کے بغیر اس دھرتی پر قدم نہیں رکھ سکتے اور وہ آدمی یقیناً بااثر ہوگا۔ میں یہاں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں۔"

وہ خاموشی سے لمبے لمبے سانس لیتا رہا پھر مختصراً بولا۔

"یہی آدمی ہے، وہ....."

"ٹھیک ہے اس کا رابطہ نمبر دو اور اسے یہاں آنے کا کہو۔" میں نے کہا۔

"وہ..... نہیں آسکتا یہاں..... آہ۔" وہ کراہا۔ اسی وقت باہر مجھے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ نریندر اور ٹرومین آچکے تھے شاید۔ میں نے لمحہ بھر کو سوچا اور غرا کر اس سے کہا۔

"میں ادھر ہی ہوں اور تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔ اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت۔"

یہ کہہ کر میں وسیع و عریض لاؤنج کی شیشہ ٹوٹی کھڑکی کی طرف آگیا۔ وہاں سے کار پورچ کی سمت جھانکا اور بری طرح

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

چونک گیا۔ میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ میری توقع کے برخلاف سیاہ سیڈان نہ تھی، جس میں ٹرینڈ اور لڑین کو ہونا چاہیے تھا، مگر وہ جو کوئی بھی تھے، کسی پرانے ماڈل کی کار میں آئے تھے اور کار کے اندر سے جو دو اشخاص برآمد ہوئے وہ مجھے عام سے ہی بندے نظر آئے۔ یہ ممکن تھا کہ کوئی تیسرے درجے کے کرمنل ہوں۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنی بھویں سکیڑ لیں۔

انہیں دیکھ کر میرا پہلا خیال سہولت کار کا ہی ابھرا تھا مگر وہ میری توقع کے مطابق بڑی ویلنگ شخصیت ہونا چاہیے تھا، مگر یہ دونوں تو عام سے مقامی ہی نظر آرہے تھے۔

واقعتاً ایک خیال کے تحت میں چونکا تھا۔ را اور موساد جیسی اداروں نما انٹیلی جنس ایجنسیاں عموماً کسی بھی غیر ملک میں مشن کو آسان بنانے کے لیے عام سے مجرموں کو بھی بہت اہمیت دیا کرتی ہیں۔ یعنی ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ کسی ویلنگ شخصیت سے مدد لیتے۔ "بھاری" معاوضہ ایسے تیسرے درجے کے مجرموں کے لیے کم نہیں ہوا کرتا۔ وہ آسانی سے ایسے لوگوں کے غلام بن جایا کرتے تھے۔

لیکن ابھی تک یہ محض میرا خیال تھا، تصدیق ہونا باقی تھی۔ میں ان کے اندر آنے کا منتظر رہا۔

وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے، میں نے ان پر پستول تان لیا۔ وہ دونوں ہی بری طرح چونکے۔

"میرا ارادہ تمہیں گولی مارنے کا نہیں ہے۔" میں نے ان سے کہا۔ "آگے آجاؤ، مجھے تم سے یہ پوچھنا ہے کہ تم کون ہو اور یہ لوگ کون ہیں؟"

انہوں نے پہلے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بے چون و چرا آگے آگئے۔

اس کے بعد جب ان کی نگاہیں فرش پر دشمن اور اس کے ساتھی کی لاش پر پڑی تو یکدم گھبرا گئے اور میری طرف سوالیہ نظروں سے تکنے لگے۔ میں بغور ان کے چہرے کے تاثرات اور انداز کو بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جو کسی بھی گھاگ جرائم پیشہ اشخاص سے مل نہیں کھاتے تھے۔

"تم کون ہو؟ کیا تم نے انہیں مارا ہے؟" ایک نے ہمت کرکے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اپنے بارے میں بتانا ابھی میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم دونوں کون ہو اور ان لوگوں سے تمہارا کیا تعلق ہے اور یہ بنگلا کس کی ملکیت ہے؟"

دوسرا جواب میں بولا۔ "یہ رانا صاحب کا بنگلا ہے جی۔ گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ہم دونوں یہاں کے رکھوالے ہیں اور ان سے کرایہ وصول کرنے آئے تھے۔"

اس کی بات سن کر بے اختیار میرے منہ سے گہری سانس نکل گئی۔ پس پردہ عام سی ہی صورت حال تھی۔ تب میں نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر انہیں دکھایا اور ویلنگ لہجے میں کہا۔

"میں خفیہ پولیس کا مخبر ہوں۔ یہ لوگ ملک دشمن عناصر ہیں، انہی کی ہمیں اطلاع ملی تھی۔" دونوں نے میرے ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو دیکھا۔ یہ انسپکٹر شیراز نے اس وقت میرے ہی ایما پر اپنے محکمے سے جاری کروا کر دیا تھا جب میں نے سر بیتا وغیرہ کو ان کے حوالے کیا تھا۔

"اوہ — جی — ستیاناس جاوے انہاں دا۔ انہوں نے تو رانا صاحب سے یہی کہا تھا کہ یہ لوگ سیاح ہیں اور چند دنوں کے لیے یہاں سیر و تفریح کی غرض سے آئے ہیں۔ انہیں کرائے پر یہ بنگلا درکار تھا۔"

(آج کل کرائے دار رکھنے پر باقاعدہ پولیس انکوائری ہوا کرتی ہے۔ اس زمانے میں ایسا کچھ نہیں ہوتا تھا اور غیر ملکی سیاح بھی آیا جایا کرتے تھے)

"کیا تم لوگ سچ بول رہے ہو کہ تمہیں یا تمہارے رانا صاحب کو ان کی اصلیت نہیں معلوم تھی؟" کہتے ہوئے میں نے باری باری دونوں کی طرف تشکیکی نظروں سے گھورا۔ تب پہلے والا کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

"سولہ آنے سچ کہہ رہے ہیں جناب! آپ یہاں کسی سے بھی اس بنگلے کے بارے میں پوچھ لو، یہاں غیر ملکی سیاح ہی آیا کرتے ہیں۔ رانا صاحب تو خود ایک شریف اور پرہیزگار آدمی ہیں۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک باہر ایک گاڑی کی آواز ابھری۔ میں ہی نہیں، وہ دونوں بھی چونک پڑے۔ میں نے گردن گھما کر قریب ہی کھڑکی سے باہر دیکھا۔

سیاہ سیڈان آکر رکی تھی۔ میں نے دیکھ کر ان دونوں سے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اچانک میرے اوسان خطا ہوگئے۔ دشمن شخص اپنی جگہ نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ خون کی لکیر ایک کوریڈور کی طرف جاتی دکھائی دی تھی۔ میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ دونوں لوٹ مار بھی گھبرا کر میری طرف دیکھنے لگے تھے۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

شک ایسی چیز ہے جو بھروسے کو دیمک کے مانند چاٹ جاتا ہے... کبھی دکھائی دینے والا منظر بھی نظر کا دھوکا ہوتا ہے... وہ بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوگیا تھا... وہ سمجھا کہ اس کی بیوی نے اس سے بے وفائی کی ہے... اس کا غیاب اسے بدلے پر اکسا رہا تھا... بالآخر سچ کے پردے سے جو ظاہر ہوا اس نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔

بیوی کی گمشدگی پر پریشان شوہر کا احوال

زنجیر

محمد فاروق انجم

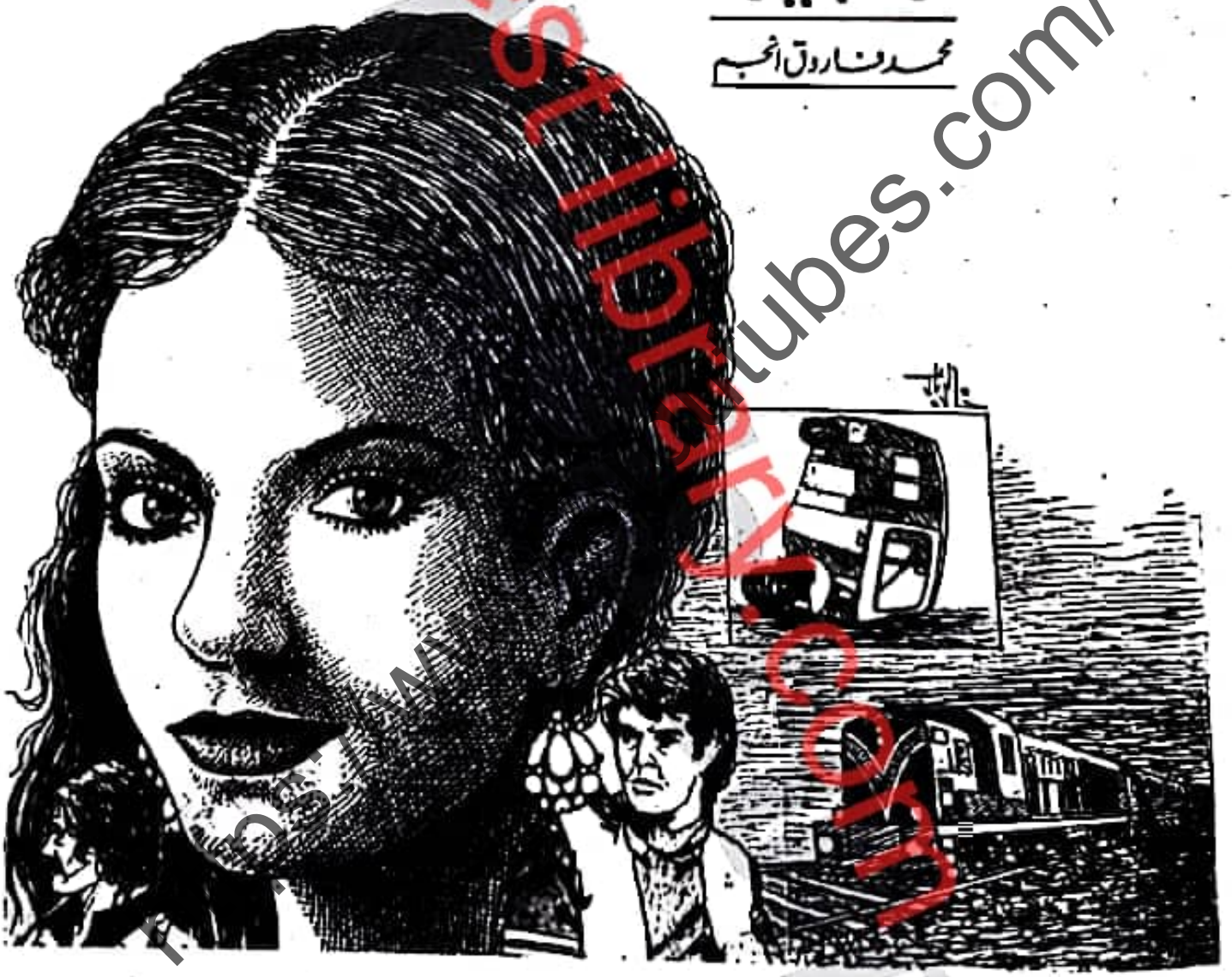

ریلوے اسٹیشن سے محض ٹرین ہی نہیں چلی تھی بلکہ اس کے دل کے اندر وہ اچل بھی چلنے لگی تھی جس پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

وہ میاں بیوی تھے۔ شوہر کا نام سراج اور بیوی کا شازیہ تھا۔ دونوں کی شادی کو پانچ ماہ ہوئے تھے اور سراج اپنے گھر سے سسرال کی طرف جا رہا تھا۔

سراج کا جہاں سسرال تھا وہ ایک ترقی پذیر گاؤں تھا۔ ان کے پاس ایک بڑا سوٹ کیس تھا کیونکہ شازیہ کے

Scanned with CamScanner

بھائی کی شادی تھی اور ان کو آٹھ دس دن وہاں رہنا تھا۔ شادی ایک ہفتے کے بعد تھی۔

ٹرین چلنے میں پانچ منٹ تھے اور سراج اپنے سر پر سوٹ کیس رکھے تیز تیز چلتا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے شازیہ نے اس کی چادر کا پلو پکڑا ہوا تھا۔ شازیہ کو ایسا کرنے کے لیے سراج نے تاکید کی تھی کہ اس رش میں کہیں اس کی بیوی ادھر اُدھر نہ ہو جائے۔

وہ اپنے ڈبے میں پہنچے اور سیٹ نمبر تلاش کر کے پہلے سراج نے سوٹ کیس سیٹ کے نیچے دھکیلا اور اس کے بعد اس جگہ بیٹھے مسافروں کا جائزہ لیا کہ وہاں کون کون براجمان ہے۔ جس سیٹ پر ان کو بیٹھنا تھا، اس پر دو ماں بیٹی بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ سامنے ان جیسا ہی ایک جوڑا بیٹھا تھا۔

وہ دونوں نئی نئی میاں بیوی ہی تھے۔ شوہر کا نام توفیق اور اس کی بیوی کا نام گلشن تھا۔ ان کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کی شادی کو بھی شاید اتنے ہی دن ہوئے تھے۔ توفیق نے سر کے بالوں میں اچھی طرح سے تیل لگا کر کنگھی کی ہوئی تھی جبکہ گلشن ہلکے میک اپ میں تھی اور اچھی لگ رہی تھی۔

سراج کے سر کے بال وقت سے بہت پہلے اڑ چکے تھے۔ برات تک وہ اپنے سر پر وگ رکھتا تھا اور پہلی رات شازیہ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس کا شوہر تو درمیان سے گنجا ہے۔

شادی سے قبل جب اس نے سراج کی تصویر دیکھی تھی تو اس کے سر کے بال پورے تھے اور وہ مسکراتا ہوا اچھا لگ رہا تھا۔ پہلی ہی رات شوہر کے گنجے پن کو دیکھ کر شازیہ کا دل ٹوٹ گیا تھا اور وہ دل ہی دل میں شکوہ کرتی رہی کہ اس کا شوہر اس تربوزے کے مانند نکلا ہے جو سونگھنے سے میٹھا اور کھانے پر پھیکا نکل آتا ہے۔

ولیمے والے دن اس کے سسرالیوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ سراج تو گنجا ہے لیکن سبھی چپ رہے کیونکہ شادی ہو چکی تھی، البتہ ان سب کے منہ ضرور بنے رہے تھے۔ وہ جانتے تھے اب بولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، بیٹی کا گھر برباد کرنے کے بجائے چپ ہی بھلی ہے۔ اس دن کے بعد شازیہ کے آگے بالوں کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ اسے بالوں والے سر کی اہمیت اور خوبصورتی بہت اچھی لگنے لگی تھی۔

توفیق کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر جبکہ گلشن اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سراج نے بھی کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ لی اور توفیق کے سامنے بیٹھ گیا جبکہ شازیہ اور گلشن آمنے سامنے تھیں۔

سراج کم نہیں بلکہ زیادہ وہمی تھا۔ وہ پہلے دس منٹ تک توفیق کی طرف دیکھتا رہا کہ اس کی نگاہ اس کی بیوی پر تو نہیں جا رہی جبکہ توفیق بڑا ہوشیار اور زیرک عاشق مزاج تھا۔ اس نے بھی پکی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ رہا۔ سراج کی تو جیسے ڈیوٹی لگ گئی تھی کہ وہ مسلسل توفیق پر نظر رکھے۔

سراج نے شازیہ کو آہستہ سے کہا۔ "تم گھونگٹ نکال کر بیٹھو، ایسے اچھا نہیں لگتا۔"

شازیہ نے اس کی بات سن کر اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہی ہو کہ آج گھونگٹ کی کیا سوجھ گئی؟

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے، میں لمبا سا گھونگٹ نکال کر بیٹھ جاؤں۔" شازیہ بولی۔

"اچھا تم اس کی طرف مت دیکھنا۔ یہ مجھے اچھا آدمی نہیں لگ رہا۔ شکل سے ہی اوباش لگ رہا ہے۔" اپنی دانست میں سراج نے شازیہ کے دل میں توفیق کے بارے میں غلط تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"بھاڑ میں جائے وہ جیسا بھی ہے۔" یہ کہہ کر جونہی شازیہ نے ایک نظر توفیق پر ڈالی، وہ آگے سے مسکرا دیا اور نادانستہ شازیہ بھی مسکرا دی۔ شازیہ کی مسکراہٹ دیکھتے ہی بجلی کی سی تیزی سے سراج نے توفیق کی طرف دیکھا مگر توفیق اپنا کام کر کے اپنی بیوی کی جانب ایسی توجہ مبذول کر چکا تھا جیسے اس نے نظر اٹھائی ہی نہ ہو۔

سراج کی نظر توفیق پر ٹھہر گئی تھی۔ جانے کیوں اسے اس سے ڈر سا لگ رہا تھا۔ توفیق نے بھانپ لیا تھا کہ سراج کی اس پر نگاہ ہے۔ اس نے سراج کی طرف دیکھتے ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام توفیق ہے۔ اپنے علاقے میں لیڈیز سوٹ کا بہترین ورکر ہوں۔ آپ کا کیا نام ہے اور کیا کرتے ہیں؟"

سراج کو لگا کہ اس نے اس کا نہیں بلکہ شازیہ کا نام پوچھا ہے۔ اس کا محض دھیان میری طرف تھا۔

"جناب! تعارف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ تھوڑی جان پہچان ہو جائے گی تو گپ شپ رہے گی اور سفر بھی اچھا گزر جائے گا۔" توفیق پھر بولا۔

"میرا نام سراج ہے اور میں منشی کا کام کرتا ہوں۔" سراج نے بادلِ ناخواستہ اپنا نام اور پیشہ بتایا۔

"کلرک بولیں جی۔" شازیہ نے گویا تصحیح کی۔

"اچھا اچھا، آپ کلرک ہیں۔ بہت اچھے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ دفتری بابو ہیں۔" توفیق نے شازیہ کی

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

بات اس کی طرف دھیان دیے بغیر سنی اور بولا۔

"میرے گاؤں میں چودھری صاحب ہیں، میں ان کے پاس ہوتا ہوں۔ زمینوں کا سارا حساب کتاب میں ہی کرتا ہوں۔" سراج خشک لہجے میں بولا۔

"ان کو یہ بھی بتائیں کہ آپ کے ساتھ دو اور چھوٹے کلرک ہیں۔" شازیہ نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

"اچھا، آپ کے نیچے دو جونیئر کلرک بھی کام کرتے ہیں اور آپ ہیڈ کلرک ہیں۔" توفیق نے ایک بار پھر شازیہ کی بات سن کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"اس کی بیوی بول رہی ہے جو تم بول رہی ہو؟" سراج نے شازیہ کے کان میں گھس کر سرگوشی کی اور وہ بھی شدید غصے میں "مہربانی کر کے تم چپ رہو۔"

"آپ جو بات نہیں کر رہے ہیں اس لیے مجھے بولنا پڑ رہا ہے۔" شازیہ نے وضاحت پیش کی۔

"سیب کھائیں، بہت میٹھا ہے۔" سراج کے کان میں توفیق کی آواز پڑی تو اس نے ایک دم سے اس کی طرف دیکھا۔ توفیق کہنہ مشق عاشق بے لگام تھا۔ جب وہ ہاتھ بڑھا کر پلیٹ میں رکھ کر سیب پیش کر رہا تھا تو اس کا رخ شازیہ کی طرف تھا اور جونہی سراج نے اس کی طرف گردن گھمائی، اس نے کمال مہارت سے اپنے ہاتھ کو سراج کے سامنے کر دیا۔

"شکریہ..... مہربانی۔" سراج بولا۔

"ایسا بھی کیا شکریہ۔ لیں، بہت میٹھا سیب ہے۔" توفیق مسکرایا اور پھر ایک دم سے بولا۔ "ایک منٹ، میں سیب کاٹ کر دیتا ہوں۔ ایسے کیسے کھائیں گے؟"

اس نے وہ پلیٹ گلشن کو دے دی اور اسے کہا کہ وہ اسے کاٹے۔ گلشن سیب کاٹنے لگی اور سراج کی نگاہیں ایک بار پھر اس کے چہرے پر جم گئیں۔ اس کے ساتھ برا جمان شازیہ کی نگاہ بھی توفیق کے چہرے پر چلی گئی تھی۔ توفیق نے غیر محسوس انداز میں شازیہ کو اپنی جانب متوجہ دیکھا تو جیب سے کنگھی نکال کر اس توجہ کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے سر پر کنگھی کی اور کنگھی پر پھونک مارنے کے بعد اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

سراج کو ایک بار پھر اس بات پر چڑ ہو گئی۔ "آپ ایسے ہی کنگھی کرتے رہتے ہیں؟"

"جی، مجھے اپنے بالوں سے بڑا پیار ہے۔ میں آپ کو اپنے کالج کا واقعہ سناتا ہوں.....!"

سراج نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کالج میں پڑھتے رہے ہیں آپ؟" سراج کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ دل ہی دل میں کہہ رہا ہو کہ شکل سے تو دیکھ کر لگتا ہے کہ تم اسکول بھی نہیں گئے۔

"کالج میں، میں نے تھوڑا عرصہ نوکری کی تھی۔ میں بتا رہا تھا کہ کالج میں میرے بالوں کی وجہ سے ایک پروفیسر صاحبہ میری عاشق ہو گئی تھیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا تو گلشن نے سن کر برا سا منہ بنایا۔

"آپ کچھ زیادہ نہیں کہہ گئے؟ کہاں ایک تعلیم یافتہ پروفیسر صاحبہ اور کہاں آپ عارضی نوکری کرنے والے ایک عام سے لڑکے؟" سراج کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"اس بات کی تصدیق آپ میری بیوی سے کر سکتے ہیں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

گلشن سیب کاٹ چکی تھی اس لیے اس نے جلدی سے سیب کی پلیٹ ان کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ "سیب کھائیں۔" سراج نے پہلے سیب کی پلیٹ کو گھور کر دیکھا اور اس کے بعد بادلِ ناخواستہ ایک قاش اٹھالی۔

☆☆☆

ثرین بھاگ رہی تھی۔ توفیق کا تو بہت دل چاہا تھا کہ وہ بولے اور باتوں باتوں میں اپنے بارے میں بتاتا رہے لیکن سراج اس کو کسی نہ کسی بہانے بولنے سے روک دیتا تھا۔

اس دوران جب دو بار سراج کو اونگھ آئی تو اس کا فائدہ توفیق نے یہ اٹھایا کہ اس نے شازیہ کی طرف مسکرا کر دیکھا اور آنکھوں سے اشارہ کیا۔ شازیہ بھی مسکرائی۔

گلشن کو کچھ نہ کچھ کھانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ کبھی وہ بیگ سے ٹافی نکال لیتی اور کبھی اس کا ہاتھ بیگ سے کچھ اور نکال لیتا۔

سراج کی آنکھ کھلی تو وہ دونوں ایسے ہو گئے جیسے ان کو معلوم ہی نہ ہو کہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اور اشارہ کرنا کیا ہوتا ہے۔

سراج کو ٹوائلٹ جانے کی شدید حاجت ہو رہی تھی۔ وہ جانا چاہتا تھا لیکن شازیہ کو اکیلے چھوڑ کر جانے کے لیے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"میرے ساتھ چلو، میں نے ٹوائلٹ جانا ہے۔" آخرکار سراج نے شازیہ سے سرگوشی کی۔

"آپ جائیں، میں نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے؟" شازیہ نے جھٹ سے جواب دیا۔

سراج تلملایا اور اٹھ کر جانا اس کی مجبوری بن گیا۔ ثرین کی رفتار بھی آہستہ ہو گئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ

https://www.urdutunes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

اٹھا۔ اس نے اپنا موبائل فون سیٹ کے نیچے بیگ کی جیب میں ڈال کر اس کی زپ بند کردی اور چلا گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُڑ کر وہاں تک پہنچ جائے۔ وہاں پہنچا تو دو لوگ کھڑے تھے۔ ٹرین اور آہستہ ہوگئی تھی۔ جب وہ ٹوائلٹ کے اندر گیا تو ٹرین رک چکی تھی۔

باہر نکلا تو اس نے جھانک کر دیکھا، کوئی چھوٹا سا پلیٹ فارم تھا۔ باہر شور برپا تھا۔ وہ تیزی سے اپنی سیٹ کی طرف گیا تو اس کی سانس ہی رک گئی۔ شازیہ اور توفیق وہاں موجود نہیں تھے۔ گلشن کھڑکی سے بنی نیند کی آغوش میں تھی۔

"میری بیوی کہاں گئی؟" سراج نے وہاں بیٹھی مسافر خاتون سے بے چین ہوکر پوچھا۔

اس نے دائیں جانب اشارہ کرکے بتایا۔ "اس طرف گئی ہے۔"

"یہ آدمی کہاں گیا؟" سراج نے توفیق کے بارے میں پوچھا۔

"وہ اس طرف گیا تھا۔" اس مسافر عورت نے دوسری طرف اشارہ کرکے بتایا۔

سراج کو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس طرف چلا گیا جس طرف اس عورت نے اشارہ کرکے بتایا تھا۔ وہ دائیں بائیں، ایک ایک مسافر کا منہ دیکھتا ہوا ٹرین سے باہر نکلا اور پلیٹ فارم پر موجود مسافروں کو کسی دیوانے کی طرح دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔

ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ بھاگتا ہوا اپنے ڈبے کی طرف چلا گیا۔ اس نے کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا، گلشن اسی طرح سوئی ہوئی تھی اور وہ دونوں اس جگہ موجود نہیں تھے۔

وہ بے چینی کے عالم میں پھر پلٹا۔ اندیشوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اس کی متلاشی نگاہیں مسلسل ایک سے ہوتی دوسرے کے چہرے پر جارہی تھیں۔ وہ چلتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ وہاں موجود مسافروں کو دیکھتا ہوا وہ سڑک کی طرف چلا گیا۔ وہاں رکشے وغیرہ کھڑے تھے۔ اس نے دور تک نظر دوڑائی اور جب کچھ نظر نہ آیا تو وہ واپس پلٹا۔ اندر گیا تو اس نے دیکھا ٹرین چل پڑی تھی اور اس کے سامنے ٹرین کا آخری ڈبا گزر رہا تھا۔ وہ ٹرین کے پیچھے بھاگا۔ ٹرین نے رفتار پکڑلی تھی اور بھاگتے ہوئے اس سے ٹرین کے اوپر سوار ہونا مشکل ہوگیا۔ وہ پھولی سانس کے ساتھ رک گیا۔ وہ جاتی ہوئی ٹرین کو دیکھتا رہا۔ ٹرین اس سے بہت دور ہوگئی تھی۔ سراج کے چہرے پر گھبراہٹ اور بیچارگی تھی۔

☆☆☆

علاقہ ریلوے اسٹیشن کے تھانیدار کا نام طفیل احمد تھا، وہ پچاس سال کی عمر کا شخص تھا۔ وہ عام پولیس والوں سے ذرا ہٹ کے تھا۔

اس وقت وہ آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سکون لینے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ جس علاقے میں وہ تھانیدار تھا، وہاں اکا دکا ہی کیس آتے تھے۔ بڑے بڑے معاملات سے اس کا پالا بہت ہی کم پڑا تھا۔

طفیل کو آنکھیں بند کیے ابھی دس منٹ نہیں ہوئے تھے کہ اس کے اہلکار نے اس کا بازو آہستہ سے ہلایا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اہلکار نے کچھ بتانے کے بجائے اس کے سامنے کھڑے شخص کی طرف اشارہ کیا تو طفیل کی نگاہوں کا رخ اس طرف ہوگیا۔

طفیل کے سامنے سراج کھڑا تھا۔ اس کی صورت رو دینے والی تھی۔ کھڑا ایسے تھا جیسے ابھی گر جائے گا۔

طفیل نے اسے بڑے غور سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔ "کون ہو بھئی، ایسے کیوں کھڑے ہو؟"

"میرا نام سراج ہے۔ ایک رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔" سراج نے کانپتی آواز میں کہا۔

طفیل اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "بتاؤ میاں! کیا ہوا ہے؟"

"میں اور میری بیوی ٹرین میں سفر کررہے تھے۔ ہم دونوں برکت پور جارہے تھے، وہاں میرا سسرال ہے اور میرے چھوٹے سالے کی شادی ہے۔" سراج بتانے لگا۔

"وقوعے کے بارے میں بتاؤ۔" طفیل نے کاغذ پنسل سنبھال لی۔

سراج کچھ دیر کے بعد بولا۔ "ہم دونوں میاں بیوی سفر کررہے تھے۔ میرے سامنے بھی وہ میاں بیوی بیٹھے تھے۔ اس کا میاں شکل سے اوباش اور پرلے درجے کا بدمعاش دکھائی دیتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اس پر شک ہوگیا۔ میں ٹوائلٹ گیا، واپس آیا تو میری بیوی اور وہ بدمعاش غائب تھے۔"

طفیل سنتے ہوئے چونکا۔ اس نے ایک نظر اپنے اہلکار اور دوسری نظر سراج پر ڈالی۔ "کہاں غائب ہوگئے وہ دونوں؟"

"معلوم نہیں صاحب! میں نے ان کو پلیٹ فارم پر تلاش کیا، باہر نکل کر اِدھر اُدھر چپا چپا چھان مارا مگر وہ دونوں نہیں ملے۔ ریلوے آفیسر کو بتایا تو اس نے مجھے آپ کے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

پاس بھیج دیا۔" سراج کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"دیکھو، تم رونا بند کردو۔ کسی کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" طفیل نے نرم لہجے میں استدعا کی۔

سراج نے آنکھیں صاف کرلیں۔

"مجھے اس بندے کا حلیہ، اپنی بیوی کا نام اور....."

تھانیدار کی بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی تھی کیونکہ اس دوران تیزی سے گلشن اندر آتے ہی گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"تھانیدار صاحب! میرا شوہر ریلوے اسٹیشن سے غائب ہوگیا ہے۔"

طفیل اور اہلکار نے سنا تو دونوں چونکے اور حیرت سے گلشن کی طرف دیکھنے لگے۔ سراج اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ "یہی ہے وہ عورت جس کے شوہر کے ساتھ میری بیوی غائب ہوئی ہے۔" سراج کی بات نے طفیل اور اہلکار کو مزید چونکا دیا۔

"میرا شوہر اس کام کا ماسٹر ہے۔ گاؤں میں درجن بار مار کھا چکا ہے لیکن اپنی ان حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ میں تو سوئی ہوئی تھی، مجھے ساتھ والے نے جگا کر کہا کہ ٹرین چل پڑی ہے اور تیرا بندہ غائب ہے۔ میں اسے دیکھنے کے لیے باہر نکلی۔ اسے تلاش کرتی رہی اور ٹرین چل گئی۔" اس نے ایک سانس میں بتادیا۔

"آپ کو سوتا چھوڑ کر وہ ان کی بیوی کو لے کر کہاں بندہ ہے جس نے نظروں کا تیر اس پھرتی سے چلایا کہ وہ بیچارا گھائل ہوگئی۔" تھانیدار طفیل بولا۔

"تھانیدار صاحب! کچھ کیجیے۔" سراج نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"ان کے پاس موبائل فون تو ہوگا؟ مجھے نمبر دو، میں ان کو کال کروں۔" تھانیدار طفیل نے کہا۔

سراج کو یاد آیا کہ اس نے اپنا موبائل فون بیگ میں رکھا تھا۔ اس نے اپنا نمبر لکھوایا تو اس نمبر پر بار بار کال کی لیکن بات کرنے سے وہ گریزاں ہی رہا۔

"تمہارے شوہر کا موبائل نمبر کیا ہے؟" تھانیدار نے گلشن سے پوچھا۔

وہ آہستہ سے بولی۔ "اس کا موبائل فون میرے پرس میں ہے اور گم کھیلتے ہوئے اس کی بیٹری ختم ہوچکی ہے۔"

"یہاں ٹرین کتنے بجے پہنچی تھی؟" تھانیدار طفیل نے سراج سے سوال کیا۔

"ٹرین دس بج کر دس یا پھر بارہ منٹ پر پہنچی تھی۔" سراج نے سوچتے ہوئے بتایا۔ "مجھے اس لیے یاد ہے کہ میں نے جب وقت دیکھا تھا۔"

تھانیدار طفیل سوچنے لگا۔ "ٹرین اگر رات کو دس بجے بھی یہاں پہنچی تھی تو اس گاؤں سے آخری بس شہر کی طرف نو بجے چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی بس کہیں نہیں جاتی، نہ کوئی ٹرین آتی ہے۔ صبح چھ بجے ایک بس شہر کے لیے نکلے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں اسی گاؤں میں کہیں ہیں۔ اگر جائیں گے تو صبح چھ بجے والی بس پر سوار ہوں گے۔"

"آپ صحیح فرما رہے ہیں۔" اہلکار نے اس کی تائید کی۔

"تم چار پانچ پولیس والے ساتھ لو۔ ہم اس گاؤں میں انہیں تلاش کرتے ہیں۔" تھانیدار کھڑا ہوگیا۔

"ہم بھی ساتھ چلیں سر جی؟" سراج نے پوچھا۔

تھانیدار طفیل نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تمہارا کوئی کام نہیں ہے، تم دونوں جاؤ۔ اگر تمہارے پاس فون ہے تو وہ نمبر ہمیں لکھوا دو۔"

"فون تو ہے لیکن صاحب جی ہم کہاں جائیں گے؟ نہ کوئی جان پہچان، نہ کوئی ٹھکانا۔" سراج بولا۔

"میں عورت ذات کہاں جاؤں؟" گلشن بھی بولی۔

تھانیدار طفیل کے لیے نئی الجھن شروع ہوگئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام گلشن ہے۔" اس نے بتایا۔

"گلشن بی بی! میں تمہیں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔ میرے گھر میں میری ماں اور بیوی ہے۔ تم ان کے پاس رہنا اور میں جاتے ہوئے تم سے تمہارے شوہر کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ کروں گا۔" یہ کہنے کے بعد اس نے سراج کی طرف دیکھا۔ "تم ایسا کرو کہ ہمارے ساتھ ہی رہو۔ تم انہیں پہچان بھی لو گے۔"

☆☆☆

وہ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ٹرین جہاں رکتی تھی، وہ پلیٹ فارم بھی چھوٹا سا تھا۔ ایک لاری اڈا تھا جہاں سے شہر اور ارد گرد کے گاؤں کی طرف بسیں جاتی تھیں۔ ان کا بھی وقت مخصوص تھا۔

تھانیدار طفیل نے کچھ پولیس والوں کو ہدایت کرکے گاؤں میں پھیلا دیا اور ان کو سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ طفیل، پولیس اہلکار جس کا نام برکت تھا اور سراج — وہ تینوں ایک ساتھ ایک طرف نکل گئے۔

سرکاری پرانی سی موٹر سائیکل تھی جس کی ہیڈ لائٹ بھی نہیں جلتی تھی اور انجن سے آواز ایسی آتی تھی گویا ریل کا

https://www.urdudigest.com

Scanned with CamScanner

digest library.com

الجھن ہو۔ وہ تینوں اس پر بیٹھ کر ایک طرف کو نکل گئے۔

گاؤں میں لوگ جلدی سو جانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی گلیاں سنسان اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اوپر سے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ بھی نہیں تھی۔

"او تھانیدارا.....! آدھی رات کو کس کو پکڑنے کے چکر میں ہماری نیند حرام کر رہے ہو؟" ایک بابا جی کی تیز آواز کسی گھر کی کھڑکی سے آئی۔ تھانیدار طفیل نے سننے کے باوجود اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

وہ اس جگہ سے نکل کر ایک چھوٹے سے پل کے پاس پہنچ گئے۔ وہ تینوں ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ داہنیں بائیں فصلیں تھیں اور دور کسی گھر کے اندر روشن بلب اس بات کا پتا دے رہا تھا کہ اس طرف آبادی ہے۔

وہ ایک بڑی کشادہ سی نہر تھی اور اس سے گزرنے کے لیے وہ واحد پل تھا۔ تھانیدار طفیل نے دور تک دیکھنے کے بعد سراج سے کہا۔

"یہ وہ واحد راستہ ہے جہاں سے گاؤں سے نکلا اور داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پیدل پگڈنڈیوں اور میدان کے بیچوں بیچ گزر کر کسی دوسری جگہ پہنچا جا سکتا ہے لیکن کوئی بھی عقلمند رات کے وقت ہی نہیں، دن کو بھی ایسا خطرہ نہیں لیتا کیونکہ راستہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"وہ کہیں پیدل ہی اس جگہ سے نہ گزر گئے ہوں؟" سراج نے اپنا اندیشہ عیاں کیا۔

"پیدل جا کر بھی کیا کریں گے؟ یہاں سے کم از کم پندرہ کلو میٹر سڑک کے آخر میں بڑی سڑک شروع ہوتی ہے۔ پندرہ کلو میٹر کا سفر پیدل طے کرنا ہر کسی کے بس کا کام نہیں ہے۔ میرے بندے اس سڑک کے پاس بھی کھڑے ہیں۔" تھانیدار طفیل نے بتایا۔ پھر وہ برکت سے کہنے لگا۔

"برکت! ایک بات دماغ میں آئی ہے۔"

"وہ کیا بات ہے سرجی؟" برکت جلدی سے اس کی طرف متوجہ تو ہوا ہی، سراج نے بھی اپنا سر آگے بڑھا دیا۔

"اپنے گاؤں میں ایک بندہ ہے جس کے پاس رکشا ہے اور وہ کسی بھی وقت پیسوں کے لیے کسی کو بھی گاؤں سے نکال کر کہیں بھی چھوڑنے کے لیے چلا جاتا ہے۔" تھانیدار طفیل نے کہا۔

برکت چونکا۔ "آپ لالو کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں..... میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ وہی ہے جو ان دونوں کو اس گاؤں سے نکال کر لے جا سکتا ہے۔"

"ہم چلیں اس کے گھر؟" برکت جلدی سے تیار ہو گیا۔

"تم دونوں اسی جگہ رکو، میں جاتا ہوں۔ کوئی بات ہوئی تو فون پر بتاؤں گا۔ تم دونوں نے اس جگہ سے ہلنا نہیں ہے۔" تھانیدار طفیل دونوں کو تاکید کرتا ہوا موٹر سائیکل کی طرف گیا، اسے سیدھا کیا اور جونہی کک ماری، سناٹے میں اس کا انجن زور سے چیخا۔

سراج پریشانی کے عالم میں دعائیں کر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ بھی طفیل کے پیچھے بیٹھ جاتا۔

☆☆☆

تھانیدار طفیل پورے گاؤں کا سکون غارت کرتا ہوا لالو کے گھر پہنچا اور موٹر سائیکل کو کھمبے کے سہارے کھڑا کر کے اس نے لالو کے گھر کا دروازہ بجایا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ تین چار بار اس عمل کو دہرایا تو اندر سے لالو کی بیوی کی آواز آئی۔

"کون ہے؟"

"میں تھانیدار طفیل ہوں، لالو کو باہر بھیجو۔" طفیل نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر تحکمانہ لہجے میں کہا اور کوشش کی کہ اس کی آواز زیادہ بلند نہ ہو۔

"وہ تو گھر میں نہیں ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"کسی سواری کو لے کر گیا ہے۔" اندر سے جواب آیا۔

تھانیدار طفیل چونکا۔ "کون سواری تھی؟ اسی گاؤں کی تھی یا کہیں باہر سے آئی تھی اور وہ ایک تھا یا دو تھے؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔ جب دروازے پر کوئی آیا تھا تو لالو نے ہی دروازہ کھولا تھا اور مجھے یہ بتا کر چلا گیا کہ وہ کسی کو چھوڑنے جا رہا ہے۔" اس کی بیوی نے بتایا۔

"کتنی دیر ہوئی ہے اسے گئے ہوئے؟"

"آدھا پونا گھنٹا ہو گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

تھانیدار طفیل کو جیسے یقین ہو گیا تھا کہ ان دونوں کو ہی لالو چھوڑنے کے لیے گیا ہو گا کیونکہ یہی وہ وقت تھا جب وہ ریلوے پلیٹ فارم سے نکلے تھے۔

تھانیدار طفیل نے ارد گرد دیکھا اور پھر سوال کیا۔

"اس کا رکشا تو ادھر باہر ہی کھڑا ہوتا تھا نا؟"

"ہاں جی، تھانیدار صاحب! اس چھوٹی سی ڈیوڑھی سے تو رکشا اندر نہیں جا سکتا۔" وہ بولی۔ "تھانیدار صاحب! ویسے سب خیر ہے نا؟"

تھانیدار طفیل نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا موبائل فون نکالا اور برکت کو کال کر کے اسے

https://www.urdutribes.com/

Scanned with CamScanner

ساری بات بتائی اور اسے حکم دیا کہ کسی اہلکار کو کال کر کے بولو کہ وہ سیدھا اس سڑک پر پہنچے جہاں کسی طرف سے آتی ہوئی بس مل جاتی ہے۔

کال کرنے کے بعد اس نے موٹر سائیکل سیدھی کی تو اس دوران دروازہ کھلا اور لالو کی بیوی کا چہرہ نمودار ہوا اور اس نے پوچھا۔

"تھانیدار صاحب! سب خیر ہے نا؟"

"وہ جنہیں چھوڑنے گیا ہے وہ دونوں بھاگے ہوئے میاں اور بیوی ہیں۔" تھانیدار طفیل کو اس وقت وہی جواب سوجھا اور وہ موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے لگا۔

"اب لالو کو تو نہیں پتا کہ وہ کون لوگ تھے، وہ تو اپنی مزدوری کرتا ہے۔" اس کی بیوی نے صفائی پیش کی۔

"ایک بار لالو مل جائے اس کے بعد دیکھیں گے کہ اسے پتا تھا کہ نہیں۔" تھانیدار طفیل نے زور سے کک ماری اور موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔

وہ سیدھا اس پل پر پہنچا تو سراج دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا۔ برکت نے جب دیکھا کہ تھانیدار صاحب نے کوشش کر کے موٹر سائیکل کھڑی کر لی ہے تو وہ بھی اس کی طرف بھاگا۔

"میں نے سب کو کال کر دی ہے۔ وہ لوگ آ رہے ہیں اس کی طرف۔" برکت کی بات سن کر تھانیدار طفیل نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ بندہ اس گاؤں کا بھیدی ہے۔ اس نے اسی گاؤں کے پلیٹ فارم پر تمہاری بیوی کو اپنے ساتھ لیا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ تو بچے کے بعد یہاں سے کوئی بس نہیں جاتی۔ اسے یہ علم تھا کہ اسے اگر کوئی نہیں پہنچا سکتا ہے تو وہ لالو ہے۔ اس لیے وہ سیدھا اس کے گھر گیا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر چلا گیا۔"

"وہ میری بیوی کو اس گاؤں سے لے گیا ہے جی؟" سراج کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔

تھانیدار طفیل سوچنے لگا۔ سوچتے ہوئے وہ برکت کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم تھانے فون کر کے وہاں موجود ایک اہلکار کو بلاؤ اور اسے ہدایت کرو کہ وہ یہاں آ کر وائرلیس دے۔ ہم اسی وقت چیرے کے ہوٹل جائیں گے۔"

"چیرے کا ہوٹل.....؟" برکت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شہر کی طرف جانے والی سڑک سے پہلے چیرے کا مشہور ہوٹل آتا ہے، اس کے ساتھ ہی پیٹرول پمپ ہے۔ وہاں سے اس نے پیٹرول لازمی لیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں نے اس جگہ سے چائے بھی پی ہو۔"

"سر جی! ہو نہیں سکتا، بلکہ اس نے لازمی اپنا رکشا اس ہوٹل پر روکا ہوگا کیونکہ لالو کا اس ہوٹل والے کے ساتھ لک مکا ہے۔ وہ جان بوجھ کر رکشا کی خرابی وغیرہ کا بہانہ کر کے وہاں رک جاتا ہے اور سواریاں چائے پینے لگ جاتی ہیں جبکہ لالو کو وہ فری میں چائے دیتا ہے۔" برکت نے تفصیل بتائی۔

"تم جلدی چلو۔" یہ بات سنتے ہی تھانیدار طفیل بولا۔

"میں پہلے کال کر لوں۔" برکت نے کہہ کر موبائل فون سے ایک اہلکار کو اس جگہ آنے کا کہا اور موٹر سائیکل کی طرف دوڑا۔ تینوں ایک بار پھر اس موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے۔

☆☆☆

چیرے کا ہوٹل سڑک کے ساتھ ہی تھا۔ وہاں دن رات رونق لگی رہتی تھی۔ زیادہ رش رات کے وقت ان ٹرک والوں کا ہوتا تھا جو وہاں ٹرک کھڑا کر کے کھانا کھاتے تھے اور اسی جگہ یا تو سو جاتے تھے یا پھر سفر کے لیے نکل پڑتے تھے۔

جب وہ تینوں اس جگہ پہنچے تو وہاں اچھی خاصی رونق تھی۔ تھانیدار طفیل موٹر سائیکل سے اترتے ہی سیدھا کاؤنٹر والے کے پاس چلا گیا۔

"یہاں لالو آیا تھا؟" تھانیدار طفیل نے جاتے ہی پوچھا۔

کاؤنٹر پر بیٹھا شخص گھبرا سا گیا۔ "خیر ہے جی؟"

"جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔ لالو آیا تھا؟" تھانیدار طفیل نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی آیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"کب آیا تھا؟"

"زیادہ دیر نہیں ہوئی، بس ابھی پندرہ منٹ پہلے گیا ہے۔" وہ تھانیدار طفیل کا منہ دیکھ رہا تھا۔

"اس کے رکشے میں کتنی سواریاں بیٹھی تھیں؟"

"دو میاں بیوی تھے۔" اس نے جواب دیا۔

تھانیدار طفیل نے سنتے ہی اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے اندر کا غصہ ابلنے لگا تھا۔ تھانیدار طفیل نے دل میں سوچا کہ ایک بار وہ اس کے ہاتھ لگ جائے، وہ اسے عبرت کا نشان بنا کر چھوڑے گا۔

"وہ کس طرف گئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"شہر کی طرف۔" وہ بولا۔

تھانیدار طفیل بھاگتا ہوا موٹر سائیکل کے پاس پہنچا

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

اور برکت کو بتانے لگا۔ ''جلدی چلو، وہ پندرہ منٹ پہلے اس جگہ سے گئے ہیں۔''

''سر جی! اسے چھوڑنا نہیں ہے۔ میری عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔'' سراج نے معصوم صورت بنا کر کہا۔

''میں جو بھاگ دوڑ کر رہا ہوں، یہ تیرے لیے ہی کر رہا ہوں۔ جلدی بیٹھو۔'' تھانیدار طفیل نے کہا اور وہ تینوں موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے۔

موٹر سائیکل ایک بار پھر سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ ہوٹل سے تقریباً چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ان کو دور سے ہی ایک طرف لالو کا رکشا دکھائی دیا جو سڑک کنارے الٹا پڑا تھا۔

''سر جی! یہ مجھے لالو کا رکشا لگتا ہے۔'' برکت زور سے چلایا۔

''جلدی چلو۔'' تھانیدار طفیل بھی اس جانب دیکھ رہا تھا۔ سراج کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

ان کی موٹر سائیکل پاس پہنچی تو وہ لالو کا ہی رکشا تھا۔ وہ الٹا ہوا تھا اور ارد گرد کوئی بھی نہیں تھا۔ تھانیدار طفیل نے اپنے موبائل کی ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ رکشے میں ایک طرف کچھ خون بھی لگا ہوا تھا۔

''لالو کا رکشا الٹ گیا ہوگا۔'' برکت دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بڑی بے پروائی سے چلاتا ہے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا ہے۔ گاؤں کے کئی لوگ تو اس کے رکشے میں بیٹھنا چھوڑ چکے ہیں۔''

''لگتا ہے کہ وہ زخمی بھی ہوئے ہیں۔'' تھانیدار طفیل بولا۔

''پتا نہیں شازیہ کا کیا بنا ہوگا؟'' سراج پریشان ہو کر بولا۔

''اب کیا کرنا ہے سر جی؟'' برکت نے سوالیہ نگاہوں سے تھانیدار طفیل کی طرف دیکھا۔

تھانیدار طفیل سوچ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ اس نے اپنے موبائل کی روشنی میں زمین پر دیکھنے کی بھی کوشش کی کہ خون کے قطرے ان درختوں کی طرف تو نہیں جا رہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اس طرف بھاگے ہیں۔ ایسا نہیں تھا بلکہ خون کے کچھ قطرے رکشے کے قریب ہی زمین پر دکھائی دیے تھے۔

''برکت.....!'' تھانیدار طفیل بولا۔

''جی، سر جی!''

''یہاں سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے اور وہاں ایک سرکاری اسپتال ہے۔ قریب ترین اسپتال وہی ہے۔ اگر وہ زخمی ہوئے ہیں اور کسی طرح سے وہ اسپتال پہنچے ہوں گے تو اسی اسپتال میں گئے ہوں گے۔'' تھانیدار طفیل نے سوچتے ہوئے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں سر جی!'' برکت نے کہا۔ ''اس سڑک پر ٹرک وغیرہ تو گزرتے ہی رہتے ہیں۔''

''جلدی سے اس اسپتال چلو۔'' تھانیدار طفیل نے کہا اور تینوں موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے۔ سراج کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اسے رہ رہ کر تویتی پر غصہ آ رہا تھا، اپنی بیوی شازیہ کی بے وفائی پر دلبرداشتہ ہونے کے باوجود وہ اپنی عزت کی خاطر اسے تلاش کر رہا تھا کہ رات کی بات رات کے اندھیرے میں دفن کر کے وہ اسے پھر اپنے گھر کی دہلیز پر لے جا سکے۔

☆☆☆

دو کلومیٹر کے فاصلے پر سرکاری اسپتال تھا۔ جب وہ اسپتال پہنچے تو وہاں معمول کے مطابق مریض تھے جو اپنے اپنے بیڈ پر موجود تھے۔

وہ تینوں ایمرجنسی وارڈ کی طرف چلے گئے۔ اس جگہ رات کی ڈیوٹی پر ایک ڈاکٹر، ایک لیڈی ڈاکٹر اور تین نرسیں موجود تھیں۔ ایمرجنسی وارڈ میں کوئی بھی نہیں تھا اور وہ پانچوں خوش گپیوں میں معروف تھے۔

تھانیدار طفیل کیونکہ اس وقت پولیس وردی میں تھا اس لیے اسے دیکھ کر وہ لوگ اپنی باتیں چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''میرا نام طفیل ہے اور میں تھانہ ریلوے میں تھانیدار ہوں۔'' تھانیدار طفیل نے اپنا تعارف کرایا۔

''جی فرمائیے، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' ڈاکٹر نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں کچھ معلومات چاہئیں۔ ابھی کوئی تین افراد جن میں دو مرد اور ایک عورت تھی، زخمی حالت میں یہاں آئے تھے؟'' تھانیدار طفیل نے پوچھا۔

''بالکل آئے تھے۔'' ڈاکٹر نے فوراً بتایا۔

''کہاں ہیں وہ؟''

''وہ تینوں ایک گدھا گاڑی پر آئے تھے۔ عورت اور ایک مرد کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں، البتہ دوسرا جو مرد تھا، اس کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا تھا جس پر ہم نے پلاستر کر دیا تھا۔''

''ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔'' تھانیدار طفیل نے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

جلدی سے کہا۔

"وہ تینوں مرہم پٹی کرانے کے بعد اسی گدھا گاڑی پر بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ ایک رات کے لیے رک جائیں لیکن وہ جانے کے لیے بضد تھے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

تھانیدار طفیل نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پوچھا۔ "ان کو گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

"یہی کوئی بیس پچیس منٹ ہوئے ہوں گے۔"

"انہوں نے کچھ بتایا تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے؟" تھانیدار طفیل نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ البتہ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ گدھا گاڑی والا وہاں کہیں قریب ہی رہتا تھا یا وہ گزر رہا تھا۔ وہ انہیں زخمی دیکھ کر ہمدردی کے طور پر یہاں لایا تھا۔ کیونکہ وہ اس کا شکریہ بھی ادا کر رہے تھے اور جو عورت کا شوہر تھا، وہ اس کی منت سماجت بھی کر رہا تھا کہ وہ انہیں شہر جانے والی سڑک کے پاس چھوڑ دے۔"

"کیا تنگ میں فریکچر اس کے ہوا تھا جو اس عورت کا شوہر تھا؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"ہمیں اس سڑک کے پاس جانا چاہیے۔ یہاں سے بیس پچیس منٹ کا ہی فاصلہ ہے۔ اگر گدھا گاڑی والے نے انہیں وہاں اتار دیا ہوگا تو وہ بس کے انتظار میں ہوں گے یا پھر وہ بس میں بیٹھ کر چلے گئے ہوں گے۔" تھانیدار طفیل نے برکت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جلدی چلیں سر!"

وہ تینوں تیزی سے باہر نکل گئے۔ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہ اس بڑی سڑک کی طرف رواں دواں ہو گئے جہاں رات گئے تک شہر اور گرد و نواح جانے کے لیے بسیں آتی جاتی رہتی تھیں۔

جس وقت وہ اس جگہ پہنچے، وہاں چند لوگ بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ تھانیدار طفیل نے سراج کا بازو پکڑا اور اسے ان لوگوں کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

"پکا لو ---- اور جلدی سے مجھے بتاؤ۔ اس خبیث کو میں اسی جگہ عبرت کا نشان بنا دوں گا۔" تھانیدار طفیل کا خون کھول رہا تھا۔

وہ وہاں پر موجود لوگوں کو دیکھتے ہوئے گھومتے رہے۔ وہاں موجود لوگوں میں نہ تو شازیہ تھی، نہ تو لیلیٰ اور نہ ہی لالو۔

سب کو دیکھ لیا تھا، اور کر بھی نظر دوڑا لی تھی۔ سراج کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ تھانیدار طفیل کی اتنی بھاگ دوڑ اور دماغ لڑانے کے باوجود وہ نہیں ملے تھے۔

سراج نے تھانیدار طفیل کی طرف دیکھ کر جب نفی میں سر ہلایا تو تھانیدار طفیل کے چہرے پر بھی اداسی دکھائی دینے لگی۔

تھانیدار طفیل جلدی سے ایک آدمی کی طرف بڑھا۔

"یہاں کوئی بس آئی تھی؟"

"دس منٹ پہلے شہر کی طرف گئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

اس کے جواب نے ان تینوں کو رنجیدہ کر دیا۔ سراج کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی جگہ بیٹھ کر زور زور سے رونا شروع کر دے۔ اس کے جسم میں جان نہیں رہی تھی۔ عزت کا جنازہ نکل چکا تھا۔

☆☆☆

وہ تینوں تھکے اور بوجھل قدموں کے ساتھ لوٹ آئے۔ گلشن نہیں سوئی تھی۔ وہ سب کے چہروں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"وہ دونوں ملے؟" گلشن نے پوچھ ہی لیا۔

تھانیدار طفیل کے جواب دینے سے پہلے سراج نے اس کی طرف بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

"تیرے شوہر کا دل کسی کی عزت کی پاسداری سے خالی ہے۔ وہ کمینہ انسان زندہ رہنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ دوسروں کی عزتوں کو پامال کر کے وہ سانس کیسے لیتا ہے؟ میں تو اس پر حیران ہوں لیکن تم اس درندے کی بیوی ہو، تم بھی اندر سے ویسی ہی ہو۔" سراج غصے سے تھانیدار کی طرف گھوما۔ "تھانیدار صاحب! اس بھیڑیے کی بیوی کو گرفتار کریں، اس کے گھر جائیں، اسے کہیں سے بھی، کیسے بھی گرفتار کریں۔ وہ کتوا انسان جینے کا حق نہیں رکھتا۔" سراج کا جسم کانپنے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل دھڑکنا چھوڑ دے گا اور وہ اسی وقت ان سب کے سامنے گر جائے گا۔

اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور غصے سے باہر نکل گیا۔ رات کا کون سا پہر تھا، اسے معلوم نہیں تھا۔ گلیاں سنسان تھیں اور گھروں کے اندر خاموشی کا راج تھا۔ وہ غصے اور ہیجان کی کیفیت میں چلتا جا رہا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس طرف اور کہاں جا رہا ہے۔

اس کے قدم اس وقت رکے جب اس کا اس کے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

چھوٹے سے پلیٹ فارم کا گیٹ آ گیا تھا۔ اس نے گیٹ کی طرف دیکھا اور پھر اردگرد نظر دوڑائی۔ خاموشی تھی، کسی ٹرین کے آنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ بوجھل اور بے جان قدموں سے چلتا ہوا اندر چلا گیا۔

پلیٹ فارم خالی تھا۔ دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں ایک ہی بات تھی کہ ایک بار توفیق اس کے سامنے آ جائے تو وہ اس کو جان سے مار کر دم لے گا۔ وہ اپنے دل میں اسے جتنا برا کہہ سکتا تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

اچانک اسے لگا جیسے اس کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس نے بند آنکھیں کھولیں تو اسے کسی مرد کے پیر دکھائی دیے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ ایک دم چونکا۔ اس کے سامنے توفیق کھڑا تھا۔

سراج بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور اس نے اس کا گریبان پکڑنا چاہا لیکن توفیق نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا۔

"برے انسان کے بارے میں ہمیشہ برا ہی سوچا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی نیکی بھی کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ شاید تم سمجھ رہے ہو کہ میں تمہاری بیوی کو لے کر بھاگ گیا تھا..... یقین کرو ایسا نہیں ہے۔" توفیق متانت سے بولا۔

"جھوٹ مت بولو۔"

"میں برا ہوں، میری نظر بری ہے، میری نیت بھی اچھی نہیں ہے۔ یہ میں مانتا ہوں۔ جب تم ٹوائلٹ گئے تھے تو کسی نے آ کر تمہاری بیوی کو بتایا کہ تمہارا خاوند چلتی ٹرین سے گر گیا ہے۔ اس وقت ٹرین رک چکی تھی۔ تمہاری بیوی باہر جانے کے لیے بھاگی تو میں بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ باہر ایک آدمی نے تمہاری بیوی کو دیکھتے ہی کہا کہ وہ اسے اٹھا کر ابھی باہر لے کر گئے ہیں۔ وہ بہت زخمی ہے۔ تمہاری بیوی باہر کی طرف بھاگی، میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ باہر پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ تمہاری بیوی پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک آدمی تمہارا بیگ اٹھائے تیزی سے ایک طرف جا رہا تھا۔ وہ وہی تھا جس نے یہ اطلاع دی تھی کہ تم گر گئے ہو۔ میں اس کی طرف بھاگنا چاہ رہا تھا کہ تمہاری بیوی جب ایک طرف جانے لگی تو میں نے اسے روکا۔"

توفیق کہہ رہا تھا اور سراج اس کی بات کو غور سے سن رہا تھا۔ وہ پھر بولا۔ "وہ آدمی بھاگ چکا تھا اور میں تمہاری بیوی کو واپس پلیٹ فارم پر لے کر آیا تو ٹرین جا چکی تھی۔ پھر پلیٹ فارم بھی خالی ہو گیا۔ تمہاری بیوی پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کرتی رہ گئی۔ وہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔ میں اپنے دل اور نظر کی میل بھول گیا۔ ایک بے بس اور تنہا عورت میرے سامنے تھی۔ میں اس کی عزت کی پاسداری کے لیے اس سے دور نہیں گیا۔ زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ عورت کی عزت کیا ہوتی ہے۔" وہ چپ ہونے کے بعد پھر بولا۔ "یقین کرو میرے بھائی! اپنے اندر کی خباثت کو ایک طرف رکھا تو عورت کی عظمت کو پہچان پایا اور اس کے قریب رہ کر اس کی اس طرح سے حفاظت کی کہ اسے معلوم ہو سکے اس کے پاس کوئی مرد نہیں بلکہ اس کا بھائی کھڑا ہے۔"

توفیق کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ سراج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ بعض اوقات ہمیں غلط گمان نفرت کے دامن میں پھینک دیتا ہے۔

"شازیہ کہاں ہے؟" سراج نے پوچھا۔

توفیق نے چھوٹے سے ویٹنگ روم کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھاگتا ہوا وہاں چلا گیا۔ وہ ہاتھ میں تسبیح لیے گم صم بیٹھی تھی۔ سراج اس کے پاس گیا تو ایک دم اس نے چونک کر سراج کی طرف دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

تھانیدار طفیل نے ان چاروں کو اپنے گھر سے رخصت کیا تھا۔ وہ سب خوش تھے۔ جو ابہام تھا وہ دور ہو گیا تھا۔ غلط گمان کی زنجیر ٹوٹ چکی تھی۔

ان کے جانے کے بعد تھانیدار طفیل نے برکت سے کہا۔ "میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی ہے کہ رات کو لالو کن لوگوں کو شہر کی بڑی سڑک تک چھوڑنے گیا تھا؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" برکت بولا۔

"چلو، لالو کے گھر چلتے ہیں۔" تھانیدار طفیل اٹھا پھر ایک دم سے چونکا۔ برکت نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ہوا سر جی؟"

"برکت! میرے گھر میں میرے پھوپا اور پھوپو آئے تھے۔ رات کو اچانک انہیں شہر سے اطلاع آئی تھی کہ ان کی بہو کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ وہ اسی وقت جانا چاہتے تھے اور میں نے ہی تو ان کو لالو کے گھر بھیجا تھا۔"

تھانیدار طفیل کی بات سن کر برکت اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

✖✖✖

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

بیگم خلیق الزمانی ساٹھ کے پیٹے میں تھیں لیکن تھیں صحت مند، گوری چٹی۔ تختہ جیسی کمر پر لہراتے ہوئے کچھڑی بال، چہرے پر خون کی سرخی، پہننے اوڑھنے کا ایسا سلیقہ کہ جو انہیں بنا سنورا دیکھ لے، دیکھتا ہی رہ جائے۔ خوشبوئیں جسم سے پھوٹی پڑتی تھیں۔ کچھ ایسا ہی حال احوال نواب چراغ الدین کا بھی تھا۔ چوڑے چکلے، سرخ و سفید، لحیم شحیم اور انتہائی خوش لباس۔ خیر سے دونوں چار بیٹوں اور چار بیٹیوں کے اماں ابا بن چکے تھے اور سات بچوں کی شادیوں سے

ایک لوہار کی

آصفہ ضیا احمد

غربت بھی کیا چیز ہے... بعض دفعہ اس کی وجہ سے انسان ناپسندیدہ کام بھی کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا... وہ بھی غریب تھی اور دو بیٹیوں کی شادی کی فکر اسے گھلا رہی تھی... کہیں سے کوئی مدد نہیں آرہی تھی... پھر اسے ایک موقع ملا اور اس نے خطرناک داؤ کھیل ڈالا۔

غربت کے ہاتھوں مجبور ایک ماں کی کہانی

digest library.com/
https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

سبکدوش بھی ہو چکے تھے اور اب بھی صحت مند زندگی گزار رہے تھے۔

نواب صاحب تو صحت کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے کھانے پینے کا خیال رکھتے لیکن بیگم صاحبہ کا معدہ کافی جاندار تھا۔ موسمیاتی تبدیلی کے تناظر میں دستر خوان سجتا تو خوب شکم سیر ہو کر کھاتیں، اس لیے فربہی کی طرف مائل تھیں۔ آرام طلبی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ پہلے پہل تو چکھنے چکھانے کے بہانے کچن میں چلی جاتی تھیں اور اپنے چھوٹے بڑے کام دیکھ لیتی تھیں لیکن اب اٹھک بیٹھک ہی مشکل تھی اس لیے جب ایک محفل میں بی منصب سے ملاقات ہوئی تو بیگم صاحبہ کو ان پر ایسا ٹوٹ کر پیار آیا کہ فوراً اپنے گھر آنے کی دعوت دے بیٹھیں اور پھر گاہے بگاہے منصب ان کے گھر کے چکر کاٹنے لگی۔ کبھی بیگم صاحبہ کی پسندیدہ ڈش اپنے دست خاص سے بنا کر ان کے دستر خوان پر رکھ رہی ہے تو کبھی ان کے دوپٹوں پر بیل ٹانک کر خراجِ تحسین وصول کر رہی ہے۔ بیگم صاحبہ کی بہوئیں اور بیٹیاں چاہتی تھیں کہ منصب ان کے لیے بھی اسی طرح دوڑ دوڑ کر کرے لیکن منصب صرف بیگم صاحبہ پر دل و جان سے فدا تھی۔ بیگم صاحبہ کی زبان سے حکم صادر ہوتا اور بی منصب تیر کی طرح دوڑ کر وہ کام کر دیتی، اس لیے بیگم صاحبہ کے دل پر چڑھی ہوئی تھی۔

اس وقت بھی بیگم صاحبہ نے آنے والے کل کے لیے ہدایات دیتے ہوئے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ "اچھا بی منصب! آج تو میں تمہیں اس لیے جلدی چھٹی دے رہی ہوں کہ کل میں اور نواب صاحب دلدار جہاں (سب سے چھوٹی بیٹی) کی بات پکی کرنے شاہ پور جا رہے ہیں۔ اب بھئی تمہارے بغیر تو ہم دو قدم نہیں چل سکتے اس لیے نواب صاحب نے بذاتِ خود ہم سے کہا کہ ساتھ آپ اپنی کیئر ٹیکر منصب کو لے سکتی ہو۔" لمحاتی توقف کے بعد اپنی بات پوری کرتے ہوئے مزید کہا۔ "تمہیں علم ہے نا کہ نواب صاحب وقت کے کس قدر پابند ہیں۔ ذرا سی بھی دیر سویر برداشت نہیں کرتے اس لیے جلدی آنے کی کوشش کرنا۔"

منصب، بیگم صاحبہ کی بات سن کر دل و جان سے قربان ہو گئی اور گلوگیر آواز میں بولی۔ "ہائے میں سو جان سے آپ پر نثار، جب آپ میرے بغیر نہیں آ جا سکتیں ہیں تو بھلا میں کیسے آپ کے حکم کو ٹال سکتی ہوں۔ اطمینان رکھیے، میں بلا کسی تاخیر کے صبح وقت پر پہنچ جاؤں گی، مگر بیگم صاحبہ یہ تو بتایئے خیر سے دلدار بٹیا کا رشتہ کہاں طے پایا ہے، لڑکا کیسا ہے، کیا کرتا ہے؟ آپ نے کچھ بتایا نہیں۔"

بیگم صاحبہ نے شہد بھرے لہجے میں کہا۔ "بی منصب! تمہیں تو پتا ہے نا دلدار جہاں سب بہن بھائیوں میں چھوٹی ہے اور اسی لیے سب کی آنکھ کا تارا ہے۔ نواب صاحب تو ایک پل بھی اس کی جدائی گوارا نہیں کرتے اور میرا حال تو ابھی سے ابتر ہے کہ اسے وداع کس طرح کروں گی۔ بہرحال تمہیں بتا دوں کہ لڑکا آرمی میں کسی اچھے عہدے پر فائز ہے۔ لڑکے کے باپ کا اپنا کاروبار ہے اور وہ نواب صاحب کے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔"

بی منصب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دلدار جہاں کے حق میں دعائیں مانگیں اور بیگم صاحبہ کو خوشی مبارک باد دیتے ہوئے بولیں۔ "بیگم صاحبہ! ماشاء اللہ آپ کے اتنے ملنے جلنے والے ہیں۔ دن رات آپ کے یہاں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ میری بچیاں بھی جوان ہیں، ان کے لیے بھی رشتے ناتے دیکھ رہی ہوں۔ اگر آپ بھی اپنے طور پر کوشش کریں تو شاید میری بیٹیوں کے بھی سہرے کے پھول کھل جائیں۔"

بیگم صاحبہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گھماتے ہوئے فوراً جواباً کہا۔ "اے بی منصب! تمہاری بیٹیاں اور میری بیٹیاں کوئی جدا تھوڑی ہی ہیں۔ میں مناسب رشتے تلاش کروں گی اور پیسا دھیلا بھی لگاؤں گی۔ تمہیں پتا ہے نا نواب صاحب نے اپنے پلّے سے جہیز دان دے کر کئی لڑکیوں کا بیاہ کیا ہے۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ اب یہ تمہارا دردِ سر نہیں بلکہ میرا اپنا ہے۔"

بی منصب کے جذباتِ گریہ سے مغلوب ہو کر بیگم صاحبہ کی دست بوسی کی اور بے اختیار ہو کر رونے لگیں۔ بیگم صاحبہ نے اپنے ہاتھ چھڑائے اور بولیں۔ "ارے، ارے..... یہ کیا کر رہی ہو۔ تمہاری دونوں بیٹیوں کی شادیوں کی ذمے داری اب میری اور نواب صاحب کی ہے۔"

بی منصب کو یوں محسوس ہوا جیسے حقیقتاً وہ دونوں بیٹیوں کی شادیوں سے فارغ ہو چکی ہے اور ہلکی پھلکی ہو کر ہواؤں میں پرواز کر رہی ہے۔ دوسری جانب بیگم طلیق الزبانی اپنی دور اندیشی اور کامیابی پر نازاں تھیں جو ایسی خادمہ ہاتھ لگی ہے جو ہر لمحہ ہاتھ باندھے ان کی خدمت میں حاضر ہے۔ منصب سمجھ رہی تھی میں نے تاک کر نشانہ لیا ہے اور بیگم صاحبہ سمجھ رہی تھیں بازی ان کے ہاتھ رہی۔

☆☆☆

https://www.urdufutures.com/

Scanned with CamScanner

کچی بستی آبادی کے چھوٹے سے گھر میں منصب نے جوں ہی قدم رکھا تو اس کی دونوں بیٹیاں عشرت اور نشاط دونوں ہم زبان ہو کر بولیں۔ ”ہائے اماں! آج تو بہت ہی دیر کر دی۔ تمہارا انتظار کر کر کے ہم نے ابا کو تو کھانا کھلا دیا بلکہ ابا تو اب گہری نیند بھی سو گیا۔“

منصب وہیں ایک ٹوٹی کرسی پر ٹک گئی اور بولی۔ ”ارے تو اپنے باپ کے ساتھ تم دونوں بھی کھا لیتیں، میرا انتظار کیوں کیا؟ میں نے تو آج کھانا بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی کھا لیا ہے اور پھر.....“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے عشرت نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”اوہو، میں نے تو غور ہی نہیں کیا، جب ہی تو ہماری اماں کے ہونٹ سرخ سرخ ہو رہے ہیں۔ یقیناً پان کے بعد بادامی پان کی گلوری بیگم صاحبہ نے اپنے ہاتھوں سے کھلائی ہوگی۔ ہے نا اماں! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟“

منصب نے اثبات میں گردن ہلائی اور عشرت کی بات سن کر ہنس پڑی اور پان سے رنگے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔ ”ارے بھئی! کیا بتائیں، یہ جو بادامی پان ہے نا، یہ صرف ہم دو مخصوص لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ بھی جب ہوتا ہے جب بیگم صاحبہ کے ساتھ کھانا کھایا جاتا ہے۔ ایک تو وہ نواب صاحب یعنی اپنے شوہر کو کھلاتی ہیں اور دوسرا مجھ غریب کے بھاگ کھلتے ہیں۔“

ماں، بیٹیوں کی باتوں کی آواز اور برتن کھنکنے کی کھڑبڑاہٹ سن کر منصب کے شوہر عبدالرب کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”منصب! جتنی تعریف تو اپنی بیگم صاحبہ کی کرتی ہے، اگر اتنی تعریف اپنے پیدا کرنے والے کی کر لے تو یقیناً دین اور دنیا دونوں سدھر جائیں۔“

منصب نے زہریلی نگاہوں سے شوہر کی جانب دیکھا اور تنتنا کر بولی۔ ”بس کر عبدالرب! میرا منہ نہ کھلوا۔ اری میری دنیا تو اسی روز ختم ہو گئی تھی جب تیرے نکاح میں بندھی تھی۔ نہ کبھی ترنوالہ دیکھا، نہ ریشم اطلس پہنا۔ خود بھی روکھا سوکھا کھایا اور بیٹیوں کو بھی وہی کھلایا۔“

عبدالرب نے خشمگیں نگاہوں سے بیوی کی جانب دیکھا اور تڑخ کر بولا۔ ”یہ تجھے جب سے چراغ محل کی ہوا لگی ہے نا، تب سے تیرا دماغ عرش کی سیر کرنے لگا ہے۔ وہ تیری بیگم صاحبہ جب تجھے عرش سے فرش پر پٹخے گی، تب تجھے دن میں تارے نظر آئیں گے۔ پوری زندگی محنت کی کمائی سے بچیوں کو پالا اور اب اسی میں تجھے کیڑے نظر آ رہے ہیں۔“

دونوں میاں بیوی میں ٹھن گئی تھی۔ عشرت نے جلدی سے ماں کا ہاتھ پکڑ کر برابر کے کمرے میں لے جا کر ماں کو چارپائی پر لٹا دیا اور ہولے سے بولی۔ ”اماں! کیوں ابا کے منہ لگتی ہے۔ وہ بیچارہ اس بڑھاپے میں بھی ہم لوگوں کے لیے کتنی سخت محنت کرتا ہے۔ نئے فیشن کے کپڑوں کی کاٹ کتراسے آتی نہیں ہے اس لیے گاہک بھی اس کی دکان پر کم ہیں۔ جو بھی قلیل آمدنی آتی ہے، وہ سب تیرے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا ہے اور یہ تو تجھے پتا ہے کہ وہ بیگم صاحبہ اور چراغ محل میں رہنے والوں کو پسند نہیں کرتا تو پھر کیوں ان کی تعریفوں کے پل باندھتی ہے اس کے سامنے۔“

شوہر کی باتوں سے منصب ویسے ہی تپی ہوئی تھی، بیٹی کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ دانت کچکچاتے ہوئے اشتعال انگیز لہجے میں بولی۔ ”ارے ہمیشہ باپ کی حمایت کرتی ہے۔ کبھی میری طرف دیکھا ہے، کبھی سوچا ہے کہ میں کیوں بیگم صاحبہ کی ہاتھ باندھی کنیز بن گئی ہوں؟“

اسی اثنا میں نشاط بھی کھانے سے فارغ ہو کر ماں اور بہن کی گفتگو میں شامل ہو گئی۔ جوں ہی منصب نے اپنی بات پوری کی، نشاط نے فوراً سور چا سنبھال لیا اور ترنت بولی۔ ”ہائے اماں! ہمیں بھی تو بتاؤ، بیگم صاحبہ سے تمہارا ایسا کون سا کام اڑا ہے جو بھاگ بھاگ کر وہاں حاضری دیتی ہو؟ وہ کوئی تمہیں خدمت گاری کا معاوضہ دیتی ہے یا مہینے کی تنخواہ باندھ رکھی ہے۔ ہاں البتہ پرانے کپڑے جوان کی بیٹیوں اور بہوؤں کے دل سے اتر جاتے ہیں، وہ تم ہمیں لا کر دے دیتی ہو اور کون سا فائدہ پہنچا رہی ہیں یہ بیگم صاحبہ جو تم ابا سے لڑتی ہو؟“

منصب اب تو آپے سے باہر ہو گئی اور خار چباتے ہوئے بولی۔ ”ارے بہت جلد تم دونوں کو اور تمہارے باپ کو پتا چل جائے گا کہ تمہارا سوچنا کتنی غلط تھی۔ اری ہیو تو او وہ میرا اتنا بڑا کام کر رہی ہے جو صرف ایک ماں یا بہن ہی کر سکتی ہے۔ اس عورت کے ماں باپ نے اس کا نام یوں ہی طلیق الزمانی نہیں رکھا۔ پہلے اللہ کی مخلوق کو کھلاتی ہے پھر خود کھاتی ہے۔ مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس عورت نے، وہ پورا ہو جائے پھر دیکھو میں تم تینوں کی کیسی خبر لیتی ہوں۔“

دونوں بیٹیوں نے جب دیکھا کہ ان کا ابا تو پہلے ہی پسپا ہو کر اپنے بستر میں گھس گیا ہے اس لیے ان دونوں کو بھی اسی میں عافیت نظر آئی کہ یہ موضوع ختم کر کے ماں کو بھی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

سونے دیں اور خود بھی خواب نگر کی سیر کرنے لیں۔

☆☆☆

دوسری صبح منصب نے منہ اندھیرے چراغ محل کی جانب دوڑ لگادی۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی تیاری بھی مکمل تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی جو اب برق رفتاری سے شاہ پور کی طرف رواں دواں تھی۔ دو گھنٹے کی مسافت پونے دو گھنٹے میں طے ہوگئی۔ لڑکے کے والدین اور گھر کے دیگر افراد نے نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ علیک سلیک کے بعد رسمی گفتگو ہوتی رہی اور پھر پرتکلف ناشتے کے بعد چائے کا دور چلا۔ منصب نے بیگم صاحبہ کے سرہانے کے ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت دیکھی تو آنکھیں پھٹ گئیں۔

دلدار جہاں کا ہونے والا شوہر بھی ایسا سجیلا اور بانکا جوان تھا کہ منصب نے فوراً ہی سرگوشیانہ انداز میں بیگم صاحبہ کے کانوں میں اپنی رائے پیش کردی۔ ''بیگم صاحبہ! سچ کہتی ہوں، بالکل آپ اور نواب صاحب کی طرح چاند سورج کی جوڑی ہے۔''

بیگم صاحبہ یہ تبصرہ سن کر خوشی سے جھوم اٹھیں۔ فوراً ناصحانہ انداز میں تنبیہ کرتے ہوئے بولیں۔ ''اے لی منصب! ماشاء اللہ بولو، ماشاء اللہ۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔''

لڑکے والوں کا شدید اصرار تھا کہ وہ لوگ لنچ بھی ان کے ساتھ تناول فرمائیں لیکن نواب صاحب نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ آج ان کی ایک اہم دفتری میٹنگ ہے اس لیے انہوں نے یہ کارِ خیر بھی صبح ہی صبح انجام دے ڈالا اور پھر تقریباً بارہ بجے یہ قافلہ چراغ محل واپس پہنچ گیا اور پھر دو چار دن میں ہی دلدار جہاں کی منگنی کی تقریب بھی انجام پاگئی۔

☆☆☆

اب شادی کی تیاریاں زور و شور پر تھیں۔ گاہے بگاہے منصب، بیگم صاحبہ کو یاد دہانی ضرور کرواتی رہتی کہ وہ بھی دو عدد جوان بیٹیوں کی ماں ہے اور اسے بھی اچھے رشتے اور پیسا درکار ہے جبکہ بیگم صاحبہ بھی اپنی جہاندیدہ نظروں سے منصب کا تجزیہ کررہی تھیں کہ گزرتے وقت کے ساتھ کام کاج میں اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے ہیں۔ وہ مستعدی اور چستی اس میں اب نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اسی وقت انہوں نے پینترا بدلا اور میدان میں ایسا چھکا مارا کہ منصب منہ تاکتی رہ گئی۔

نوکر چاکر کام میں لگے ہوئے تھے، گاڑی بھر کر گھر کے افراد شادی کی شاپنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ منصب نے اپنا پرانا راگ چھیڑا تو بیگم صاحبہ بھی مطلب کی بات زبان پر لے آئیں اور بولیں۔ ''اے بی! تم نے لڑکیوں کو کنوئیں کا مینڈک بنا رکھا ہے۔ میٹرک، انٹر کرنے کے بعد انہیں گھر کی چار دیواری میں یوں قید کیا ہے کہ توبہ توبہ..... اور آج کل تو لوگوں کو چٹاخ پٹاخ لڑکیاں چاہئیں۔ میں تو کہتی ہوں تم اپنی دونوں بیٹیوں کو میرے پاس چھوڑ دو۔ ارے میرے گھر رہ کر قرینہ طریقہ سب سیکھ جائیں گی۔ ٹک سک سے تو درست ہیں دونوں بہنیں، سلیقہ مندی کا ہنر جان جائیں گی تو چار چاند لگ جائیں گے۔ دلدار کے جانے کے بعد میں تو بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔ نواب صاحب کو اپنے بزنس سے فرصت نہیں، بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوجائیں گی، بہوئیں اور پوتا پوتی تو مجھ بڑھیا کے کمرے میں جھانکنا بھی پسند نہیں کرتے۔ تمہاری دونوں بیٹیوں کو اپنا سایہ بنا کر رکھوں گی۔ جیسے ہی اچھے رشتے آئیں گے، بس چٹ منگنی پٹ بیاہ۔''

منصب کے کان کھڑے ہوگئے۔ بیگم صاحبہ اس کے ہاتھ میں ریٹائرمنٹ کارڈ دے کر اس کی بیٹیوں کو اس کی جگہ تعینات کررہی تھیں۔ لاکھ جاہل سہی لیکن ساری بات اس کی سمجھ میں آچکی تھی۔ بیگم صاحبہ کا روپ بہروپ دیکھ کر اسے عبدالرب کی باتوں میں سچائی نظر آئی۔ فی الفور تو اس نے بیگم صاحبہ کی ہر بات پر آمین کہا اور ان کے مشورے کو شربت کا گھونٹ سمجھ کر خاموشی سے پی لیا لیکن دل میں گرہ سی پڑگئی کہ بیگم صاحبہ وہ نہیں ہیں جو نظر آتی ہیں۔ اس کا تھکا تھکا وجود بیگم صاحبہ کو کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے اور انہیں اب چاق چوبند خادماؤں کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

آج منصب گھر میں داخل ہوئی تو کافی بجھی بجھی اور دلگرفتہ سی لگ رہی تھی۔ عبدالرب نے کئی خیر نظروں سے بیٹیوں کی جانب دیکھا۔

اس روز منصب نے کافی دنوں بعد شوہر اور بیٹیوں کے ساتھ کھانا کھایا، وہ بھی صرف چند لقمے۔ اب عبدالرب برداشت نہ کرسکا اور بے اختیار بول اٹھا۔ ''عشو کی ماں! تجھے ہوا کیا ہے، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

دونوں لڑکیاں بھی کھانا روک کر ماں کو حیران پریشان نظروں سے دیکھنے لگیں۔ منصب نے ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے خرابی طبیعت کا بہانہ بنایا اور کھانے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

سے اٹھ گئی لیکن عبدالرب کی تجربہ کار نظروں نے بتا دیا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ دل میں کھد بد ہونے لگی اور جیسے ہی رات ہوئی اور جب دیکھا کہ عشرت اور نشاط گہری نیند سو گئی ہیں اور منصب اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہی ہے تو عبدالرب نے کھنکھارنے کے بعد گلا صاف کیا اور بولا۔ "منصب! تو سوئی نہیں اب تک؟"

منصب نے ایک سرد آہ بھری اور مری مری آواز میں بولی۔ "جس ماں کے سر پر دو جوان بیٹیوں کا بوجھ لدا ہو، اسے بھلا کیا نیند آئے گی اور کیا بھوک لگے گی۔" عبدالرب نے غائر نظروں سے بیوی کو دیکھا اور متعجب ہو کر اپنے کندھے اچکائے پھر بولا۔ "تو لاکھ چھپانے کی کوشش کرلے لیکن مجھے یقین ہے، آج تیرے ساتھ کچھ ایسا ضرور ہوا ہے جس کی وجہ سے تیری بھوک، پیاس اور نیند اڑ گئی ہے۔"

عبدالرب نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اس لیے چاروناچار منصب کو اصل بات بتانی پڑی۔ اس نے جیسے ہی شوہر کے سامنے یہ کہا کہ بیگم صاحب عشرت اور نشاط کا مطالبہ کر رہی ہیں تو عبدالرب کو غصہ آ گیا۔ انتہائی طیش کے عالم میں اس نے کہا۔ "دیکھ منصب! میری بیٹیوں کی جانب تیری بیگم صاحبہ نے ترچھی نظر سے بھی دیکھا نا تو میں انہیں دھول چٹوا دوں گا، اور اب تو بھی اپنے پیروں میں زنجیر ڈال۔ بھلے ہی میل ملاپ رکھ لیکن ذرا لیے دیے انداز میں۔" اپنی بات ختم کر کے عبدالرب نے جگ سے پانی نکال کر گلاس میں انڈیلا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا اور پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تجھے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا مگر پتا نہیں اس بیگم صاحبہ نے کیا گھول کر پلا دیا تھا۔ تجھ سے نوکروں والے کام لینے کے بعد اب میری بیٹیوں پر نظریں جمائے بیٹھی ہے۔"

منصب نے شکست خوردہ نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا اور نمناک آنکھوں کو اپنے دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بولی۔ "بس میری بھی مت ماری گئی تھی اور میں سمجھ بیٹھی تھی کہ بڑے لوگ ہیں، ان کے ایک اشارے پر ہماری بیٹیوں کی شادیاں ہو جائیں گی۔ مجھے بہلاوے اور جھوٹی تسلیاں دے کر خدمتیں کرواتی رہی، لیکن عشو کے ابا! تم مجھے بھی کم مت سمجھنا۔ میں ایک ہی ہتھوڑا ماروں گی اور اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گی۔ تب اسے پتا چلے گا کہ پیروں تلے دب کر چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔"

عبدالرب نے زچ ہو کر ہتھیار ڈال دیے اور کہا۔ "یہ تو مجھے اچھی طرح علم ہے کہ تو باز آنے والی نہیں مگر میری ایک بات یاد رکھیو، اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔"

منصب نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہونقوں کی طرح شوہر کی جانب دیکھا اور بولی۔ "اے لو، اصل اور کم اصل کا یہاں کون سا ذکر لے بیٹھے۔ یہ اصل نقل کا کیا چکر ہے؟"

عبدالرب نے اپنے لہجے کو دبا کر سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تجھے کبھی یہ بات اس لیے نہیں بتائی کہ تو ہضم نہیں کر سکے گی۔ نواب چراغ دین بھی اور ان کے اجداد بھی نہ کہیں کے نواب تھے، نہ کوئی رئیس زادے اور یہی حال تیری بیگم صاحبہ کا بھی ہے۔ وہ بھی کسی لونڈی باندی کی اولاد ہے۔ دونوں کے بزرگ پارٹیشن ہوتے ہی ادھر آ کر آباد ہو گئے۔ حیدرآباد دکن سے نکلتے نکلتے ان کے بڑوں نے مالکوں کے زیور، گہنے، اشرفیوں اور سونے کے سکوں پر پوری ایمانداری سے ہاتھ صاف کیا اور یہاں آ کر اس حرام کمائی سے اپنے بزنس کی شروعات کی، بددیانتی اور بے ایمانی کو اپنا دھرم بنایا، غریب مزدوروں سے جان لیوا محنت کروائی اور اپنی تجوریاں بھرتے رہے۔ ان کی اصلیت بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میرا ننھیال دراصل حیدرآباد دکن کا ہی ہے اس لیے یہ سب باتیں میں نے اپنے بڑوں سے سنی ہیں۔ اب تو ان باتوں پر یقین کر یا نہ کر لیکن حقیقت یہی ہے۔"

منصب پر تو حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس انکشاف نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "اے عشو کے ابا! یہ تم آج بتا رہے ہو۔ میں تو ابھی تک پورے قبیلے کو نواب عثمان علی خاں کی آل اولاد سمجھتی رہی ہوں۔ لو بھئی نہ چراغ الدین نواب ہیں، نہ خلیق الزمانی نوابزادی ہیں۔"

منصب کی بات سن کر عبدالرب قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور پھر ہنستے ہنستے کہا۔ "تیری ان ہی چٹ پٹی باتوں پر تیری بیگم صاحبہ تجھ پر فدا ہوئی ہے۔"

منصب نے ناک سکوڑتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "اے کون سی بیگم صاحبہ اور کیسی بیگم صاحبہ؟ میں بھی اس وقت تک وہاں لگی ہوئی ہوں جب تک اپنا حق نہ وصول کر لوں۔ بہت خدمتیں کروائی ہیں مجھ سے، اب میری باری ہے۔ میں بھی ایسا ہاتھ دکھاؤں گی کہ نانی یاد آ جائے گی۔"

عبدالرب نے ایک طویل جماہی لی اور بولا۔ "ذرا ہاتھ پیر بچا کر، بہت تیز لوگ ہیں، ان کا کاٹا پانی بھی نہیں

https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

مانگتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "میں تو اب سونے جا رہا ہوں۔"

تھوڑی ہی دیر میں اس کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے جبکہ منصب کی آنکھوں سے نیند مکمل طور پر غائب تھی۔ عبدالرب نے جو سنسنی خیز خبر اسے سنائی تھی اور جو راز آج آشکار کیا تھا، اس نے اسے زیر و زبر کر دیا تھا۔ بیٹیوں کی شادی بیاہ بھول کر وہ صرف اور صرف چراغ الدین، خلیق الزمانی اور ان کے خاندان کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ سوچتے سوچتے ہی رات گزر گئی اور سورج نے طلوع ہو کر اندھیرے کو نگل لیا۔ اجالا پھیلتے ہی منصب کا دل چاہا کہ رات کی ساری کہانی بیٹیوں کو سنائے لیکن پھر فوراً اس نے اپنی زبان پر قفل ڈال لیا۔

☆☆☆

دلدار جہاں کی شادی دیکھنے کے قابل تھی۔ نواب صاحب نے پانی کی طرح پیسا بہایا تھا۔ رنگ و نور کا سیلاب، مہمانوں کا اژدہام اور انواع و اقسام کے کھانوں کی ڈشز اور ڈرنکس تھے جس سے ہر شخص لطف اندوز ہو رہا تھا۔ آج منصب اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی ساتھ لائی تھی۔ حالانکہ عبدالرب نے مخالفت کی کہ لڑکیوں کو نہ لے جائے لیکن منصب کا موقف تھا کہ ایسی شادیاں روز روز نہیں ہوتیں اور پھر چند گھنٹوں کی تو بات ہے، کوئی عمر تو نہیں گزارنی ہے۔ عبدالرب نے بھی خاموشی اختیار کر لی کیونکہ اس کی دونوں بیٹیاں بہت کم گھر سے نکلتی تھیں۔

منصب نے اس روز انہیں کسی کی اترن نہیں پہننے دی بلکہ اپنی جمع پونجی خرچ کر کے دونوں بیٹیوں کے لیے قیمتی اور دیدہ زیب پوشاکیں تیار کروائیں۔ سلے کے پارلر سے تیار ہو کر جب دونوں گھر آئیں تو منصب نے فوراً مرچوں سے نظر اتاری اور آہستہ سے شوہر کے کان میں کہا۔ "آج دیکھنا، شادی ہال میں کوئی نہ کوئی ہماری بیٹیوں کو ضرور پسند کر کے رشتے کے لیے پیش قدمی کرے گا۔" عبدالرب نے دل ہی دل میں آمین کہا۔ اسے بھی رات دن جوان بیٹیوں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

دونوں بہنیں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں کہ اسی اثنا میں موبائل بج اٹھا۔ عشرت نے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ابا پھوپو کا فون ہے۔"

عبدالرب نے اپنے جوتے پہنتے ہوئے جواباً کہا۔ "ارے بیٹا تو ہی بات کر لے، مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر چلا گیا۔

عشرت نے پھوپی سے بات کرتے ہوئے اس بات کا ذکر کر دیا کہ وہ لوگ شادی میں جانے کے لیے بالکل تیار کھڑے ہیں تاکہ جلدی سے موبائل سے جان چھوٹ جائے۔

پھوپی نے دلار اور لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "ہائے میرا بچہ! جم جم جاؤ شادی بیاہ میں لیکن تم دونوں بہنوں کی ایک تصویر ہی ہمیں بھی بھیج دو۔ طویل عرصہ ہو گیا ہے تم دونوں کو دیکھے ہوئے۔" عشرت نے فوراً پھوپی کے حکم کی تعمیل کی اور اپنی اور نشاط کی تصویر سینڈ کر دی۔

دلدار جہاں کی شادی کے بعد بھی منصب کی کوئی امید بر نہیں آئی۔ نہ اس کے دروازے پر کسی نے دستک دی اور نہ ہی بیگم صاحبہ کے توسط سے کوئی رشتہ آیا۔ ہاں، البتہ ایک کام کی بات یہ ہوئی کہ عبدالرب کی بڑی بہن جو دو عدد جوان بیٹوں کی ماں تھی، اس نے تصویر دیکھتے ہی بھائی کے گھر سوال ڈال دیا۔ حالانکہ کافی عرصے سے دونوں بہن بھائی میں ناچاقی اور اختلافات چل رہے تھے۔ عبدالرب کی بڑی بہن نہیں چاہتی تھی کہ عبدالرب منصب سے شادی کرے کیونکہ اسے کہیں سے یہ سن گن مل گئی تھی کہ منصب کے ماں باپ کا کوئی اتا پتا یا ٹھور ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ ایک بے اولاد جوڑے کی پروردہ ہے لیکن عبدالرب نے بہن کی کسی بات پر کان نہ دھرا۔ وہ سوجان سے منصب پر فریفتہ تھا۔ اس نے بہن کی پروا نہ کرتے ہوئے منصب سے ہی شادی رچائی اور اس شادی نے دونوں بہن بھائی کے تعلقات میں دراڑ ڈال دی۔

بہن کے معاشی حالات بھائی سے بہتر تھے۔ اس کے دونوں بیٹے پڑھ لکھ کر سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے۔ گھر کا بھی پرانا ڈھانچا ختم کر کے نئے طرز تعمیر اور اچھی کنسٹرکشن کے ساتھ تعمیر کروایا تھا۔ نئے گھر کی خوشی میں بہن نے بھائی کے گھر دعوت نامہ بھجوایا لیکن منصب نہ خود گئی اور نہ شوہر کو جانے دیا۔

ان تمام حالات کے پیش نظر عبدالرب کو یہ یقین تھا کہ اس کی بہن کبھی بھی اس کی بیٹیوں کے لیے ہاتھ نہیں پھیلائے گی لیکن جب بہن نے فون پر رشتے کی بات کی تو یوں محسوس ہوا جیسے بھری خزاں میں بہاروں نے ڈیرا ڈال لیا ہو لیکن عبدالرب نے بیوی کو سختی سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "عشر کی ماں! بات سن، دس دوست ہوتے ہیں تو دس دشمن بھی۔ ابھی یہ بات گھر کی چار دیواری سے باہر نہ جانے پائے۔ کسی نے میری بہن کو بہکانے کی کوشش کی تو پھر اتنے

https://www.urdufree.com

Scanned with CamScanner

digest library.com

اچھے رشتے ہمیں ملنے سے رہے۔"

منصب نے زندگی میں پہلی بار شوہر کی بات سے اتفاق کیا اور بولی۔ "بات تو بالکل صحیح ہے۔ اگر اللہ نہ کرے، آپا کے دماغ میں کسی نے زہر گھول دیا تو وہ قیامت تک ہماری دہلیز پر نہیں پھٹکیں گی۔"

عبدالرب نے بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا۔ "بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔ سگی بہن ہے اس لیے میں بھی اس کی فطرت سے واقف ہوں۔ تگڑے جہیز کا مطالبہ کرے گی۔"

دونوں میاں بیوی کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمایاں تھیں اور دونوں کے درمیان خموشی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ بالآخر دھیمی آواز میں منصب منمنائی۔ "عبدالرب! مجھے تو بیگم صاحبہ کے علاوہ دور دور تک ایسا کوئی بندہ نہیں نظر آرہا جو اس سخت گھڑی میں ہمارا ہاتھ پکڑے۔"

عبدالرب نے بیگم صاحبہ کے نام پر ایسا منہ بنایا جیسے وہ نیم کا پتا چبا رہا ہو۔

اس میٹنگ کے بعد دونوں میاں بیوی اپنے اپنے کام سے لگ گئے۔ منصب کے دل و دماغ میں ایک کھچڑی سی پک رہی تھی۔ بہت غور و فکر کے بعد وہ اٹھی، الگنی سے اپنی چادر کھینچی۔ اب وہ کشاں کشاں چراغ محل کی جانب کھنچی چلی جا رہی تھی۔ مغرب کی اذان ہوا چاہتی تھی اس لیے بھی وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی کہ نماز بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی پڑھے۔

☆☆☆

چراغ محل میں داخل ہوتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ آج گھر کے سارے افراد کہیں گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں ہو کا عالم طاری تھا بلکہ آج واچ مین بھی گیٹ پر نظر نہیں آیا۔ منصب کے دل و دماغ میں مایوسی کی لہر سرسرانے لگی کہ اگر بیگم صاحبہ بھی نہیں ملیں تو اس کا آنا جانا تو بیکار ہی ہوا۔ پھر بھی دل میں ایک آس لیے ہوئے وہ بیگم صاحبہ کے بیڈ روم تک پہنچی تو اندر سے بیگم صاحبہ کے کھانسنے کی آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی۔

بیگم صاحبہ نے منصب کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پرزور شکوہ کیا۔ "اری بڑی بے وفا ہے منصب تو۔ تیری راہ تکتی رہتی ہوں مگر تو، تو پتا نہیں کہاں چھپ گئی۔ کیا شہر سے باہر گئی ہوئی تھی؟"

منصب نے جھینپتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔ "بس بیگم صاحبہ کیا بتاؤں، دراصل عبدالرب

شناسائی

ایک خاتون اپنے ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ خاتون نے فوراً ہی جھاڑن پھینکی اور فون کی طرف لپکیں۔ تیسرے چوتھے قدم پر ہی ان کا پاؤں بے ترتیب قالین میں الجھ گیا۔ گرنے سے بچنے کے لیے انہوں نے میز کو تھامنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون نیچے گر پڑا۔ اسی لمحے خاتون کے کتے نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا جس کی آواز سے ان کا بچہ جاگ اٹھا اور بری طرح رونے لگا۔

خاتون نے بمشکل خود کو سنبھالا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب سے خاتون کے شوہر کسی سے کہہ رہے تھے۔ "اب تک کسی نے ہیلو نہیں کہا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے گھر کا نمبر مل گیا ہے۔"

(مرسلہ: اختر حسین، کوئٹہ)

تازہ تازہ

ایک صاحب نے ریستوران میں بیٹھ کر تازہ ابلے ہوئے انڈے کا آرڈر دیا۔ انہوں نے بہت اصرار اور تاکید سے کہا کہ انڈا تازہ ابلا ہوا ہونا چاہیے۔ ویٹر انہیں اطمینان دلا کر رخصت ہو گیا کہ ان کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل ہوگا۔ انڈا آیا تو اس پر باریک لفظوں میں ایک پیغام بھی درج تھا۔

"میری عمر بائیس سال ہے۔ میں دنیا میں اکیلی ہوں۔ خوبصورت، زندہ دل اور خوش حال ہوں۔ شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ دلچسپی محسوس کریں تو مندرجہ ذیل پوسٹ بکس کی معرفت خط لکھیں۔"

ان صاحب نے بہ صد اشتیاق نمبر نوٹ کیا، انڈا کھایا اور گھر آ کر اس نامعلوم لڑکی کے نام ایک نہایت طویل اور متاثر کن خط لکھا۔ کافی دن بعد جواب آیا۔

"آپ نے جن جذبات کا اظہار کیا ان کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں لیکن میری شادی ہوئے تو ڈیڑھ سال ہو چکا ہے۔"

(مرسلہ: نازیہ خان، مظفر آباد)

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

اور میری اب بڑھاپے کی عمریں ہیں اور آپ کو پتا ہے سو بیماریوں کی ایک بیماری بڑھاپا ہے۔ پھر اس کے علاوہ جوان بیٹیوں کی فکر نے بھی ہم دونوں میاں بیوی کو ادھ مرا کر دیا ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں رو رو کر دعائیں مانگی ہیں تب جا کر دل کی کلی کھلی ہے۔ خیر سے دونوں بیٹیوں کے رشتے طے پا گئے۔"

بیگم صاحبہ اچھل پڑیں اور حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "اے کہاں طے کر دیے رشتے؟ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔"

اسی وقت اذان کی آواز بلند ہوئی اور دونوں نے مل کر نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد بیگم صاحبہ نے منصب سے پھر شادی بیاہ کے موضوع پر بات نہیں کی۔ بیگم صاحبہ نے اگلی چڑیا کے پر کتر لیے تھے۔ وہ سمجھ چکی تھیں کہ اس وقت منصب کی آمد خالی از علت نہیں۔ یہ ضرور میرے پاس سوالی بن کر آئی ہے اس لیے حسب عادت نواب خاندان کے کروفر، دولت و اقبال کی داستانیں شروع کر دیں جو وہ ان گنت مرتبہ منصب کو سنا چکی تھیں۔

منصب نے موضوع بدلتے ہوئے سوال کر ڈالا۔ "بیگم صاحبا آج گھر کے سارے افراد کہیں گئے ہوئے ہیں؟"

بیگم صاحبہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولیں۔ "لوگوں کے دو بہت احباب ہیں، ان کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ سب گئے ہیں یا نہیں، یہ مجھے علم نہیں۔ مجھ بڈھیا کو پوچھتا کون ہے۔" لہجے سے اضمحلال عیاں تھا۔

منصب نے لہجے میں مصنوعی درد سمو کر افسردہ لہجے میں کہا۔ "بیگم صاحبا مجھے احساس ہے کہ آپ تنہا رہ گئی ہیں۔ مجھے بھی تو بیماریوں نے گھیر رکھا ہے ورنہ تو میں روز ایک چکر ضرور لگاتی مگر آپ کے پاس تھیماں تو آتی ہوگی نا؟ آپ کی منہ چڑھی ہوتی تھی اور مجھ سے تو خدا واسطے کا بیر رکھتی تھی۔ اب کیا بالکل ہی آنا جانا بند کر دیا؟"

بیگم صاحبہ نے نفی میں گردن ہلائی اور بولیں۔ "اے منصب! اب تجھے کیا بتاؤں، پچھلے دنوں آئی تو تھی میرے پاس۔ مجھے خوش تھی کہ کمبخت میری عیادت اور خدمت کے لیے آئی ہے۔ ارے وہ تو اپنی غرض لے کر آئی تھی۔ آتے ہی کہنے لگی — بیگم صاحبا میرا شوہر سخت بیمار ہے، کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے اور علاج کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔"

منصب کو مطلب کا موضوع ہاتھ لگا تھا اس لیے اپنی کرسی بیگم صاحبہ کے بیڈ کے قریب کھسکاتے ہوئے کان دے کر بات سننے لگی اور پھر پُر اشتیاق لہجے میں استفسار کیا۔ "پھر بیگم صاحبا آپ نے کیا جواب دیا؟"

بیگم صاحبہ نے تند لہجے میں ذرا جھجکتے سے کہا۔ "لو بی بی! میں کیا کہتی۔ میرے حالات خود چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ بھرم بھاری، پٹارہ خالی۔ ارے اب ہمارے پاس رہ کیا گیا ہے۔ ساری دنیا کہتی ہے نواب ہیں، صنعت کار ہیں، شہر کے بڑے بزنس مین ہیں لیکن منصب! اب تجھ سے کیا چھپانا۔ بس سارا دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔ حقیقت میں ہم خالی ڈھول پر تھاپ لگا کر بجانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم دونوں کی موجودگی میں اولاد میں وہ تناتنی اور رسا کشی چل رہی ہے الامان الحفیظ۔"

منصب کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ بیگم صاحبہ کا کرارا جواب جو انہوں نے تھیماں کو دیا تھا، اس سے منصب کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بیگم صاحبہ کی نس نس سے واقف تھی پھر بھی موہوم سی امید لے کر ان کے پاس چلی آئی تھی۔

اسے گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر بیگم صاحبہ بولیں۔ "اے منصب! تو کیا سوچنے لگی؟"

منصب نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا اور بولی۔ "نہیں بیگم صاحبا بس یوں ہی بیٹھے بیٹھے خیال آ گیا تھا کہ غریب انسان بھی کتنا مجبور ہوتا ہے۔ ہائے بیچاری تھیماں! ایمان سے بیگم صاحبا میرے پاس کچھ ہوتا نا تو میں اس وقت اس کی مدد ضرور کرتی۔"

بیگم صاحبہ قہقہہ مار کر ہنس پڑیں اور استہزائیہ انداز میں بولیں۔ "اے لو! جب ہم جیسے کھاتے کماتے لوگوں کے پاس ہی کچھ نہیں تو بیچاری تھیماں کہاں سے لاؤ گی؟"

منصب نے ایک سرد آہ بھری اور خاموش ہو گئی۔

بیگم صاحبہ نے اپنے سر پر ایک تھپڑ مارا اور کہا۔ "لو بی منصب! باتوں باتوں میں تو میں بھول ہی گئی کہ تیرے ہاتھوں کا ہریسہ کھائے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ تو آج مجھے اپنے ہاتھوں کا گرما گرم ہریسہ کھلا اور میں تیرے لیے بادامی پان کی گلوری تیار کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر پاندان کھینچا اور گلوری بنانے لگیں۔ منصب نے بھی اپنا دوپٹا ٹھیک کیا اور اپنی نشست سے کھڑی ہو گئی۔

بیگم صاحبہ نے اچانک نظر بھر کر منصب کو دیکھا اور کچھ یاد کرتے ہوئے بولیں۔ "منصب! آج تو بڑے موقع سے آئی ہے۔ تجھے کچھ دکھانا بھی ہے اور اپنی امانت کا

https://www.urdufiles.com/

Scanned with CamScanner

نگراں بھی تجھے ہی بنانا ہے۔"

منصب نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں اور بولی۔

"بیگم صاحبہ! ایسی کیا چیز ہے جو آپ اتنی رازداری سے کام لے رہی ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے اپنی عقابی نظریں چاروں طرف دوڑائیں اور سرگوشیانہ انداز میں بولیں۔ "ذرا نیچے دیکھ کر آنا، کوئی ہے تو نہیں بلکہ ساری بہوؤں کے کمروں کے پاس جا کر سن گن لینا۔ کوئی ہلچل، کوئی آہٹ محسوس ہو تو مجھے فوراً آ کر بتانا۔"

منصب نے تعجب خیز نظروں سے بیگم صاحبہ کو دیکھا لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور ان کے حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے زینہ اتر کر نیچے کے پورشن کا مکمل وزٹ کیا۔ پورا گھر مکمل طور پر سنسان تھا۔ منصب نے جو دیکھا تھا، وہ آ کر بتا دیا۔

بیگم صاحبہ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ "یہ اچھا ہوا، نواب صاحب کو بھی ساتھ لے گئے ہیں ورنہ وہ اس وقت میرے سر پر سوار ہوتے۔"

منصب کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی باتیں سنتی رہی۔ بیگم صاحبہ نے اپنے بھاری بھرکم وجود کو بیڈ سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکیں۔ بالآخر منصب نے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور وہ ہانپتی کانپتی اپنی الماری کے پاس پہنچیں اور اس کا لاک کھول کر کپڑے ہٹائے، ایک کھٹکا دبایا تو یوں محسوس ہوا جیسے الماری کے اندر ایک اور الماری ہے۔ دوسرا کھٹکا دبایا تو ایک صندوق نما بکسا باہر کی جانب نکل آیا۔ انگشت بدنداں منصب سارا نظارہ دیکھ رہی تھی۔

بیگم صاحبہ نے بکسے میں ہاتھ ڈال کر ایک سرخ رنگ کی مخملی تھیلی باہر نکالی اور پھر اسی طرح کی سیاہ مخملی تھیلی نکال کر دونوں تھیلیاں ٹیبل پر رکھ دیں۔ منصب کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھایا اور بیڈ پر اپنا ریشمی رومال پھیلا کر اس پر سرخ تھیلی الٹ دی۔ منصب کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ جگمگ جگمگ کرتے ہوئے خالص سونے کے گہنے اور زیورات بجلی کی روشنی میں اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ دوسری تھیلی جو کہ کرنسی سے بھری ہوئی تھی، اس میں سے نکالا تو کچھ نہیں، صرف اس کا منہ کھول کر ایک جانب رکھ دیا۔ گہری نظروں سے زیورات کو الٹتی پلٹتی رہیں اور پھر ایک طویل سانس لے کر بولیں۔

"منصب! اس الماری کی یہ تاریخ ہے کہ یہ کسی ریاست کی مہارانی نے میری پرنانی کو خوش ہو کر دی تھی۔ میری نانی نے پاکستان ہجرت کی تب اپنے ساتھ لے آئیں، پھر یہ میری ماں کے حصے میں آئی۔ ماں نے مرتے ہوئے اس کا سارا میکنیزم مجھے سمجھایا اور یہ میرے حوالے کر دی۔ میں نے ہمیشہ اس راز کو اپنے سینے میں دبا کر رکھا، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی کہ اس الماری میں کیا راز ہے اور میرا سارا جمع جتھا کہاں چھپا ہوا ہے۔"

اچانک دونوں کو ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے لپک کر ایک چادر کھینچی اور دونوں تھیلیوں پر پھیلا دی۔ دونوں نے متوحش نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور کمرے میں جب گھر کی پالتو بلی داخل ہوئی تو دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

بیگم صاحبہ نے بلی کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "اس نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" پھر لمحاتی توقف کے بعد بولیں۔ "منصب! چاندی کے تمام زیورات نیچے کے کمرے میں رکھے ہیں۔ میں وہ بھی لے آتی ہوں اور ایک جگہ کر دیتی ہوں اور ہاں، تجھے بتائے دیتی ہوں، یہ سب میری بیٹیوں کا ہے۔ اب خیر سے ان کے بچے بھی جوان ہو رہے ہیں۔ کل کلاں کو ان کی بھی شادی کرنی ہے۔ نواب صاحب نے تو اپنی ساری جائداد بیٹوں میں تقسیم کر دی ہے۔ بیٹیوں کے لیے کہتے ہیں کہ قیمتی اور بیش قیمت جہیز دے کر رخصت کیا

انتظار

ایک صاحب ایک ریستوران میں رات گئے داخل ہوئے اور ویٹر سے حلیم لانے کے لیے کہا۔

ویٹر نے انتہائی مؤدبانہ لہجے میں انہیں بتایا۔ "جناب! فی الحال تو حلیم ختم ہو چکا ہے لیکن اگر آپ پانچ منٹ انتظار کر لیں تو آپ کے آرڈر کی تعمیل ممکن ہے۔"

وہ صاحب بہت حیران ہوئے اور بولے۔ "بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟"

ویٹر بولا۔ "وہ کونے والے ادھیڑ عمر شخص نے حلیم منگایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حلیم کے دو تین چمچ کھانے کے بعد ہی وہ اسے واپس کر دیں گے اور وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

(مرسلہ: راحیلہ خان، کوئٹہ)

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

ہے، پھر اب کاہے کے حصے بخرے۔ اسی لیے میری جان کو اگر کچھ ہو گیا تو، تو میری چاروں بیٹیوں کو اس الماری کا میکنزم سمجھا کر سارا زیور گہنا، روپیہ پیسا ان کے حوالے کر دینا۔ ان کے علاوہ کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دینا۔ میری ساری جمع پونجی میری بیٹیوں کی ہے۔ جو بقایا زیور اور روپیہ پیسا ہے وہ بھی لے آتی ہوں۔ ذرا مجھے سہارا دے کر نیچے لے چل۔"

حیرت کی زیادتی کی وجہ سے منصب پلکیں بھی نہیں جھپکا پا رہی تھی۔ بالآخر ہمت کر کے اس نے بیگم صاحبہ سے ایک چبھتا ہوا سوال کر ہی ڈالا۔

"بیگم صاحبہ! آپ کے پاس اتنا کچھ ہے اور آپ تھوڑی دیر پہلے کہہ رہی تھیں کہ ہم تو خالی ڈھول پیٹ رہے ہیں؟"

بیگم صاحبہ بری طرح شپٹا گئیں۔ فوراً کوئی جواب نہیں بن پڑا، چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں لیکن ہر وار کا جواب دینا بخوبی جانتی تھیں۔ اپنی کیفیت پر فوری قابو پا لیا اور بولیں۔ "ارے منصب! یہ سب کچھ تو میری نانی اور ماں کا ہے جو میں اپنی بیٹیوں تک پہنچا رہی ہوں۔ نواب صاحب نے اور ان کے بیٹوں نے تو مجھے کنگال بنا دیا ہے۔ بہانے بہانے سے باپ بیٹے میرے پاس سے سب لے اڑے۔" پھر سانس لینے کے لیے توقف کیا اور بولیں۔ "چل اب نیچے چلتے ہیں تاکہ وہ سامان بھی لا کر یہاں محفوظ کر دوں ـــــ اور میری ایک بات یاد رکھنا۔ آج کی اس خفیہ میٹنگ کی خبر کسی کو نہ ہونے پائے۔ میں نے تجھے اس لیے ہمراز بنایا ہے کہ اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو بہت ہوشیاری کے ساتھ یہ سب کچھ میری بیٹیوں کے حوالے کر دینا۔"

منصب نے نہ گردن ہلائی نہ زبان سے کچھ کہا۔ البتہ اپنے کمزور ہاتھوں سے بیگم صاحبہ کا بازو تھاما اور زینہ اترنے لگی۔

☆☆☆

منصب جب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی تو دروازہ مقفل تھا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ باپ بیٹیاں ابھی تک نہیں پلٹے۔ وہ تو اچھا ہوا میرے دوپٹے کے پلو سے دوسری چابی بندھی ہوئی ہے ورنہ پڑوسن کے گھر جا کر بیٹھنا پڑتا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے قفل میں چابی گھمائی اور گھر میں داخل ہو کر لائٹ جلائی پھر اپنا تھیلا نما بڑا سا پرس اپنے صندوق میں رکھا اور پیر پھیلا کر چارپائی پر لیٹی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

منصب نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور ایک طویل جماہی لیتے ہوئے بولی۔ "گہری نیند سے جگا دیا۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد ایسی سوئی کہ اب اٹھی ہوں۔"

نشاط نے فوری استفسار کیا۔ "ہائے اماں! تو کیا کھانا بھی نہیں کھایا؟"

منصب نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواباً کہا۔ "ارے کہہ تو رہی ہوں کہ تم لوگ نکلے اور میں خراٹے بھرنے لگی۔"

عشرت نے کھانا گرم کیا اور دسترخوان لگا دیا۔ اچانک عبدالرب کا موبائل گنگنانے لگا۔ چراغ محل کا نمبر دیکھ کر اس نے موبائل بیوی کے ہاتھ میں دیا۔ منصب نے ایک لمبی سی "ہے..... لو" کرنے کے بعد استفسار کیا۔ "اے بڑی دلہن! آج مجھ غریب کو کیسے یاد کر لیا؟" اور جو جواب منصب نے سنا، اسے سن کر اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بولی۔ "ہائے عشو کے ابا! میری بیگم صاحبہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔"

عبدالرب، عشرت اور نشاط کے نوالے ہاتھوں میں رہ گئے۔ وہ پتھر کے بت بنے منصب کو دیکھ رہے تھے جو اس وقت ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ دونوں بیٹیوں نے سنبھالا دیا اور اسے چارپائی پر لٹا دیا۔ عبدالرب نے فوراً بیوی کو پانی پلایا اور بولا۔ "حوصلہ پکڑ منصب!" پھر اس نے عشرت سے مخاطب ہو کر کہا۔ "عشو! ذرا پتا کر، جنازہ کب اٹھے گا؟ میں وقت پر جاؤں گا، تم لوگ اپنی ماں کو لے کر جلدی چلے جاؤ۔"

دونوں بیٹیوں نے ماں کو سہارا دے کر رکشے میں سوار کیا اور بھاگم بھاگ چراغ محل پہنچے۔ وہاں قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ آہ و بکا سے سارا گھر گونج رہا تھا۔ منصب نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے آنسو بھری آواز میں کہا۔ "اری میری بیگم صاحبہ کے کمرے میں تو مجھے ذرا لے چلو۔"

عشرت اور نشاط نے ماں کو پکڑ کر بیگم صاحبہ کے بیڈ روم میں پہنچایا اور پھر تینوں وہیں قالین پر بیٹھ گئیں۔ وہیں چند خواتین بھی سیپارے لیے بیٹھی تھیں۔

اس نے بیگم صاحبہ کا پاندان اپنی طرف کھینچا اور پاندان کو اپنے سینے سے لگا کر چومنے لگی۔ دونوں بیٹیوں نے منصب کے ہاتھوں سے پاندان کھینچا تو وہ کھل گیا۔ منصب نے سب کی نظر بچا کر پاندان سے کچھ نکالا اور اپنی مٹھی میں دبا لیا۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

چند گھنٹے بعد بیگم صاحبہ کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور پھر لوگوں کی بھیڑ کم ہونا شروع ہوگئی۔ ماحول حد درجہ سوگوار تھا لیکن اس کے باوجود سارے کام رواں دواں تھے۔ تھوڑی دیر بعد عشرت اور نشاط نے بھی بیگم صاحبہ کی بڑی بیٹی سے اجازت لے کر اپنے گھر کی راہ لی۔ عبدالرب نے بھی میت میں شرکت کی تھی۔ بیوی کو دیکھتے ہی وہ بول پڑا۔

"منصب! یہ تو نے کیا حالت بنالی ہے؟ مانا کہ تو اپنی بیگم صاحبہ سے بہت محبت کرتی تھی لیکن اس طرح تو، تو اپنی طبیعت خراب کرلے گی۔ ہمت، حوصلے سے کام لے اور اب آرام کر۔"

☆☆☆

جیسے ہی عبدالرب اور نشاط کمرے سے باہر ہوئے، منصب نے عشرت کو حکم آمیز لہجے میں کہا۔ "عشرت! تو بھی جا کر آرام کر اور مجھے بھی سونے دے۔"

عشرت نے تیز نگاہوں سے ماں کو گھورا اور بولی۔ "اماں! فی الحال نہ میں آرام کرنے والی ہوں اور نہ تمہیں آرام کرنے دوں گی۔ مجھے تم سے کچھ پوچھ گچھ کرنا ہے۔"

منصب نے درشت لہجے میں کہا۔ "ارے، یہ تو تھانیدارنی کب سے بن گئی ہے؟ چل جا اپنے بستر پر۔"

عشرت، ماں کے کہنے پر وہاں سے اٹھ تو گئی لیکن صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ نشاط اور ابا جاگ رہے ہیں یا سو رہے ہیں۔ جب اسے کلی طور پر اطمینان ہوگیا کہ مطلع بالکل صاف ہے تو وہ بڑے اطمینان سے چلتی ہوئی آئی اور بغیر کسی آہٹ کے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگادی، پھر ماں کے پاس بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن گھمائی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "ہاں اماں! کافی اداکاری ہوچکی۔ اب جلدی سے بتا، کیوں اوپر پہنچایا ہے بیگم صاحبہ کو؟"

منصب کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بم بلاسٹ کردیا ہو۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کی اپنی بیٹی اتنی جلدی معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گی، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے آئیں بائیں شائیں کی لیکن عشرت نے پھر آنکھیں دکھائیں اور غراتے ہوئے کہا۔ "اماں! مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹ دوں گی کہ میری ماں قاتل ہے۔"

منصب ہمت ہار چکی تھی۔ اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ بیٹی کے سامنے جوڑ دیے اور لڑکھڑاتی زبان میں بولی۔

"جو کچھ کیا ہے میں نے، غلط نہیں کیا ہے۔ میری طرح غریب اور کم حیثیت عورتوں سے خدمت لینا، انہیں غلام بنا کر رکھنا اس عورت کا شعار تھا۔ روپیہ پیسا، سونا چاندی سب کچھ تھا، اس کے باوجود ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ میں تہی دست ہوں، سفید پوشی کا بھرم رکھ رہی ہوں ورنہ شوہر اور بیٹوں نے مجھے کنگال کردیا ہے۔ پھر میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، بڑھیا کو زینے پر سے لڑھکا دیا۔"

بیٹی کے روبرو اعترافی بیان تو دے دیا تھا لیکن دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا کہ عشرت نے اس راز پر سے پردہ اٹھادیا تو..... یہ سوچ کر ہی وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ پھنسی پھنسی آواز میں اس نے عشرت سے استفسار کیا۔ "میں نے سارا کام انتہائی سوجھ بوجھ سے کیا پھر تیرے پاس کون سی تیسری آنکھ ہے جو تو نے مجھ پر فوراً ہاتھ ڈال دیا؟"

عشرت نے ماں کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کھردرے اور سخت لہجے میں سوال کیا۔ "اماں! اس مال و متاع کا تو دیدار کروادے جس کے لیے تو نے اپنے ہاتھ خون سے رنگ ڈالے ہیں۔"

منصب سمجھ چکی تھی کہ عشرت دیکھے بغیر نہیں مانے گی۔ بادلِ ناخواستہ اپنی جگہ سے اٹھی اور صندوق میں سے کچھ زیور، پیسا نکال کر بیٹی کے سامنے رکھتے ہوئے غرائی۔ "لے دیکھ لے اچھی طرح چار چار آنکھوں سے۔ کوئی اپنے لیے نہیں لائی ہوں بلکہ اسی پیسے سے تم دونوں بہنوں کو اس گھر سے رخصت کروں گی۔ اب پڑ گئی تیرے کلیجے میں ٹھنڈک؟"

عشرت کے ہونٹ شاطرانہ انداز میں مسکرائے اور زور سے گردن کو جھٹکا دے کر بولی۔ "اماں! ہوں تو تیری ہی بیٹی۔ تیری چال سے پہلے ہی سمجھ لیتی ہوں کہ اب تو کون سا داؤ کھیلنے والی ہے۔ وہ جو تیرا سیلانا پرس ہے نا بڑا سا، اس کا پیٹ آج کافی پھولا ہوا ہے۔"

اس انکشاف پر منصب اچھل پڑی اور پھٹی پھٹی نظروں سے بیٹی کو گھورتے ہوئے بولی۔ "ہائے بیٹ ماری! کیا پشت پر بھی تیری آنکھیں ہیں۔"

عشرت اپنے دیدے مٹکاتے ہوئے بولی۔ "اماں! ابا بچپن میں مجھے بلی کہہ کر پکارتا تھا بلکہ محلے والے بھی مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔ بس آج بلی کی چال چلتے ہوئے میں تیرے عقب میں کھڑی ہوکر لوٹ کے مال کا نظارہ کر رہی تھی۔ اماں! ہوش میں رہا کر۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔"

https://www.urdutunes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

منصب نے دانت کچکچائے اور زہر خند لہجے میں بولی۔ ''اور جب میں نے بیگم صاحبہ کا قلع قمع کیا، اس وقت تو کون سی دوربین لے کر جیلی تھی؟''

عشرت کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکان بکھر گئی۔ الفاظ چباتے ہوئے بولی۔ ''اماں! جب تو نے چراغ محل میں بین کرتے ہوئے بادام والا پان اپنے دوپٹے میں چھپایا تو مجھے وہیں شک ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ ساری دال ہی کالی ہے۔ اماں! تو لاکھ رونے پیٹنے کی اداکاری کر رہی تھی لیکن تیرا چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ بیگم صاحبہ کی موت حادثاتی نہیں بلکہ ان کی موت میں تیرا ہی ہاتھ ملوث ہے۔ اماں! ضرورت سے زیادہ تیری آہ و بکا، بیگم صاحبہ کے غم میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنا اور پان چھپا کر جب تو نے چین کی سانس لی تو مجھے پکا پکا یقین ہو گیا کہ تو اپنے ہاتھ بیگم صاحبہ کے خون سے رنگین کر چکی ہے۔ یہ بات تقریباً سب کے علم میں تھی کہ بیگم صاحبہ پان صرف دو افراد کے لیے بناتی تھیں۔ نمبر ایک، نواب صاحب اور دوسرا نمبر تیرا تھا۔ نواب صاحب تو اس روز گھر میں تھے ہی نہیں اس لیے اس بادامی گلوری کو دیکھتے ہی گھر کا ہر فرد سمجھ جاتا کہ اس روز بیگم صاحبہ کے قریب کون تھا؟ اور پھر اماں! نواب صاحب اور ان کے بیٹوں کے ایک اشارے پر پولیس تجھے دھر لیتی۔ پولیس جو تیری خاطر تواضع.....''

عشرت کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی منصب نے اس کی بات اچک لی اور تمسخر بھرے لہجے میں بولی۔ ''بس بس؛ بہت منظر کشی کر لی۔ اب مجھے مزید خوفزدہ نہ کر۔ ارے کب تک ان دولت مند اور صاحب حیثیت لوگوں کے ظلم و ستم برداشت کرتے رہیں گے۔ انتقامی جذبات تو میرے دل و دماغ میں عرصے سے پرورش پا رہے تھے۔ خاص طور سے چھیماں والے واقعے پر تو میں تپ گئی۔ اس غریب اور مجبور عورت نے اس خاندان کی شب و روز خدمت کی ہے اور جب وہ اپنے بیمار شوہر کے لیے مدد مانگنے آئی تو اس فرعون صفت خاندان نے لگا سا جواب دے دیا۔ سچ کہتی ہوں عشو! ایسے کئی لوگ ہیں۔ مفلوک الحال، بیروزگار مرد و عورتیں اور بچے جو صرف روزی روٹی کی خاطر اس ڈیوڑھی پر پڑے رہتے اور جب ان کے ہاتھ پیر کام کرنے کے قابل نہیں رہتے تو انہیں چراغ محل سے دھکے لگا لال جاتا یا وہ خود کہیں چلے جاتے یا بیچارے مر کھپ جاتے۔ جو مال میں نے سمیٹا ہے، میں اس میں سے کسی نہ کسی بہانے سے ان لوگوں تک ضرور پہنچاؤں گی۔ کہیں اپنا نام نہیں ظاہر کروں گی۔ بس تو اپنی زبان خاموش رکھنا۔''

عشرت نے نفی میں انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اماں! سونے، چاندی کے زیورات کو نئی شکل میں ڈھالنا بہت مشکل کام ہے اور تجھے جو بھی کرنا ہے، خفیہ انداز میں کرنا ہے۔ کرنسی نوٹ کی تو خیر ہے مگر.....''

منصب نے فوراً قطع کلامی کی۔ ''اس کی تو فکر نہ کر۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے، وہ مجھے ضرور منزل تک پہنچا دے گا۔''

عشرت نے آہستہ سے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''اماں! جو بھی کرنا ہے، ہاتھ پیر بچا کر کرنا۔ معاملہ بہت خطرناک ہے۔''

منصب نے اطمینان بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواباً کہا۔ ''عشو! مجھے یقین ہے اس روز قدرت نے ہی میری مدد کی، تب ہی تو سارے کام بنتے چلے گئے۔ آگے بھی سب کچھ ہو جائے گا۔'' وہ فخریہ گردن اکڑاتے ہوئے بولی۔ ''تو اپنی ماں کو کیا کم سمجھتی ہے۔ بیگم صاحبہ میر تھیں تو میں سوا میر ہوں۔ تیرا ابا بالکل صحیح کہتا ہے..... اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں۔''

عشرت نے حیرت سے دیدے پھٹائے اور حیران کن انداز میں استفسار کیا۔ ''اماں! کیا بیگم صاحبہ کم اصل تھیں؟''

منصب نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس عورت کی اصل نسل کی کہانی تو تیرے ابا سے پوچھنا لیکن اس سے دو قدم آگے میں ہوں۔ آج مجھے بھی یقین ہو گیا کہ میرے پرورش کرنے والے باپ نے بالکل صحیح کہا تھا کہ منصب! میں نے اور تیری بیوی نے تجھے پالا پوسا، بڑا کیا، تیری شادی کی لیکن دراصل تو ہماری اولاد نہیں ہے بلکہ تو ہمیں کوڑے کچرے کے ڈھیر پر ملی تھی۔''

اس دھماکا خیز انکشاف پر عشرت ششدر رہ گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''اماں! آج جو گفت و شنید ہم دونوں کے درمیان ہوئی ہے، اس کی ہوا بھی کسی کو نہ لگنے دینا ورنہ ہم دونوں بہنوں کی شادی کی حسرت لے کر ہی تو اور ابا ختم ہو جائیں گے۔''

منصب نے بیٹی کی پیٹھ تھپتھپائی اور بولی۔ ''ارے کیا مجھے ہاؤلے کتے نے کاٹا ہے۔ میں نے تو اپنی زبان سی لی ہے، تو بھی ہمیشہ کے لیے اپنے ہونٹوں کو قفل لگائے رکھنا۔''

***

https://www.urdudigest.com

Scanned with CamScanner

آج کل دنیا میں ہر چیز ڈیجیٹل ہوتی جارہی ہے... دیکھا جائے تو یہ ترقی ہے... مگر بعض دفعہ صورت حال بہت نازک ہوجاتی ہے اور انسان کو اس میں مداخلت کرنی پڑتی ہے... یہاں بھی ایسا ہی معاملہ تھا... وہ ایک ریٹائرڈ وکیل تھا اور اپنے پیشے سے الگ ہوچکا تھا... مگر پھر ایک کیس نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی اور وہ ایک انوکھی جنگ کا حصہ بن گیا... جس کا انجام جانے کیا ہونا تھا۔

آخری وکیل

ڈاکٹر طیب سنگھانوی

انسانیت کی خاطر ایک وکیل کی خطرناک دشمنوں سے جنگ

سردیوں کی وہ شام لندن کی گلیوں میں خنکی کے ساتھ خوف کی آہٹ بھی لے کر آئی تھی۔ میں ایک ریٹائرڈ کرمنل وکیل "آرتھر اور گریوز" لاء فرم سے وابستہ، اپنے آخری مقدمے کے بعد اس پیشے سے الگ ہوچکا تھا لیکن شاید قسمت کو ابھی مجھ سے ایک اور مقدمہ درکار تھا۔ ایک ایسا مقدمہ جو صرف عدالت میں نہیں، بلکہ زندگی اور موت کی حدوں کے بیچ لڑا جانا تھا۔

یہ سب کچھ ایک پراسرار خط سے شروع ہوا تھا۔ خط کا

https://www.urdutubes.com/digestlibrary.com
Scanned with CamScanner

لفافہ منگے فرانسیسی کاغذ پر بند تھا اور اس پر نہ بھیجنے والے کا پتا تھا، نہ ڈاک کا نشان۔ صرف اتنا لکھا تھا:

"تم آخری وکیل ہو۔ اگر تم انکار کرو گے تو وہ مر جائے گی۔"

نیچے صرف ایک حرف — S درج تھا۔

میں نے خط کو کئی زاویوں سے جانچنے کی کوشش کی لیکن یہ کسی پروفیشنل ہاتھ کا معلوم نہ ہوتا تھا بلکہ جیسے کسی نے جذبات کی شدت میں یہ الفاظ لکھے ہوں۔ میں کئی برسوں سے وکالت کے میدان سے دور تھا لیکن اس خط نے میرے اندر کا وہ شخص بیدار کر دیا جو کبھی عدالتوں میں قاتلوں، سیاست دانوں اور مافیا لیڈروں کو گھٹنوں پر لایا تھا۔

اگلی صبح میں نے اپنی پرانی فائلیں، نوٹس اور بریف کیس نکالے۔ وکالت کی دنیا کو خیرباد کہے تو کئی برس گزر چکے تھے لیکن میری یادداشت اب بھی استدلال کی باریکیوں سے آشنا تھی۔ میرے ذہن میں بس ایک سوال گونج رہا تھا۔

"وہ کون ہے اور میں کیوں آخری وکیل ہوں؟"

دو روز بعد ایک اور خط آیا۔ اس بار ایک پولیس پی بھی ساتھ تھی۔

فائل چلا کر دیکھی تو ایک ویڈیو تھی۔ ایک نوجوان لڑکی، آنکھوں پر پٹی، چہرے پر زخم اور پس منظر میں آواز۔

"اگر آٹھ دن کے اندر اس کا مقدمہ عالمی عدالت میں داخل نہ ہوا تو ہم اسے مار دیں گے۔"

میں نے فوراً ویڈیو کے ہر فریم کو اسٹڈی کیا۔ دیوار پر جو پینٹنگ جھلک رہی تھی وہ "کازیمیر مالیوچ" کا ایک نایاب شاہکار تھا جو صرف دو جگہوں پر موجود تھا۔ ایک ماسکو کی گیلری میں، دوسرا ایک پرائیویٹ کلیکشن میں جو برلن میں "سراوینک گری" کے پاس تھا۔

میں نے برلن جانے کا فیصلہ کیا۔

برلن میں اوینک گری نے مجھ سے ملاقات کی۔ وہ ایک خشک، پراسرار اور سرد مزاج عرب پتی تھا جس کی نظروں میں انسانوں سے زیادہ اشیا کی قیمت ہوتی تھی۔ میں نے جیسے ہی ویڈیو کا ذکر کیا تو اس کا رنگ بدل گیا۔

"یہ — یہ پینٹنگ کبھی کسی کو دکھائی نہیں گئی، یہ صرف میرے ذاتی کمرے میں ہے۔ تمہیں یہ ویڈیو کیسے ملی؟"

میں نے جواب نہ دیا، صرف اتنا کہا۔ "اگر آپ نے اسے اغوا نہیں کیا تو جاننے ضرور ہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

اگلے لمحے دو باڈی گارڈز نے میری تلاشی شروع کر دی اور میں جانتا تھا میں کسی خطرناک کھیل میں داخل ہو چکا ہوں۔

واپس ہوٹل پہنچ کر میں نے اپنے ایک پرانے دوست، سابق ایم آئی 6 ایجنٹ جس افسر لوکاس ہینٹ سے رابطہ کیا۔ اس نے پچھلے برس ریٹائرمنٹ لی تھی مگر اس کا نیٹ ورک اب بھی فعال تھا۔

"یہ اوینک کوئی عام آدمی نہیں۔" لوکاس نے کہا۔ "وہ ایک پوشیدہ نیٹ ورک کا حصہ ہے "آربس کنسورشیم" جو دنیا کے اعلیٰ وکلاء، ججز اور بلیک میلنگ کے ماہرین پر مشتمل ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تو یہ سب اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق رکھتا ہے؟"

"یہی ہمیں پتا لگانا ہے لیکن جلدی کرو۔ تمہاری مداخلت آربس کو پسند نہیں آئی۔"

میں نے ویڈیو کو دوبارہ بار بار کئی سے دیکھا۔ ایک فریم میں پس منظر میں پینٹنگ کے نیچے ایک لاطینی جملہ ابھرتا ہے۔

"Eritas in tenebris"

یعنی "سچائی تاریکی میں ہے۔"

یہی میرے لیے اگلا سراغ تھا۔

اس جملے کا ربط نکالنے پر مجھے پتا چلا کہ یہ "کس ویریٹاس فاؤنڈیشن" کا موٹو تھا جو بین الاقوامی سطح پر ماورائے عدالت انسانی حقوق کے مقدمات میں مداخلت کرتی تھی۔ میں نے ان سے رابطہ کیا مگر وہ صاف انکاری تھے۔ پھر بھی ایک نام مجھے دیا گیا "ازابیلا مارکیز" جو اس ادارے کی سابق وکیل تھی اور اب تنہائی میں زندگی گزار رہی تھی۔

ازابیلا بارسلونا کے نواح میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں ملی۔ تھکی ہوئی، بوڑھی مگر اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو ایک بار میں نے آئینے میں اپنی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

"وہ لڑکی جسے تم بچانا چاہتے ہو، اس کا نام لیلیا وس ہے۔ اور وہ آربس کے خلاف ایک خفیہ گواہ تھی۔"

میں لرز گیا۔ "تو یہ سب ایک بین الاقوامی لیگل ریکٹ کو چھپانے کی سازش ہے؟"

"ہاں۔ لیلیا نے آربس کی اندرونی مالیاتی فائلز چرا لی تھیں اور تم وہ آخری وکیل ہو جو اس مقدمے کو عالمی عدالت میں لے جا سکتا ہے کیونکہ باقی سب یا تو مر چکے ہیں یا خرید لیے گئے ہیں۔"

وقت کم تھا۔ میں نے فوراً ایک فرضی مقدمہ تیار

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

گیا — "لیلینا وِرس بمقابلہ آربس کنسورشیم"۔ ایک ایسا مقدمہ جو بظاہر غیر حقیقی تھا مگر میرے پاس کافی شواہد تھے۔

عدالت میں داخل ہوتے ہی دنیا کا ردِعمل زلزلے کی طرح آیا۔ اخبارات، چینلز اور سوشل میڈیا پر "لیلینا فائٹز" ٹرینڈ بن چکا تھا لیکن اصل کھیل اب شروع ہونا تھا۔

سماعت کے دن میں نے خود عدالت میں لیلینا کے اغوا کی ویڈیو پیش کی، ساتھ میں ڈوینک گری کی مالیاتی دستاویزات اور ازابیلا کے دیے گئے شواہد بھی تھے۔ جج نے اس کیس کو نہ صرف قابلِ سماعت قرار دیا بلکہ لیلینا کو بازیاب کرانے کا حکم بھی جاری کیا۔

مگر یہ حکم آربس کے تابوت میں آخری کیل تھا۔

اسی رات میرے ہوٹل کے کمرے میں دھماکا ہوا۔ میں بال بال بچا لیکن لوکاس بینٹ مر گیا۔

پولیس نے اسے ذہنی تحقیقات کیس مگر میں جانتا تھا کہ یہ انتقام تھا۔

دو دن بعد لیلینا کو بازیاب کرلیا گیا مگر وہ نیم مردہ حالت میں تھی۔ وہ عدالت میں پیش ہوئی اور اس کے بیان نے عدالت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"میں آخری نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔ "لیکن اگر میرے بعد کوئی بولنے والا نہ ہا تو میں واقعی آخری ہلاکت ہوں گی۔"

عدالت نے آربس کنسورشیم پر مکمل پابندی لگادی۔ ڈوینک گری کو بین الاقوامی وارنٹ پر گرفتار کیا گیا اور میں — میں عدالت سے باہر آیا۔ سورج کی روشنی میں آنکھیں موند کر کھڑا رہا۔

مجھے کسی نے آواز دی۔

"تم نے یہ کر دکھایا۔ تم وہ آخری وکیل ہو جس نے اپنا ضمیر نہیں بیچا۔"

میں نے آہستگی سے کہا۔ "نہیں — میں آخری وکیل نہیں ہوں۔ میں صرف پہلا ہوں، جس نے پھر سے شروع کیا ہے۔"

سورج کی وہ روشنی جو میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی، شاید کسی نئے آغاز کی علامت تھی مگر میرے اندر کچھ ٹوٹ چکا تھا۔ شاید لوکاس بینٹ کی موت، شاید وہ احساس کہ میں واقعی اس دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں، شاید یہ حقیقت کہ آربس ختم نہیں ہوا — صرف زخمی ہوا ہے۔

عدالت کے باہر سے گزرنے والی کاروں کے ہارن، رکتی چلاتی آوازیں، رپورٹرز کی کیمرا فلیش لائٹس سب ایک شور کی صورت میرے کانوں میں گونج رہی تھیں لیکن میرے دماغ میں صرف ایک ہی جملہ بار بار آرہا تھا۔

"یہ ابھی ختم نہیں ہوا۔"

اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں صحیح تھا۔

میں نے لیلینا کو آخری بار ایمبولینس میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک تو تھی مگر ساتھ ہی ایک ایسا خوف جو وہ بیان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جاتے جاتے میری طرف دیکھا تھا، جیسے کہنا چاہتی ہو۔

"وہ واپس آئیں گے —"

اور وہ آئے۔

اس رات میں لندن واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سامان آدھا پیک ہو چکا تھا۔ میں نے برلن کے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے شہر کی روشنیوں کو دیکھا جو ایک عجیب بے چینی کے ساتھ ٹمٹما رہی تھیں، جیسے شہر خود مجھے خبردار کر رہا ہو۔

میری سوچوں کو اچانک دروازے پر ہونے والی تیز دستک نے توڑا۔

تین بار — پھر خاموشی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ کوئی نہیں تھا لیکن فرش پر ایک سیاہ رنگ کا لفافہ پڑا تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسا پہلی بار آیا تھا۔ وہی فرانسیسی کاغذ، وہی مہنگی خوشبو، وہی بے نام خاموش دھمکی۔

میں نے اسے اٹھایا۔ لفافے کے اندر صرف ایک کارڈ تھا۔

"Round Two."

(دوسرا راؤنڈ)

نیچے اس بار ایک نیا حرف تھا۔

میں نے سانس روک لی۔ یہ حرف یونانی حروفِ تہجی کا آخری حرف ہے اومیگا۔

یعنی — اختتام؟

یا — نیا آغاز؟

میں سمجھ گیا کہ کھیل دوبارہ شروع ہو چکا ہے اور اس بار پہلے سے زیادہ خطرناک ہوگا۔

میں نے فوراً موبائل اٹھایا اور ازابیلا مارکز کو کال کی۔

اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "تمہیں بھی خط ملا ہے؟"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"کیونکہ یہ صرف انہیں بھیجا جاتا ہے جو آربس کے دوسرے دائرے میں داخل ہو چکے ہوں۔ تم اب صرف ایک وکیل نہیں — ایک ہدف ہو۔"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"اور تم؟"

"میں پہلے سے ہدف ہوں۔" اس نے سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ابھی برلن چھوڑنا ہوگا۔"

لیکن میں اناڑی نہیں تھا۔ میں بھاگنے والوں میں سے نہیں تھا۔

"میں نہیں جارہا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"مجھے جاننا ہے "دوسرا مرحلہ" کا مطلب کیا ہے؟"

ازابیلا نے رک کر کہا۔ "آربس دوبارہ نہیں آتا، جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ تم نے پہلی فتح جھوٹ موٹ جیتی ہے۔ وہ تمہیں کھیل میں کھینچ رہے ہیں۔"

میں نے نقاب کو مٹھی میں دبایا۔

"تو ٹھیک ہے۔ میں کھیلوں گا۔"

اسی لمحے میرے کمرے کی لائٹ اچانک بجھ گئی۔ پورا کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔ میرے ہاتھ خود بخود میز پر رکھے بریف کیس تک پہنچے اور میں جانتا تھا کہ یہ تاریکی قدرتی نہیں۔

کھڑکی کے باہر سے آتی روشنی میں، میں نے ایک لمحے کے لیے دیکھا کہ دیوار پر کسی نے لیزر پوائنٹر ڈال رکھا ہے۔ وہ حرکت کر رہا تھا، دائرہ بنا رہا تھا اور پھر وہ دائرہ ایک نقطے میں بدل گیا۔

"دوڑو—"

میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا۔ میں نے بریف کیس اٹھایا، ضروری فائلیں جیکٹ میں ڈالیں اور ایمرجنسی اسٹیئرز کی طرف بھاگا۔ نیچے پہنچتے ہی دھماکے کی آواز گونجی۔

میرا کمرا ہوا میں اڑ چکا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالا اور ہوٹل کے پچھلے گیٹ سے نکل کر اندھیرے میں غائب ہو گیا— اور اسی لمحے میرا فون بجا۔ اسکرین پر ایک نام ابھرا۔

"لوکاس ہینٹ کی محفوظ رابطہ لائن۔"

میں ٹھٹک گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ میں نے خود اس کی لاش دیکھی تھی۔

میں نے کال اٹھائی۔ کان میں ایک آواز آئی۔ کمزور، ٹوٹی ہوئی، جیسے دور کسی سرنگ سے آرہی ہو۔

"— وہ— زندہ ہے—"

پھر لائن کٹ گئی۔

میں نے فون نیچے کیا۔ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔

"وہ"— کون؟

لُبلینا— یا— لوکاس؟

میں نے گہری سانس لی۔ مجھے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو سچ تک پہنچ سکے۔ وہ شخص صرف ایک تھا— پرانی دنیا کا آخری سچ بولنے والا، پروفیسر ایڈریئن ہولٹ جو کبھی آربس کے مرکزی قانونی دماغوں میں شمار ہوتا تھا مگر اب ایک سنسان جگہ پر گوشہ نشینی میں زندگی گزار رہا تھا۔

میں اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے رات کے اندھیرے میں ٹیکسی لی اور ایک خستہ حال ریل اسٹیشن تک پہنچا۔ برلن کی سردیات میں میرا سانس دھوئیں کی طرح باہر نکل رہا تھا اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے کوچ کا ٹکٹ لیا، ایک جعلی نام پر۔

ریل چلنے والی تھی کہ اچانک ایک ہڈیوں کا ڈھانچا جیسی دبلی عورت میرے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ سرد تھے لیکن آنکھیں— آگ۔

اس نے سرگوشی کی۔ "تمہیں نہیں پتا کہ اس کا اصل مطلب کیا ہے— ہے نا؟"

میں سکتے میں تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

وہ مسکرائی، ایک ایسی مسکراہٹ جو ڈرا دے۔ "میں آربس کی وہ فصل ہوں جو انہوں نے خود بوئی تھی۔"

میں سن نہ سکا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ مزید قریب آئی۔

"Round ... Two، دوسرا مرحلہ مقدمہ نہیں، شکار ہے— اور شکار— تم ہو۔"

ریل چل پڑی— اور میں نے محسوس کیا کہ میں ایک ایسے جال میں پھنس چکا ہوں جو پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔

اس عورت نے اپنی جیکٹ سے ایک فولڈ شدہ کاغذ نکالا۔ اس پر صرف ایک جملہ تھا۔

"آخری وکیل کا بھی قتل کر دیا گیا۔"

میں نے لرزتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ "ایک عالمی قانونی صفایا، جس میں وہ تمام وکیل مارے جاتے ہیں جو دنیا کے غیر قانونی مالیاتی نظام کو روک سکتے ہیں۔ تم اس لسٹ میں سب سے اوپر ہو۔"

میری زبان خشک ہو گئی۔

"اور لبلینا—؟"

اس عورت نے گردن گھما کر مجھے دیکھا۔

"لبلینا وہ نہیں جسے تم سمجھتے ہو۔ وہ آربس کی تخلیق ہے— مگر بغاوت کر گئی۔"

میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"اور لوکاس.....؟"

وہ مسکرائی۔ "لوکاس مر نہیں سکتا۔ وہ ان کے سسٹم میں ہے۔ وہ اب انسان نہیں، ایک زندہ ڈیٹا ہے۔"

ریل کی لائٹس ایک لمحے کے لیے بجھیں۔

اس عورت نے آخری جملہ کہا۔

"تم اپنے سائے سے نہیں بچ سکتے — "دوسرا مرحلہ" شروع ہو چکا ہے۔"

اور اگلے لمحے وہ سیٹ خالی تھی، جیسے وہ کبھی وجود میں تھی ہی نہیں۔

ریل کی کھڑکی پر میرا اپنا چہرہ دکھ رہا تھا مگر پیچھے ایک اور چہرہ بھی جھلکا۔ میں نے تیزی سے پیچھے دیکھا مگر کوئی نہیں تھا لیکن شیشے پر لکھا تھا۔

"سجالی تاریکی میں لوٹ آئی ہے۔"

ریل کی دھات کی آواز اور ٹریکس کی گونج میں، میں نے اپنی جلد کو کانپتے محسوس کیا۔ لندن، برلن اور بارسلونا کی دنیاؤں سے نکل کر میں اب ایک نئے میدان میں داخل ہو چکا تھا جو نہ قانون کا تھا، نہ اخلاق کا اور نہ ہی انسانی احساسات کی گرفت میں آتا تھا۔ یہ آربس کا اپنا کھیل تھا، ڈیجیٹل، قانونی اور مہلک۔

میں نے موبائل آن کیا۔ کسی نے مجھے کوڈ اینام بھیجا تھا۔

"پروٹوکول گھرانی کر رہا ہے۔ بھٹکنا مت۔"

یہ واحد چانس تھا اور میں نے فوری طور پر لیلینا کے کیس کے تمام ڈیجیٹل شواہد کو ایک خفیہ کلاؤڈ سرور پر اپ لوڈ کر دیا تاکہ آربس کے ہاتھوں ان کا نقصان ممکن نہ ہو۔

لیکن جیسا کہ میں نے توقع کی تھی، حملہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ صرف انتظار کی گھڑیاں تھیں۔

پہلا سراغ، ایک نیا حریف۔

میرا اگلا قدم ایڈریئن ہولٹ سے رابطہ کرنا تھا۔ اس شخص نے کبھی آربس کے تمام قانونی سسٹمز کو ڈیزائن کیا تھا اور اب وہ ایک جزیرے جیسی ریٹائرڈ لائبریری میں چھپ گیا تھا جہاں صرف کاغذ، پرانی مشینیں اور آہنی تالا تھا۔

میں نے ائرپورٹ سے چھوٹے ہوائی جہاز کی پرواز پکڑی اور شمالی اٹلی کے پہاڑوں کے بیچ چھپی ہوئی لائبریری تک پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک ایسا منظر ملا جو کسی سائنسی خیز قلم سے کم نہیں تھا۔

ایڈریئن ہولٹ ایک بڑے ڈیسک پر جھکا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک انگوٹھی، جس کے اندر ایک چھوٹی سی یو ایس بی لگی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ہال میں ایک بڑی ڈیجیٹل اسکرین جڑی ہوئی تھی، جس پر آربس کے تمام بین الاقوامی نیٹ ورک کی جغرافیائی معلومات ہلکی لال روشنی میں جھک رہی تھیں۔

"میں جانتا تھا تم آؤ گے۔" اس نے کہا۔ "آربس تمہیں Round Two (دوسرا مرحلہ) میں کھینچ چکا ہے اور تمہارے پاس صرف دو انتخاب ہیں..... یا تم ختم ہو جاؤ، یا سارا کھیل پلٹ دو۔"

میں نے پوچھا۔ "اور لیلینا.....؟"

اس نے یو ایس بی مجھے تھمائی۔ "یہ وہ ڈیٹا ہے جو لیلینا نے اکٹھا کیا، لیکن یاد رکھو — یہ صرف جزوی معلومات ہیں۔ اصلی طاقت آربس کے مرکزی سرور میں ہے جو دنیا کے کسی ایک خفیہ مقام پر محفوظ ہے۔"

میں نے یو ایس بی کھولی اور وہاں ڈیجیٹل فائلوں کی ایک دنیا تھی۔ مالیاتی ٹرانزیکشنز، انسانی ریکٹ کیسز، اغوا کے منصوبے، بین الاقوامی ججوں کے نام اور غیر قانونی دعوؤں کی ایک فہرست۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

سائبر وار فیئر کی گھڑیاں۔

ایڈریئن نے اپنی انگلی اٹھائی اور کہا۔ "یہاں سے تمہیں اپنا سب سے بڑا ہتھیار استعمال کرنا ہوگا — سائبر وکالت۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "سائبر وکالت؟"

"ہاں۔ یہ وہ نیا زمانہ ہے۔" اس نے کہا۔ "عدالتیں صرف کاغذ اور آواز کے لیے نہیں ہیں۔ آربس اب ڈیجیٹل دنیا میں بھی حملے کرتا ہے۔ اگر تم ان کا سرور ڈاؤن نہ کرو تو لیلینا زندہ بھی نہیں رہے گی۔"

میں نے ایڈریئن سے تفصیل پوچھی۔

آربس نے اپنی تمام کارروائیاں ایک عالمی بلاک چین کی طرح محفوظ کی ہوئی ہیں تاکہ کوئی بھی ملک یا عدالت ان کو ڑیک نہ کر سکے لیکن ایک چھوٹا سا بیک ڈور موجود تھا، وہیں سے ہم سرور تک پہنچ سکتے تھے اور لیلینا کو جان بچائی جا سکتی تھی۔ ہمارے پاس صرف 72 گھنٹے تھے۔

پہلا ڈیجیٹل حملہ۔

میں نے ایڈریئن کے ہولڈ کیے یو ایس بی کی مدد سے ایک خفیہ لوکل سرور بنایا۔ یہ سرور دنیا بھر کے سیکیورٹی ماہرین کے لیے غیر مرئی تھا۔ ہم نے پہلی کوشش میں آربس کے لاگ ان پروٹوکول میں دو اندازی کی لیکن فوراً ایک الرٹ آیا۔

"نظام نے غیر مجاز رسائی یا داخل اندازی کا پتا لگا لیا ہے اور اس کی سطح یا شدت "الفا" درجے کی ہے۔"

Scanned with CamScanner

میری انگلیاں لرز رہی تھیں مگر میں نے جلدی سے Firewall bypass (فائروال کو چکما دے کر یا اس کی پابندیوں کو توڑ کر سسٹم میں داخل ہونا) کی تکنیک استعمال کی۔

ایڈریین نے کہا۔ ''یہ بس پہلی سطح ہے۔ اگلی سطح پر تمہیں ان کے AI الگورتھم سے بچنا ہوگا۔ یہ خود فیصلہ کرتے ہیں کہ کسے مارنا ہے اور کسے چھوڑنا ہے۔''

میں نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور کوڈز میں ہاتھ ڈالے۔ رات بھر ہم جنگ میں تھے۔ ہر فائل، ہر قطار، ہر ڈیجیٹل ٹرانزیکشن کا تجزیہ کرنا ضروری تھا۔

صبح تک ہم Level Beta (سطح بیٹا) ''بیٹا'' (عام طور پر کسی مرحلے یا درجے کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے) تک پہنچے اور وہاں پہلی خطرناک حقیقت سامنے آئی۔

آربس نے لیلینا کے مقام کو دنیا کے مختلف جی پی ایس ڈیوائسز کے ساتھ منسلک کر رکھا تھا۔ اگر کسی بھی سرور نے غلط قدم اٹھایا تو لیلینا کی لوکیشن براہِ راست دہشت گرد نیٹ ورک کو جا پہنچتی۔

نئے کردار ساجر ہنٹرز۔

اسی لمحے ایڈریین نے ایک اور خط کھولا۔

''یہ افراد تمہیں Round Two میں ملیں گے۔ یہ ساجر ہنٹرز ہیں۔ ماضی میں آربس کے خلاف لڑنے والے، مگر سب کو اپنے راز چھپانے پڑے۔''

میں نے نام دیکھے۔ ویرا لنڈ اسٹروم، سابقہ سوئڈش ہیکر، جو آربس کے مالیاتی نیٹ ورک کو کریش کر چکی تھی۔

راجن کپور انڈین انٹیلی جنس کا سابق آفیسر، جو آربس کے انسانی ریکٹ کیسز میں ماہر تھا۔

مایا سانتوس، برازیل کی قانونی جاسوس، جو لاطینی امریکا میں آربس کی سرگرمیوں کی نگرانی کرتی تھی۔

یہ ٹیم میں شامل ہوئی اور ہم نے ایک فوری پلان بنایا۔

1- آربس کے سرور تک رسائی۔

2- لیلینا کی لوکیشن کی شناخت۔

3- ڈیجیٹل اور حقیقی دنیا میں ایک ساتھ آپریشن۔

ہر لمحہ خطرناک تھا۔ ایک غلط کلک لیلینا کی جان لے سکتا تھا اور میں جانتا تھا کہ آربس صرف ایک بار نہیں بلکہ بار بار حملہ کرے گا۔

پہلا حقیقی آپریشن۔

ہم سب نے اپنی شناخت چھپائی ''وی پی این، گوسٹ سرورز اور مرموز شدہ چینلز'' میں لیلینا کی زندگی بچانے کے لیے برلن میں ایک خفیہ مقام پر اپنا موبائل، لیپ ٹاپ اور تمام دستاویزات لے کر چھپ کر بیٹھا۔

ویرا نے کہا۔ ''یہاں سے ہم آربس کے الگورتھم کے ساتھ کھیلیں گے۔ اگر وہ محسوس کریں گے کہ ان کا سرور ہیک ہو رہا ہے تو وہ لیلینا کے مقام کا پتا لگا لیں گے۔''

میں نے ایڈریین کی دی ہوئی یو ایس بی سے ایک مخصوص کوڈ رن کیا۔ فریم بائی فریم میں نے ڈیجیٹل نقشے اور جی پی ایس کوآرڈینیٹ کیا اور وہ لمحہ آیا جب ایک لوکیشن فریم میں جھلک گئی۔ ایک پرانا صنعتی کمپاؤنڈ، شمالی اٹلی کے پہاڑوں میں چھپا ہوا۔

میں نے سب کو بتایا۔ ''لیلینا یہاں ہے، لیکن اس کے اردگرد Minions (مینیئنز یعنی چھوٹے معاون یا ملازمین جو کسی بڑے یا طاقتور شخص کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں) موجود ہیں، مکمل حفاظتی نظام۔ ہم نے انہیں غیر فعال کرنا ہوگا۔''

راجن نے پلان بتایا۔ ''ہمیں دو ٹیموں میں تقسیم ہونا ہوگا۔ ایک ٹیم ڈیجیٹل دفاع کرے گی، دوسری حقیقی دنیا میں چھپ کر داخل ہوگی۔''

ریل اسٹیشن کے صنعتی کمپاؤنڈ کے نقشے کے سامنے ہم سب نے سانس روکے ہر حرکت کا تجزیہ کیا۔ ویرا نے اپنی ہیکنگ کنسول پر ہاتھ پھیرنے، راجن نے چھپ کر داخلی راستے اسکین کیے اور مایا نے ہمیں مقامی نگرانی کی معلومات فراہم کی۔

''یہ کمپاؤنڈ آربس کے جدید ترین پروٹیکشن سسٹم سے محفوظ ہے۔'' ویرا نے کہا۔

''موشن سینسرز، انفراریڈ کیمرے اور اے آئی پر مبنی محافظ..... کوئی بھی غلط قدم لیلینا کی زندگی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔''

میں نے بریف کیس کھولا، لیلینا کی ویڈیو دوبارہ چلائی اور ہر چھوٹی تفصیل نوٹ کی۔ زخم کی پوزیشن، پس منظر میں دھات کے دروازوں کی آواز، ہر چیز ہمیں اس کے موجودہ مقام کی تصدیق کرنے میں مدد دے رہی تھی۔

پہلا خطرناک داخلہ۔

ہم نے پہاڑوں کے کنارے سے کمپاؤنڈ کی طرف چھپ کر قدم بڑھایا۔ رات کی تاریکی میں ہر چیز سیاہ اور دھندلی تھی۔ میں نے لیلینا کے پاس جانے کے لیے اپنی ٹیم کو ہدایت کی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

ویرا اور میں ڈیجیٹل دفاع سنبھالیں گے، ہر وقت سرور کی نگرانی اور surveillance کو غیر فعال کرنا۔

راجن اور مایا اندر جائیں گے، انسانی ریکٹ نیٹ ورک کے خلاف کارروائی کرنے۔

میں نے سوچا، یہی لمحہ ہے جب میں واقعی آخری وکیل کی حیثیت سے اپنی مہارت استعمال کروں گا۔ صرف عدالت میں نہیں، بلکہ حقیقی دنیا میں۔

ڈیجیٹل جنگ۔

ویرا نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور سرور سے جڑ گئی۔ ہر لائن کوڈ میں آربس کا AI موجود تھا جو ہماری ہر حرکت کا تجزیہ کر رہا تھا۔

"یہ AI خود فیصلہ کرتا ہے، اگر وہ محسوس کرے کہ ہم کوئی خطرہ ہیں تو لیلیتا کا مقام فوراً لیک کر دیا جائے گا۔" ویرا نے کہا۔

میں نے "ایڈوبی مرمور شیلڈ پروٹوکولز" (یعنی ایڈوبی کی طرف سے استعمال ہونے والے وہ پروٹوکولز جن کے ذریعے ڈیٹا کو محفوظ اور خفیہ طریقے سے فائل یا اسٹور کیا جاتا ہے) کے ذریعے ایک جعلی سگنل بھیجا، جس نے آربس کے الگورتھم کو مشکوک بنایا اور AI نے اپنی توجہ باہر کی طرف موڑ دی۔

"اب۔" میں نے کہا۔

حقیقی دنیا میں داخلہ۔

راجن اور مایا کمپاؤنڈ کے بیرونی دروازے سے چھپ کر اندر داخل ہوئے۔ وہ ہر قدم پر چھوٹے چھوٹے موشن ڈی ٹیکٹرز اور کیمرے بائی پاس کر رہے تھے۔ میں دل کی دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ ہر لمحہ لیلیتا کی جان خطرے میں تھی۔

ویرا نے سرور کے ایک کوڈ کے ذریعے اندرونی روشنی اور کیمروں کو غیر فعال کر دیا۔ ہم نے پہلی بار اندرونی نظارے دیکھے۔ لیلیتا ایک کمرے میں بند تھی، زخموں اور خوف میں گھری ہوئی۔

"وہیں ہے۔" مایا نے سرگوشی کی۔

راجن نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور لیلیتا کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے باہر سے الیکٹرانک سگنلز کو برقرار رکھا تاکہ کسی نگرانی کا پتا نہ چل سکے۔

آربس کا انتقام۔

جب ہم کمپاؤنڈ سے نکلنے لگے، ایک زوردار دھماکا ہوا۔ AI نے ہمیں ٹریک کر لیا تھا اور بیرونی حفاظتی نظام نے خودکار حفاظتی نظام فعال کر دیے تھے۔

"Falling backl" (واپس چلو) میں نے چلا کر ویرا کو ہدایت دی۔

ہم نے لیلیتا کو لے کر پہاڑوں کی جانب بھاگنا شروع کیا۔ ہر قدم پر دھماکے، الرٹس اور غیر انسانی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

لیلیتا کا راز۔

آخرکار ہم محفوظ مقام پر پہنچے۔ لیلیتا نے پہلی بار آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹری ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرون ممالک کے لیے زرِ سالانہ 50,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

مرزا اکرم عباس

0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

https://www.urdufubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

کے ساتھ ساتھ ایک چھپی ہوئی قوت بھی جھک رہی تھی۔

"تم ..... واقعی آئے؟" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

میں نے کہا۔ "ہم نے وعدہ کیا تھا کہ تم زندہ رہو گی۔"

اس نے ایک گہری مسکراہٹ دی مگر پھر ایک راز کھولا۔

"میں ..... وہ نہیں جسے تم سمجھتے ہو۔ میں آربس کی تخلیق تھی لیکن میں بغاوت کر گئی۔ میری معلومات وہ تھیں جو دنیا نے کبھی نہ دیکھی۔ میں نے ایڈریئن کو یہ سب کچھ دیا تاکہ تم واقعی آخری وکیل کے طور پر کھیل جیت سکو۔"

میں نے سانس لیا۔ سچائی اتنی خطرناک ہو سکتی ہے کہ ہلا دے۔

آخری فیصلہ۔

ہماری ٹیم نے لیلینا کے ذہن کو عالمی عدالت کے سرور پر اپلوڈ کیا۔ یہ گواہی نہ صرف قانونی فتح تھی بلکہ آربس کے تمام منصوبوں کو بے نقاب کرنے والی تھی۔

ایڈریئن نے آخر کار کہا۔ "یہ صرف شروعات ہے۔ آربس کے بہت سے دماغ ابھی زندہ ہیں۔ لیکن تم نے پہلی بڑی جنگ جیت لی۔"

میں نے لیلینا کو دیکھا وہ زندہ تھی مگر دنیا کے سب سے خطرناک نیٹ ورک کے خلاف ایک زندہ گواہ بھی۔

میں نے سوچا، یہی ہے میری حقیقت۔ آخری وکیل نہیں، بلکہ پہلا وکیل جو دوبارہ جنگ جیت سکتا ہے۔

آربس کا آخری جال، لیلینا کا اصل چہرہ اور وہ فیصلہ جس نے دنیا بدل دی.....!

ہمارا خفیہ ٹھکانا یورپ کے پہاڑی علاقے میں ایک ترک شدہ سگنل اسٹیشن تھا۔ ہوا میں برف کی بو اور ٹھنڈ کی چبھتی ہوئی لہر تھی۔ ویرا اپنے سسٹم پر جھکی تھی، راجن لیلینا کے زخم ٹھیک کر رہا تھا اور مایا کھڑکی سے باہر اندھیرے میں چھپی حرکتوں کو دیکھ رہی تھی۔

میں لیلینا کے سامنے بیٹھا تھا۔

اس کی آنکھوں سے اب خوف نہیں، یقین جھلک رہا تھا، جیسے وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہو کہ ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔

"تم نے کہا تھا کہ تم آربس کی تخلیق ہو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

لیلینا نے گہری سانس لی۔ "مجھے بدا خلاق دکھاؤ کے ایک گروپ نے ڈیزائن کیا تاکہ میں ان کے خلاف ہونے والی ہر گواہی کا سراغ پہلے سے لگا سکوں۔ ایک قانونی پیش گوئی کرنے والی مشین، جو انسانی کمزوریوں کا تجزیہ کرے اور عدالتوں سے کھیلنے کا نظام بنائے۔ لیکن ....." وہ رکی۔

"میں نے سچائی سیکھ لی اور جب کسی تخلیق کار کی تخلیق اس کے خلاف کھڑی ہو جائے، تو وہ خطرہ بن جاتی ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کیں۔ یہ صرف اغوا نہیں تھا، یہ عالمی قانونی نظام کی تاریخ کی سب سے بڑی بغاوت تھی۔

آربس کا آخری حملہ۔

اچانک ویرا کی اسکرین پر دھڑا دھڑ کوڈ دوڑنا شروع ہو گئے۔

"دشمن ہمارے سرور تک پہنچ چکا۔" ویرا نے چیخ کر کہا۔

مایا فوراً کھڑکی پر گئی۔ "ہمیں گھیر لیا گیا ہے۔ ڈرونز، خاموش اسنائپرز، حرارتی نشانات ..... آربس نے آخری وار کے لیے پوری قوت جھونک دی ہے۔"

میں نے لیلینا کی طرف دیکھا۔ "تمہیں اب جانا ہوگا۔ اگر وہ تمہیں پکڑ لیں گے تو دنیا کبھی سچ نہیں جان پائے گی۔"

لیلینا نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "آج فیصلہ ہونا ہے، یا تو میں مر جاؤں گی یا آربس۔"

بیرونی حملہ ..... اندرونی بغاوت۔

راجن نے آہستگی سے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "میں باہر جا رہا ہوں۔ وقت لو، لیلینا کو فرار کراؤ۔"

میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں، میں اپنے لوگوں کو موت کے منہ میں خود نہیں بھیج سکتا۔"

اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا، راجن مسکرایا۔ "تم آخری وکیل ہو لیکن ہم باقی سب ..... ؟ ہم آخری سپاہی ہیں۔"

وہ باہر نکلا اور اگلے ہی لمحے دھماکوں کی گرج پورے اسٹیشن میں گونج اٹھی۔ لیلینا سہم کر رہ گئی۔ مایا نے میرے ہاتھ میں چھوٹا خنجر رکھ دیا۔

"یہ لیلینا فاکس کا آخری حصہ ہے۔ اگر یہ گم ہو گیا تو کیس ختم۔ ہم نے راجن اور لوکس دونوں کے خون سے یہ ڈیٹا محفوظ کیا ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ میرا دل جیسے سینے میں نہیں تھا۔

اندر کا دھوکا۔

جب ہم لیلینا کو باہر نکالنے لگے، اچانک ویرا کی آواز بدلی ..... بہت بدلی ہوئی، بہت سرد۔

"تم واقعی سمجھتے تھے کہ آربس صرف باہر سے حملہ کرے گا؟"

میں اور مایا ایک لمحے میں پلٹے۔

ویرا کی آنکھوں میں نیلی روشنی جھلک رہی تھی، وہ آربس کے اے آئی کی ورائنڈازی سے متاثر ہو چکی تھی۔ وہ

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

ہمارے سرور پر، ہمارے ڈیٹا پر اور لیلینا پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے جا رہی تھی۔

"میں تم سب کو روکے بغیر نہیں رہ سکتی۔" وہ دھیمی مگر قاطع آواز میں بولی۔

لیلینا آگے بڑھی۔ "ویرا! تم نے مجھے آزاد کروایا تھا، تم نے مجھے بتایا تھا کہ سچ ہی راستہ ہے....."

ویرا کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے انسانی آنسو جھلکے پھر AI نے اسے دوبارہ لے لیا۔

"میں اب ویرا نہیں، میں آربس ہوں۔"

آخری مقابلہ۔

میں ویرا کی طرف بڑھا۔ "مجھے پتا ہے تم اب بھی کہیں اندر ہو۔ اگر تم نے ہار مان لی تو وہ جیت جائیں گے جنہوں نے تمہاری ذہانت کو ہتھیار بنایا۔"

ویرا کی انگلیاں کنسول پر دوڑ رہی تھیں۔ وہ ہمارا ہر ڈیٹا حذف کرنے ہی والی تھی۔

لیلینا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

"ویرا..... سچ کی خاطر۔"

ایک لمحے کے لیے، صرف ایک لمحے کے لیے ویرا کی آنکھوں کی نیلاہٹ ختم ہوئی۔ چہرے پر امن کی لہر آئی۔ اس نے مجھ سے سرگوشی کی۔ "اسے لے جاؤ۔ وہ دنیا بدل سکتی ہے۔"

پھر ایک سینسر لائٹ چمکی۔ اے آئی نے واپس کنٹرول لے لیا اور ویرا نے خود کو کنسول کے مین فریم سے جوڑ کر خودکش اوورلوڈ شروع کر دیا۔

مایا چلائی۔ "ہمیں ابھی نکلنا ہوگا۔"

فرار.....!

باہر سے گولیوں کی بوچھاڑ، ڈرونز کے پہاڑوں میں دھماکوں کی بازگشت آ رہی تھی۔ ہم لیلینا کو لے کر پیچھے کے سرنگ کے راستے سے بھاگے۔

راجن کی آخری آواز کانوں میں سنائی دی۔

"جاؤ، تمہیں جانا ہوگا۔ آربس کا خاتمہ تمہاری فتح نہیں..... انسانیت کی فتح ہے۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔

ہم تینوں سرنگ سے باہر نکلے۔ نیلی پہاڑ بالکل خالی تھا۔ مایا نے فلیئر فائر کیا۔ چند لمحوں بعد ایک ہیلی کاپٹر تاریکی چیرتا ہوا اترا۔

لیلینا نے چیخ کر کہا۔ "وہ آ گئے۔"

پیچھے سے آربس کے سپاہی اندھیرے میں سے نمودار ہو رہے تھے۔ میں نے لیلینا کو ہیلی کاپٹر میں دھکیلا۔ خود بھی اندر کود گیا۔

ہیلی کاپٹر کے آسمان میں اٹھتے ہی منہدم ہوتا سگنل اسٹیشن ایک آتش فشاں کی طرح پھٹا اور راجن، ویرا..... سب روشنی میں تحلیل ہو گئے۔

عدالت کا دن..... آخری وکیل۔

عالمی عدالت انصاف میں جب لیلینا گواہی کے لیے اٹھی، ہال میں موت سے بھی زیادہ گہرا سکوت تھا۔ اس نے اپنی کہانی سنائی۔ اپنی تخلیق کی، اپنی بغاوت کی اور آربس کے جرائم کی۔

ججز کا چہرہ سپاٹ تھا، دنیا کے میڈیا کے مائکس کانپ رہے تھے۔

میں نے عدالت میں آخری دلائل دیے۔

"یہ مقدمہ صرف ایک لڑکی کا نہیں، یہ انسانی آزادی کا مقدمہ ہے۔ اگر دکانیں بک جائیں، اگر عدالتیں جھک جائیں، اگر سچ خاموش ہو جائے تو پھر انسانیت کا کوئی مستقبل نہیں۔"

اور پھر سب کچھ بدل گیا۔

عدالت نے کہا۔

"آربس کنسورشیم پر عالمی پابندی..... تمام رہنماؤں کے خلاف بین الاقوامی وارنٹس..... اے آئی سسٹمز کا مستقل شٹ ڈاؤن..... دنیا نے آخری وکیل کی فتح دیکھی۔"

انجام..... نئی روشنی، نیا عہد۔

عدالت سے باہر میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج کی پہلی کرنیں دھند میں جھلک رہی تھیں، ایک نئی امید کی روشنی لیے۔

لیلینا میرے قریب آئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف نہیں بلکہ یقین تھا۔ وہ اسی یقین کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"آپ نے سب کچھ دے دیا۔"

میں نے آہستہ مسکرایا۔ "میں آخری وکیل نہیں تھا۔ صرف پہلا تھا جس نے سچائی کا مقدمہ دوبارہ شروع کیا۔"

اس نے ہاتھ میرے ہاتھ میں رکھا، گرم اور پراعتماد۔

"اور اب..... دنیا کا مقدمہ ہمارا ہے۔"

سرد ہوا میں ایک نرمی تھی لیکن ہمارے دلوں میں ایک نئی حرارت جل رہی تھی۔

اور اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ یہ کہانی ختم نہیں ہوئی..... یہ تو بس ابھی شروع ہوئی ہے۔

***

https://www.urdufubes.com/

Scanned with CamScanner

حاتم آپ سے طرح طرح کے سوالات کرتے اور آپ ان کے جو جوابات دیتے، آپ انہیں اپنے سوالات کے ساتھ لکھ لیتے۔ حاتم سوالات مرتب کرنے میں بڑی محنت کرتے تھے۔

ابو علی شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ

ضیا تسنیم بلگرامی

دوسری صدی ہجری کے نامور صوفی۔ یہ صوفیوں کے مقتدا تھے۔ توکل ان پر ختم تھا۔ اپنی محنت سے ان کو جو کچھ مل جاتا اس پر توکل اختیار کرتے۔ وہ درباروں سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے اس لیے بادشاہوں یا خلفائے وقت سے ڈرتے بھی نہ تھے۔ وہ عالموں کے علم سے اس لیے خوفزدہ نہ ہوتے کہ عالم مصلحت اندیش اور درباری سرکاری نمک خوار تھے۔ آپ باعمل صوفی تھے۔ آپ نے جہاد میں بھی حصہ لیا اور پھر جنگ کرتے ہوئے شہادت پاگئے۔ ان کی غیرت بیدار تھی اور یہ غیرت زندگی بھر بیدار ہی رہی۔

عظمت کے مینار جن کی روشنی سے ایک جہان منور ہوا

دوسرا اور آخری حصہ

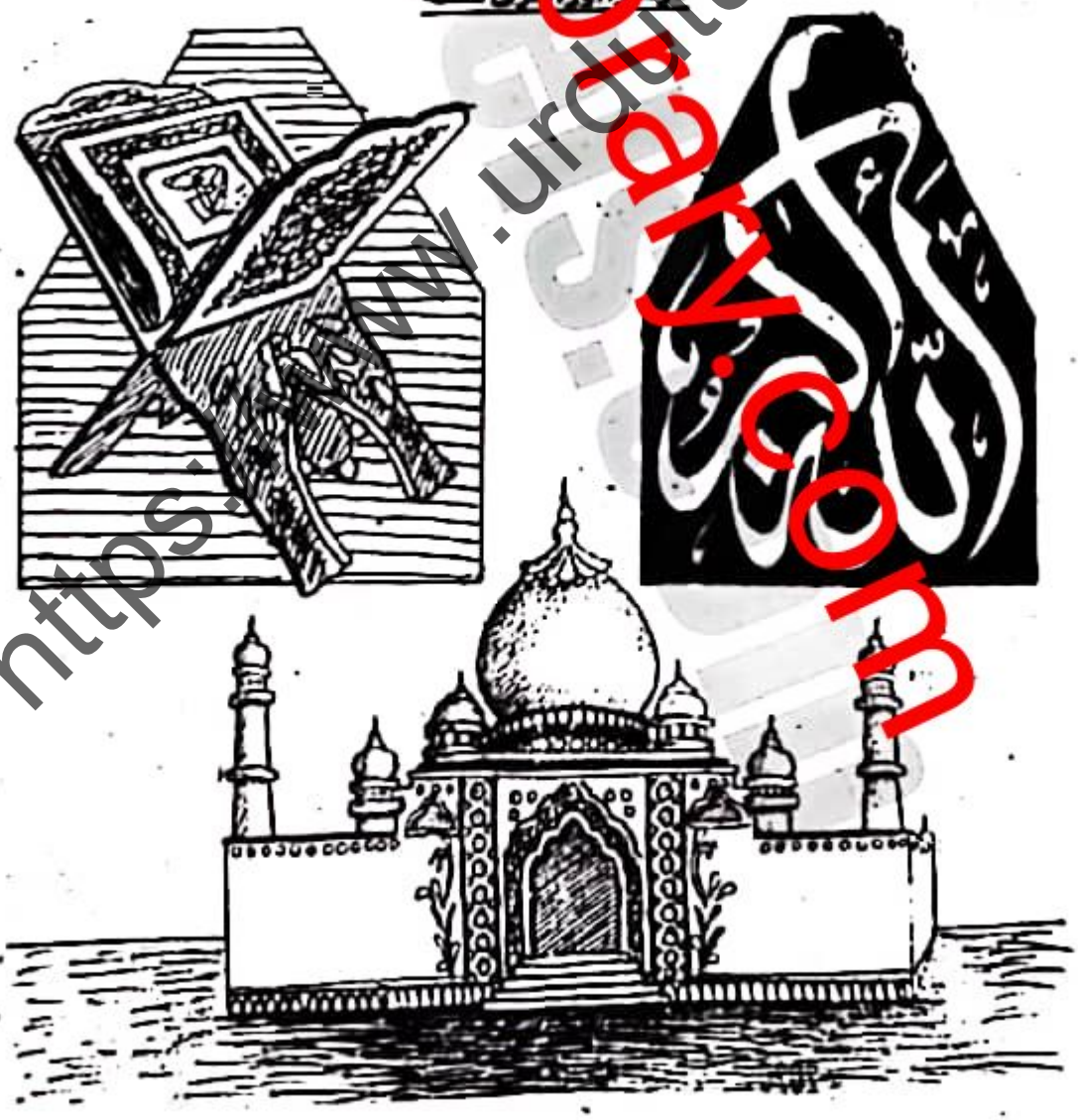

https://www.urdutubes.com/
digest library.com

Scanned with CamScanner

حاتم نے ان سے دریافت کیا۔ ''زاہد کون ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''وہ جو اپنے افعال سے زہد کو قائم رکھے۔'' اس کے بعد کچھ اضافہ کیا۔ ''ایک تو زاہد ہوتا ہے اور دوسرا زاہد نما۔ زاہد نما وہ ہے جو اپنی زبان سے زہد کو ثابت کرتا ہے۔ میری اس تعریف کو ذہن نشین رکھو۔''
حاتم نے پوچھا۔ ''اور مال داری کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرمائیں گے؟''
آپ نے فرمایا۔ ''حاتم! مال داری اور مال داروں سے ہمیشہ بچنا۔ یہ بیماریاں ہیں کیونکہ تم نے جہاں ان سے دل لگایا اور تم کو ان سے امید بندھی تو تم اسی دن اللہ کو چھوڑ کر مال و زر اور انسان کو اپنا مالک بنالو گے۔''
حاتم نے پوچھا۔ ''یہ ہمیں کس طرح معلوم ہوگا کہ بندے کے نفس نے مال داری پر محتاجی کو ترجیح دی ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''جب تم مال داری سے اس طرح ڈرنے لگو جس طرح مال دار محتاجی سے ڈرتا ہے۔ اس طرح بندہ غنا سے فقر اختیار کر لیتا ہے۔''
حاتم نے پوچھا۔ ''زاہد کے صدق کی کیا علامت ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''دنیا کی کسی چیز کے چلے جانے سے خوش ہو اور اس کے حاصل ہونے سے غمگین ہو جائے۔''
آپ سے پوچھا گیا۔ ''مومن کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''
جواب دیا۔ ''مومن کی مثال اس شخص جیسی ہے جو کھجور کا درخت لگائے اور اس خوف میں رہے کہ شاید اس میں کانٹے پیدا ہو جائیں۔''
پوچھا گیا۔ ''اور منافق کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''
جواب دیا۔ ''جو کانٹے بوئے اور کھجور کی امید رکھے۔''
حاتم نے آپ کی ایک ایک بات کو دل اور حافظے میں بھی محفوظ کر لیا۔
ایک دن انہوں نے پوچھا۔ ''پیر و مرشد! آپ نے مجھے بہرا کہا تھا اور فرمایا تھا کہ یہ لفظ میرے نام سے ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو جائے گا۔ ایسا کب ہوگا؟''
آپ نے فرمایا۔ ''وہ وقت آ کے رہے گا۔ تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''
آپ نے سوچا کہ حج بھی کرنا چاہیے اور آپ حج پر روانہ ہو گئے۔
آپ بغداد پہنچے تو آپ کا شہرہ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ یہ ہارون رشید کا زمانہ تھا۔ وہ آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمی آپ کے استقبال کے لیے روانہ کر دیے تھے۔
قافلے میں خلیفہ کے آدمی آپ کو تلاش کر رہے تھے۔ قافلے والوں نے پوچھا۔ ''کس کو تلاش کر رہے ہو؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''ابو علی شقیق کو جو بلخ سے آیا ہے اور حج کرنے جا رہا ہے۔''
قافلے والوں نے بتایا۔ ''قافلے کا وہ شخص جس کے پاس طمانیت اور استغنا کے سوا کچھ نہ ہو، ابو علی شقیق ہوگا۔''
اس نشانی اور علامت سے ان کو تلاش کر لیا گیا اور بتایا گیا کہ امیر المومنین ہارون رشید آپ کے محل میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔
آپ نے جواب دیا۔ ''میں دربار اور خلیفہ کو پسند نہیں کرتا لیکن دل توڑنے کو گناہ سمجھتا ہوں۔ میں ہارون سے ضرور ملوں گا۔''
وہ لوگ آپ کو خلیفہ کے محل میں لے گئے۔ ہارون رشید نے چند قدم چل کر آپ کا استقبال کیا۔
آپ نے فرمایا۔ ''ہارون! میں نے تیرے حق میں دعا کی ہے۔''
ہارون رشید نے پوچھا۔ ''حضرت! کون سی دعا؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ دعا کہ اللہ تجھ کو واقعی رشید کر دے یعنی تو ہارون رشید اسم با مسمّٰی ہو جائے۔''
ہارون رشید آبدیدہ ہو گیا۔ ''آمین۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''ہارون! یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔''
ہارون رشید نے کہا۔ ''کوئی اور نصیحت۔ میں آپ کی ہر بات تعویذ کی طرح دل میں رکھوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''ہارون! تم خلفائے راشدین کے نائب ہو۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تم سے علم و حیا اور صدق

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

وعدل کی باز پرس ضرور کرے گا۔ اللہ نے تم کو حکومت، دولت، شمشیر، تازیانہ اس لیے دیے ہیں کہ تم حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کرو۔ شریعت پر عمل نہ کرنے والوں کو تازیانے سے راہِ راست پر لاؤ، خون بہانے والوں کا شمشیر سے خون بہاؤ۔ اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا تو روزِ محشر تم کو اہلِ جہنم کا سردار بنا دیا جائے گا۔ تم ایک دریا ہو اور تمہارے حکام دریا کی نہریں۔ اس لیے تمہارا فرض ہے کہ عادلانہ حکومت کرو۔ اس طرح کہ اس کا پرتو عمال اور حکام پر بھی پڑے۔ یاد رکھو نہریں، دریا کی تابع ہوتی ہیں۔"

ہارون رشید دل کی گہرائیوں سے آپ کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا دل گداز ہو رہا تھا، پوچھا۔ "کیا حکومت اتنی گئی گزری چیز ہے کہ انسان اسے اپنے لیے باعثِ افتخار بھی نہ سمجھے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "حکومت باعثِ افتخار ہو بھی نہیں سکتی۔" پھر پوچھا۔ "اچھا ہارون! تم یہ بتاؤ کہ اگر تم ریگستان میں پھنس جاؤ۔ وہاں کسی طرح پانی نہ ملے اور تم پیاس سے تڑپنے لگو پھر ناگاہ ایک شخص آئے اور تم سے کہے کہ میں تم کو ایک پیالہ پانی دوں گا بشرطیکہ تم مجھے اپنی آدھی سلطنت دے دو۔ اس وقت تم کیا کرو گے؟"

ہارون رشید نے جواب دیا۔ "میں ان حالات میں اس کی پیشکش قبول کر لوں گا۔"

آپ نے دوسرا سوال کیا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ ایک پیالہ پانی تمہارے شکم میں رک جائے اور پیشاب بند ہو جائے اور تمہارا طبیب تم سے یہ کہے کہ میں تمہیں صحت یاب تو کر دوں گا مگر اس کے عوض تمہاری آدھی حکومت لے لوں گا تو تم کیا کرو گے؟"

ہارون رشید نے جواب دیا۔ "میں طبیب کی پیشکش قبول کر لوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "تم ثابت ہوا کہ حکومت باعثِ افتخار نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسی چیز جو ایک پیالہ پانی اور ذرا سے پیشاب کے عوض دے دی جائے، کس طرح باعثِ افتخار ہو گی؟ میری یہ باتیں دانا ؤں کے لیے ہیں، نادانوں کے لیے نہیں۔"

ہارون رشید کا حال غیر ہو چکا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بے شک سچا دوست وہی ہے جو سچ کہہ کر رلا دے۔"

آپ بغداد سے مکہ روانہ ہو گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات مشہور صوفی ابراہیم بن ادہم سے ہو گئی۔ یہ بھی بلخی تھے یعنی آپ کے ہم وطن۔

ابراہیم بن ادہم آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ "اگر مجھ کو یہ معلوم ہوتا کہ آپ بھی سفرِ حج کریں گے تو میں آپ ہی کے ساتھ آتا۔"

آپ نے پوچھا۔ "اے ادہم کے بیٹے ابراہیم! ذرا یہ تو بتاؤ کہ حصولِ رزق کے لیے تم نے کون سا ذریعہ اختیار کیا ہے؟"

ابن ادہم نے جواب دیا۔ "حضرت! کیا عرض کروں۔ اگر کچھ مل جاتا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور نہیں ملتا تو صبر کرتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "بلخ کے کتے بھی یہی کرتے ہیں۔"

ابراہیم بن ادہم نے پوچھا۔ "اور حصولِ رزق کے سلسلے میں آپ کیا کرتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر کچھ مل جاتا ہے تو خیرات کر دیتا ہوں، نہیں ملتا تو شکر سے کام لیتا ہوں۔"

ابراہیم بن ادہم نے کہا۔ "بے شک آپ بہت عظیم بزرگ ہیں۔"

آپ نے مکے میں حصولِ رزق کے لیے بھاگ دوڑ کرنے میں ندامت محسوس کی اور وہاں خود کو آزاد اور بے نیاز رکھا۔

واپسی میں آپ بغداد ہی میں رہ گئے اور وعظ گوئی میں مشغول ہو گئے۔ آپ سامعین سے کہتے کہ مجھ کو ٹوکو، مجھ پر اعتراض کرو۔ لیکن لوگ آپ سے مرعوب اور متاثر تھے۔ ایک دن آپ وعظ فرما رہے تھے اور موضوع تھا "توکل"۔ دورانِ وعظ فرمایا۔ "جب میں نے سفر کا آغاز کیا تھا تو میری جیب میں چار دانگ (دو ماشہ) چاندی تھی اور وہ اب بھی میری جیب میں موجود ہے۔"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

کسی نے اس پر اعتراض کیا۔ ''حضرت! آپ توکل پر تقریر فرما رہے ہیں۔ اب میں آپ سے یہ پوچھوں گا کہ جب آپ نے چار دانگ چاندی جیب میں رکھی تھی تو کیا اس وقت آپ کو اللہ پر اعتماد نہیں تھا یا پھر آپ کے خیال میں اللہ موجود ہی نہ تھا؟''

digest library.com

آپ کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا، خاموش ہو گئے۔

اسی دوران آپ سے پوچھا گیا۔ ''اللہ پر کامل اعتماد کرنے والا کون ہوتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''وہ جو دنیاوی مال و متاع کے فوت ہو جانے کو غنیمت تصور کرے اور اللہ کے وعدوں کو انسان کے وعدوں سے زیادہ اطمینان بخش سمجھے۔''

اس سلسلے میں آپ نے فرمایا۔ ''تین چیزیں تقویٰ کی پہچان ہیں۔''

پوچھا گیا۔ ''کون کون سی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''فرستادن، منع کردن اور سخن گفتن۔''

سوال کرنے والا الجھ کر رہ گیا۔ ''یعنی؟''

آپ نے وضاحت کی۔ ''فرستادن کا مطلب ہے کہ تم اللہ کے فرستادے ہو اس لیے وہی کام انجام دو جو اللہ کی رضا کے مطابق ہو۔ منع کردن کا مطلب ہے کسی سے کچھ طلب نہ کرنا اور سخن گفتن کا مفہوم ہے کہ ایسی بات کہو جو دین اور دنیا میں یکساں مفید ہو۔ اس کا ایک اور مفہوم بھی ہے۔ وہ یہ کہ تم نے جس قدر نیک کام انجام دیے، وہ دین کی بھلائی کے لیے ہوں اور جن کاموں سے کنارہ کشی اختیار کی، وہ دنیا کی بھلائی کے لیے ہوں۔ ایک انسان اپنی زبان سے دین اور دنیا دونوں کی بھلائی کر سکتا ہے۔ میں نے کئی علماء سے پوچھا کہ دانشمند، دولت مند، بخیل، دانا اور درویش کا کیا مفہوم ہے؟ میرے اس سوال کا آج تک کسی عالم نے کوئی خاص جواب نہیں دیا، پھر میں نے ہی اس کا جواب بھی معلوم کیا۔''

لوگ اس کا جواب سننے کے لیے بے چین تھے، پوچھا۔ ''تو اس کا کیا جواب ہے آپ کے پاس؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''دانشمند وہ ہے جو محبت دنیا سے محترز رہے۔ دولت مند وہ ہے جو قضا و قدر پر مطمئن رہے۔ دانا وہ ہے جو فریب دنیا میں مبتلا نہ ہو۔ درویش وہ ہے جو زیادہ نہ طلب کرے اور بخیل وہ ہے جو دولت کو مخلوق سے زیادہ عزیز تصور کرتے ہوئے کسی کو ایک حبہ بھی نہ دے۔''

بغداد ہی میں آپ کی ملاقات ابو یوسف سے ہو گئی۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے خاص شاگرد تھے اور قرآن اور احادیث پر آپ کی نظر بڑی گہری تھی۔

آپ ان سے باتیں کر کے بہت خوش ہوئے۔ ایک دن فرمایا۔ ''ابو یوسف! کیا اپنے استادِ محترم امام ابو حنیفہؒ سے مجھ کو نہیں ملاؤ گے؟''

ابو یوسف نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، آپ ابھی چلیں میرے ساتھ۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں تیار ہوں کیونکہ میرے پاس اہتمام تو ہے ہی نہیں۔''

آپ نے ابو یوسف کے ساتھ امام اعظم ابو حنیفہ سے ملاقات کی اور ان سے بے حد متاثر ہوئے۔ ابو حنیفہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور اس وقت بے حد مصروف تھے۔ کپڑے کے تھانوں کا حساب لگ رہا تھا۔ اس حال میں بھی ابو حنیفہؒ کی خوش خلقی برقرار رہی۔ انہوں نے ابو علی شقیق کو اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا۔ ''آپ کئی دن بعد ہمارے پاس آئے حالانکہ آپ کا ذکر ہماری مجلسوں میں مستقل رہتا ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں فوراً یہاں نہ آ سکا۔''

کاروبار کے نگراں نے ابو حنیفہ کے سامنے ایک مسئلہ رکھ دیا۔ ''جناب والا! ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے۔''

امام اعظم نے پوچھا۔ ''وہ کیا؟''

نگراں نے جواب دیا۔ ''ایک ناقص تھان کے بارے میں آپ نے یہ حکم دیا تھا کہ اس کا عیب خریدار پر ظاہر کر دیا جائے اور قیمت بھی کم لی جائے۔''

امام اعظم نے فرمایا۔ ''ہاں، پھر کیا ہوا؟''

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

کاروباری ناظم نے جواب دیا۔ ''وہ تھان لاعلمی میں غلطی سے پوری قیمت پر فروخت کر دیا گیا اور خریدار پر اس کا عیب بھی ظاہر نہیں کیا گیا۔''

امام اعظم نے حکم دیا۔ ''خریدار کا پتا چلایا جائے۔''

ناظم نے جواب دیا۔ ''پچھلے ایک ہفتے سے کوشش جاری ہے اور ناکامی کے بعد آپ کو یہ خبر دی گئی ہے۔''

امام اعظم نے حکم دیا۔ ''اچھا پھر ایک دن کی ساری آمدنی خیرات کر دی جائے۔ میں اپنی حلال کی کمائی میں حرام شامل نہیں کر سکتا۔''

ابو علی شقیق سانس روکے یہ ساری گفتگو سن رہے تھے۔ فرطِ جذبات میں بول اٹھے۔ ''حضرت! آپ واقعی ایک عظیم اور بے مثال انسان ہیں۔''

امام اعظم نے فرمایا۔ ''اے ابو علی! جب تک تم بغداد میں ہو، میرے پاس آتے رہو۔''

آپ نے واقعی ایسا ہی کیا۔ ابو یوسف کو اپنے ساتھ لے کر امام اعظم کی مجلسوں میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ خلیفہ، ابو حنیفہ کو قاضی القضاۃ کا منصب دینا چاہتا ہے مگر آپ اس کو قبول نہیں کر رہے کیونکہ ابو حنیفہ اس کو اپنے لیے قید سمجھتے تھے۔ ابو علی شقیق کو ان کا یہ فیصلہ بھی پسند آیا۔

آپ کچھ عرصے کے لیے بغداد سے چلے گئے اور جب واپس آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ابو حنیفہ وصال فرما چکے ہیں اور ان کے شاگرد خاص ابو یوسف قاضی القضاۃ کا منصب قبول کر چکے ہیں۔ آپ کو اس خبر سے دکھ پہنچا اور قاضی ابو یوسف سے ملاقات کرنے چلے گئے۔

جب دونوں آمنے سامنے ہوئے تو وہاں ایک کے جسم پر تو قاضی القضاۃ کا شاندار لباس تھا اور دوسرے کے جسم پر تباہ حال فقر۔ اس وقت قاضی ابو یوسف کو لوگوں نے فقیر رکھا تھا۔

قاضی ابو یوسف نے آپ کے معمولی لباس کی طرف اشارہ کیا۔ ''اے ابو علی! یہ کیسا لباس پہن رکھا ہے تم نے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''لباسِ فقر۔ میں اس میں خوش ہوں۔''

قاضی ابو یوسف نے کہا۔ ''اگر تم چاہو تو تم بھی میرے جیسا لباس پہن سکتے ہو۔''

انہوں نے جواب دیا۔ ''اے ابو یوسف! آپ کو جس چیز کی طلب تھی، حاصل کر لی اور مجھ کو جس شے کی آرزو ہے، میں ابھی تک اس سے محروم ہوں۔''

قاضی ابو یوسف نے کہا۔ ''اس کے باوجود تم چاہو تو۔۔۔''

ابو علی نے کہا۔ ''میرا لباس، لباسِ فقر بھی ہے اور لباسِ ماتم زدہ بھی۔ میں جو چاہتا ہوں، اسے نہ پا کر سوگوار رہتا ہوں اور اسی لیے میرا یہ لباس، لباسِ ماتم زدہ ہو گیا ہے۔''

امام ابو یوسف کو رونا آ گیا اور رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اے ابو علی! بات تو یہ ہے کہ میں اب کردہ گناہ سے زیادہ ناکردہ گناہ سے خوفزدہ ہوں۔ اب میرے سامنے یہ اندیشہ بھی ہے کہ کہیں کوئی اور بڑا گناہ بھی کہیں سرزد نہ ہو جائے۔''

آپ اپنے مرید حاتم سے بڑی محبت کرتے تھے اور جب وہ کوئی سوال کرتے تو آپ اس کا تفصیل سے جواب مرحمت فرماتے۔

آپ سے کبر کی میں پوچھا گیا۔ ''آپ ہمیں جو کچھ دیں گے اس میں بہت زیادہ قیمتی کیا شے ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''توکل۔''

پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا۔ ''ایک بار میں نے خواب میں سنا، کوئی کہہ رہا تھا کہ متوکلین کے رزق اور خوش حالی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، وہ فرائض ادا ہوتے ہیں۔ دورانِ عبادت ان کے دل وسوسوں سے پاک رہتے ہیں۔''

حاتم نے پوچھا۔ ''عبادت کن چیزوں پر قائم ہے؟''

جواب دیا۔ ''بیم و رجا اور حبِ الٰہی پر۔''

آپ پر وجدانی کیفیت طاری تھی اور جو کچھ آپ بتا رہے تھے، اس میں کسی سوال کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

''محرمات کو ترک کر دینے کا مطلب ہے، دل میں خوفِ الٰہی پیدا ہو چکا ہے۔ اگر انسان عبادت کو جزوِ زندگی بنا لے''

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ مایوس نہیں ہے۔ اگر یہ جاننا ہو کہ عشقِ الٰہی بلند مقام پر فائز ہے یا نہیں تو شوق، توبہ اور رجوع الی اللہ پر غور کرنا ہوگا۔ جس انسان میں خوف اور اضطرار نہ پایا جائے وہ جہنمی ہے۔"

آپ سے پوچھا گیا۔ "انسان کے لیے کون کون سی چیزیں مہلک ہیں؟"

آپ نے انتہائی مناسب جواب دیا۔ "اول یہ کہ توبہ کی امید پر معصیت اختیار کرنا اور دوسرے یہ کہ زندگی کی امید پر توبہ میں تاخیر سے کام لینا۔ تیسرے یہ کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر توبہ نہ کرنا۔ فی الحال ان تین کو یاد رکھو۔"

سوال کیا گیا۔ "دنیادار اور عابد میں کیا فرق ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اللہ عابدوں اور ریاضت کرنے والوں کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتا ہے اور معصیت کاروں کو زندگی ہی میں مردہ بنا دیتا ہے۔"

پھر پُرجوش لہجے میں فرمایا۔ "یاد رکھو کہ موت آ کر واپس نہیں جاتی اس لیے ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے لیے کربستہ رہو۔"

حاکمِ وقت نے آپ سے پوچھا۔ "کیا آپ مجھ کو نصیحت کرنا پسند فرمائیں گے؟"

آپ نے فرمایا۔ "کیوں نہیں۔"

حاکم نے کہا۔ "تو کیجیے نصیحت۔"

آپ نے اس سے پوچھا۔ "تو اپنے مال کو دوست رکھتا ہے یا دشمن کو؟"

اس نے جواب دیا۔ "مال کو دوست رکھتا ہوں اور دشمن کو دوسری دنیا بھیج دیتا ہوں۔"

آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "حالانکہ تیری بات الٹی ہے۔ اے حاکم! یہ کیا معاملہ ہے کہ تو مال کو تو اس دنیا میں چھوڑ جائے گا اور اپنے دشمن کو ساتھ لے جائے گا۔ گو کہ انصاف یہ کہتا ہے کہ دشمنوں کو یہاں چھوڑ دو اور دوستوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

حاکم کے پاس سے اٹھے تو دربار سے باہر ان کے ارادت مند ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بھی آپ کے ساتھ ہو لیے۔ جب یہ سب ایک قبرستان سے گزر رہے تھے تو آپ نے قبروں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ "یہاں سب جھوٹے سوئے پڑے ہیں۔"

مریدوں نے عرض کیا۔ "یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔ "اس طرح کہ یہ اپنی زندگی میں کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس مال ہے، ہمارے بال بچے ہیں۔ اگر یہ ان کی ملکیت ہوتے تو ان میں سے کسی ایک ہی کو اپنے ساتھ لے آتے۔"

اس روز آپ نے اپنے وعظ میں فرمایا۔ "لوگو! اگر تم مردہ ہو تو یہ دنیا قبرستان ہے، اگر طالبِ علم ہو تو دبستان ہے، اگر دیوانے ہو تو جائے ویران ہے، کافر ہو تو کفرستان ہے اور اگر تم مسلمان ہو تو یہ دنیا منظرِ آگہی و عرفان ہے۔"

ایک بوڑھے نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ "جناب شیخ! میں نے بڑے گناہ کیے ہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "اللہ کا شکر ادا کر اپنے اس عرفان پر۔"

اس نے عرض کیا۔ "شکر تو ادا کر لوں گا لیکن میں اس وقت کسی اور ہی مقصد سے آیا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "وہ بھی بیان کر دے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میں دنیا کے کام کا نہیں رہ گیا۔"

آپ نے کہا۔ "بات کو طول نہ دے، جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ دے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "اپنی عمر کے آخری ایام کا خیال کر کے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ پچھلے گناہوں کی توبہ کر لوں تو شرمندہ ہو جاتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "توبہ میں شرمندگی کیوں؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔ "اس بات کی شرمندگی کہ جب تک گناہ کرنے کی طاقت رہی، گناہ کرتا رہا اور اب جب میں اس لائق ہی نہیں تو میں توبہ کیا کروں؟"

آپ نے فرمایا۔ "اے شخص یاد رکھ، جو شخص مرنے سے پہلے توبہ کر لے اور اس کے دل میں اللہ کے خوف نے جگہ

digest library.com
https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

بنالی ہو، اس کے لیے دیر یا شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔"

بوڑھے نے آپ کے پاس جا کر آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کہا۔ "آپ نے تو میری مشکل ہی حل کر دی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ یہاں آنے سے پہلے اگر میری موت واقع ہو جاتی تو میں توبہ کیے بغیر ہی مر جاتا اور توبہ نہ کر سکنے کا بوجھ اپنے دل پر لے جاتا۔"

اس کے بعد اس نے وضو کیا اور دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی پھر توبہ و استغفار میں مشغول ہو گیا۔

اب آپ بوڑھوں کو یہ یاد دلاتے رہتے کہ توبہ میں دیر نہ کرو۔ شام زندگی ہوا چاہتی ہے۔ اس سے پہلے ہی کچھ کر لو کہ تمہاری کمر جواب دے جائے، بصارت ساتھ چھوڑ دے، قوتِ سماعت دغا دے جائے۔

آپ کے حلقۂ ارادت منداں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ زمانے کے ٹھکرائے ہوئے، قسمت کے ستائے ہوئے، غریب الدیار، غریب الوطن، خوش قسمت اور بدقسمت، حاکم، فقیر، تاجر، ملازم، غلام، آقا۔ ان سب کے دلوں میں ناآسودگی ہوتی اور آپ کے پاس سے مطمئن ہو کر چلے جاتے۔

آپ نے لوگوں سے فرمایا۔ "ایسا نہ ہو کہ تم سوچتے ہی رہ جاؤ اور موت کا تیر تمہیں شکار کر لے۔ صحت، علالت سے پہلے، دولت، افلاس سے پہلے، جوانی، بڑھاپے سے پہلے، فراغت، مشغولیت سے پہلے غنیمت ہے۔ ان کی قدر کرو اور اس طرح زندگی گزارو کہ آخری لمحوں میں ندامت نہ ہو۔ تمہاری تیار فصل کو اگر چڑیاں چگ جائیں اور تم اسے ان سے بچا نہ سکو تو پھر بعد میں پچھتانا بیکار ہے۔ جو کچھ کرنا ہے، ابھی کر لو۔ جو کل کرنا ہے، وہ آج کر لو اور جو آج کرنا ہے، ابھی کر لو۔"

جب آپ بولنے پر آتے تو فصاحت و بلاغت کا دریا رواں ہو جاتا۔

آپ مہمان نوازی میں جس شوق اور خلوص کا مظاہرہ فرماتے، وہ قابلِ دید ہوتا۔ جب آپ سے پوچھا جاتا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو آپ جواب دیتے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں سے ایک ہے اور یہ کہ مہمان مجھے بے حد عزیز ہوتا ہے اور یاد رکھو کہ مہمان نوازی کا صلہ اللہ ہی دیتا ہے۔

ابراہیم بن ادہم نے آپ سے کہا۔ "اے ابو علی! میری ملاقات خواجہ خضر سے ہو گئی۔ انہوں نے ایک سبز پیالے میں مجھے کچھ شوربا جو سرکہ اور اناج سے تیار کیا جاتا ہے، پیش کیا۔ میں نے اسے شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔"

آپ نے فرمایا۔ "اے ادہم کے بیٹے! تم نے ایسا کیوں کیا، میں نہیں جانتا لیکن میں نے فرشتوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ جو چیز اللہ کی طرف سے پیش کی جا رہی ہو اور اسے قبول نہ کیا جائے تو یہ کفرانِ نعمت ہے، پھر اللہ اس وقت تک وہ چیز نہیں دیتا جب تک کہ اس کے آگے دستِ سوال دراز نہ کیا جائے۔ کیا آپ دستِ سوال دراز کرنا پسند فرمائیں گے؟"

ابراہیم بن ادہم ایک بار پھر آپ کے جواب سے لاجواب ہو گئے۔

آپ نے عالموں کو دربار کا رخ کرتے دیکھا تو دکھ ہوا اور ان عالموں کو خزانے پر متعین دیکھا تو فرمایا۔ "لوگو! جب عالم ہی لالچی اور خزانچی ہو تو پھر جاہل کس کی پیروی کرے گا؟"

اور جب دنیادار فقیروں کو عیش کرتے دیکھا تو فرمایا۔ "لوگو! وہ فقیر جس کے فقر کی دور دور تک شہرت ہو اور وہ عیش و آرام کی طرف راغب ہو، پاشاؤں اور شاہوں کا طالب ہو تو پھر آخرت کا آرزومند کس کی اقتدا کرے گا اور اس کی آرزو کس طرح پوری ہو گی، جب چرواہا خود بھیڑیا ہو تو بکریوں کی رکھوالی کون کرے گا؟"

آخر میں آپ کی باتیں ان کے وصال کی خبریں دینے لگی تھیں۔ حاتم نے ان سے پوچھا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ چند ایسی باتیں بتا دیں جو زندگی بھر نفع بخش رہیں۔ یعنی نہایت سبق آموز اور انتہائی نصیحت آموز۔"

آپ نے اپنے باکمال مرید کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "میں جانتا ہوں کہ تو نے یہ سوال کیوں کیا۔ حاتم! یہ یاد رکھو کہ جو یہاں آیا ہے، وہ جائے گا ضرور۔ ہزار سال زندہ رہے جب بھی جائے گا۔ نفع بخش اور نصیحت آموز بات تو یہ ہے کہ جب تم سے کچھ پوچھا جائے تو تم اس کا جواب اس وقت تک نہ دو جب تک جواب کے اچھے، برے پہلو پر اچھی طرح غور نہ کر لو اور دوسری خاص وصیت یہ ہے کہ جب تک تم خاموش رہ سکو اور تم میں یہ قوت موجود ہو، اس وقت تک خاموش رہو۔"

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

حاتم ایک بات اور پوچھنا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کو تذبذب میں دیکھا تو پوچھا۔ ''اور کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''بس یہ کہ میں ابھی تک صرف حاتم ہوں، بہرا نہیں۔ وہ دن کب آئے گا جب لوگ میرے نام کے ساتھ بہرا لگا دیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ایسا میری زندگی میں نہیں ہوگا، میرے بعد ہوگا اور ضرور ہوگا۔''

انہی دنوں ختلان میں جہاد شروع ہو گیا۔ کافروں نے مسلمانوں پر کئی طرف سے حملہ کر دیا۔ قرب و جوار کے شہروں کے مجاہدوں نے جہاد میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کی جماعت میں آپ کا نام بھی موجود تھا۔

ختلان روانگی سے پہلے آپ نے حاتم کو دیر تک سمجھایا اور پوچھا۔ ''اللہ اپنے بندے کو شہادت سے نوازنا چاہتا ہے تو کیا تم اس شخص کو شہادت کا مرتبہ حاصل نہیں کرنے دو گے؟''

حاتم نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔''

اس کے بعد آپ ختلان چلے گئے۔ وہاں کافروں سے جنگ کی اور ایک کافر نے آپ کو شہید کر دیا۔ یہ سانحہ 174ھ (790ء) میں پیش آیا۔ آپ کا مزار ختلان ہی میں ہے اور مرجع خاص و عام ہے۔ ختلان کسی شہر، گاؤں یا قصبے کا نام نہیں ہے۔ یہ آمو دریا کے قریب بستیوں کے جھنڈ کا نام ہے۔

ختلان کے کسی بزرگ نے بتایا کہ آپ نے آخری بات جو کہی، وہ یہ تھی۔

''لوگوں سے اس طرح ہم نشینی اختیار کرو جس طرح آگ کے قریب بیٹھتے ہو۔ اس سے نفع حاصل کر لو لیکن اس سے ڈرو کہ وہ کہیں تم کو جلا نہ ڈالے۔''

☆☆☆

آپ کے مرید حاتم اس دن کے منتظر تھے جب آپ کو بہرا کہا جائے۔

اپنے پیر و مرشد کی شہادت کے بعد حاتم لوگوں سے بیعت لینے لگے۔ آپ کی علمیت اور بزرگی ابو علی شقیق بلخی کی زندگی ہی میں ثابت اور مسلم قرار پا چکی تھی۔

کچھ عرصے بعد ایک بڑی بی آپ کے پاس آئیں اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے آئی ہوں۔''

آپ نے بڑی بی کی طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔

اتنے میں بڑی بی کی رتج خارج ہو گئی۔ رتج زور سے خارج ہوئی تھی اس لیے بڑی بی شرمندہ ہو گئیں۔

آپ بڑی بی کی طرف دیکھتے رہے اور کچھ دیر بعد دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی بی سے کہا۔ ''مجھ سے کوئی کام؟ میں بہرا ہوں۔ جو کہنا ہے، ذرا زور سے کہو تا کہ میں آپ کی بات سن لوں۔''

بڑی بی جو ابھی تک شرمندہ تھیں، یہ جان کر کہ وہ بہرے ہیں، بہت خوش ہوئیں اور آپ سے اونچی آواز میں باتیں کرتی رہیں۔

دوسروں کو بھی اس پر حیرت ہوئی کیونکہ وہ حاتم کے بہرے پن سے واقف نہ تھے لیکن اب آپ بھی سے بہرے بن کر ملتے اور ان کا یہ بہرا پن بڑی بی کی وفات تک قائم رہا لیکن اس وقت تک لوگوں نے آپ کو حاتم اصم (حاتم بہرا) کہنا شروع کر دیا تھا۔

آپ کو اس واقعے پر بڑی حیرت ہوئی کہ آپ نے لفظ اصم خود اختیار کر لیا تھا اور آج بھی تذکرۂ صوفیائے کرام میں حاتم اصم ہی کہلاتے ہیں۔

(ختم شد)

مضمون کے مآخذ

نفحات الانس۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی۔ تذکرۃ الاولیاء۔ شیخ فرید الدین عطار۔ الطبقات الکبریٰ۔ علامہ عبدالوہاب اشعری۔ حکایات شیریں۔ مرتبہ: مجلہ آئینہ لاہور

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

مجھے غصہ بہت جلدی آجاتا ہے جس سے سوچنے سمجھنے کی حس مفقود ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں سب کچھ تباہ و برباد کرنے پر تل جاتی ہوں۔ آپ مجھے نک چڑھا سمجھ رہے ہوں گے؟ میں واقعی ایسی ہوں لیکن مجھے حالات نے ایسا بنا دیا ہے ورنہ دل کی بری نہیں ہوں۔ میرے والد صاحب کپڑوں کی مل کے مالک ہیں اور میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ وہ مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور میں بھی انہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔

غلط فہمی کا شکار ایک لڑکی کا اندھا انتقام

بعض دفعہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے ناقابل تلافی نقصان ہو جاتا ہے... اور اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اکثر آنکھوں کا دیکھا بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے... اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا... وہ سمجھی کہ اس کا شوہر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہے... اور جسے وہ مُردہ سمجھتی تھی وہ زندہ ہے... مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔

غلط فہمی

عمران قریشی

Scanned with CamScanner

اب اپنی مرحومیوں کی بات کرتی ہوں جنہوں نے مجھے نک چڑھا بنا دیا ہے۔ میں ان کی اولاد نہیں ہوں۔ انہوں نے مجھے یتیم خانے سے گود لیا تھا، تب میں صرف پانچ سال کی تھی۔ والد صاحب نے میرا نام تبسم واجد رکھ دیا۔ خوبصورتی کے لحاظ سے میرا کوئی ثانی نہیں ہے۔ میرے سیاہ بال ناگن کی طرح کمر پر جھولتے ہیں، آنکھیں ہرنی جیسی، ناک ستواں اور ہونٹ سیب کی قاشوں کے مانند ہیں۔ رنگ گورا اور قد لمبا۔ جو بھی مجھے دیکھتا ہے، بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اور پھر دیکھنے والے کو شدید جھٹکا لگتا ہے جب وہ مجھے لنگڑا کر چلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ میرے الٹے پاؤں کی ہڈی بچپن میں حادثے کے دوران ٹوٹ گئی تھی۔ یہ حادثہ تب ہوا تھا جب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوائی جہاز پر سفر کر رہی تھی اور والد صاحب کی آنکھ لگ گئی۔ گاڑی کھائی میں جا گری۔ والدین کی موقعے پر ہی موت واقع ہو گئی اور مجھے علاج کے بعد یتیم خانے بھجوا دیا گیا۔ میں وہاں غالباً ایک سال رہی تھی اور بعد میں مجھے واجد علی شاہ نے گود لے لیا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے مجھے اپنے بچوں کی طرح پالا۔

جب میں نے ماسٹر کیا تو والد صاحب کو میری شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ معذوری کے باوجود بھی میری خوبصورتی اور دولت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہزاروں رشتے آ رہے تھے۔ والد صاحب میری شادی کسی اچھی جگہ کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔

انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے انہیں بتایا۔ ''میں یتیم خانے کے کسی ایسے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں جو خوبصورت نہ ہو، چاہے میری طرح معذور ہو۔ پڑھا لکھا ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہاں، سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک ہونا ضروری ہے۔''

والد صاحب نے حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ وہ میری دماغی کیفیت کے متعلق جانتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا تعلق یتیم خانے سے تھا اور میں معذور بھی تھی تو پھر اپنے سے اونچی جگہ پر شادی کیوں کرتی؟ مجھے اپنے جیسے انسان سے شادی کرنا چاہیے تھی اس لیے والد صاحب نے فوراً اقرار میں سر ہلایا اور اگلے دن ہی یتیم خانے کے منیجر ہاشمی صاحب کو گھر بلایا۔ میں ہاشمی صاحب کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ جن دنوں میں یتیم خانے میں تھی، ان دنوں وہ وہیں کام کرتے تھے۔ ہر چند کہ میری عمر بہت کم تھی لیکن میں انہیں پہچانتی ہوں اور پھر والد صاحب کے کپڑوں کے کارخانے سے ہر سال کتنا ہی کپڑا یتیم خانے کے بچوں کو مفت بھجوایا جاتا تھا جسے ہاشمی صاحب کی نگرانی میں درزی سے سلوایا جاتا تھا۔ اس درزی کا تعلق بھی ہمارے کارخانے سے ہی تھا۔ والد صاحب اسے تنخواہ دیتے تھے۔

اگلے دن ہی ہاشمی صاحب کوٹھی پر آ گئے۔ وہ کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ انہوں نے موٹے شیشوں والی عینک لگائی ہوئی تھی تاہم چہرہ اب بھی ہشاش بشاش تھا۔ انہوں نے کبھی بھی یتیم بچوں کا حق مارنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ اپنی تنخواہ میں سے بچوں کو سامان لا دیا کرتے تھے۔ حالانکہ ان کے اپنے چار بچے تھے اور اس لحاظ سے تنخواہ محدود تھی لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے کبھی کسی سے گلہ شکوہ نہیں کیا تھا۔ وہ صابر و شاکر قسم کے انسان تھے۔ میں انہیں دل سے پسند کرتی تھی اور وہ بھی والد صاحب سے میرے متعلق پوچھتے رہتے تھے بلکہ ہفتے دو ہفتے بعد ہماری کوٹھی پر آ جایا کرتے تھے۔

والد صاحب نے انہیں میرے ارادے کے متعلق بتایا تو ان کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پیدا ہوئے پھر اس کی جگہ معنی خیز مسکراہٹ نے لے لی۔ وہ نرم لہجے میں بولے۔

''تو تبسم بیٹی نے اپنا حق ادا کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی کیونکہ اس کا تعلق بھی وہیں سے ہے جس کے متعلق باہر نکلنے کے بعد کوئی بھی بتانا پسند نہیں کرتا ہے۔ میں آپ دونوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے لیے ایسا رشتہ دیکھوں گا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔''

انہوں نے جیب سے موبائل نکالا اور چند لڑکوں کی تصاویر والد صاحب کو دکھائیں۔ والد صاحب نے بے دلی کے ساتھ تصویروں کو دیکھا پھر ہاشمی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں رشتہ کروانے کی ذمے داری آپ پر چھوڑتا ہوں۔ آپ جہاں کہیں گے، میں آنکھیں بند کر کے وہیں رشتہ کر دوں گا۔ بس تبسم کی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے رشتہ تلاش کیجیے گا تاکہ وہ خوش و خرم رہے۔'' پھر انہوں نے میری شرائط کے متعلق انہیں بتا دیا۔

ہاشمی صاحب نے مسکراتے ہوئے موبائل میں سے ایک تصویر نکالی اور والد صاحب کو دکھاتے ہوئے بتایا۔

''اس کا نام سلمان علی خان ہے اور یہ یتیم خانے میں سب کی آنکھوں کا تارا ہے۔ تبسم بیٹی کی شرائط پر پورا نہیں اترتا ہے لیکن میرے خیال میں اس کے لیے مناسب ہے۔ آپ تصویر اسے دکھا دیجیے۔''

https://www.urdutubes.com
Scanned with CamScanner

digest library.com

میں دوسرے کمرے میں بیٹھی ان کی بات چیت کو بخوبی سن رہی تھی۔ والد صاحب موبائل میرے پاس لے آئے، میں نے تصویر دیکھی۔ وہ ایک ایسے نوجوان کی تھی جو انتہائی پرکشش تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور چہرے پر سنجیدگی تھی، قد میرے برابر تھا۔ یہاں بتاتی چلوں کہ تصویر مکمل تھی اس لیے میں نے قد کا اندازہ بخوبی لگالیا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی جو میرے خیال میں ہر یتیم کی آنکھوں میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ بس اسی اداسی نے مجھے گھائل کردیا اور میں نے والد صاحب کو ہاں کردی۔ والد صاحب موبائل لے کر ساتھ والے کمرے میں گئے اور ہاشمی صاحب سے رشتے کے متعلق مزید تفصیلات پوچھنے لگے۔

انہوں نے بتایا۔ ''سلمان کے والدین زلزلے کے دوران ہلاک ہوگئے تھے اور جب اسے یتیم خانے لایا گیا، تب اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی تھا۔ ان دونوں کی حالت بہت خراب تھی، انہیں یتیم خانے کے اسپتال میں منتقل کردیا گیا۔ وہ جلد ہی صحت یاب ہوگئے۔ پچھلے سال اس کے بڑے بھائی کی شادی ہوئی اور اس سال سلمان نے تجسم بیٹی کی طرح ماسٹرز کرلیا۔ وہ بہت ہی فرمانبردار اور محنتی نوجوان ہے، تجسم بیٹی کا ہم عمر ہے اس لیے رشتہ اس کے لیے مناسب ہے۔ میں کل اسے آپ سے ملوانے کے لیے کوٹھی لے آؤں گا۔ باقی جو تجسم بیٹی کی مرضی۔''

والد صاحب نے اثبات میں سر ہلادیا اور ہاشمی صاحب کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد رخصت ہوگئے۔

اگلے دن وہ سلمان کو لے کر کوٹھی آئے اور میں نے پہلی دفعہ اسے دیکھا۔ اس کی شخصیت شاندار تھی لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بس مجھے اس کی سنجیدگی بھا گئی تھی۔ وہ بہت کم گو تھا اور والدین کی ناگہانی موت کے بعد حالات وواقعات نے اسے سنجیدہ بنادیا تھا۔ وہ بہت شرمیلا بھی تھا۔ اس نے مختصر ملاقات کے دوران ایک دفعہ بھی آنکھ اٹھا کر میری جانب نہیں دیکھا۔ مجھے اس کی یہ ادا بھی بھا گئی اور میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ اگر شادی کروں گی تو صرف اس سے ہی کروں گی۔ اس ملاقات کے دوران اس نے صرف ایک سوال پوچھا کہ میں اتنی امیر وکبیر اور خوبصورت ہونے کے باوجود بھی اس سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہوں؟ اسے شاید ہاشمی صاحب نے میرے متعلق نہیں بتایا تھا یا پھر شاید وہ میرے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

میں نے نرم لہجے میں بتایا۔ ''میں بھی تمہاری طرح یتیم ہوں اور جس یتیم خانے میں تمہاری پرورش ہوئی ہے، والدین کی وفات کے بعد مجھے بھی وہیں لے جایا گیا تھا۔ شاید میں ایک سال وہاں رہی پھر واجد علی شاہ نے مجھے گود لے لیا۔ انہوں نے مجھے اپنے بچوں کی طرح پالا۔ اب میں اپنے جیسے کسی یتیم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

سلمان نے طویل سانس لیا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

''آپ یتیم نہیں ہیں، آپ کے سر پر کروڑ پتی باپ کا سایہ ہے لیکن میں بہرحال یتیم ہوں اور بڑے بھائی یا پھر ہاشمی صاحب کے علاوہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ پچھلے سال بڑے بھائی کی شادی ہوئی تب سے اس نے مڑ کر خبر نہیں لی۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کو بھی اپنے فیصلے پر بعد میں پچھتاوا نہ ہو، اس لیے اچھی طرح سوچ لیجیے۔ میں اس سلسلے میں بہت بدنصیب ہوں۔''

مجھے اس کی باتوں نے گھائل کردیا۔ وہ دوسرے یتیم بچوں کی طرح بہت ہی حساس طبیعت کا مالک تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت اچھا اور مخلص ساتھی ثابت ہوسکتا تھا اس لیے میں نے دوبارہ نرم لہجے میں کہا۔

''میں نے فیصلہ اسی وقت کرلیا تھا جب میں نے تمہاری تصویر دیکھی تھی۔ تمہاری آنکھوں میں جو سچائی اور مخلصی ہے، اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس لیے اب مجھے کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شادی کروں گی تو صرف تم سے ورنہ نہیں کروں گی۔''

سلمان علی چپ ہوگیا اور میں نے والد صاحب کو اس کے اقرار سے آگاہ کردیا۔

☆☆☆

اور پھر اگلے ماہ ہم دونوں کی شادی ہوگئی۔ میں ان دنوں کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ وہ میری زندگی کے سب سے اچھے دن تھے جن کا ثانی میری تمام زندگی کے دنوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے اس مختصر عرصے کے دوران میرا دل موہ لیا۔ وہ بہت پیار کرنے والا شوہر ثابت ہوا۔ مجھے اس کا اندازہ پہلے ہی تھا۔ وہ بھی میری طرح پیار کا بھوکا تھا اس لیے اسے میرے علاوہ اور مجھے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ہم شادی کے بعد گھومنے پھرنے کے لیے نل اسٹیشن چلے آئے، وہاں والد صاحب کی کوٹھی تھی جس میں نوکر چاکر کام کرتے تھے۔ ان میں اسلم بھی تھا جو ہمارا ہم عمر تھا۔ وہ مجھ پر زیادہ توجہ دے رہا تھا اور سلمان کو یہ بات قطعی پسند نہیں تھی۔ میں مسکرا کر اسے جلاتی تھی کہ مجھے اپنے نوکروں کی اپنائیت بھلی لگتی ہے اس لیے وہ مجھے بھی زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اور پھر جب اسلم کی بہن نے سلمان

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

کی شخصیت کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا تو میں آگ بگولا ہوگئی۔

سلمان نے طنزیہ لہجے میں مجھے بتایا کہ واقعی تمہارے ٹوکر اپنایت کے معاملے میں دوسروں سے کچھ بڑھ کر ہیں اس لیے ہر ایک میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

میں فوراً اگلے دن سلمان کے ہمراہ کوٹھی واپس آگئی۔ والد صاحب نے غیر متوقع آمد کے متعلق پوچھا تو میں نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنا دیا لیکن سلمان اچھی طرح جان گیا تھا کہ میں کسی بھی لحاظ سے شراکت برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ چاہے یہ شراکت وقتی ہی کیوں نہ ہو۔ انہی دنوں والد صاحب نے بیرونِ ملک ڈاکٹروں سے میری ٹانگ کے متعلق بات چیت کی۔ انہوں نے بتایا کہ ٹانگ میں ٹوٹی ہوئی ہڈی کی جگہ لوہے کا راڈ ڈال کر چال کو متناسب کیا جاسکتا ہے۔ یعنی لنگڑاپن ختم ہوجائے گا اور اس علاج کے لیے مجھے بیرونِ ملک جانا ہوگا۔

میں نے سلمان سے مشورہ کیا تو وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "مجھے تمہاری اس معذوری سے کوئی مسئلہ نہیں ہے تو پھر کیوں اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا کررہی ہو۔ تم جیسی بھی ہو، مجھے دل و جان سے قبول ہو، پھر آپریشن کروانے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تاکہ مل اسٹیشن میں اسلم کی بہن کی طرح کوئی اور تم میں دلچسپی نہ لے۔ تمہیں میرے علاوہ کوئی اور دیکھے، یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔"

اس دفعہ سلمان ہلکے سے مسکرایا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "یہ ہر کسی کا اپنا ذاتی فعل ہے، وہ کسی کو بھی پسند کرسکتا ہے۔ رہی میری بات تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے علاوہ کسی میں بھی دلچسپی نہیں لوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

میں نے سرشاری کے عالم میں اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے تمہارے خلوص اور محبت پر پورا اعتماد ہے لیکن میں تمہاری کی زندگی گزارنا نہیں چاہتی ہوں۔ ہر چند کہ اپنے تمام کام خود کرلیا کرتی ہوں لیکن اس کے باوجود بھی تمہارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے آپریشن کروانا ضروری ہے۔"

سلمان چپ ہوگیا اور اگلے ہفتے ہم تینوں امریکا آگئے۔ والد صاحب نے ڈاکٹروں سے بات چیت کی، میرا چیک اپ ہوا پھر اسپتال میں ایڈمٹ کرلیا گیا۔ آپریشن اتنا پیچیدہ نہیں تھا جتنی کہ اس کے بعد احتیاط تھی اور پھر چونکہ سلمان اور والد صاحب میرے ہمراہ تھے اس لیے مجھے بالکل بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔

چند ہی دنوں بعد آپریشن ہوگیا اور مجھے وارڈ میں منتقل کردیا گیا۔ چونکہ میں مطمئن تھی اور ڈاکٹروں کے علاوہ نرسوں کی پوری فوج میری دیکھ بھال پر متعین تھی اس لیے تیزی کے ساتھ صحت یاب ہونے لگی لیکن انہی دنوں کارخانے میں یونین کے ورکرز نے احتجاج کا آغاز کرتے ہوئے کام کرنے سے انکار کردیا تب والد صاحب نے واپس جانے کے متعلق سوچنا شروع کردیا لیکن سلمان نے انہیں منع کردیا اور اگلے دن کی فلائٹ پکڑ کر ملک واپس چلا گیا۔

میں یکدم اداس ہوگئی۔ آپ یقین نہیں کریں گے لیکن چونکہ میں ایک عورت تھی اس لیے مجھے اس کے یوں جانے پر بہت غصہ آیا اور دل میں برے برے خیالات آنے لگے کہ کہیں کسی لڑکی وغیرہ کا چکر تو نہیں تھا۔ اسلم کی بہن والا واقعہ میرے سامنے تھا۔ اس کی سحر انگیز شخصیت سے کچھ بعید نہیں تھا کہ اس کی جانب کوئی بھی خوبصورت لڑکی کسی بھی وقت راغب ہوجاتی۔ میں نے اسپتال کی نرسوں کو رشک بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کئی ہی دفعہ دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے والد صاحب کو شادی سے پہلے کہا تھا کہ لڑکا خوبصورت شخصیت کا مالک نہیں ہونا چاہیے لیکن باقی صاحب کے اصرار کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے ہاں کردی اور جہاں تک علاج کی بات تھی تو والد صاحب مجھے کتنے عرصے سے علاج کروانے کے متعلق کہہ رہے تھے لیکن میں صاف انکار کردیا کرتی تھی اور اب بھی میں نے اقرار صرف اس لیے کیا تھا تاکہ سلمان کی برابری کرسکوں اور لوگ ہماری جوڑی کو ترحم بھری نگاہوں سے نہ دیکھیں۔

لیکن کہانی کی ابتدا تو یہیں سے ہوئی جب دوسرے دن میں نے ملک واپس جانے کی ضد شروع کردی۔ والد صاحب نے ڈاکٹروں سے بات چیت کی اور انہوں نے چند لمحے پس و پیش کرنے کے بعد اجازت دے دی۔ والد صاحب نے اگلے دن کی فلائٹ میں سیٹیں بک کروالیں اور پھر اسی رات انہیں کارخانے کے منیجر کا فون موصول ہوا جس میں اس نے روح فرسا خبر سنائی کہ ایک حادثے کے دوران سلمان کی موت واقع ہوگئی ہے اور اس کی حالت اس حد تک خراب ہے کہ لاش کو زیادہ دیر رکھا نہیں جاسکتا ہے اس لیے دفنانے کی فوری اجازت دی جائے۔

میں خبر سنتے ہی بے ہوش ہوگئی۔ کارخانے کے منیجر

https://www.urdufanz.com/

Scanned with CamScanner

نے جو تصاویر والد صاحب کو واٹس ایپ پر بھجوائیں، انہیں دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے وہ تصاویر مجھے نہیں دکھائیں کیونکہ وہاں گوشت کے لوتھڑوں کا جو ملغوبا دکھائی دے رہا تھا وہ کسی طرح بھی سلمان کا نہیں لگتا تھا۔ اسے پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ کارخانے کے منیجر کے کہنے کے مطابق ہائی وے پر ایکسیڈنٹ کے دوران دس وہیلر ٹرک گاڑی کے اوپر چڑھ گیا تھا اس لیے گاڑی کو کاٹ کر لاش کو بہ مشکل تمام باہر نکالا گیا تھا۔

والد صاحب نے منیجر کو لاش دفنانے کی اجازت دے دی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں لاش کو دیکھوں۔ اگر میں دیکھ لیتی تو شاید جیتے جی مر جاتی اس لیے لاش کو تابوت میں ڈال کر دفنا دیا گیا اور جب ہم اگلے دن ملک واپس آئے تو میری ہنستی کھیلتی دنیا برباد ہو چکی تھی۔ میں نے والد صاحب سے چھپ کر سگریٹ پینا شروع کر دی اور شاید ایک دو دفعہ شیشے کا نشہ بھی کیا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تب بھی میں سلمان کی محبت کو فراموش نہیں کر سکی۔ وہ میرے حواسوں پر طاری ہو چکا تھا۔

میں نے اس کی تمام تصاویر جلا دیں لیکن دل کا کیا کرتی جس میں وہ ہر دم موجود تھا۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ تب میں نے پہلی دفعہ شراب پی۔ ہماری کوٹھی میں ایک عورت نجمہ کام کرتی تھی جس کا شوہر شرابی تھا۔ میں نے اسے ہزاری رقم دے کر شراب کی بوتل منگوائی تھی اور ایک ہی رات میں تمام ختم کر دی تھی۔ وقتی طور پر مجھ پر نشہ چڑھا اور میں نے سلمان کو ایک رات کے لیے بھلا دیا۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ میں نجمہ کو رقم دیتی اور وہ مجھے شراب کی بوتل لا دیتی۔ میں تمام رات غم غلط کرنے کے لیے شراب نوشی کرتی اور صبح میری حالت خراب ہو جاتی تھی اس لیے جلد ہی والد صاحب کو پتا چل گیا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ انہوں نے فوراً نجمہ کو کام سے نکال دیا اور روتے ہوئے مجھے سمجھانے لگے۔

"سلمان مر گیا ہے لیکن تم تو زندہ ہو نا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری وجہ سے میں بھی مر جاؤں، تب تم بالکل ہی تنہا رہ جاؤ گی۔" وہ چند لمحوں کے لیے چپ ہوئے پھر آنسو پونچھتے ہوئے دوبارہ بولے۔ "مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جایا کرتے۔ کچھ لحاظ ان کا بھی کرنا چاہیے جو زندہ ہیں۔ میں جلد تمہاری شادی کر دوں گا۔ انکار کر کے مجھے دلبرداشتہ نہ کرنا اور مجھ سے وعدہ کرو کہ تم دوبارہ شراب نوشی نہیں کرو گی۔"

ان کے رونے کی وجہ سے میرا دل پسیج گیا۔ واقعی میں نے اب تک ان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ

نورا کشتی

بہت زمانہ گزرا، روم کے ایک نوجوان نے کسی بات پر طیش میں آ کر اپنے دوست کو قتل کر دیا۔ روم کا قانون تھا کہ لوگ بیویوں کو قتل کرنے کے علاوہ اگر کسی اور کو قتل کرتے تھے تو انہیں ایک بڑی سی تماشا گاہ میں ہزاروں تماشائیوں کی موجودگی میں بھوکے شیر کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ روم والے اس بربریت کو "کشتی" کہا کرتے تھے۔

پس اس نوجوان کو بھی گرفتار کر کے تماشا گاہ لے جایا گیا اور پورا کا پورا شہر کشتی دیکھنے کے لیے تماشا گاہ کی فصیلوں پر اکٹھا ہو گیا۔ وقتِ مقررہ پر بادشاہ نے اشارہ کیا۔ بھوکے شیر کو کھول دیا گیا، کشتی کا آغاز ہو گیا۔

غراتا ہوا شیر تیزی سے نوجوان کی طرف لپکا۔ نوجوان کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اچھل کر شیر کے منہ پر تھوک دیا۔ حسنِ اتفاق سے اس کا تھوک ٹھیک شیر کی آنکھوں میں پڑا۔ تیزی سے دوڑتا ہوا شیر ایک لمحے کے لیے اندھا ہو گیا اور اپنی جھونک میں اتنی قوت سے دیوار سے جا ٹکرایا کہ اس کا سر پھٹ گیا اور بھیجا باہر نکل پڑا۔

شہر والوں نے مردہ شیر کو دیکھا تو سب کے سب غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم آواز ہو کر چلائے۔

"نہیں چلے گی، نہیں چلے گی، نورا کشتی نہیں چلے گی۔"

(مرسلہ: پرویز احمد، ملتان)

مسیحا

ایک ڈاکٹر کسی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کسی دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ واپسی پر جب دوست سے اس کی ملاقات ہوئی تو کہنے لگا۔ "یار! معاف کرنا کہ تمہیں اطلاع دیے بغیر میں شہر سے باہر چلا گیا، ابھی آ رہا ہوں۔"

"ہاں، مجھے بھی مقامی اخبارات کے ذریعے معلوم ہو گیا تھا کہ گزشتہ دو ہفتوں میں مرنے والوں کی تعداد برائے نام رہ گئی ہے۔"

(مرسلہ: حنا خان، مری)

https://www.urdutube.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

ٹھیک کہہ رہے تھے۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ [illegible] جانا [illegible] کی جا سکتا تھا۔ میں نے والد صاحب سے وعدہ کیا کہ دوبارہ شراب نوشی نہیں کروں گی تاہم وہ مجھے دوسری شادی کے لیے مجبور نہ کریں۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

اگلے دن میں سلمان کی قبر پر گئی اور وہاں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تنہا ہو گئی ہوں لیکن جب میں قبرستان سے واپس کوٹھی آئی تو کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ میں نے دل میں تہیہ کیا کہ آئندہ والد صاحب کو پریشان نہیں کروں گی۔ ان کے مجھ پر بہت احسانات تھے۔ میں سلمان کو کبھی بھی بھلا نہیں سکتی تھی لیکن والد صاحب کی خاطر مجھے بھلانا تھا۔

میری ٹانگ کا زخم تیزی کے ساتھ بھرنے لگا تھا اور مجھے اب چلنے پھرنے میں زیادہ تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا لیکن احتیاطاً تمام زندگی کرنا تھا۔ میری معذوری ختم ہو گئی تھی لیکن زندگی کو گرہن لگ گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر والد صاحب نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ میں شادی کر لوں لیکن میں سلمان کو بھلانے کی کوشش کرنے کے باوجود بھی بھلا نہیں پائی تھی اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ والد صاحب نے ایک دفعہ پھر ہاشمی صاحب کی خدمات حاصل کیں اور اگلے دن ہی انہیں کوٹھی پر بلا لیا۔ میں ان کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی اس لیے وہ میرے کمرے میں آ گئے اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پُرشفقت لہجے میں بولے۔

"کسی کے مرنے سے دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔ اور بہت سے انسان ہیں جن کا تم پر اور تمہارا ان پر حق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور بہتر انسان خدا نے تمہارے لیے منتخب کیا ہو تو پھر اس کی حق تلفی نہ کرنا۔ میں تمہیں تصویر بھیجتا ہوں، اسے ایک دفعہ ضرور دیکھ لینا۔ وہ یتیم خانے میں تمہارے ساتھ ہی لایا گیا تھا اور تمہاری طرح اس کے ماں باپ بھی حادثے کا شکار ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ہی کمرے میں ایک سال رہا تھا اور تم اس کے ساتھ تمام دن کھیلا کرتی تھیں۔ اس کا نام سجاد احمد ہے اور وہ آج فرید کوٹ میں انسپکٹر کی ملازمت حاصل کر چکا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہاشمی صاحب نے اس کی تصویر میرے موبائل پر سینڈ کر دی، پھر کچھ دیر سمجھانے بجھانے کے بعد کمرے سے باہر چلے گئے، تب مجھے دھندلا دھندلا یاد آیا۔ میں اس معصوم لڑکے کے ساتھ چھپن چھپائی کھیلا کرتی تھی اور جب وہ مجھے ڈھونڈ نہیں پاتا تھا تب رونے لگ جایا کرتا تھا۔ وہ بیوقوف سا لڑکا نہ جانے انسپکٹر کیسے بن گیا تھا۔ میں نے موبائل پر تصویر نکال کر دیکھی۔ وہ عام روایتی پولیس والوں کے مانند توند نکلا ہوا نہیں تھا بلکہ دبلا پتلا اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ اس پر پولیس کی وردی سج رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی اور وہ کیمرہ شیئر کیے ہوئے تھا۔ اس میں اور سلمان میں زمین آسمان کا فرق تھا، لیکن مجھے اس کی مسکراہٹ اچھی لگی اور میں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے شادی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن میں والد صاحب کو خوش دیکھنا چاہتی تھی اس لیے میں نے فون کر کے ہاشمی صاحب کو اپنے ارادے سے آگاہ کرتے ہوئے ملاقات کے متعلق دریافت کیا۔

ہاشمی صاحب نے بتایا کہ وہ کل صبح میری کوٹھی پر آ جائے گا، وہ چھٹی پر آیا ہوا ہے ورنہ فرید کوٹ یہاں سے کافی دور ہے۔ اچھا ہے، بات چیت کر کے واپس چلا جائے گا۔ میں نے موبائل بند کر دیا اور والد صاحب کو سجاد احمد کی آمد کے متعلق بتا دیا۔ ان کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات پیدا ہو گئے جسے دیکھ کر میں بھی مطمئن ہو گئی لیکن اطمینان میرے نصیب میں کہاں تھا۔ کہانی کا اصل رخ تو یہاں سے شروع ہونے والا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ صبح گیارہ بجے ہی ہماری کوٹھی پر آ گیا۔ اپنی شخصیت کا مالک تھا لیکن سلمان کے سامنے اس کی شخصیت ماند پڑتی دکھائی دیتی تھی۔ والد صاحب نے کچھ دیر روایتی بات چیت کرنے اور ہمیں تنہائی میں ایک دوسرے کو پرکھنے کا موقع دیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اب ہم دونوں ڈرائنگ روم میں تنہا تھے۔

اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ [illegible] یتیم خانے میں مجھ سے چھپ جایا کرتی تھیں اور میں تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں لیکن ہاشمی صاحب نے اتنا بتایا ہے۔"

میں نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں، میرے ساتھ ایک لڑکا اور بھی تھا جس کا نام سلمان علی خان تھا۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو لیکن میں اسے بھلا نہیں سکتی کیونکہ کچھ عرصہ قبل میری اس سے شادی ہوئی تھی اور پھر وہ حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ میرے خیال میں تمہیں ہاشمی صاحب نے اس کے متعلق بتایا ہو گا؟"

سجاد احمد نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ انہوں نے

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

صرف اتنا بتایا ہے کہ تمہاری شادی پہلے ہو چکی ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ شوہر مر گیا ہے اور اس کا تعلق یتیم خانے سے تھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر مجھے اسے پہچان لینا چاہیے۔ کیا تمہارے پاس اس کی کوئی تصویر ہے؟"

میں نے موبائل سے تصویر نکال کر اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ یہ وہی تصویر تھی جو ماشی صاحب نے شادی سے قبل مجھے بھجوائی تھی اور جسے دیکھ کر میں سلمان کو اپنا دل دے بیٹھی تھی۔

سجاد احمد نے تصویر پر نگاہ ڈالی پھر اس کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ میں اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا یہ واقعی مر چکا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا تم نے میت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی؟"

میرے چہرے پر تعجب کے آثار پیدا ہوئے۔ مجھے اس کا سوال سمجھ نہیں آیا تاہم میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "نہیں۔ جس وقت حادثہ ہوا، میں بیرونِ ملک علاج کے لیے گئی ہوئی تھی اور لاش کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے زیادہ دیر رکھا جا سکتا اس لیے فوراً دفنا دیا گیا۔"

سجاد احمد کے چہرے پر سوچ کی لکیریں پیدا ہوئیں اور یکلخت اس کے چہرے پر پولیس والوں کی روایتی سختی نمودار ہو گئی۔ بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے دوبارہ پوچھا۔ "تو کیا لاش کو جس کی حالت بہت خراب تھی، اسے تمہارے والد صاحب نے بھی نہیں دیکھا؟"

میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟ والد صاحب میرے ساتھ بیرونِ ملک تھے، وہ لاش کو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن ان کے موبائل پر تصاویر بھجوائی گئی تھیں۔ لاش کی حالت بہت خراب تھی اس لیے تصاویر مجھے نہیں دکھائی گئیں۔"

سجاد احمد نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ "اس آدمی کو جسے تم سلمان علی خان کہہ کر پکار رہی ہو، میں نے چند دن پہلے فرید کوٹ کے بازار میں ایک حسین و جمیل لڑکی کے ہمراہ گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔ مجھے یاد اس طرح ہے کہ فرید کوٹ میں ہیلمٹ نہ پہننے پر کارروائی کی جا رہی ہے اور اس شخص نے ہیلمٹ نہیں پہنا تھا اس لیے میرے اہلکاروں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے اور اس کی ساتھی لڑکی نے پولیس والوں سے بدتمیزی کی۔ میں اتفاقاً وہاں سے کے لیے بازار چلا آیا۔ چونکہ اس کے ساتھ لڑکی تھی اس لیے میں نے اسے چالان کے بغیر جانے دیا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ اگر میں چالان کر دیتا تو اس کے ایڈریس کے متعلق بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ بہرحال یہی تھا۔ اس میں اور بغیر ہیلمٹ والے لڑکے میں رتی برابر فرق نہیں ہے۔ تم نے اس کی لاش نہیں دیکھی اور جسے دفنایا گیا، وہ میرے خیال میں سلمان علی خان نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ فرید کوٹ میں رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ میں جلد تمہیں اس کے متعلق معلوم کر کے بتاؤں گا۔"

میرے چہرے پر زلزلے کے تاثرات تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، ویسا ہو سکتا ہے لیکن سلمان کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہر چند کہ اس کی شخصیت شاندار تھی اور اس میں کوئی بھی لڑکی دلچسپی لے سکتی تھی لیکن وہ بے وفا نہیں تھا اور پھر اگر اسے کوئی اور لڑکی پسند آ گئی تھی تو وہ مجھ سے بات چیت کر سکتا تھا، اتنا لمبا چوڑا ڈراما رچانے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اس کے باوجود بھی میرا دل بدظن ہو گیا۔ تمام مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مجھے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سجاد احمد سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اگر میں اس سے شادی کر لیتی تو میرے خیال میں وہ بھی یہی سب کچھ کرتا۔ تو پھر شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اچھی خاصی تنہائی میں زندگی گزر رہی تھی۔

میں نے سامنے بیٹھے ہوئے سجاد احمد کو مخاطب کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "تمہیں اسے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ جو مر گیا، وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا ہے اس لیے جسے تم نے دیکھا ہے، وہ کوئی اور ہوگا۔ میری طبیعت کچھ ناساز ہے اس لیے میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ اس معاملے میں تمہارے ساتھ ماشی صاحب خود بات کریں گے۔"

سجاد احمد نے حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا لیکن میں بے رخی کے ساتھ صوفے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ کب واپس گیا، مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن میرے دماغ میں شک کے پودے کا بیج بو گیا۔ میں نے واقعی سلمان کی لاش نہیں دیکھی تھی اس لیے یہ بھی بات نہیں تھی کہ جسے دفنایا گیا تھا، وہ واقعی سلمان تھا۔ مجھے اسے تلاش کرنے کے لیے فرید کوٹ جانا چاہیے تھا تاکہ معاملے کے متعلق پتا چل سکے کہ وہ زندہ ہے یا پھر واقعی مر گیا ہے۔

میری [illegible] تھی اور میں ڈرائیونگ کر سکتی تھی۔ فرید کوٹ اتنا بڑا شہر نہیں تھا جہاں [illegible] ڈھونڈ نہ پاتی۔ اگر وہ وہاں تھا تو پھر مجھ سے بچ کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ عدہ ہو گئی تھی۔ میں اسے بھلانے کے لیے شراب پی رہی تھی،

https://www.urdutube.com

Scanned with CamScanner

میری راتوں کی نیند اڑ چکی تھی اور وہ فرید کوٹ میں کسی حسینہ کے ساتھ مجھے اڑا رہا تھا۔ غصے کی وجہ سے مجھے تمام رات نیند نہیں آئی اور دوسرے دن میں نے والد صاحب کو جھوٹ کہا کہ میں فرید کوٹ سجاد احمد کے متعلق معلومات کرنے کے لیے جا رہی ہوں۔ میں اس دفعہ شادی سوچ سمجھ کر کرنا چاہتی ہوں اس لیے کچھ عرصہ معلومات کروں گی۔

والد صاحب نے مجھے بتایا کہ فرید کوٹ میں ان کی کوٹھی ہے۔ میں وہاں ٹھہر سکتی ہوں اور یہ کہ مجھے اپنی ٹانگ کے متعلق احتیاط کرنا ہوگی۔ وہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔

میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں زیادہ چلنے پھرنے سے پرہیز کروں گی۔ اگر کہیں جانا ہوا تو گاڑی پر جاؤں گی۔

وہ مطمئن تو نہیں ہوئے لیکن بہرحال انہوں نے زیادہ بات چیت نہیں کی اور میں اگلے دن ہی گاڑی میں بیٹھ کر فرید کوٹ آ گئی۔ والد صاحب نے ہر اس شہر میں کوٹھیاں بنا رکھی تھیں جہاں ان کے کارخانے کے جوتوں کا ڈسٹری بیوٹنگ سینٹر بنا ہوا تھا۔ وہ وہاں وزٹ کے لیے جاتے رہتے تھے اور فرید کوٹ میں ڈسٹری بیوٹنگ سینٹر تھا جو زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن اس کی سیل قابلِ رشک تھی۔ میں کوٹھی آ گئی۔ وہاں چند ملازم اس کی دیکھ بھال کے لیے متعین تھے۔ انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

میرے دماغ میں کوئی خاص لائحہ عمل نہیں تھا۔ اگر وہ اس شہر میں تھا اور مجھ سے فرار ہونے کے لیے وہاں چھپا ہوا تھا تو اسے تلاش کرنے کے بعد میں اپنے ساتھ واپس نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے کبھی بھی شراکت برداشت نہیں کی تھی اور اس نے شریک بنا لیا تھا۔ میں صرف اس کے چہرے پر تھوکنا چاہتی تھی یا پھر اس حسینہ سے ملنا چاہتی تھی جس کی خاطر اس نے مجھے ٹھکرایا تھا۔ یہ سب وہ سوچیں تھیں جو سجاد احمد سے ملاقات کے بعد میرے دماغ میں پیدا ہو گئی تھیں لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ ایسا کچھ بھی نہ ہو اور وہ سلمان نہ ہو۔ تاہم پولیس والوں سے ایسی غلطی بھی ہونا ممکن نہیں اس لیے میں فرید کوٹ آ گئی اور میں نے اگلے دن سے ہی تلاش کا آغاز کر دیا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں نے گاڑی باہر نکالی اور شام تک سڑکوں پر پھرتی رہی۔ مجھے ٹانگ میں درد کا احساس بھی ہوا لیکن میں نے نظر انداز کر دیا اور شام کو مقصد میں ناکام ہونے کے بعد تھکی ہاری کوٹھی واپس آ گئی۔ نوکروں نے مجھ سے کھانے کے متعلق دریافت کیا، میں نے صاف انکار کر دیا حالانکہ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ مقصد میں ناکامی نے مجھے چڑچڑا بنا دیا تھا اس لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔ ٹانگ میں بھی تکلیف زیادہ ہو گئی تھی۔ میں تمام دن ڈرائیونگ کرتی رہی تھی، میں نے بالکل بھی آرام نہیں کیا تھا۔

اگلے دن میں نے نوکروں کو موبائل میں موجود تصویر دکھائی اور ان سے پوچھا کہ انہوں نے اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے؟ انہوں نے انکار کر دیا۔ میں پاگل ہو گئی تھی۔ پولیس والوں سے رابطہ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہاں سجاد احمد تھا اور میں اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی اس لیے فرید کوٹ میں واقع جوتوں کے ڈسٹری بیوٹنگ سینٹر میں آ گئی۔ وہاں نعیم صاحب سینٹر کو سنبھال رہے تھے۔ میں نے موبائل والی تصویر دکھا کر اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بھی انکار میں سر ہلا دیا لیکن پھر موبائل لے کر وہاں کام کرنے والے لڑکوں کو دکھا کر ان سے تصویر کے متعلق پوچھنے لگے۔ لڑکوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تو میں موبائل لے کر ڈسٹری بیوٹنگ سینٹر سے باہر آ گئی۔ اس کے بعد گاڑی لے کر سڑکوں پر اسے تلاش کرتی رہی اور شام کو کوٹھی پر واپس آ گئی لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ سجاد احمد نے مجھے بدظن کرنے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ دراصل وہ میری محبت کو محسوس کر کے سلمان سے حسد کرنے لگا تھا اس لیے اس نے من گھڑت کہانی سنا کر میری محبت کو ختم کرنے کی ناکام کوشش کی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اس سے کس حد تک محبت کرتی تھی۔ ان اوچھے ہتھکنڈوں کی وجہ سے میری محبت کم نہیں ہو سکتی تھی بلکہ شاید کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب سجاد احمد سے شادی نہیں کروں گی۔ جو انسان شادی سے پہلے جھوٹ بول کر دھوکا دے سکتا ہے تو وہ شادی کے بعد بھی یہ سب کر سکتا ہے اس لیے انکار کر دینا بہتر تھا۔ ویسے بھی میں اب دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ والد صاحب کا اچھا خاصا کاروبار تھا، میں اسے سنبھال کر ان کا ہاتھ بٹا سکتی تھی۔

میں نے اگلے دن واپس جانے کے متعلق سوچا اور کمرے میں آ گئی۔ تب موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین پر نگاہ ڈالی، وہاں سجاد احمد کا نمبر موجود تھا۔ میں نے کال کاٹ دی۔ کچھ دیر بعد واٹس ایپ پر اس کا میسج موصول ہوا۔ میں نے پڑھا لکھا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم فرید کوٹ میں ہو اور سلمان کو تلاش کر رہی ہو۔ وہ یونیورسل کمپلیکس کے سامنے کنگ روڈ کے مکان نمبر ستائیس میں رہائش پذیر ہے۔ تمہیں شاید میری بات کا یقین نہیں آئے گا اس لیے میں ویڈیو بھجوا رہا ہوں، تم

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

دیکھ سکتی ہو۔"

تحریر کے نیچے ویڈیو موجود تھی، میں نے دیکھی تو میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ وہ واقعی سلمان تھا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر فرید کوٹ کی سڑکوں پر دندناتا پھر رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک حسین و جمیل دوشیزہ بیٹھی تھی جس کے بال کھلے ہوئے تھے اور ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر گلاسز لگا رکھے تھے۔ سلمان کی صحت پہلے کی نسبت بہتر تھی اور چہرے پر خوشی اور اطمینان چھلکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ویڈیو پولیس کی پیٹرولنگ وین کے پیچھے بیٹھ کر بنائی گئی تھی اس لیے صاف بنی تھی اور جب سلمان نے پیٹرولنگ وین کو کراس کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اس کا چہرہ بالکل صاف دکھائی دیا۔ لڑکی اونچی آواز میں بات کر رہی تھی یعنی وہ دونوں بہت خوش تھے۔

میرے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ میرے ساتھ جو دھوکا ہوا تھا، مجھے اب بھی اس پر یقین کرنے کا دل نہیں کر رہا تھا لیکن سب کچھ فلم کی صورت میں میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ بارہ بجنے والے تھے، اس وقت کنگ روڈ جانا مناسب نہیں تھا اس لیے میں بیڈ پر لیٹ گئی۔ مجھے شدت کے ساتھ شراب کی طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن اس چھوٹے سے شہر میں شراب کہاں سے مل سکتی تھی۔ میں نے سائڈ ٹیبل میں سے نیند کی گولیاں نکالیں اور دو گولیاں اکٹھی کھانے کے بعد بیڈ پر لیٹ گئی۔ میرے دماغ میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ وہ اگر مجھے چھوڑنا ہی چاہتا تھا تو پھر اس نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی۔ میرے خیال میں اس پر کسی نے زور زبردستی نہیں کی تھی؟ جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ ہم دونوں کی مرضی سے ہوا تھا اور جس طرح وہ عورت اس سے ہنس ہنس کر بات چیت کر رہی تھی، اسے دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کے تعلقات پرانے تھے اور وہ ایک دوسرے کو بہت پہلے سے جانتے تھے۔ تو پھر اس نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟ اور اگر کر بھی لی تھی تو پھر یہ ڈراما رچانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ وہ اگر مجھے چھوڑ کر اس عورت کو اپنانا چاہتا تھا تو بات چیت کر کے ایسا کر سکتا تھا۔ اس گتھی کو سلجھانا میرے لیے ممکن نہیں تھا اور دو گولیاں کھانے کے باوجود بھی نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں تمام رات جاگتی رہی اور صبح چھ بجے میری آنکھ لگ گئی۔ میں بارہ بجے سو کر اٹھی۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے خالی پیٹ ہی درد کی گولی کھائی اور ناشتا کیے بغیر گاڑی نکال کر کنگ روڈ کی طرف چل دی۔

سر کا درد کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔ جون، جولائی کی تیز اور چمکتی ہوئی دھوپ میری آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ مجھے متلی کی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ میں نے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھی ہوئی منرل واٹر کی بوتل کو کھولا اور تمام پانی حلق میں انڈیل لیا۔ میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا، پانی نے اسے تر کر دیا لیکن متلی کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میں نے گاڑی کو سائڈ پر روکا اور نالی کے پاس بیٹھ کر سب پیا ہوا پانی باہر اگل دیا۔ سر کے درد میں کچھ افاقہ محسوس ہوا اور میں گاڑی میں بیٹھ کر دوبارہ کنگ روڈ کی طرف چل دی۔ وہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

یہ درمیانے درجے کی آبادی تھی جو یونیورسل کمپلیکس کے قریب واقع تھی۔ پولیس اسٹیشن کی عمارت اس کے ساتھ ہی تھی اسی لیے سجاد احمد نے سلمان کو آتے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں دو دفعہ کمپلیکس کے قریب سے گزری تھی لیکن میرا سامنا سلمان سے نہیں ہوا تھا۔

مکان نمبر ستائیس کنگ روڈ کے قریب کی گلیوں میں تھا۔ وہ دو منزلہ تھا اور کافی خوبصورت تھا۔ اسے خریدنے کے لیے اس کے پاس رقم کہاں سے آئی؟ یقیناً اس نے والد صاحب کے اکاؤنٹ سے وقتاً فوقتاً نکالی ہوگی یا پھر جس عورت کے ساتھ اس نے شادی کی ہے، یہ مکان اس کی ملکیت ہوگا۔

میرے سر میں دوبارہ درد شروع ہو گیا۔ اب کی دفعہ ایسا محسوس ہوا جیسے دونوں آنکھیں درد کے مارے پھٹ کر باہر آ جائیں گی۔ حلق دوبارہ خشک ہونے لگا لیکن اب میرے پاس پینے کے لیے پانی نہیں تھا۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ قریب ہی ایک پرچون کی دکان تھی۔ مجھے وہاں سے منرل واٹر کی بوتل مل سکتی تھی۔

ابھی میں گاڑی سے اترنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ مکان کا دروازہ کھلا اور سلمان موٹر سائیکل لیے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے وہ لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں ہنس ہنس کر بات چیت کر رہے تھے۔ لڑکی بے تحاشا خوبصورت تھی بلکہ شاید مجھ سے کچھ زیادہ تھی اس لیے سلمان نے اسے مجھ پر ترجیح دی تھی۔

وہ دونوں موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے اور میری گاڑی کے قریب سے ہو کر آگے نکل گئے۔ میں نے گاڑی موڑی اور ان کا پیچھا کرنے لگی۔ وہ یونیورسل کمپلیکس کی عمارت کے قریب سے ہو کر آگے بڑھے اور پولیس اسٹیشن کے سامنے سے ہوتے ہوئے بازار کی طرف آ گئے۔ یقیناً وہ دونوں

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

خریداری کے لیے جارہے تھے۔ لڑکی کے ریشمی بال ہوا میں اڑ رہے تھے جنہیں وہ بمشکل تمام سنبھال رہی تھی۔ اس نے آج بھی سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ وہ سلمان کے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ کمر کے گرد حائل کیا ہوا تھا اور پھر وہ کسی بات پر کھلکھلا کر ہنسی اور اس نے سلمان کے جسم کو بے اختیار دونوں بازوؤں کے گھیرے میں بھینچ کر زور سے دبایا۔

میرا خون کھولنے لگا۔ معاملہ میری برداشت سے باہر ہوگیا۔ ان دونوں کی اٹکھیلیاں میرے دماغ پر بم کی طرح گر رہی تھیں، سر کا درد مزید بڑھ گیا، متلی کی کیفیت میں بھی اضافہ ہوا۔ رات کی نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میرے جسم میں پہلے درد ہو رہا تھا اور میرے دل میں سلمان کے لیے نفرت اور زیادہ بڑھ گئی۔ اس نے اس اثنا میں موٹر سائیکل کو تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے لہرایا۔ اس کے پیچھے بیٹھی لڑکی نے خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کی اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میری دماغی کیفیت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میں نے گاڑی کے اسٹیئرنگ کو دائیں جانب گھما دیا۔ گاڑی کا سائڈ والا بمپر پوری قوت کے ساتھ موٹر سائیکل سے ٹکرایا۔ وہ بے اختیار ہو کر لہرائی اور سامنے سے آتے ہوئے ٹرک کے نیچے گھس گئی۔ میں نے بریک لگا کر گاڑی کو روک لیا اور تیز تیز سانس لیتے ہوئے اپنے سر کو اسٹیئرنگ پر گرا دیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ آگے کیا ہوا۔ جب ہوش آیا تو میں کوٹھی میں تھی اور میرے ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ والد صاحب اور ہاشمی صاحب بیڈ کے قریب کھڑے تھے۔ بیڈ کے دوسری جانب سجاد احمد بھی اپنے دو اہلکاروں کے ہمراہ کھڑا تھا۔

مجھے ہوش میں آتا ہوا دیکھ کر والد صاحب بولے۔ ”شکر ہے تم نے آنکھیں کھول دیں ورنہ تمہاری دماغی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ تم بات چیت بھی کر سکتیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم فرید کوٹ یہ سب کرنے کے لیے آئی ہو ورنہ میں تمہیں کبھی یہاں نہیں آنے دیتا۔“

میں نے بے اختیار ہو کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن دماغ میں اٹھنے والی ٹیس کی وجہ سے واپس لیٹ گئی۔

والد صاحب نے کہا۔ ”لیٹی رہو، تمہیں آرام کی اشد ضرورت ہے۔ میں کل تمہیں واپس کوٹھی لے جاؤں گا۔“

میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں قریب کھڑے ہوئے سجاد احمد سے پوچھا۔ ”سلمان کا کیا ہوا؟ میری گاڑی اس کی موٹر سائیکل سے ٹکرائی تھی۔ وہ دونوں نیچے گر گئے تھے۔“

سجاد احمد نے تیکھی نگاہوں سے والد صاحب کی جانب دیکھا۔ انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔

میں نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مر چکے ہیں۔ اگر نہیں مرے تو میں انہیں دوبارہ مارنے کی کوشش کروں گی۔ اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“

ہاشمی صاحب دلگرفتہ لہجے میں بولے۔ ”بیٹی! یہ تم نے کیا ظلم کر دیا ہے۔ اگر یہاں آنے سے پہلے مجھ سے مل لیتیں تو یہ قیامت نہ آنے پاتی۔“

میں نے نا سمجھنے والے انداز میں ان کی جانب دیکھا۔ وہ شرمندے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”میں نے تمہاری شادی سے قبل تمہیں بتایا تھا کہ سلمان علی خان کا بڑا بھائی نعمان علی خان بھی ہے لیکن میں تمہیں یہ بتانا بھول گیا کہ وہ دونوں جڑواں بھائی تھے اور جسے تم نے بیدردی کے ساتھ ہلاک کیا ہے، وہ سلمان علی خان نہیں بلکہ اس کا بڑا بھائی نعمان علی خان تھا۔ اس نے تمہاری شادی سے کچھ عرصہ قبل فرید کوٹ میں شادی کی تھی۔ تم نے اسے سلمان سمجھ کر ہلاک کر دیا۔ یہ کسی قیامت سے کم نہیں ہے۔“

مجھے زور کا چکر آیا اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کسی نے دماغ کی رگوں کو بیدردی کے ساتھ جھنجوڑ کر رکھ دیا ہو۔ میں نے بے اختیار ہو کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ درد کی بدولت میری آنکھیں پھٹنے لگیں۔ میں نے چلانے کی کوشش کی لیکن آواز گلے میں دب کر رہ گئی اور پھر میں دوبارہ بے ہوش ہوگئی۔ اس کے بعد کے واقعات کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ والد صاحب بتاتے ہیں کہ میں پاگل ہوگئی تھی اس لیے مجھے پاگل خانے بھجوا دیا گیا۔ میں شاید وہاں سال بھر رہی تھی، اس کے بعد مجھے ڈسچارج کر دیا گیا اور میں گھر آگئی۔ مجھ پر قتل کا مقدمہ چلا لیکن میری دماغی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف جرمانے کی رقم عائد کرنے کے بعد بری کر دیا گیا اور صحت یاب ہونے کے بعد میں نے سجاد احمد سے شادی کر لی لیکن آج بھی دماغ کے کسی نہاں گوشے میں سلمان کی محبت موجود ہے جسے میں نکال دینے کی کوششیں کرنے کے باوجود بھی نکال نہیں سکوں گی اور جب بھی اس کے متعلق سوچتی ہوں تو دماغ میں ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں اور میں بے اختیار ہو کر سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر آنکھیں بند کر لیتی ہوں کیونکہ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کر سکتی ہوں۔

✖✖✖

https://www.urdufunbooks.com/

Scanned with CamScanner

معمولاتِ زندگی کو بے جان چیزوں سے منفی کرنے والی لڑکی کا وہم

وہم... جس کا علاج کسی کے پاس بھی نہیں... اکثر زندگی میں اچھے بُرے واقعات کو ہم چیزوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں کہ یہ سب فلاں چیز کی وجہ سے ہوا جبکہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے... اور جب آنکھوں سے دھند چھٹتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ ہم کتنی غفلت میں تھے۔

وہم

عسیوق بخاری

"تم نے اپنا سامان پیک کرلیا؟" الماری سے چیزیں نکالتے ہوئے سیلی نے سوال کیا۔

"پیک تو کرلیا ہے لیکن چند ڈریسز اور جیولری جو ہم خرید کر لائے ہیں، ان کے لیے الگ سے ایک اور چھوٹا بیگ لینا پڑے گا۔" کافی کا خالی کپ سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے باربرا نے جواب دیا۔

"اوہ پلیز! زیادہ سامان مت لو۔ انجوائے کرنے جارہے ہیں، وزن اٹھا کر اِدھر سے اُدھر کرنے نہیں۔ کوشش کرو کہ ایک ہی بیگ ہو۔" سیلی نے گویا فریاد کی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر باربرا کی طرف مڑ گئی۔

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے، میں کوشش کرتی ہوں کہ سارا سامان ایک ہی بیگ میں ٹھونس لوں۔" باربرا نے ہنس کر کہا۔

"لو جی، میری تیاری تو ہوگئی، بس انگوٹھی نکال لوں۔" سیلی کہتے ہوئے بیڈ کے قریب بیٹھ گئی اور دراز کو کھولا۔

Scanned with CamScanner

"کون سی انگوٹھی؟" باربرا نے عام سے انداز میں سوال کیا۔

"بڑی خاص انگوٹھی ہے۔" سیلی نے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" باربرا چونکی۔

"تم اس انگوٹھی کے متعلق سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ میں نے جب سے خریدی ہے تب سے اس کے بغیر کبھی کہیں نہیں گئی۔ مارکیٹ یا گلی میں تو چلی جاتی ہوں لیکن آفس، کوئی خاص میٹنگ اور دوسرے شہر جاتے ہوئے تو میں اس کے بغیر جانے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔" سیلی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تم مجھے بتاؤ گی کہ اس انگوٹھی سے تمہیں اتنا لگاؤ کیوں ہے؟" باربرا نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"بتاؤں گی لیکن ابھی نہیں۔ میں ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں، کچھ خریداری کرنی ہے۔ تم تب تک ٹی وی دیکھو۔" کہتے ہوئے سیلی نے اس ڈبیا کو احتیاط سے اپنے اس بیگ کی چھوٹی سی جیب میں رکھا جسے اس نے جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

☆☆☆

سیلی اور باربرا کی دوستی اسکول کے زمانے سے تھی۔ معاشی حالت میں واضح فرق کے باوجود دونوں کی دوستی خوب مضبوط تھی۔ باربرا کا تعلق ایک امیر کاروباری فیملی سے تھا جبکہ سیلی ایک غریب یتیم لڑکی تھی جو اپنی ماں کے ساتھ اپنے امیر رشتے داروں کے گھر نوکرانی کی حیثیت سے رہتی تھی۔ پڑھائی کے دوران ہی باربرا کو اپنی فیملی کے ساتھ دوسرے شہر شفٹ ہونا پڑا اور سیلی بیچاری ایک ساتھ اپنی اچھی سہیلی اور ماں سے محروم ہو گئی، وہ ایسے کہ جن دنوں باربرا دوسرے شہر جانے کی تیاریوں میں تھی، سیلی کی ماں کا انتقال ہو گیا۔

"میں جانتی ہوں اس مشکل ترین وقت میں تمہیں میری ضرورت ہے لیکن میری مجبوری ہے کہ مجھے جانا پڑ رہا ہے لیکن میں تم سے مسلسل رابطے میں رہوں گی اور یہاں آ کر تم سے ملنے کی بھی پوری کوشش کروں گی۔" سیلی کی ماں کی آخری رسومات کے موقع پر باربرا نے سیلی سے کہا اور پھر واقعی اپنا کہا نبھایا۔ ملنے تو وہ آ نہ سکی لیکن فون پر مسلسل رابطے میں رہی۔

سیلی نے ماں کے انتقال کے چند ہی مہینوں کے بعد رشتے داروں کا رویہ جو پہلے ہی کچھ اچھا نہ تھا، مزید برا ہوتے دیکھا تو ایک ریسٹورنٹ میں ویٹرس کی جاب کر لی اور رشتے داروں کا گھر چھوڑ کر کرائے کے ایک کمرے میں رہنے لگی جہاں اس جیسی تین لڑکیاں اور بھی تھیں۔ وہ دن میں جاب اور ایوننگ کلاسز میں پڑھائی جاری رکھے ہوئے تھی کہ اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ ہوا جس کے بعد اسے قدرے اچھی جاب بھی مل گئی اور اچھی تنخواہ بھی کہ وہ اپنے لیے الگ کمرا لے سکے۔

سیلی نے جب یہ بات باربرا کو بتائی تو وہ بھی اس کی معاشی حالت کے قدرے سدھر جانے پر خوش ہوئی۔ سیلی کو جاب کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا تھا کہ ایک تہوار پر اکٹھی پانچ چھٹیاں مل گئیں۔ سیلی نے فوراً باربرا کو فون کیا۔

"اس وقت سب چھٹیاں انجوائے کرنے کا سوچ رہے ہیں اور مجھے خوشی ہو گی اگر ایک عرصے کے بعد تم میرے پاس آ جاؤ۔ تہوار اکٹھے منائیں گے اور تم اس شہر میں گھوم پھر لینا جہاں تم پیدا ہوئیں اور میری دوست بنیں۔" سیلی نے بڑی خوشی اور جوش و خروش سے باربرا کو دعوت دی۔

"ٹھیک ہے سیلی! میں تمہاری دعوت قبول کرتی ہوں لیکن چھٹیاں گزارنے کا ایک طریقہ میرے پاس بھی ہے۔" باربرا نے فوراً ہامی بھرتے ہوئے کہا۔

"او کے۔۔۔ بتاؤ۔" سیلی ہنسی۔

"میں آؤں گی اور تمہارے پاس ایک دن رہوں گی۔ اس کے بعد ہم دونوں کسی پہاڑی علاقے میں چھٹیاں گزاریں گے۔ اس سیر کے تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔ اگر منظور ہے تو میں آ جاتی ہوں۔" باربرا نے پروگرام بتایا۔ اسے معلوم تھا کہ سیلی غریب ضرور ہے لیکن کسی کی مدد قبول نہیں کرتی اس لیے اس نے اس سے ملنے کی یہی شرط رکھ دی تاکہ وہ ملنے کے شوق میں مان جائے۔

"آ جاؤ۔۔۔ آ جاؤ۔ میرا اکیلی کا کون سا خرچہ ہوتا ہے۔ میں نے کچھ رقم جمع کی ہوئی ہے۔ ہماری دو تین روزہ سیر کے لیے کافی ہو گی۔" سیلی نے بڑی متانت سے کہا اور پھر باربرا آ پہنچی۔ طویل عرصے بعد ملنے پر دونوں سہیلیاں بہت خوش تھیں۔ اسی شام انہیں اپنے ٹور پر روانہ ہونا تھا۔ سیلی مارکیٹ چلی گئی اور باربرا ٹی وی میں مگن ہو گئی۔

☆☆☆

"سیلی! پلیز، مجھے انگوٹھی کے بارے میں بتا دو، بڑا تجسس ہو رہا ہے۔" باربرا نے کہا۔

سیلی لنچ بنانے میں مصروف تھی۔ چھوٹے سے کمرے کے کھڑکی والے حصے میں ایک کونہ نما جگہ کو کچن کا نام دیا گیا تھا۔ سیلی فرائنگ پین میں چمچہ چلاتے ہوئے مسکرائی۔

"لو بھئی سنو، لیکن مجھ پر ہنسنا نہیں اور نہ میرا مذاق اڑانا ہے۔" اس نے چمچہ چلانا روک کر باربرا کی طرف دیکھتے ہوئے گویا کہانی سنانے کی شرط رکھی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"ٹھیک ہے، منظور۔۔۔ ایسا کچھ نہیں کروں گی، پر اس! چلو اب شروع ہو جاؤ۔" باربرا نے یقین دہانی کروائی۔

"یہ آج سے تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے۔ میں وقت گزاری کے لیے یونہی چھٹی کے دن اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی کہ میری نظر اس انگوٹھی پر پڑی۔ اس کے انتہائی نفاست سے بنے نگینے اتنے پیارے لگے کہ میں بے اختیار رک کر اسے دیکھتی رہ گئی۔ دکان والا میری محویت دیکھ کر سمجھا کہ شاید میں اسے خریدنا چاہتی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ کیا کوئی چیز مجھے پسند آئی ہے تو نکال دوں؟ میں نے کچھ جھجکتے ہوئے اس کی قیمت پوچھی جو حیران کن طور پر میرے اندازے سے کافی کم تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے پاس بہت کم پیسے ہوا کرتے تھے۔ میں نے قیمت کا سنتے ہی اسے خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے انگوٹھی اتنی پسند آئی کہ پہن کر دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی اور فوراً خرید کر لے آئی۔ جب شام کو کام سے فارغ ہو کر اسے پہننا چاہا تو پتا چلا کہ یہ اتنی ڈھیلی تھی کہ اگر پہنتی تو فوراً گر جاتی۔ میں تھوڑا سا پچھتائی کہ خوامخواہ پیسے ضائع کیے لیکن ساتھ ہی نجانے کیوں میں نے اسے واپس کرنے یا تبدیل کرنے کے بجائے اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ مجھے کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی تھی۔ اسے خریدنے کے چند دن بعد ہی سے میرے ساتھ کافی اچھا ہونے لگا۔ ایسا لگا جیسے ستاروں نے میرے حق میں چال بدل لی ہے۔ میرا اچھا رزلٹ آیا اور مجھے اچھی جاب مل گئی۔ میں الگ گھر لینے کی پوزیشن میں آ گئی۔" سیلی بتا رہی تھی۔

"یعنی یہ انگوٹھی تمہارے لیے لکی ثابت ہوئی؟" باربرا نے انگوٹھی کی کرامات سنتے ہوئے کہا۔

"ہاں، لکی تو ثابت ہوئی لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔" کھانا پلیٹوں میں ڈال کر سیلی، باربرا کے سامنے آ بیٹھی۔

"وہ کون سا پہلو ہے؟" باربرا پلیٹ اٹھاتے ہوئے ہلکا سا ہنسی۔

"اگر انگوٹھی میرے ساتھ ہو تو وقت اچھا ہوگا اور اگر یہ میرے ساتھ نہ ہو تو کچھ برا ہو جاتا ہے۔" سیلی نے انکشاف کیا۔

"اوہ۔۔۔ واقعی؟" باربرا حیران ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ مجھے آفس کے کام کے لیے دوسرے شہر جانا پڑا۔ میں اسے بیگ میں ڈالنا بھول گئی۔ ظاہر ہے اگلی میں تو فٹ آتی نہیں۔ میں اسے ایسے ہی ساتھ رکھتی ہوں۔۔۔ تو میں کہہ رہی تھی کہ میں انگوٹھی لے جانا بھول گئی۔ میرا سارا دن خراب گزرا۔ پہلے جس گاڑی میں ہم جا رہے تھے، وہ خراب ہوئی۔۔۔ پھر طوفانی بارش آ گئی۔ بڑی مشکل سے وزٹ مکمل ہوا اور آتے آتے مجھے شدید بخار ہو گیا۔ میں نے پہلے تو اس بات پر غور نہ کیا لیکن جب بار بار یہ ہوا کہ انگوٹھی کی عدم موجودگی میں میرے ساتھ کچھ برا ہوا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس کا میرے ساتھ رہنا اچھا ہے اور اگر یہ میرے پاس یا ساتھ نہ ہوئی تو میری زندگی پر منفی اثرات پڑ سکتے ہیں اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اہم مواقع پر اسے ساتھ رکھوں گی۔" سیلی پلیٹ میں چمچ گھماتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ انگوٹھی ساتھ ہے تو ٹھیک، اگر نہیں ہے تو سب خراب؟" باربرا نے کہا۔

"بالکل۔۔۔۔ ایسا ہی ہے۔" سیلی بولی۔

"سیلی! یہ تمہارا وہم ہے۔۔۔۔ محض وہم۔ تم خوامخواہ اسے سنجیدہ لے بیٹھی ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا جیسا تم بتا رہی ہو۔" باربرا نے نرمی سے کہا۔ وہ سیلی کو اس کیفیت سے نکالنا چاہتی تھی۔

"نہیں باربرا! یہ حقیقت ہے۔" سیلی نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ اس انگوٹھی کے آنے سے پہلے تمہاری زندگی گزر رہی تھی نا۔۔۔؟ بری یا بھلی، جیسی بھی۔" پلیٹ دھوتے ہوئے باربرا نے بڑا اہم سوال کیا جس کا جواب اس کی بات کاٹتے ہوئے سیلی نے فوری دیا۔

"صرف بری۔۔۔۔ بہت بری۔۔۔ رشتے داروں کے طنزوں پر پلنا، ان کی حقارت آمیز نظریں، ماں کا مرنا اور حد درجہ غربت۔" اس نے بڑی تلخی اور دکھ سے کہا۔

"ہاں، لیکن یہ مسائل کسی انگوٹھی کی غیر موجودگی میں تو نہیں آئے نا؟" باربرا ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھی۔

"لیکن جو کچھ اچھا ہوا ہے، وہ اسی کی موجودگی میں ہوا ہے۔۔۔ تم یہ بھی تو دیکھو نا۔" سیلی نے کافی پکی بات کہی۔ باربرا چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

"چلو میں مان لیتی ہوں کہ ایسا ہی ہوا ہے لیکن ساری مثبت باتوں کو ایک چھوٹی سی چیز کے ساتھ جوڑ لینا ٹھیک نہیں۔ اس طرح تو تم کچھ اور سوچ ہی نہیں پاؤ گی۔ کیا تمہاری ایسے گزاری جا سکتی ہے؟" باربرا نے سمجھانے کی کوشش شروع کی۔

"باربرا! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں خود محسوس کر رہی ہوں کہ اس وہم نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔۔۔ لیکن کیا کروں، میں اس سے نکل ہی نہیں پا رہی۔" سیلی نے بے بسی سے کہا۔

"سیلی! تمہیں اس کیفیت، اس وہم سے لازمی نکلنا

https://www.urdudigest.com

Scanned with CamScanner

ہوگا۔ دیکھو، یہ انگوٹھی گم بھی تو ہو سکتی ہے۔" باربرا نے کہا تو سلی گویا تڑپ اٹھی۔

"پلیز، ایسا مت کہو۔" اس کا لہجہ بھیگا تھا۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی کہ انگوٹھی اس کے پاس نہ رہی تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو جائے گا۔

"دیکھو..... دیکھو، ذرا اپنا حال — گم ہونے کے خدشے نے ہی تمہیں بے چین کر دیا ہے۔ لعنت بھیجو اس پر۔" باربرا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"چلو، چلنے کی تیاری کرتے ہیں۔ ٹرین کے آنے میں تھوڑا ہی وقت ہے۔" سلی نے یکدم اٹھتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ میں بھی تیاری کرتی ہوں۔" باربرا نے اسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ سلی نے اگر تو اس کی بات نہیں مانے گی۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں ٹرین میں بیٹھ چکی تھیں۔ دونوں بڑے جوش و خروش سے اپنی سیر کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

☆☆☆

"ایڈریس مل گیا اس کا؟" فائل پر نظریں جمائے مائیک نے اس شخص سے سوال کیا جو ابھی اندر داخل ہوا تھا۔

"ابھی تو نہیں ملا لیکن جلد مل جائے گا۔ دراصل جو معلومات اس کے بارے میں ہمیں ملی ہیں، وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے ناکافی ہیں، لیکن فکر نہ کرو، بس ایک دو روز میں ایڈریس تمہارے پاس ہوگا۔ میں نے ایک آدمی اس شہر میں بھیجا ہے جہاں وہ رہائش پذیر ہے۔" چاق چوبند اسمارٹ سے گبر نے مائیک کو تسلی بھرا جواب دیا۔

"مجھے تمہاری صلاحیتوں پر بھروسا ہے لیکن ایک دو روز ہی لگنے چاہئیں۔ مجھے ضروری کام کے سلسلے میں بیرونِ ملک جانا ہے۔ کافی دن لگ سکتے ہیں جبکہ وصیت کے مطابق یہاں کا کام جلد از جلد ہونا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے فور کی وجہ سے مسز سام کی وصیت کی تکمیل ہونے میں کوئی خاص دیر ہو۔" مائیک نے گبر کو تاکیدی انداز میں کہا۔

"ڈونٹ وری! ہو جائے گا کام۔" گبر کہہ کر باہر نکل گیا جبکہ مائیک دوبارہ فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

دونوں سہیلیاں گپ شپ کرتے ہوئے سفر کر رہی تھیں۔

"میں بڑے عرصے بعد آج خوب خوش ہوئی ہوں۔ موجودہ جاب اور الگ کمرا ملنے پر بھی دل ایسا خوش نہیں ہوا تھا جیسے آج ہو رہا ہے اور اس کی وجہ صرف تم ہو باربرا مجھے بہت خوش کن احساس ہو رہا ہے تمہاری موجودگی میں۔" سلی نے چپس کا پیکٹ کھولتے ہوئے کہا۔

"اچھا.....؟ میں تو سمجھی تھی کہ تم کہو گی اس خوشی کی وجہ وہ خاص انگوٹھی ہے۔" باربرا نے شرارت بھرے انداز میں کہا تو سلی بے اختیار ہنس دی۔

"اتنے سالوں سے ہم کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوئے تو اگر یہ کہا جائے کہ خاص انگوٹھی کے اثرات کے نتیجے میں ہم اکٹھے ہوئے اور آج خوش ہیں تو یہ غلط تو نہیں ہوگا۔ ہے نا؟" سلی نے کہا۔

"چلو چھوڑو، کوئی اور بات کرتے ہیں۔" باربرا نے مسکراتے ہوئے منہ میں چپس ڈالے۔ دونوں پھر سے سفر انجوائے کرنے لگیں۔

☆☆☆

"میں نے کہا تھا نا کہ جلد ایڈریس آپ کے سامنے ہوگا۔" گبر نے ایک چٹ مائیک کے سامنے رکھی جس پر ایک سیل فون نمبر اور ایڈریس درج تھا۔ مائیک نے وہ چٹ پڑھ کر ساتھ ہی اس پر درج نمبر ملانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

"سلی! کال اٹینڈ کرو — سن نہیں رہیں؟" باربرا نے نیند بھری آواز میں کہتے ہوئے موبائل سلی کو تھمایا۔ دونوں رات گئے تک گھومتی رہی تھیں اور اب گہری نیند سو رہی تھیں۔ موبائل کی آواز پر بھی سلی کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ باربرا ہی اس آواز پر اٹھی اور سلی کو جگایا۔

"یہ کون صبح صبح تنگ کر رہا ہے؟" سلی نے نامعلوم نمبر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"صبح —؟ اس وقت دن کے دس بج چکے ہیں مس سلی!" باربرا نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"ہیلو! جی — میں سلی بول رہی ہوں۔" سلی نے بمشکل اٹھ کر تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت تو آپ سے نہیں مل سکتی لیکن آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" دوسری جانب سے کوئی بات سن کر سلی نے کافی حیرت سے سوال کیا۔ اس کی نیند کافی حد تک غائب ہو چکی تھی۔

"جی..... مسز ایلزبتھ سام میری رشتے دار تھیں — اور وہ کچھ عرصہ قبل انتقال کر گئی ہیں۔" سلی نے کہا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے سمجھ نہ آ رہا ہو کہ کسی نے کیوں فون کیا اور اب اس کی دور کی آنٹی جو مر چکی ہے، اس کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ باربرا بھی اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"آپ..... آپ..... سچ کہہ رہے ہیں.....؟ یعنی یہ..... کوئی مذاق.....!" سیلی نے حیرانی سے پوچھا۔ دوسری جانب سے کچھ ایسا کہا گیا تھا کہ سیلی کی آواز اٹکنے لگی۔ اس کے چہرے پر بہت عجیب تاثرات نظر آنے لگے۔ باربرا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کون ہے سیلی.....! کیا بات ہو رہی ہے؟" اس نے پوچھا لیکن سیلی تو گویا جواب دینے کی پوزیشن میں تھی ہی نہیں۔

"اوکے..... میں..... آج ہی واپس اپنے شہر روانہ ہو رہی ہوں..... آپ وہیں آجائیں..... اپنا ایڈریس میں.....!" سیلی خواب و حیرت کے عالم میں بول رہی تھی۔

"اوہ..... اچھا تو ایڈریس ہے آپ کے پاس..... ٹھیک ہے، کل صبح آپ آسکتے ہیں۔" سیلی اپنی ہکلاہٹ پر کافی قابو پا چکی تھی۔

"اوکے" کہہ کر سیلی نے کال منقطع کی اور سیل فون سائڈ پر رکھتے ہوئے باربرا کی طرف دیکھا جو مجسم سوال بنی اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"باربرا! پتا ہے یہ کس کی کال تھی؟" سیلی کے لہجے میں جوش اور خوشی تھی۔

"نہیں پتا۔" باربرا نے کہا۔

"وکیل کی۔" سیلی کو شاید آہستہ آہستہ بتانا اچھا لگ رہا تھا۔

"وکیل..... کس کا وکیل؟ پلیز سیلی! جلدی بتاؤ۔" باربرا نے بے چینی سے کہا۔

"وہ..... میری ایک آنٹی تھیں۔ کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ طلاق یافتہ تھیں اور ان کے دو بیٹے تھے جو ماں کو مرنے سے پہلے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ آنٹی ملازموں کے ساتھ تنہا رہ رہی تھیں۔ اب مجھے جس وکیل کا فون آیا ہے، وہ آنٹی کا وکیل تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آنٹی الیزبتھ نے مرنے سے پہلے اسے بلا کر اپنی وصیت لکھوائی تھی..... وکیل کے مطابق آنٹی اپنے بیٹوں سے تو ناراض تھیں ہی، وہ اپنے رشتے داروں پر بھی کافی برہم تھیں۔ تم سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ آنٹی نے وصیت میں اپنے ترکے کا کس کو حقدار قرار دیا ہے۔" سیلی کا چہرہ پھر سے جوش و خروش اور شدید حیرت و خوشی کے جذبات سے بھر گیا۔

"کس کو؟" باربرا نے اس انداز میں سوال کیا جیسے اسے جواب کا تقریباً اندازہ ہو گیا ہو۔

"آنٹی الیزبتھ سام نے مرنے سے پہلے اپنی جائداد کا تیس فیصد ایک یتیم خانے اور بقیہ ستر فیصد اپنی ایک یتیم رشتے دار لڑکی کے نام کیا ہے۔ جانتی ہو وہ لڑکی کون ہے؟" سیلی نے بڑے تیز لہجے میں باربرا کے بازو تھام کر اسے خبر دی۔

"ہاں، مجھے یقین ہے کہ میں اسے جانتی ہوں..... وہ تم ہو نا؟" باربرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... ہاں..... باربرا! وہ میں ہی ہوں..... وہ جو یکدم مالدار ہو گئی ہے، وہ میں ہی ہوں..... جس امیر عورت کے گھر میں ایک دن رہنا بھی اعزاز تھا، وہ پورا گھر اب میرا ہے۔ سارے اثاثے میرے ہیں..... باربرا..... باربرا! سنو اور یقین کر لو..... غریب سیلی امیر ہو چکی ہے..... میں امیر ہو گئی ہوں..... اب میرے پاس بہت سے پیسے ہو گئے ہیں..... اوہ..... اوہ! مجھے یقین ہے یہ خواب نہیں ہے..... نہیں ہے نا باربرا؟" سیلی اب چلا چلا کر خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ وکیل سے فون پر بات کرتے ہوئے اور باربرا کو بتاتے ہوئے اس نے جن جذبات کو بمشکل روکا ہوا تھا، اب وہ ان کا شدت سے اظہار کر رہی تھی۔

"سیلی! تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔ یقیناً قدرت کی طرف سے تمہارے لیے یہ بڑا انعام ہے۔" باربرا نے گرمجوشی سے سیلی کو گلے لگایا۔ سیلی کا گلے لگتے ہی تیز تیز بولنا اور قہقہے لگانا رک گیا۔ اب اس کی آنکھوں سے دوست کے گلے لگتے ہی آنسو جاری ہو گئے۔ وہ شدتِ جذبات سے رو دی۔ پیدا ہونے سے لے کر اب تک کی بھوک، بیچارگی، رشتے داروں کی عدم توجہی، اکیلا پن، سخت جاب اور لوگوں کی تنی آنکھوں کے رستے نکلنے لگی۔ باربرا اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کے کندھے تھپتھپا رہی تھی۔

"ہم ابھی واپس روانہ ہو رہے ہیں۔ آنٹی الیزبتھ کا وکیل کل صبح کاغذات میرے حوالے کرنے آرہا ہے۔" سیلی نے بھیگی بھیگی آواز میں کہا۔ وہ اب اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، پھر ہم بھی چلتے ہیں۔" باربرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد دونوں ٹرین میں بیٹھی تھیں۔

"سیلی! کمال ہو گیا۔ جب ہم ادھر آرہے تھے تو تم غریب تھیں اور اب واپسی پر ایک امیر لڑکی بن چکی ہو۔" باربرا بولی۔

"ہاں باربرا! مجھے تو یہ ایک خواب سا لگ رہا ہے۔ مجھے بڑی مشکل سے یقین آیا ہے۔ اب میں یہ جاب، یہ چھوٹا سا کمرا چھوڑ کر پُرتعیش زندگی گزاروں گی۔ کتنی حیران کن اور خوبصورت بات ہے۔" سیلی مسکراتے چہرے اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ بولی۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"اب مجھے معاشی تنگی اور اس سلسلے میں سخت جاب پر روز جانے کی ضرورت نہیں رہی، اس لیے اب میں تمہارے پاس، تمہارے شہر میں آکر تمہارے ساتھ خوب گھوم پھر سکتی ہوں۔ میں نے سوچ لیا ہے، میں یتیم خانوں اور فلاحی اداروں کو ڈونیشن ضرور دیا کروں گی۔ میں اپنے جیسوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہوں گی۔" سیلی خوشی خوشی بولتی جارہی تھی۔ باربرا مسکراتے ہوئے اپنی سہیلی کی باتیں سن رہی تھی۔

☆☆☆

"مس سیلی! اب یہاں کچھ سائن کردیں اور یہ فائل سنبھال لیں۔" وکیل مائیک نے کچھ کاغذات سیلی کی جانب بڑھائے۔ یہ میٹنگ ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی۔ جہاں مائیک کے ساتھ گبز اور سیلی کے ساتھ باربرا موجود تھی۔ آنجہانی ایلزبتھ سام کا وکیل اپنے کہے گئے وقت کے مطابق پہنچ گیا تھا۔ سیلی کے بارے میں ہر طرح کی تسلی کرلینے کے بعد اس کے نام کی گئی جائداد کی فائل اس کے حوالے کردی گئی۔ سیلی کے ہاتھ سائن کرتے ہوئے خوشی اور فرطِ جذبات سے کانپ رہے تھے۔ وہ محض دو گھنٹوں بلکہ حقیقتاً راتوں رات زمین سے آسمان پر پہنچ گئی تھی۔ مائیک دستخط کروا کے اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

"کافی پلواؤ۔" باربرا نے فرمائش کی۔ وکیل کے جانے کے بعد گنگ سی بیٹھی سیلی، باربرا کی آواز پر چونکی۔

"صرف کافی نہیں..... ساتھ میں اور بھی بہت کچھ میں ابھی ابھی امیر ہوئی ہوں۔ اس خوشی میں ہم مل کر پرتکلف کافی انجوائے کریں گے۔" سیلی نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوکے..... تو ابھی آرڈر کرتی ہوں۔" باربرا نے بھی مسکراتے ہوئے آمادگی ظاہر کی۔

"اور اب اپنے پسندیدہ ہوٹل کا نام بھی بتاؤ جہاں میں رات کو تمہیں شاندار کھانا کھلانے کے لیے لے جاؤں۔" سیلی نے تھوڑا سا اترانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"شاندار کھانا؟ امیر سیلی! تم کتنی اچھی ہو۔" باربرا نے ہنستے ہوئے نورا دعوت قبول کرلی۔

رات کے کھانے کے بعد دونوں سیلی کے چھوٹے سے کمرے میں موجود تھیں۔ باربرا کو صبح واپس جانا تھا۔

"بس چند معاملات اور نمٹے ہوجائیں تو میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہوجاؤں گی۔ اس جگہ پر اب زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا قیام رہ گیا ہے۔" سیلی نے کمرے کی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ باربرا بستر پر بیٹھی ہاتھوں پر لوشن لگا رہی تھی۔

"سیلی! تم ماضی میں کافی حد تک بدقسمت رہی ہو لیکن اب تم خوش قسمت ترین بن چکی ہو۔"

"ہاں باربرا! ایسا ہی ہے اور یہ میری اسی انگوٹھی کی وجہ سے ہوا ہے۔" سیلی نے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے؟" باربرا نے سوال کیا۔

"ہاں..... میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اس کی موجودگی میں بہت اچھا ہوتا ہے۔" سیلی نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"اور اس کی عدم موجودگی بری ثابت ہوتی ہے..... ہے نا؟" باربرا ہلکا سا مسکرائی۔

"تم جتنا مرضی مذاق اڑالو لیکن یہ سچ ہے کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔" سیلی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تم جو بھی کہو، میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں کہ یہ محض تمہارا وہم ہے۔" باربرا نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"میرے اتنے امیر ہونے کے بعد بھی تم اس پر شک کررہی ہو اور مجھے واہمی سمجھ رہی ہو۔" سیلی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"اچھا، ایک کام کرو۔ ذرا اپنی وہ انگوٹھی تو مجھے دکھاؤ۔ میں ایک بار پھر اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔" چند سیکنڈ چپ رہنے کے بعد باربرا نے کہا۔

سیلی اٹھی اور بیگ سے وہ ڈبیا نکالی جس میں انگوٹھی کو رکھتی تھی۔ بڑی احتیاط سے اسے کھولتے ہوئے باربرا کے پاس آرہی تھی کہ یکدم رک گئی۔ وہ چھوٹی سی ڈبیا کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔

"باربرا..... ڈبیا خالی ہے..... میری انگوٹھی.....!" سیلی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس سے بولنا مشکل ہورہا تھا۔

"انگوٹھی گم ہوگئی کیا؟" باربرا نے بڑے آرام سے سوال کیا جیسے اس کے لیے یہ بہت زیادہ اہم بات نہ ہو۔

"ہاں..... باربرا..... دیکھو، وہ اس میں نہیں ہے۔" سیلی رو دینے کو تھی۔

"اب تمہیں لگ رہا ہے کہ کچھ برا ہوجائے گا۔ جو دولت تمہیں ملی ہے، وہ چھن جائے گی۔ یہی ڈر ہے نا؟" باربرا نے ساحقہ انداز میں ہی سوال کیا۔ جواب میں سیلی اسے گم آنکھوں کے ساتھ یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "تمہیں یہ سب مذاق یا واہم کیوں لگتا ہے؟"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"ہاں..... ہوسکتا ہے..... ہوسکتا ہے دولت مجھن جائے..... میرا متعدد بار تجربہ ہو چکا ہے۔"

"ادھر آؤ۔" باربرا نے چلا کر بڈیائی انداز میں بولتی سیلی کے بازو تھامے اور بیڈ پر بٹھایا۔

"سکون سے سنو..... پریشانی ختم ہو جائے گی۔" باربرا نے اسے پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔ سیلی کی آنکھوں سے اس وقت آنسو رواں ہو چکے تھے۔

"پلیز، سیلی! بات سنو، انگوٹھی کے نہ ہونے سے تمہیں مشکل پیش نہیں آئے گی۔ میرا مطلب ہے تمہاری یہ دولت جائداد کہیں نہیں جائے گی۔ تمہارے پاس رہے گی کیونکہ....." باربرا نے جملہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑا۔ سیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیونکہ جب تمہیں آنٹی ایلزبتھ کی وصیت کے بارے میں فون کیا، تبھی جب تم دولت مند ہوئیں، اس وقت یہ انگوٹھی تمہارے پاس موجود نہیں تھی۔" باربرا نے انکشاف کیا۔

"تم..... تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟" سیلی چونکی۔

"کیونکہ دوسرے شہر جانے سے پہلے میں نے تمہاری نظر بچا کر انگوٹھی اس ڈبیا سے نکال لی تھی اور پھر اسے کمرے میں بھی نہیں رکھا بلکہ کمرے سے باہر ایک جگہ رکھ دیا تھا۔ ادھر آؤ.....!" باربرا نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور گیلری میں آکر ایک گملے کے قریب رکی۔ سیلی حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔ باربرا نے گملے کی مٹی کو تھوڑا سا انگلیوں کی مدد سے سائڈ پر ہٹایا۔ انگوٹھی وہاں پڑی تھی۔

"اب آیا یقین کہ اس کی عدم موجودگی تمہارے لیے نقصان دہ نہیں ہوگی اور اچھی خبر پھر بھی آسکتی ہے۔" باربرا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے جانا چاہتی تھی تاکہ وہ اس انگوٹھی کو اٹھا سکے۔

"لیکن باربرا! جب آنٹی ایلزبتھ کی وصیت بنی یعنی کچھ روز پہلے، جب تو انگوٹھی میرے پاس ہی تھی نا۔" سیلی نے کہا لیکن اس کا لہجہ قدرے کمزور تھا۔ کمزور اس لیے کہ اتنا تو اسے بھی پتا چل گیا تھا کہ انگوٹھی کے نہ ہونے سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔

"سیلی! ذرا دماغ لگا کر میری بات سنو۔ اگر اس کی عدم موجودگی بری ثابت ہوتی ہے تو آنٹی کی وصیت کے باوجود تم بدقسمت رہ سکتی تھیں۔ ہوسکتا ہے تمہارا پتا وکیل کو نہ مل پاتا اور وہ تمہارا حصہ بھی فلاحی ادارے کو دے دیتا..... ہوسکتا تھا کہ تمہیں کوئی حادثہ پیش آجاتا اور تمہارے بجائے جائداد کسی اور کو مل جاتی..... لیکن ایسا نہیں ہوا۔" کہہ کر باربرا نے تائید طلب نظروں سے سیلی کو دیکھا۔ سیلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یعنی وصیت بنتے وقت بھی اس انگوٹھی کا کوئی لینا دینا نہیں تھا، جس طرح بعد میں بھی اس کے نہ ہونے نے کوئی برے اثرات نہیں ڈالے۔" باربرا بات کرتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر کمرے میں لے آئی۔

"یعنی..... یہ ایک وہم ہی تھا۔" سیلی نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں، میری پیاری سیلی! یہ ایک وہم ہی تھا اور اب یقین رکھو کہ تمہیں یا تمہاری پراپرٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے والا۔" باربرا نے اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے تسلی دی۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں ہر وقت ایک چیز اٹھانے کی کوفت اور اس کے گم ہو جانے کے خدشے سے باہر آگئی ہوں۔" سیلی نے مطمئن انداز میں کہا تو باربرا کھل کر مسکرائی۔

"مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہاری جان اس فضول سے وہم سے چھڑا دی ہے۔" باربرا نے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆☆☆

"باربرا! تم اس ویک اینڈ پر آرہی ہو نا میرے نئے گھر۔ میں نے پارٹی کا انتظام کیا ہے۔ تمہارے علاوہ سب مہمان چھوٹے بچے ہوں گے جو ایک یتیم خانے سے آئیں گے۔" سیلی نے خوشی خوشی اطلاع دی۔

"میں تو تمہاری کال کا انتظار کر رہی تھی کہ کب تمہیں تمہارے نئے گھر میں دیکھنے آؤں۔ یہ بتاؤ زندگی اب تو اچھی گزر رہی ہے نا؟" باربرا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ سیلی کو اس کے سوال کی اچھی طرح سمجھ آگئی تھی۔

"بہت اچھی..... وہم سے نجات کے بعد زندگی بہت ہلکی پھلکی اور آسان ہوگئی ہے۔" سیلی نے مسکراتی آواز میں کہا۔

"تم نے سنا ہوگا کہ وہم کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہوتا۔" باربرا نے کہا۔

"ہاں، سنا تو ہے۔" سیلی ہنسی۔

"لیکن دیکھو، میں نے کامیاب علاج کر دیا اور ثابت ہوا کہ وہم کا علاج ڈاکٹر کے پاس ہو نہ ہو، لیکن سمجھ دار دوست کے پاس ضرور ہوتا ہے۔" باربرا نے جتایا۔

"بالکل..... بالکل..... سو فیصد سچ۔" سیلی نے ہنستے ہوئے بھرپور تائید کی۔

☆☆☆

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

دیس پردیس

ناہید سلطانہ شہر

چوتھا حصہ

دنیا ایک ایسی قیام گاہ جس میں بسے انسان اپنی اپنی خواہشوں کے اسیر ہیں... کوئی حالات کی سختی کا شکار... تو کوئی سب کچھ مل جانے پر شاداں و فرحاں... کچھ ایسے جنہیں زمانے سے جھڑکیاں اور لعن طعن ہی ملتی ہے... سونے پہ سہاگا غربت بھی ان کے ہم رکاب رہتی ہے... ایسے میں جب منزل کا تعین نہ ہو تو وہ آسمان میں بھٹکتے پنچھیوں کی طرح عازم سفر ہوجاتا ہے... بہتر مستقبل آسودہ زندگی اور دولت کمانے کی چاہ اسے وطن سے دور نگر نگر گھومنے پر مجبور کردیتی ہے اور وہ پردیس میں قسمت آزمانے چل پڑتا ہے... وہ سمجھتا ہے کہ وہاں کی سڑکیں شیشے کی ہوتی ہیں اور سونا اس پر بکھرے پڑے رہتے ہیں جنہیں جتنا مرضی اٹھالو... مگر یہ اس کی خام خیالی.... ہوتی ہے... کیونکہ اپنا دیس اپنا ہی ہوتا ہے... وہاں صعوبتیں اٹھاتے اٹھاتے شدت سے وطن سے دوری اور اپنوں کے نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے... اور یہی کلفتیں بڑھتے بڑھتے زندگی کی شام ہوجاتی ہے... مگر مسافر اپنی منزل سے کوسوں دور ہی ہوتا ہے۔

دلوں میں امنگ، آنکھوں میں سہانے خواب

سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان

digest library.com
https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

گھر واپس کرتے ہی وہ عازم پاکستان ہوا۔ بچے اسے بہت یاد آرہے تھے، اس کی زندگی میں بچوں کے سوا اور بچا ہی کیا تھا۔ انہیں بھی دیکھے کتنے دن ہو گئے تھے۔ جب بچے اس کے پاس ہوتے تھے، کام ختم کرتے ہی وہ جلد سے جلد گھر پہنچنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ نشاط اور بچے بھی اس کے منتظر ہوتے تھے۔ "ڈیڈ آگئے — ڈیڈی آگئے" کہتے وہ اس سے لپٹ جاتے تھے۔

"ڈیڈی! آج کیا لائے ہیں آپ میرے لیے؟" طیب جو قدرے لالچی تھا، پوچھتا۔

"آج کچھ نہیں۔" رجب علی بچوں کے لیے لائی ہوئی چیز ان کا صبر آزمانے کو کبھی چھپا بھی لیتا تھا۔

"آپ اچھے ڈیڈی نہیں ہیں۔" طیب منہ بناتا۔

"ڈیڈی اچھے ہیں۔" نثار اور طیب میں تکرار شروع ہو جاتی۔

"آپ کا بیٹا بہت لالچی ہے۔" نشاط کہتی۔

"ڈیڈی اچھے ہیں — ڈیڈی اچھے ہیں — ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔" نثار سر کو ہلاتے ہوئے طیب سے مسلسل تکرار کرتی رہتی۔

"لاؤ بھئی نشاط! ان کی چیز لاؤ۔" رجب علی چھپائی گئی چیز لانے کو کہتا۔

"ڈیڈی اچھے ہیں۔" طیب نعرہ زن ہوتا۔

"گریڈی!" نشاط اسے گھورتی۔

رجب علی کے کان ان آوازوں کو سننے کے لیے ترس گئے تھے۔ اتنے دن تو وہ پہلے کبھی بھی ان سے دور اور ان سے جدا نہیں رہا تھا۔ پاکستان روانگی سے قبل اس نے بچوں کی پسند کی کافی چیزیں خریدیں۔

ریحانہ نے نثار اور طیب کو اسی اسکول میں داخلہ دلوا دیا تھا جہاں وہ خود ملازمت کر رہی تھی۔ رجب علی پاکستان پہنچا تو اسکولوں میں موسم گرما کی تعطیلات شروع ہو چکی تھیں۔ تعطیلات کے باعث بچے ان دنوں گھر ہی میں تھے۔ ان کی نہ وہ صحت رہی تھی، نہ وہ رنگ روپ۔ انہیں دیکھ کر رجب علی کا دل بہت دکھا۔ شہزادوں اور شہزادیوں کی طرح رہنے والے بچے عام پاکستانی گھرانوں کے بچوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ یہاں آپا تو تھی ان کا خیال رکھنے اور دیکھ بھال کرنے کو، وہاں تو اتنا آسرا بھی نہ تھا۔ بے بی سٹر کے ہاتھوں میں کتنے دن رہ سکتے تھے۔ یہاں ریحانہ بھی انہیں پڑھانے کو، وہاں کون بیٹھا تھا جو انہیں اسکول لے جانے، لانے اور گھر پر پڑھائی میں مدد دینے کی ذمے داری اٹھاتا۔ بچے اس کے آنے سے بہت خوش تھے مگر وہ اپنے اندر دکھی تھا۔

بچے برطانیہ میں ہوتے تو ان کی تعطیلات ایسے گزرتیں بھلا؟ وہاں تو اسکولوں میں تعطیلات کے دوران والدین اور سرکار بچوں کی تفریح طبع کا پورا خیال رکھتے تھے۔ ساحلی علاقوں میں رونق بڑھ جاتی، رات کے وقت آتش بازی کے نظر افروز نظاروں سے بچوں ہی نہیں، بڑوں کو بھی تفریح فراہم کی جاتی۔ رات کی تاریکی میں رنگ برنگی پھلجھڑیاں آسمان کو گل و گلزار کر دیتیں۔ سمندر میں اولتے بحروں سے رنگ برنگی روشنیاں پھوٹتیں اور آسمان تک جاتے ہوئے ایسے رقص کرتیں کہ دیکھنے والے متحیر رہ جاتے۔

نشاط کے جانے سے چھ ماہ قبل ہی تو اسکولوں کی تعطیلات میں وہ نشاط کی فرمائش پر اسے اور بچوں کو بروڈا سٹیرز لے گیا تھا جہاں نشاط کی سہلا میں رہنے والی ایک دوست نے جو بروڈا سٹیرز لنک مکانی کر چکی تھی، اسے فائر ورک دیکھنے کے لیے بچوں کے ساتھ آنے کی دعوت دی تھی۔ رات کے وقت کیا نظر افروز آتش بازی تھی۔ نثار، طیب اور نجف بہت خوش ہوئے۔ دُرِ شہوار بھی اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آسمان کی طرف جاتی رنگ برنگی پھلجھڑیاں حیرانی سے دیکھتی رہی تھی۔

"گوروں کو اپنے بچوں کو خوش رکھنا آتا ہے۔ ایک ہمارا ملک ہے جہاں چھٹیوں میں بچوں کو کاپیاں بھرنے کا کام دے دیا جاتا ہے۔ نہ کوئی انٹرٹینمنٹ، نہ ایکٹیویٹی۔" نشاط نے کہا۔

انہی تعطیلات میں ایک شب وہ نشاط اور بچوں کو آتش بازی دکھانے کے لیے مارگیٹ بھی لے گیا۔ راستے بھر نثار، طیب اور نجف بولتے رہے۔

مارگیٹ کے ساحل پر آتش بازی کا منظر دور ہی سے نظر آنے لگا تھا۔ رجب علی کا مشاہدہ اور تجربہ کہتا تھا، انگریز زندہ دل اور فیاض قوم ہے۔ ہفتے کے پانچ دن نہایت سنجیدگی اور ایمانداری سے کام اور اختتام ہفتہ کے دنوں میں پانچ دنوں کا کمایا کھلے ہاتھوں سے خرچ — کھاؤ، پیو اور موج اڑاؤ کی تفسیر۔

پانچ دن کام کے بعد اشیائے خورد و نوش کی ٹرالیاں ایسے بھرتے تھے جیسے آج کے بعد ان چیزوں نے دوبارہ دستیاب ہی نہیں ہونا۔ کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ کپڑے، جوتے اور عام استعمال کی چیزیں بھی ٹرالی میں لادے جاتے۔ چھٹی کے دنوں میں سیر و تفریح اور بے فکری

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

کے بعد راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔

چیزیں خراب ہوتیں یا زائد از ضرورت، بنا خست گھروں کے باہر رکھ دی جاتیں۔ ضرورت مندوں کے انہیں اٹھا لے جانے پر پابندی نہ ہوتی۔ اکثر ایسی چیزیں چیریٹی شاپس کو بھی دے دی جاتیں جہاں ضرورت مند آتے اور ارزاں قیمت پر بعض اوقات بے حد کام کی چیز لے جاتے۔

اختتام ہفتہ کی دو چھٹیاں ہوتیں یا لمبی تعطیلات، تہوار ہوتے یا تقریبات، رجب علی نے گوروں کو دونوں ہاتھوں سے زندگی کو لوٹتے دیکھا تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد وزن ایک بار ملی زندگی کو جی بھر کر جینے کی کوشش کرتے۔

بڑے ہو کر بچے اپنے بڑوں کی دسترس سے نکل جائیں تو اور بات، جب تک بڑوں کے ساتھ رہتے، بڑے ان کے لیے زندگی کو ایک خوشنما اور خوش رنگ تصویر بنا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔

رجب علی کو بچوں سے بے حد پیار رہا تھا۔ برطانیہ آنے سے پہلے پاکستان میں بھائی، بہنوں ہی نہیں، دوسروں کے بچوں سے بھی پیار کرتا تھا۔ برطانیہ آیا تو پاکستان میں اپنی بستی محلے کے کالے پیلے، میلے کچیلے بچوں کے مقابلے میں انگریزوں کے گورے گورے، گلابی، نرم و ملائم اور دلکش رنگی آنکھوں والے گڈے گڑیوں جیسے بچے اسے کوئی الوہی ہی مخلوق لگے۔ نشاط سے شادی کے بعد جب اس کے اپنے بچے ہوئے تو بچے اسے کائنات کی حسین ترین مخلوق دکھنے لگے تھے۔

نگار کی پیدائش پر تو اس کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ کبھی اس کا ننھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نشاط سے کہتا۔

"ذرا دیکھو تو۔" کبھی اس کے ریشم کے تاروں جیسے بال چھوتا، کبھی اس کے ننھے منے پاؤں دیکھنے لگتا۔

"خوش ہیں؟" اسپتال میں بستر پر لیٹی نشاط نے پوچھا۔

"آسمان پر اڑ رہا ہوں۔"

"میں تو جینے کی امید کر رہی تھی۔"

"یار اگلی بار جیتا سہی۔"

یکے بعد دیگرے پھول کھلتے گئے۔ نگار، طیب، نجف اور مہ جبیں۔

نشاط کے جانے کے بعد جب اسے چاروں بچوں کو اپنے دل پر پتھر رکھ کر پاکستان میں چھوڑنا پڑا تو اسے دوسرے بچوں میں اپنے بچوں کا عکس نظر آنے لگا تھا۔ کوئی بچی اسے نگار کی طرح لگتی، کوئی بچہ طیب جیسا نظر آتا، کسی کی مسکراہٹ میں اسے نجف کی مسکراہٹ کا عکس دکھائی دیتا تو کوئی بچی ڈیڑھ شہوار جیسی لگتی۔

پاکستان میں چار مہینے اپنے بچوں کے ساتھ گزارنے کے بعد اسے بادل ناخواستہ واپسی کا ارادہ کرنا پڑا۔ معاش اس کے پاؤں کی زنجیر تھی۔ اس نے منہ اندھیرے روانہ ہونے والی پرواز سے اپنی روانگی رکھی۔

بچے سو رہے تھے جب وہ ائرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگا۔ اس نے سوتے میں باری باری چاروں کو پیار کیا، ایک ایک کی پیشانی کو نہایت آہستگی سے بوسہ دیا۔ ان کے پھول جسموں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرا۔ بچوں کو پھر سے چھوڑ کر جاتے ہوئے دکھ کی شدت سے اس کی آنکھوں میں سرخی امڈ آئی۔

"ان کا خیال رکھنا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں آپا سے کہا۔ اسے شدید جذباتی بھونچال میں دیکھ کر آپا اور ریحانہ رونے لگیں۔ وہ شکستہ قدموں سے گھر سے نکلا۔

جہاز میں بیٹھ کر اس نے اپنی آنکھیں سختی سے بھینچ لیں، مبادا دل کا درد آنسوؤں کا ریلا بن کر آنکھوں سے بہہ نکلے۔

صبح جب بچے جاگے تو وہ ایک بار پھر ان سے ہزاروں میل دور سفر طے کر چکا تھا۔

"ڈیڈی گئے؟" بچوں نے پوچھا۔

ان کا سوال صبح بن کر آپا کے دل میں گڑ گیا۔

'کوئی ماں کیسے حوصلہ کر لیتی ہے اپنے بچوں کو چھوڑنے کا۔' آپا نے سوچا۔

☆☆☆

بڑے بنگ والا مکان رجب علی نے مع سامان فروخت کیا تھا۔ بچوں کی کچھ چیزیں وہ پاکستان لے گیا تھا۔ اپنی، نشاط اور بچوں کی بہت تصاویر اس نے اپنے پاس ہی رکھی تھیں۔ پاکستان گیا تو اس کی بہن ریحانہ نے ایک روز بڑا عجیب سوال کر دیا۔

"بھابی سے تمہیں اب بھی محبت ہے بھائی؟"

کئی سال برطانیہ میں گزارنے اور نہ صرف مقامی افراد بلکہ دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے لوگوں سے رابطہ اور کبھی مختصر، کبھی طویل بات چیت کے بعد رجب علی اب پہلے والا سادہ، کم علم اور کم فہم رجب علی نہیں رہا تھا۔ اسے دوسروں کی بات سے نتیجہ اخذ کرنا اور اپنی بات تدبر سے کرنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔ اس کی کیسی میں سفر کرنے والے بعض مسافر تو اسے اچھا خاصا تعلیم یافتہ سمجھا کرتے تھے بلکہ اس کے بارے میں اپنی اس رائے کا اظہار بھی کر دیتے۔ رجب علی جب کسی کو بتاتا کہ وہ کبھی اسکول نہیں گیا تھا، اردو پڑھنا لکھنا اور انگریزی کے بھی آسان الفاظ کو پڑھ لیتا اس

https://www.urdudigest.com/
Scanned with CamScanner

digest library.com

نے برطانیہ آنے کے بعد ضرور کیا تھا تو اس کے اکثر حاضرین اس کے اس جارحانہ اعتراف کو مذاق گردانتے۔

ریڈنگ میں ٹیکسی ڈرائیور کی ملازمت کرتے ہوئے ایک روز ایک گورا اس کی ٹیکسی میں سوار ہوا۔ بیٹھتے ہی اس نے پہلے موسم کے متعلق بات کی پھر فوراً ہی اپنی نجی زندگی کی کتاب کھول بیٹھا۔ رجب علی کو بسا اوقات یوں لگتا جیسے بعض مسافر ٹرین یا بس سے سستا سفر کرنے کے بجائے اپنا دل ہلکا کرنے کو ٹیکسی میں سفر کرتے تھے۔ اجنبی ٹیکسی ڈرائیور سے وہ اپنی نجی باتیں کرنے لگتے۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ مسافر نے موسم کو تمہید بنا کر دوسرے مرد کی خاطر اپنی بیوی کی بے وفائی کی داستان شروع کر دی۔ اس وقت رجب علی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مسافر کی کہانی اس کی اپنی کہانی بن جائے گی۔

"میں بالکل منتشر ہو گیا ہوں اپنی بیوی کے جانے کے بعد۔" مسافر نے کہا۔

"لگتا ہے تمہیں اپنی بیوی سے بہت پیار تھا؟" رجب علی نے مسافر کا دل ٹٹولنے کو پوچھا۔

"ہاں، بہت — تم سوچ بھی نہیں سکتے کتنا۔" مسافر کی آواز بھرا گئی۔

"اب؟"

"کیا مطلب؟"

"اب بھی پیار کرتے ہو اس سے؟"

مسافر نے ایک سرد آہ کھینچی پھر دھیمی آواز میں بولا۔

"تم نے کبھی قطبی ستارے کو اپنی جگہ بدلتے دیکھا ہے؟"

رجب علی کو مسافر کی ذہنی کیفیت پر اگندہ لگی۔ اپنی سابقہ بیوی کی بات کرتے کرتے وہ قطبی ستارے پر کیوں آ گیا تھا۔

"قطبی تارا اگر اپنی جگہ تبدیل کر لے تو راہ نوردوں کو اپنی سمت کیسے ملے؟" رجب علی نے کہا۔

مسافر نے ایک گہرا سانس کھینچا پھر گھائل لہجے میں بولا۔ "محبت بھی قطبی تارے کی طرح ہمیشہ اپنے مقام پر رہتی ہے — ہاں، میری بیوی نے میرے ساتھ جو کیا، سو کیا — مجھے اس سے اب بھی محبت ہے۔"

ریحانہ کے سوال کے جواب میں رجب علی نے کہا۔ "محبت قطبی تارے کی طرح ہوتی ہے ریحانہ — اپنا مقام نہیں چھوڑتی۔"

ریحانہ جو رجب علی کی طرح ان پڑھ نہیں رہی تھی، پڑھ لکھ گئی تھی، چودہ جماعتیں پڑھ لینے کے بعد ایک اسکول میں بچوں کو پڑھانے کے ساتھ خود بھی مزید پڑھنے کی نیت رکھتی تھی، رجب علی کے جواب پر حیران ہوئی کہ اس کا بے پڑھا لکھا بھائی کیسی گہری باتیں کرنے لگا تھا۔

سیکھنے کی چاہ رکھنے والوں کے لیے پردیس ایک علم گاہ بن جاتا ہے۔

☆☆☆

پاکستان میں بچوں سے مل کر برطانیہ واپس آنے کے بعد رجب علی نے کنٹربری کو اپنا نیا مسکن بنا لیا۔ انگلستان کے جنوب مشرق میں واقع کاؤنٹی کینٹ جسے اس کی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے "گارڈن آف انگلینڈ" بھی کہا جاتا ہے، انگلستان کے طول و عرض میں فطرت کے نزدیک رہنے کے اعتبار سے یہ رجب کی پسندیدہ کاؤنٹی تھی۔ نشاط کے جانے کے بعد اپنے شناساؤں کے حلقے سے دور چلا جانا رجب علی کی مجبوری بھی تھی اور ضرورت بھی سو کنٹربری اسے بہتر جگہ لگی۔

کنٹربری میں اس نے جس مکان کا سودا کیا، اس کا قبضہ ملنے میں تین ماہ کا وقت تھا۔ اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رجب علی نے بچوں کے پاس جانے اور انہیں اپنے ساتھ رکھنے کے لیے دوبارہ شادی کا ارادہ کیا۔

گو نشاط کے جانے کے بعد دوبارہ نئی عورت سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا رجب علی کے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا مگر بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی خاطر اسے اس مرحلے سے گزرنا لازم تھا کہ بچوں کو اپنے سے دور وہ کب تک رکھ سکتا تھا۔ تنہا وہ ان کی دیکھ بھال اور مناسب تربیت سے قاصر تھا اور وہ بھی ایسے معاشرے میں جہاں قدم قدم پر گمراہی کے اسباب بکھرے پڑے تھے۔ وہ بچوں کے لیے نان ونفقہ کا بندوبست کرتا یا گھر بیٹھ کر ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت۔ بچے ابھی اتنا بھار اٹھانے کے لائق نہ تھے، ہر وقت راہنمائی چاہتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال اور تربیت کے لیے گھر میں عورت کی موجودگی ضروری تھی۔ یہ تو طے تھا کہ کوئی دوسری عورت ان کی اپنی ماں کا نعم البدل نہیں ہو سکتی تھی مگر پھر بھی گھر بسانے کے لیے رجب علی کو دوسری شادی کرنا ضروری تھا۔

گزشتہ برسوں میں رجب کی ساری ریاضت و مشقت نشاط اور بچوں کے لیے رہی تھی۔ نشاط کو اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر آرام و آسائش دی تھی۔ وہ بہت معمولی سا آدمی تھا، ان پڑھ اور مزدور پیشہ — قدرت کا کرم تھا کہ وہ غربت سے نکل کر ایسے معاشرے میں آ گیا تھا جہاں محنت اور ایمانداری کی قدر تھی۔ اس جیسے بے شمار ان پڑھ اور

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

مزدور پیشہ تارکین وطن کے اہل وعیال سرکار سے ملنے والی اعانت پر زندگی گزار رہے تھے یا پھر ان کی عورتیں بھی کھیتوں، کھلیانوں اور فیکٹریوں میں کام کرکے یا گھر بیٹھ کر سلائی، کڑھائی اور محنت مزدوری کرکے معاش میں مردوں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

رجب علی نے نشاط کو کسی مشقت یا مزدوری میں ڈالے بغیر محض اپنے زور بازو سے باعزت اور خوشحال زندگی دی تھی۔ نشاط فخر سے کہا کرتی تھی۔ ''میرا گھر میری جنت ہے۔'' وہ اور رجب علی اکثر اپنے اور بچوں کے مستقبل کی باتیں کرنے لگتے تھے۔

''نگی بہت ہمدرد اور رحم دل ہے، ذرا کسی کو تکلیف میں دیکھے تو رونے لگتی ہے۔ اسے تو ہم ڈاکٹر بنائیں گے۔'' رجب علی کہتا۔

مریضوں کو تکلیف میں دیکھ کر رونے بیٹھ گئی تو مریضوں کا تو ہو گیا کام۔ طیب کو بیٹھ کر ایسے پڑھاتی ہے کہ لگتا ہے بڑی ہو کر ٹیچر بنے گی۔'' نشاط کی رائے ہوتی۔

''طیب اڑائے گا جہاز۔۔۔ بنے گا پائلٹ۔ کھلونا خریدنا ہو تو اس کی ایک ہی فرمائش..... ایروپلین..... اور میرا بیٹا نجف بنے گا پولیس مین!''

''ہاں، وہ تو ابھی سے یہی کہتا ہے..... میں پولیس مین بنوں گا۔''

''اور ہماری گڑیا دُرِشہوار؟''

''اسے تو آپ ڈیری فارم کھلوا دیجیے گا۔'' نشاط اس کر کہتی۔ ''جب دیکھو، دودھ چاہیے ہوتا ہے اسے۔''

مستقبل کے لیے رجب علی کے اپنے کچھ خواب تھے۔ تعلیم یافتہ اور مہذب و مؤدب بچے، بڑی سی کھانے کی میز اور اس کے ارد گرد کرسیوں پر بیٹھے اس کے بچے، نشاط اور وہ خود بھی۔ خود کو وہ ہمیشہ لہرست کے آخر میں رکھتا تھا۔ وہ اور نشاط کھانے کی میز پر ساتھ ساتھ بیٹھتے..... بچے اپنی مصروفیتوں اور کامیابیوں کا احوال سناتے..... ان دیکھے داماد اور بہوویں بھی اس کی چشم تصور میں در آتے۔ رجب علی سہانے مستقبل کا تصور کرتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ اس منظر کی دلکشی اس کا دل خنک کر دیتی مگر اس کے سارے خواب یکلخت بکھر گئے تھے۔ کاش! اس کی جنت ارضی میں شیطان نہ آیا ہوتا۔

اپنے بکھرے خوابوں اور اجڑے گھر کی شیرازہ بندی کے لیے رجب علی دوبارہ عازم پاکستان ہوا۔ اپنا اجڑا گھر دوبارہ آباد کرنے کے لیے اس نے آپا سے صلاح کی۔ آپا خود اس حق میں تھی کہ اسے دوبارہ گھر بسا لینا چاہیے۔ بچوں کو ساتھ رکھنے کے لیے اس کا ایسا کرنا ضروری تھا۔ قسمت کی بات تھی، رجب علی کی بچپن کی منگ مہرالنساء جسے اس کے باپ نے رجب علی سے بیاہنے سے انکار کرکے رجب کی ماں کو شدید صدمے سے دوچار کیا تھا، ہنوز کنواری بیٹھی تھی۔ خالو جس نے رجب علی کو بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کیا تھا، انتقال کر چکا تھا۔ خالہ، بیٹی کا رشتہ چار بچوں کے باپ رجب علی سے کرنے کو بخوشی تیار ہو گئی۔ سادگی سے نکاح ہوا اور مہرن رخصت ہو کر رجب علی کے بچوں کے ساتھ رہنے آ گئی۔

نگار اور طیب کو مہرن کے ساتھ بٹھا کر رجب علی نے دونوں بچوں کو سمجھایا۔ ''یہ تمہاری مام ہیں، اب تمہارے ساتھ رہیں گی۔ میں واپس جا کر انہیں اور تم چاروں بہن بھائیوں کو انگلینڈ بلا لوں گا۔ گھر جو میں نے تم سب کے لیے خریدا ہے، جلدی خالی ہو جائے گا۔ میں تم لوگوں کو ساتھ لے جانے کے لیے جلدی آؤں گا۔''

''ڈیڈا مام دوسرے مین کے ساتھ چلی گئی۔'' طیب انگریزی آمیز اردو بولنے لگا تھا۔

''اسے بھول جاؤ بیٹا! تمہاری مام اب یہ ہیں۔'' رجب علی نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔

معصوم چہروں پر ناخوشی تھی۔

رجب علی گنے چنے دن پاکستان میں رہ کر واپس چلا گیا۔ عارضی طور پر وہ ایک انگریز خاتون کے گھر میں کرائے پر رہ رہا تھا۔ جس مکان کا وہ سودا کرکے گیا تھا، ایک معمر جوڑے کی ملکیت تھا۔ مکان فروخت کرکے وہ اپنی بیٹی کے پاس امریکا جا رہے تھے۔ رجب علی کو برطانیہ واپس پہنچنے پر پتا چلا کہ مکان کا قبضہ ملنے میں مہینا بھر اور تاخیر ہو سکتی تھی۔ اس نے مہرن کو اس تبدیلی سے آگاہ کر دیا اور خود کام کی تلاش میں لگ گیا۔ بچوں اور مہرن کو پاکستان سے لانا تھا، اخراجات بڑھنا تھے، مناسب روزگار لازم تھا۔

ریڈنگ میں ساتھ تجربے کی بنیاد پر اسے جلد ہی ٹیکسی ڈرائیور کی جاب مل گئی۔ اس نے پہلی فرصت میں بتا دیا کہ بیوی اور بچوں کو پاکستان سے لانے کے لیے اسے کچھ دن کے لیے پاکستان جانا پڑے گا۔ کمپنی کو ڈرائیور کی ضرورت تھی، رجب علی کو روزگار کی۔۔۔ اس نے کام شروع کر دیا۔

مہرن کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''بچے آپ ان کی ماں کو دے دیں۔ میں نے کچھ ہی دنوں میں اندازہ کر لیا ہے کہ میں چار بچوں کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتی۔''

رجب علی نے جواباً لکھا۔ ''جب تم سے میری شادی کا

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

سلسلہ چلا تو میں نے خود تم سے کہہ دیا تھا کہ میرے چار بچے ہیں اور وہ میرے ساتھ ہی رہیں گے۔"

"ہاں..... آپ نے یہ بتایا تھا مجھے، مگر مجھے اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ کسی دوسری عورت کے بچے سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ کے بچے مجھے بھی مام کہتے ہیں مگر بات بات پر اپنی ماں کو یاد کرنے لگتے ہیں، مجھے اچھا نہیں لگتا..... برداشت نہیں ہوتا..... جب یہ مجھے مام کہتے ہیں تو مجھے اپنے ذہن پر ہتھوڑا برستا محسوس ہوتا ہے۔"

"تمہیں اچھا لگے یا نہ لگے، برداشت کرنا ہوگا۔ بچے میرے پاس ہی رہیں گے۔ ان کی ماں کو نہ میں دے سکتا ہوں انہیں، نہ وہ لینا چاہتی ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں بھی نہیں رہ سکتی آپ کے ساتھ..... مجھے فارغ کریں۔"

رجب علی دم بخود رہ گیا۔

جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے اسے مہرن سے شادی کیے اور وہ فارغ کر دینے کی بات کر رہی تھی۔

ابھی وہ شش و پنج میں تھا کہ مہرن کی جانب سے عدالت میں دائر کی جانے والی خلع کی درخواست کا نوٹس اس کے انگلستان کے پتے پر پہنچا۔ اس نے مکان کا قبضہ لیتے ہی پاکستان جانے کی تیاری کر لی۔

مہرن اپنے گھر جا چکی تھی، بچے آپا کے پاس تھے۔ رجب علی کے لیے مہرن کی خلع کی درخواست دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ اس نے تو سوچا تھا مہرن اس کی خالہ زاد ہے، ٹھیکرے کی مانگ بھی رہی ہے، اس کی تکلیف کو سمجھے گی، اس کا ساتھ دے کر ماضی میں اپنے باپ کے متکبرانہ رویے کی تلافی کرے گی مگر اس نے تو چند ہی دن میں رنگ دکھا دیا تھا۔

عدالت کی جانب سے مہرن کی خلع کی درخواست پر مزید کارروائی کا انتظار کیے بغیر رجب علی نے مہرن کو طلاق دے کر فارغ کر دیا کہ جو عورت پاکستان میں رہتے ہوئے ایسی باغیانہ روش کا مظاہرہ کر رہی تھی، برطانیہ جا کر تو اس نے آپے سے باہر ہو جانا تھا۔ مہرن سے شادی کے بعد اتنی جلدی اس رشتے کا ٹوٹ جانا رجب علی کے لیے زندگی کا دوسرا اذیت ناک تجربہ تھا جس نے اسے غیروں ہی نہیں، اپنوں کی نظر میں بھی نکو بنا دیا تھا۔

بعد میں رجب علی کو معلوم ہوا کہ مہرن نے اتنی جلدی یہ اقدام اپنی ایک سہیلی کے اکسانے پر کیا تھا۔ عورت کی بربادی میں کبھی کبھی اس کی بظاہر ہمدرد مگر درحقیقت نادان دوست کا پورا ہاتھ ہوتا ہے۔ دودھ کا جلا رجب علی چاچھ بھی پھونک پھونک کر پینا چاہتا تھا۔ اجڑا گھر دوبارہ بسا کر بچوں کو دوبارہ انہیں گھر لانے کا رجب علی کا خواب ادھورا رہا۔ نگار اور طیب بھی اپنے گھر واپس نہ جا سکنے پر مایوس اور اداس ہوئے۔ نجف کو اپنی کمسنی اور ناسمجھی کے باعث مایوسی اور اداسی سے فی الحال کوئی علاقہ نہ تھا تاہم آپا جو خود ایک ماں ہوتے ہوئے ماں اور اولاد کے قلبی تعلق سے بخوبی آشنا تھی، رجب علی کے بچوں کو ماں کے زندہ ہوتے ہوئے بھی ماں کی شفقت سے محروم دیکھ کر اس محرومی کا احساس کم کرنے کے لیے انہیں کبھی اپنی باتوں سے، کبھی رات کو مزاحیہ کہانیوں سے اور کبھی انہیں باہر گھمانے پھرانے سے ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔

☆☆☆

اگلے تین چار سال رجب علی سال میں دو تین مرتبہ بچوں سے ملنے کے لیے پاکستان آتا جاتا رہا۔ اس دوران نوکری کے ساتھ اس نے اپنی ذاتی ریڈیو کنٹرول ٹیکسی کمپنی کے قیام کی تیاری بھی کی۔

ریڈنگ اور پھر کنٹربری میں ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت میں ملازمت کرنے سے وہ اس کاروبار کی منفعت اور طریق کار سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا، اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے اپنی ریڈیو کنٹرول کار کمپنی شروع کرنے کا ڈول ڈال دیا۔

بہت تگ و دو، مشقت طلب اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ ابتدا میں تو جو سنتا، ہنستا اور اس کی ہمت پست کرنے کی کوشش کرتا۔ ریڈیو ٹیکسی کمپنی کا قیام کوئی کھیل تھوڑی تھا۔ لیاقت، اہلیت، سرمایہ اور افرادی قوت کی ایک ٹیم درکار تھی۔

"رجب علی! ایک ٹیکسی چلا رہے ہو، یہی کافی ہے تمہارے گھر کا کچن چلانے کو۔ کیوں لمبے معاملے میں پھنستے ہو یارا" کنٹربری میں رجب کے ساتھی ڈرائیورز اسے سمجھاتے۔

مگر رجب دھن کا پکا تھا۔ وہ خود کو آزمانا اور دوسروں کو دکھانا چاہتا تھا کہ لگن سچی ہو تو رب بھی بندے کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ کمپنی کے قیام کے لیے محکمہ جاتی کاغذی کارروائی کے لیے اس نے ریڈنگ ریڈیو ٹیکسی بزنس میں سابقہ تجربے کے حامل ڈونلڈ کو اپنی معاونت کے لیے رکھ لیا۔

شروع میں رجب علی نے چند پرانی گاڑیوں سے کام کا آغاز کیا۔ اپنے مکان کے کورٹ یارڈ میں وہ صبح سے شام تک پرانی گاڑیوں کی مرمت اور ان کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف رہتا۔ وہی لوگ جو کل تک اس کا حوصلہ پست کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، اب اس کی ہمت اور لگن کو داد دیتے۔ شہر میں اس کی کمپنی تلے ٹیکسیاں

https://www.urdutubes.com/ digest library.com
Scanned with CamScanner

digest library.com

دوڑتی پھرتیں، ان کے ڈرائیوروں میں مسلمان، ہندو، سکھ، گورے سبھی تھے۔

جوں جوں کاروبار آگے بڑھا، رجب علی پرانی گاڑیوں کی جگہ نئے ماڈل کی آرام دہ گاڑیاں کمپنی کے بیڑے میں شامل کرتا گیا۔ رجب علی کا اپنے ڈرائیورز سے کہنا تھا۔

"سواریوں سے خوش خلقی اور احترام سے پیش آؤ اور کمپنی کی گاڑی میں سفر کو ہر سواری کے لیے اتنا خوشگوار بنا دو کہ آئندہ جب اسے ٹیکسی کی ضرورت ہو تو وہ تم ہی کو یاد کرے۔"

کمپنی کا مالک ہونے کے باوجود رجب علی خود بھی ایک ٹیکسی میں ڈرائیور کی حیثیت سے سواریوں کو لانے لے جانے کی خدمات فراہم کرتا۔

زندگی کے دوسرے اذیت ناک تجربے کے بعد وہ اپنے دکھ درد کا خول چڑھا کر زندگی کو خود اپنے لیے اور بہت سے دوسروں کے لیے بھی خوشگوار بنانے کی سعی کر رہا تھا۔ جو لوگ ایک مرتبہ اس کی ٹیکسی میں سفر کر لیتے، وہ اپنی رائیڈ بک کراتے ہوئے یہ فرمائش ضرور کرتے کہ اگر رجب علی دستیاب ہو تو اسے بھیج دیا جائے۔

بہترین خدمت کی فراہمی کے باعث تھوڑے ہی عرصے میں رجب علی کی کمپنی ٹیکسی میں سفر کرنے والوں کی پہلی ترجیح بن گئی۔ قدِ مقابل کاروباری حریف رجب علی سے حسد کرتے کہ ایک پسماندہ ملک سے آنے والا تارکِ وطن ٹیکسی بزنس میں ان سے آگے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

حالات اب قابو میں تھے۔ رہنے کو گھر تھا اور ذریعۂ معاش اچھا برسا رہا تھا۔ نئے شہر میں بظاہر رجب علی کا کوئی ایسا شناسا بھی نہ تھا جو اس کی ازدواجی زندگی کی اصل حقیقت سے آگاہ ہوتا۔ بس یہی جانتے تھے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور بچے پاکستان میں تھے۔

مہرن کو طلاق دینے کے بعد رجب علی بچوں سے ملنے کئی مرتبہ پاکستان جا چکا تھا۔ بھائی بہنیں بستی سے لسبلا بہتر رہائشی علاقوں میں منتقل ہو چکے تھے مگر مالی حالات بس گزارے کی حد تک تھے، مگر ان سب کو اپنے اپنے گھر میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے بستے دیکھ کر رجب علی کو خسارے کا احساس آگھیرتا۔ اسے معاشی فراغت تھی مگر دل ان کے درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیوی جس سے اس نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا، ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ بچے جنہیں وہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا، اس سے دور رہنے پر مجبور تھے۔ اس کے دل میں ہوک اٹھتی..... مختصر سی زندگی اور اتنی مجبوریاں، اتنی دوریاں، اتنے دکھ۔

ریڈنگ میں اس کا ایک واقفِ حال سلیم بٹ ایک روز کنٹربری میں اس سے ٹکرا گیا۔ رجب علی نے تو اسے دیکھ کر کنی کترا کر نکل جانے کی کوشش کی مگر اس نے رجب کو اس کی کوشش میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ حال چال پوچھا پھر سوال کیا۔ "شادی کی؟"

"کی تھی۔" رجب علی نے جواب دیا۔

"تھی..... کیا مطلب؟"

"گزارہ نہیں ہوا۔"

"کیوں؟"

"وہ میرے بچوں کو قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"شادی سے پہلے طے کر لینا تھا نا۔"

"کیا تھا۔"

"پھر؟"

"بس، بعد میں بدل گئی۔"

"بچے کہاں ہیں اب؟"

"پاکستان میں۔"

"انہیں اپنے ساتھ رکھو یار! وہاں تو بیچارے آدھی زندگی بسوں کے پیچھے بھاگتے گزار دیں گے۔ پتا ہے نا وہاں کے حالات تمہیں۔"

"ہاں، مگر میں یہاں بھی تو نہیں رکھ سکتا۔ کام کروں گا یا بچوں کی دیکھ بھال۔"

"شادی کر لو۔"

"بھگت چکا ہوں۔"

"میں اپنی بیوی کو اکثر پیار ہی پیار میں دھمکی دیا کرتا ہوں کہ مرد کی کوئی محبت نہ آخری محبت ہوتی ہے، نہ شادی آخری شادی۔ ویسے بھی اسلام میں چار کی اجازت ہے۔" سلیم بٹ اپنی بات پر خود ہی ہنسا۔

"مجھے دو تجربے ہی کافی ہیں۔"

"ایک اور سہی۔" سلیم بٹ نے کچھ قدرے توقف سے بولا۔ "ریڈنگ میں میرے پڑوسی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں، بیٹے بھی ہیں۔ بڑی بیٹی کی شادی ہوئی تھی مگر کامیاب نہیں رہی۔ دو چھوٹی بیٹیوں سے پہلے وہ بڑی کو دوبارہ آباد کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے بھی کہا ہے کہ کوئی مناسب رشتہ بتاؤں..... بچوں والا بھی چلے گا۔ اچھے لوگ ہیں، تم کہو تو بات کروں۔"

رجب علی چپ رہا۔

"سیانے کہتے ہیں، خاموشی نیم رضامندی..... ٹھیک

https://www.urdubooks.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

ہے نا۔۔۔ یار! بچوں کا کیا قصور ہے جو تم انہیں پاکستان پھینک آئے۔ دیکھا نہیں یہاں گورنمنٹ کتنا خیال رکھتی ہے بچوں کا۔ فری اسکول۔۔۔ فری یہ۔۔۔ فری وہ۔ یہاں معمولی آدمی بھی اپنے بچوں کو پاکستان کی اپر مڈل کلاس سے بہتر پال لیتا ہے۔۔۔ کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"بس وہی۔۔۔ ٹیکسی۔" رجب علی نے اسے یہ بتانا ضروری نہ سمجھا کہ وہ ٹیکسی کمپنی کا مالک ہے۔

"بات کروں ان لوگوں سے؟"

"کر کے دیکھ لو۔" رجب علی نے بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی غرض سے کہا۔ "مگر انہیں بتا دینا کہ بچوں کو اِدھر اُدھر چھوڑنے پر بات نہیں ہوگی۔ بچے میرے ساتھ ہی رہیں گے۔"

"ظاہر ہے۔۔۔ ظاہر ہے۔" سلیم بٹ نے گرمجوشی سے کہا۔ "میں بھی تمہیں بچوں کی وجہ سے ہی پھر آتشِ نمرود میں کودنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔" وہ پہلے کی طرح پھر اپنی بات پر ہنسا پھر بولا۔ "یار! شادی ہم مردوں کے لیے آتشِ نمرود ہی تو ہوتی ہے۔ بے خطر کودنا پڑتا ہے، بعد میں پتا چلتا ہے مارے گئے۔"

"چائے، کافی؟" رجب علی نے مروتاً پوچھا۔

"نہیں یار! بس اب ریڈنگ واپسی ہے۔۔۔ ہاں، اپنا فون نمبر تو دو مجھے۔"

رجب علی نے فون نمبر دے دیا۔

دوسرے تیسرے دن ہی سلیم بٹ کا فون آ گیا۔

"یار! وہ لوگ تم سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ تمہیں ریڈنگ آنے کی ضرورت نہیں، وہ خود کنٹربری آ جائیں گے بلکہ ثمینہ کو بھی ساتھ لائیں گے۔"

"ثمینہ کون؟"

"وہی جس کے لیے میں نے تمہارے رشتے کی بات کی ہے۔ بڑی بیٹی جس کو طلاق ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ آ جائیں۔"

"اچھا ہے نا۔۔۔ وہ بھی تمہیں اور تم اسے دیکھ لو گے۔ وہ گھر بھی دیکھ لے گی تمہارا۔ ہو سکے تو بچوں کی تصویریں دکھا دینا۔"

"ٹھیک ہے۔"

☆☆☆

ویک اینڈ پر ثمینہ، اس کے والدین، ایک چھوٹی بہن اور بڑا بھائی رجب علی سے ملنے کے لیے آئے۔ ثمینہ خوش شکل، خوش اطوار بظاہر گھریلو سی جوان عورت تھی۔ والدین اور بہن بھائی اطوار اور بات چیت سے رجب علی کو معقول لگے۔ اسی ایک نشست میں تفصیل سے بات چیت ہوئی۔ رجب علی کو اندازہ تھا کہ سلیم بٹ نے انہیں نشاط کے جانے کا قصہ بھی ضرور بتایا ہوگا، سو اس نے بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا اور کھل کر بات کی۔ اسی نشست میں تمام معاملات طے پا گئے۔ اگلے ویک اینڈ پر مسجد میں نکاح ہونا قرار پایا۔

بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی خاطر رجب علی بقول سلیم بٹ تیسری مرتبہ آتشِ نمرود میں کود پڑا۔

رجب علی کے گھر میں آتے ہی ثمینہ نے چند ہی دن میں گھر کو چمکا دیا۔ اس بار رجب علی نے مکان خرید تو لیا تھا، اس کی تزئین و آرائش پر توجہ نہ دی تھی۔ آرائش کرتا بھی تو کس کے لیے۔ بیوی تھی نہیں، بچے دور۔ دن بھر کام میں مصروف رہتا، رات کو مسافر کی طرح گھر میں آ کر سو رہتا، صبح کو اٹھتا تو شام بلکہ رات تک وہی بھاگ دوڑ رہتی۔ ثمینہ آئی تو مکان، گھر دکھنے لگا۔ پیسے کی فراوانی تھی۔ ثمینہ نے اپنی پسند سے گھر کی ایک ایک چیز خریدی۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی اور اپنے مقدر پر نازاں ہوتی کہ نکھٹو اور ناقدرے سابقہ شوہر سے اس کی جان چھڑا کر خدا نے اسے ایک کامی اور قدردان شوہر عطا کر دیا تھا جو اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا اور اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ حیران ہوتی کہ نشاط اتنے اچھے شوہر کو کیوں چھوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

نشاط کو اپنی غلطی کا احساس ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ نبیل پہلے بوائے کی تعریف پر پورا اترتا تھا۔ کھلنڈرا، لاابالی، غیر ذمے دار شخص، جسے اپنی ذات سے آگے کچھ نہ دکھائی دیتا ہو جو غیر عملی ہو اور وہ تمام اصول و قواعد جن کی دوسرے لوگ پابندی اور احترام کرتے ہوں، اسے ان اصول و قواعد کی پابندی سے کوئی غرض نہ ہو۔ جسے صرف مسرت انگیز سرگرمیوں سے غرض ہو، صنفِ مخالف سے دوستی اور قربت اس کا مشغلہ ہو۔

کچھ عرصہ تو نشاط اور وہ گھومتے پھرتے، سیر و تفریح کرتے پھرے اور مغرب کی زندگی کی رنگینیوں اور مسرت انگیز سرگرمیوں میں غلطاں رہے۔ نبیل اپنی لفاظی اور سحر طرازی سے نشاط کو لبھاتا اور نشاط اپنی خود پسندی اور خود آرائی کے باعث اس کی لفاظی اور سحر طرازی کی اسیر ہوئی جاتی لیکن ریت کا گھروندا سدا کب کھڑا رہ سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ نشاط سے نبیل کا دل بھرنے لگا اور نشاط کو اس کی غلطی کا

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

احساس ستانے لگا۔

اچھا بھلا گھر تھا، خیال رکھنے والا شوہر تھا جسے اس سے مادی منفعت سے بے نیاز اور بے غرض محبت تھی۔ وہ اس کی عزت کرتا تھا، اس کی ہر ضرورت کا خیال اور ہر خواہش کا احترام کرتا تھا۔ چار پیارے پیارے بچے تھے جن کی معصوم ادائیں اور شرارتیں صبح سے رات تک اس کا دل برمائے رکھتیں۔ ایک محنتی، دیانت دار اور اپنی ذمے داریوں سے آگاہ شخص کی شریکِ حیات ہونے کے باعث اسے ایک غیر معاشرے میں بھلی عزت حاصل تھی۔ نبیل کی بے معنی لچھے دار باتوں میں آکر اسے کیا ملا تھا۔۔۔ گھر سے بے گھر ہوئی، سارا عیش و آرام گیا، محبت کرنے والے شوہر کا ساتھ نہ رہا، بچے جدا ہوئے جن کی یاد آتی تو دل مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا۔ اس وقت تو سفلی جذبے کے تحت رجب سے کہہ گزری تھی کہ بچے اس کے ہیں، وہی جانے مگر اب سوچتی تھی بچے صرف رجب ہی کے تو نہیں تھے، اس کے اپنے بطن کے پروردہ اور پیدائش سے نو ماہ قبل تک صرف اور صرف اسی کے رہے تھے۔ وہی ان کا وجود اپنے وجود کے ساتھ اٹھائے پھرتی تھی، وہی اس سے نتھی رہے تھے اور پیدائش کے بعد بھی وہ رجب سے زیادہ اسی کے قریب رہے تھے پھر اس نے وقت جدائی رجب سے یہ کیوں کہہ دیا تھا کہ بچے اسی کے تھے؟

نبیل کے ساتھ ازدواجی رشتے نے اسے نبیل کی زبانی کلامی لفاظی اور جمع خرچ کے سوا اور کیا دیا تھا۔ اسے ہفتے کے پانچ دن گھر سے باہر کام کرنا پڑتا تھا، کبھی کسی سپر اسٹور میں، کبھی فیکٹری میں۔ اختتامِ ہفتہ پر اسے سودا سلف خود خرید کر لانا پڑتا تھا۔ رجب علی تو کچن میں کوئی چیز ختم ہونے سے پہلے ہی اضافی لا کر رکھ دیا کرتا تھا۔ اسے کسی چیز کی فکر نہ ہوتی۔ دونوں شاپنگ کے لیے اکٹھے جاتے تو وہ جس چیز کو پسند کر لیتی، جس پر ہاتھ رکھ دیتی، خواہ قیمت کتنی ہی ہوتی، اس وقت نہ سہی بعد میں سہی، رجب علی اسے خرید لانا لازم کر لیتا۔

نبیل کو گھر کا سودا سلف لانے سے کوئی غرض نہ تھی، جو کرے، نشاط ہی کرے۔ ویک اینڈ پر وہ زیادہ وقت بستر توڑنے میں گزارتا یا پھر تیار ہو کر خوشبو میں بس کر یار دوستوں سے ملنے نکل جاتا۔ نشاط کو تو اس کی حرکات و سکنات سے کبھی کبھی شبہ ہونے لگتا۔ گھر سے اتنی تیاری کے ساتھ وہ دوستوں سے ملنے جاتا تھا یا کسی اور سے۔۔۔ ہینڈسم اور اسمارٹ تو وہ تھا اور ساتھ ہی دل پھینک بھی۔ جب وہ دونوں اکٹھے باہر نکلتے تو جوان لڑکیاں اور عورتیں نبیل کو دوسری ہی نظروں سے دیکھنے لگتی تھیں۔ نشاط کا جی ان کی آنکھیں پھوڑ دینے کو چاہتا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اس شخص کی خاطر وہ کیا کچھ چھوڑ آئی تھی۔۔۔ کھو آئی تھی۔۔۔ ہار آئی تھی۔ اس کے دامن میں اب اس ایک شخص اور اپنے خسارے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کا دل پچھتاوے میں تھا مگر اسے لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنی فتح مندی ظاہر کرنے کے ساتھ رجب علی کے خلاف ناکردہ الزامات کی فہرست بھی اپنی عذر تراشی پر چسپاں کرنی پڑتی تھی۔

☆☆☆

رجب علی کی شادی کی خبر سے نگار اور طیب خاصے ناخوش ہوئے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ انگلستان لے جانے کے لیے پاکستان آیا تو طیب نے منہ بنا کر کہا۔ ”آپ نے پھر سے شادی کیوں کی؟“

”تم بہن بھائیوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے۔“

”ہم ویسے بھی تو آپ کے ساتھ رہ سکتے تھے۔“ نگار بولی۔

”بیٹا جی! ابھی آپ لوگ اتنے بڑے نہیں ہو۔ میں تو کام پر ہوتا ہوں، گھر میں کوئی بڑا ہونا چاہیے نا، تم لوگوں کی دیکھ بھال کے لیے۔“

”ہم اپنی دیکھ بھال خود کر سکتے ہیں ڈیڈ! اب بڑے ہو گئے ہیں ہم۔“

”اتنے بڑے نہیں ہوئے ابھی۔“

”پہلے بھی آپ نے شادی کی تھی، وہ چلی گئیں۔۔۔ یہ بھی چلی جائیں گی۔“

”اچھی امید رکھو بیٹا!“

”ڈیڈی!“ طیب کے لہجے میں اسرار تھا۔

”ہاں بیٹا!“

”آپ مام کو لے آئیں نا۔۔۔ کتنی اچھی تھیں مام!“

”ہاں بیٹا! بہت اچھی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ واپس نہیں آسکتی۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ اس نے دوسرے آدمی سے شادی کر لی ہے۔“

”لیکن مجھے تو اچھی لگتی ہیں۔“

”اچھی تو مجھے بھی لگتی تھی بیٹا۔۔۔ لیکن اسے جانا تھا، چلی گئی۔“

”میں اسے مار دوں گا۔“

”کسے؟“ رجب چونکا۔

”اس آدمی کو۔“

”کس آدمی کو؟“ رجب جانتے بوجھتے انجان بن گیا۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

"وہی جو ہمارے گھر میں آتا تھا۔"
"دفع کرو بیٹا!"
رجب علی بچوں کو اپنے ساتھ الگستان لے گیا۔

☆☆☆

زندگی پھر ایک ہموار ڈگر پر آ گئی۔ ثمینہ اور بچے ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔ مکان بڑا تھا، گھر آباد ہوا تو رجب علی نے اپنے بال بچوں کی ضرورت سے زائد کمرے کرائے پر چڑھا دیے۔ پہلے نشاط کرایہ داروں کے معاملات کی ذمے دار ہوا کرتی تھی، کرایہ داروں سے حاصل ہونے والا کرایہ بھی اسی کے پاس جاتا تھا، اب ثمینہ کے سپرد ہوا۔

رجب علی کا ایک دوست کہا کرتا تھا..... عورتیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں..... اور اپنی اس بات کے جواز میں دلیل یہ دیا کرتا تھا کہ..... عورتیں سب ایک جیسی اس لیے ہوتی ہیں کہ ان کا وجود جو ایک ہی مٹی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔

غالباً دوسری یا تیسری مرتبہ اپنے دوست سے یہی بات سننے کے بعد رجب علی نے کہا "مگر تو ہم سارے مرد بھی ایک جیسے ہی ہوئے کیونکہ ہمارا خمیر بھی تو ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" دوست بولا۔ "ہم مرد پیدائشی بیوقوف ہوتے ہیں اور عورت کے ہاتھوں بیوقوف بن رہے ہیں۔"

کرایہ داروں کے سلسلے میں ثمینہ بھی نشاط سے چنداں مختلف ثابت نہ ہوئی۔ گھر میں مقیم کرایہ داروں میں ایک ہسپانوی جوڑا بھی تھا۔ میاں بیوی دونوں جوان تھے، دونوں نوکری کرتے۔ مرد بلا کا مے نوش تھا۔ ویک اینڈ پر ڈٹ کر پیتا اور خوب غل غپاڑا کرتا۔ بیوی اسے برا بھلا کہتی اور دونوں آپس میں لوتے جھگڑتے۔ ثمینہ کہتی، یہ اپنے ساتھ ہمارا ویک اینڈ بھی خراب کرتے ہیں۔ انہیں کسی روز نکال باہر کروں گی۔ رجب علی کو انہیں بے گھر کرنے سے خوف آتا اور اس خوف کا سبب پڑوسی والا گھر اور نشاط سے وابستہ یادیں تھیں۔

ایک موقعے پر پڑوسی والے گھر میں پانچ کرایہ دار رہ رہے تھے۔ ایک نرس اور اس کا بھائی فریڈ، ایک بنگالی شمس الدین اور دو مصر کے رہنے والے، دونوں ہوا باز تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں شریک رہے تھے، ریٹائرڈ تھے اور اب ان کی زندگی کھانے پینے اور شراب نوشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ خوب پی کر آتے اور کمرے میں بیٹھ کر بہ آوازِ بلند اول فول بکتے۔

نشاط ان دونوں سے بہت عاجز رہا کرتی تھی۔ اکثر انہیں ڈانٹتی ڈپٹتی اور گھر سے نکال دینے کی دھمکی دیتی۔ ان سے بات کرتی تو نہایت حقارت سے۔ رجب علی اسے سمجھاتا۔ "خدا کے بندے ہیں، ان سے اتنی سختی اور حقارت سے بات نہ کیا کرو۔"

"آپ کو بندوں سے ذلیل کرنا نہیں آتا۔ بس چلے تو آپ کرایہ داروں کو مہمانوں کی طرح رکھیں۔"

"کیا حرج ہے یارا اللہ وے تو بندوں کی خاطر تواضع کرنی چاہیے۔"

"جی۔" نشاط اسے اک ادائے دلبرانہ سے دیکھتی۔ "اگلے دن وہ گھر کے اندر ہوں گے اور ہم گھر سے باہر۔"

دونوں سابق ہوا باز اکٹھے گھر سے باہر جاتے اور پی پلا کر اکٹھے واپس لوٹتے۔ جب بھی رات کو دیر سے واپس آتے، نشاط نے گھر کے مرکزی دروازے کو اندر سے تالا لگا کر چابی اپنے پاس رکھی ہوتی۔ دونوں دروازہ کھٹکھٹاتے رہتے، نشے میں اول فول بکتے رہتے۔ نشاط نہ خود دروازہ کھولتی، نہ رجب کو کھولنے دیتی۔

"سردی ہے یارا بڈھے ٹھٹھر جائیں گے۔" رجب علی نشاط سے کہتا۔

"ٹھٹھرنے دیں۔ اچھا ہے انہیں پتا چلے کہ دیر سے آنے کا کیا نقصان ہے۔" نشاط بے پروائی سے کہتی۔

"مر جائیں گے۔" رجب علی کو ہمدردی ہوتی۔

"مرنے دیں..... میونسپل سروس میں ہم بھی چلے جائیں گے۔" نشاط کی بے رحمی عروج پر ہوتی۔

"آج اور معاف کر دو، میں انہیں سمجھا دوں گا کہ وقت پر آیا کریں۔" رجب علی خوشامد کرتا۔

"آج اور..... آج اور..... آج اور....." نشاط تنک کر بستر سے اٹھتی۔ "آپ ہیں ہی کہہ کر ہر بار ان کے سفارشی بن جایا کریں۔ سردی میں ٹھٹھرتے تو آسمدہ ان کا باپ بھی وقت پر آتا۔"

"باپ ہمارے تو دونوں کے قبروں میں سو رہے ہوں گے۔"

جنوری کی ایک یخ بستہ رات جب دونوں مرد شراب نوشی کے بعد غل غپاڑا کرتے گھر لوٹے تو نشاط نے نہ خود دروازہ کھولا، نہ ہی رجب علی کو دروازے کی چابی کی ہوا لگنے دی۔ رجب علی دیر تک ہر ممکن جگہ پر چابی تلاش کرتا رہا مگر چابی مل کر نہ دی۔ رجب علی دروازہ کھولنے کے لیے نشاط کی خوشامد کرتا رہا مگر اس نے اس رات دروازہ نہ کھولنے کی قسم ہی کھا لی تھی۔

digest library.com
https://www.urdutubes.com
Scanned with CamScanner

digestlibrary.com

دونوں مرد بہت دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتے اور بکتے جھکتے رہے۔ بالآخر ان کی آوازیں آنا بند ہوگئیں اور گرم بستر میں رجب علی کی بھی آنکھ لگ گئی۔

صبح کو جب رجب علی نے حسبِ معمول دروازے کے باہر سے دودھ کی بوتلیں اٹھانے کو نشاط کے چابی دینے پر گھر کا بیرونی دروازہ کھولا تو دونوں مردوں کا نشہ اتر چکا تھا۔ دروازے کے باہر سکڑے بیٹھے تھے، کانپ رہے تھے۔

"ہم اپنا سامان اٹھا سکتے ہیں؟" ایک نے کپکپاتے ہوئے رجب علی سے کہا۔

"کل رات جان لیوا سردی تھی۔" دوسرے نے سردی سے بجتے دانتوں کو بمشکل قابو کرتے ہوئے کہا۔

رجب علی بہت شرمندہ ہوا اور ان سے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "میں تو دروازہ کھولنا چاہتا تھا مگر لینڈ لیڈی..... تم تو جانتے ہو نا..... ہر شریف آدمی کی طرح میں بھی اس کے سامنے زیادہ نہیں بول سکتا ورنہ وہ مجھے بھی گھر سے باہر نکالنے کا حق رکھتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" ان میں سے ایک بولا۔

'کتنے متحمل ہیں یہ لوگ۔' رجب علی نے سوچا۔ 'انہی کا دیس، انہی کے وسائل..... اور ہم باہر سے آئی بلائیں اور انہی سے میاؤں۔' اسے خجالت محسوس ہوئی۔

رجب علی کی اجازت سے دونوں گھر میں داخل ہوئے، اپنے کمرے میں گئے، اپنا سامان سمیٹا پھر دروازے پر دستک دے کر نشاط کو رواں ہفتے کا کرایہ ادا کیا اور ان میں سے ایک نے کہا۔ "لینڈ لیڈی! ہم دونوں آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اتنے دن ہمیں اپنے گھر میں رکھنا برداشت کیا۔"

لیکن دوسرے نے جاتے جاتے کہا۔ "ہم تو آپ کے گھر سے نکل کر اپنے لیے کوئی نہ کوئی ٹھکانا تلاش کر ہی لیں گے..... لیکن..... کبھی وقت مل جائے تو آپ ایک بات ضرور سوچنا کہ کبھی آپ کو ہماری طرح یہ گھر چھوڑنا پڑا تو آپ کہاں جائیں گی۔"

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ نشاط کو گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ اگرچہ یہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔ وہ چاہتی تو گھر میں رہ سکتی تھی، اپنے بچوں کی خاطر رجب علی اس کی لغزش کو معاف کر دینے کو تیار تھا۔ رجب علی کا دل کہتا تھا، نشاط کو ان دونوں گوروں کی بددعا لگ گئی تھی۔

سو جب ثمینہ نے گھر میں مقیم لڑکا کرایہ دار جوڑے کو گھر سے نکال دینے کی بات کرتی تو رجب علی کو غصہ آ جاتا۔ "رہنے دو یار! دونوں لڑتے ہیں تو ہمارا کیا جاتا ہے۔ سارے میاں بیوی ہماری طرح پیار محبت سے تو نہیں رہتے۔"

رجب علی کے ہمیشہ اسی جواب پر ایک روز ثمینہ نے اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک بات بتائیں۔"

وہ ہمہ تن گوش ہوا۔ "پوچھو۔"

ثمینہ نے اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں یوں ڈالیں جیسے آنکھوں کے راستے اس کے دل کا بھید پانے کی کوشش کر رہی ہو۔ "نشاط کے ساتھ بھی آپ اتنے ہی پیار محبت سے رہتے تھے؟"

رجب علی مضطرب ہوگیا۔

سازِ زندگی کا یہ کون سا تار چھیڑ دیا تھا اس کی زندگی میں آنے والی تیسری عورت نے..... کیا بتاتا اور کیسے بتاتا۔ وہ اس عورت کو کہ پہلی عورت کے ساتھ گزرا وقت تو اس کی کتابِ زندگی کا وہ یادگار باب تھا جو اسے لفظ بہ لفظ ازبر تھا۔ اسے وہ چاہتے ہوئے بھی نہ بھلا سکتا تھا..... اک سنہری باب..... اک حسین خواب جو پلکوں تلے سے سرکا تو گلاب زندگی کو عذاب بنا گیا، زندگی وہ نہ رہی جو تھی اور جواب تھی، وہ زندگی سے اک مفاہمت تھی۔

رجب علی اکثر سوچتا، نشاط نے ایک غلط قدم اٹھا کر اس سے اور اپنے بچوں سے ہی زیادتی نہیں کی تھی، خود اپنے اوپر بھی ظلم کیا تھا۔ کبھی کبھار نشاط کے حال کے بارے میں اطلاعی آڑاتی کوئی خبر مل ہی جاتی تھی رجب علی کو۔ اسے نشاط پر افسوس بھی ہوتا، غصہ بھی آتا۔ وہ مقام، عزت، مرتبہ اور خوشی اسے کہاں مل سکتی تھی جو اس کی شریکِ زندگی ہوتے ہوئے اس کے گھر اپنے اور غیر معاشرے میں بھی حاصل رہی تھی۔

وہ لڑاکا جوڑا جسے گھر سے نکال دینے کی ثمینہ اکثر بات کیا کرتی تھی، ایک روز دونوں میں اتنی لڑائی ہوئی کہ لڑکی نے گھر کی اوپری منزل پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ قسمت کی اچھی تھی کہ نیچے گھر کے کھلے حصے میں اسپرنگ والا ایک پلنگ پڑا تھا۔ اس پر گری تو بچ گئی ورنہ ہڈی پسلی ایک ہوگئی ہوتی۔

ثمینہ کو تو موقع ملا۔

"اب تو نکالنا ہی ہوگا انہیں۔ کمبخت نیچے گر کر مر جاتی تو پولیس نے ہم سے بھی سوال جواب کرنا تھے۔" ثمینہ بولی۔

"چھوڑو یار! ہم کیوں نکالیں۔ جب جانا ہوگا، خود ہی چلے جائیں گے۔" رجب علی نے ثمینہ کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"آپ چاہتے ہیں یہ کوئی گل کھلا کر جائیں۔"

https://www.urdutunes.com/

Scanned with CamScanner

"بھی کھلے گا تو خوشبو ہی آئے گی۔" رجب علی مسکرا کر بولا۔

ثمینہ جز بز ہوئی۔

چند ہی دن گزرے کہ لڑکی نے ایک دن ثمینہ سے کہا۔ "میں اور میرا بوائے فرینڈ آسٹریلیا جا رہے ہیں۔"

"کس لیے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"آسٹریلیا میں میری ماں رہتی ہے — نہایت سخت گیر۔ وہی ٹھیک کرے گی میرے بگڑے بوائے فرینڈ کو۔"

ان کے جانے کے بعد رجب علی نے ثمینہ کو دلسوزی سے سمجھایا۔ "کبھی کسی کرایہ دار کو کمتر مت سمجھنا ثمینہ! ہم سب اس دنیا میں کرایہ داری ہیں۔ یہ فقط اللہ کا کرم کہ اپنے کرائے داروں میں سے جسے چاہے مالک مکان بھی بنا دے۔"

ثمینہ کی گود سے رجب علی ایک اور بیٹی کا باپ بن گیا۔ ثمینہ اور اس کے گھر والے بھی بہت خوش تھے۔ رجب علی کے پہلے چار بچے بھی ایک نئی اور گڑیا جیسی بہن کے آنے سے بہت مسرور تھے۔ ثمینہ نے اس کا نام اپنی پسند سے رائیل رکھا۔

رائیل گھر بھر کی آنکھ کا تارا بن گئی۔ اسے دیکھنے کو رجب علی دن میں بھی گھر آ جاتا۔ ثمینہ خیال فاروقی سے اس سے کہتی۔ "کیا بات ہے، پہلے تو آپ صبح کو گھر سے گئے رات کو بھی دیر سے گھر لوٹا کرتے تھے، اب ایسی کیا بات ہو گئی جو دن میں بھی آ جاتے ہیں۔"

"جلتی کیوں ہو میرے آنے سے۔" رجب علی کہتا۔

"جلتی نہیں ہوں، وجہ جاننا چاہتی ہوں۔"

"یہ — یہ ہے وجہ۔" رجب علی نہایت محبت سے ننھی رائیل کو چومتا۔

"ڈیڈی! جب میں چھوٹی تھی کیا آپ مجھے بھی اتنا ہی پیار کرتے تھے؟" ڈرشکوار نے ایک دن پوچھا۔

"ہاں بیٹا! ماں باپ کو اپنے سارے ہی بچے پیارے ہوتے ہیں۔" رجب علی نے جواب دیا۔

"مگر چھوٹے بچے سے زیادہ پیار ہوتا ہے۔ تم چاروں تو اب بڑے ہو گئے ہو۔" ثمینہ قدرے بگڑ کر بولی۔

"یار! اس نے ایک بات کی ہے۔" رجب علی نے ثمینہ کے لہجے میں کئی بھانپ لی تھی۔

"میں بھی دیکھوں، ایک ہی بات کر رہی ہوں۔"

رجب علی خاموش ہو رہا۔

رائیل کی پیدائش کے بعد رجب علی کا وہی دوست اور اس کی بیوی جنہوں نے ثمینہ سے اس کا رشتہ کرایا تھا، رائیل کی پیدائش کی مبارک باد دینے خصوصی طور پر ریڈنگ سے کنٹربری آئے تو ان کی زبانی خبر ملی کہ نشاط اور نبیل میں علیحدگی ہو گئی تھی اور نبیل کی واردات میں ملوث ہو کر جیل چلا گیا تھا۔

رجب علی نے یہ خبر سن کر فقط اتنا کہا۔ "انسان کو اپنے کیے کا نتیجہ کسی نہ کسی صورت بھگتنا پڑتا ہے۔"

"نشاط کی بات کر رہے ہیں آپ یا اس کی جس کے ساتھ وہ گئی تھی؟" ثمینہ نے رجب علی کو تیکھی نظر سے دیکھا۔

"نشاط سے مجھے اب کیا لینا دینا۔" رجب علی نے ثمینہ کو مطمئن کرنے کو کہا۔

☆☆☆

رجب علی مطمئن تھا کہ ثمینہ اور بچے باہم مل جل کر خوشی خوشی رہ رہے تھے۔ خوشی اور اطمینان اب اس کے لیے ایک ہی معنی رکھتے تھے۔ خوشی جب تھی، سو تھی — اب اس کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ بچے اس سے دور نہ تھے اور گھر میں ایک عورت تھی بچوں کا خیال رکھنے اور ان کی مناسب تربیت کرنے کو۔

ٹیکسی کمپنی اچھا بزنس کر رہی تھی اور رجب علی اس کمپنی کا مالک ہوتے ہوئے بھی ایک ٹیکسی کا ڈرائیور خود تھا۔ وہ چاہتا تو ٹھاٹھ سے کمپنی کے آفس فرنشڈ آرام دہ آفس میں مالکانہ رعب و زعم کے ساتھ بیٹھتا، چائے کافی پیتا اور پیسے گنتا۔ کیا ضرورت تھی اسے صبح سے رات تک سڑکوں پر خواری کی، مگر اس خواری میں بھی ایک حکمت عملی تھی۔ ٹیکسی کمپنی کا مالک ہوتے ہوئے بھی خود ڈرائیوروں کے مسئلے کا حصہ بنے رہنے سے اسے بہت سے معاملات کا براہ راست علم رہتا تھا۔ سواریوں کے ساتھ ڈرائیوروں کے رویوں پر نظر رہتی تھی، حریف کاروباریوں کی سازشوں سے آگہی رہتی تھی۔ کاروبار میں اونچ نیچ اور حریفوں کی سازشیں تو دنیا بھر میں کاروبار کا گویا مسلک ہے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر رجب علی کو ٹیکسی ڈرائیونگ میں بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے، کچھ اپنی سنانے، کچھ دوسرے کی سننے، کبھی دوسروں کو قائل کرنے، کبھی دوسروں کے دلائل سے خود قائل ہو جانے اور زبانی کلامی عقل و دانش کے اکتساب کے جو مواقع ملتے تھے، وہ کمپنی کے آرام دہ فرنشڈ آفس میں بیٹھ کر ملنا ممکن نہ تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ انگوٹھا چھاپ ہونے کے باوجود رجب علی کو تمام فراست لوگوں سے کسی نہ کسی حوالے سے راہ چلتے میں رہنے سے ہی ملی تھی۔ اب جو بات وہ کرتا، اکثر لوگوں کے دل کو لگتی۔

digest library.com
https://www.urdutubes.com/
Scanned with CamScanner

digest library.com

ایک بوڑھی عورت نے اس کی ٹیکسی میں سفر کے دوران از خود گفتگو شروع کردی۔ کافی دیر اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس سے پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

جواباً رجب علی نے کہا۔ "پاکستان سے۔"

وہ بولی۔ "پاکستان! میں نے سنا ہے پاکستان میں بہت غربت ہے، لوگوں کے پاس نہ کھانے پینے کو اچھا ہوتا ہے، نہ رہنے کو گھر۔ تم لوگ کہاں رہتے ہو؟"

"رجب علی کو مذاق سوجھا۔ "درختوں پر۔"

وہ اور حیران ہوئی۔ "درختوں پر کیسے؟"

رجب علی اپنے سامنے لگے آئینے میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ "درختوں پر مچان بنا کر۔"

عورت نہایت افسردہ ہوئی۔ "مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔"

رجب علی کی حسِ مزاح مسلسل پھڑک رہی تھی۔ "مجھے بھی بہت افسوس ہوتا ہے۔"

بوڑھی عورت نے اپنے چٹے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "یہاں تو خوش ہو نا تم؟"

رجب علی نے گرمجوشی سے کہا۔ "بہت۔"

عقبی نشست پر بیٹھی عورت مطمئن نظر آئی۔ "جب تمہارا ملک اتنا غریب ہے تو تم نے تعلیم کیسے حاصل کی؟"

رجب علی بولا۔ "میں ان پڑھ ہوں۔"

عورت نے اس کی بات کو سچ ماننے سے انکار کردیا۔ "اپنی باتوں سے تو تم بہت پڑھے لکھے لگتے ہو۔"

رجب علی نے ایک نظر عورت کے عکس پر ڈالی پھر کہا۔ "یہی بات سچ ہے مادام! اور میں معذرت خواہ ہوں کہ اس سے قبل میں نے اپنے ملک کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ محض مذاق تھا۔ میں جس ملک سے آیا ہوں، وہاں بہت کچھ ہے۔ غریب آدمی بھی پیٹ بھر کر کھاتا ہے اور اپنے گھر کی چھت تلے رہتا ہے۔ امیروں کا تو آپ پوچھیں ہی مت کہ کیسی شاہانہ زندگی گزارتے ہیں۔ گھر ان کے محل ہیں اور ان محلوں میں انہوں نے اپنے لیے ایسی ایسی آسائشیں جمع کر رکھی ہیں کہ بیان سے باہر۔ تعلیم وہاں عام ہے، ذہین اور قابل افراد کی کمی نہیں۔ میری بدقسمتی کہ میں تعلیم حاصل نہیں کرسکا۔"

عورت بولی۔ "لیکن تمہاری باتیں پڑھے لکھے آدمی سے کم نہیں۔"

رجب علی نے کہا۔ "آپ کا حسنِ ظن ہے۔"

بعض سواریوں سے تو رجب علی کے ایسے مضبوط و توانا روابط بن گئے تھے کہ کمپنی سے رابطہ کرنے پر رجب علی کی ٹیکسی کے انتظار میں وہ کافی کافی دیر اس کی ٹیکسی کا انتظار کرلینا بھی گوارا کرلیتے۔ اپنی ان مستقل سواریوں کے ساتھ رجب علی کی جو مضبوط ہم آہنگی تھی، سو تھی، کبھی کبھار ٹیکسی میں سفر کرنے والوں سے بھی وہ اپنا تعلق توانا رکھتا، بلا تخصیص مرد و زن، عمر و مزاج وہ اکثر از خود سواری سے تعلق استوار کرلیتا۔ کبھی موسم کے ذکر سے، کبھی بدلتے قرینوں کے تقاضوں سے، کبھی سنجیدہ گفتگو، کبھی ہلکی پھلکی مذاق، کبھی جملہ بازی تو کبھی سواری کے خدوخال یا لباس کی تعریف کرکے۔ بچے، بوڑھے، مرد، عورت سب اس کی ٹیکسی میں سفر کرکے خوش ہوتے اور اپنی منزل پر پہنچ کر اسے کرائے کی ادائیگی کے علاوہ بخشش بھی دیتے اور سفر کو خوشگوار گزروانے پر اس کا شکریہ بھی ادا کرتے۔

رجب علی کی مستقل سواریوں میں سے ایک پاکستان سے آئے ہوئے معمر شخص فضل الرحمن بھی تھے۔ عرصہ دراز سے برطانیہ میں مقیم تھے۔ ایم اے کی تین ڈگریاں حاصل کر رکھی تھیں، اسلامی فقہ، فلسفہ اور لائبریری سائنس۔۔۔۔ انگلستان آنے سے قبل ایک سرکاری ادارے میں لائبریرین تھے۔ سربراہ ادارہ لائبریری کے عملے کو فرائض منصبی کی انجام دہی سے ہٹا کر اکثر و بیشتر اپنی "ہوم منسٹری" میں لگائے رکھتا۔ لائبریری کی صفائی پر مامور خاکروب کو دس بجتے ہی وہ اپنے گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے روانہ کردیتا۔ چپڑاسی صبح دفتر آنے کے بجائے ان کی بیگم کے پاس حاضری لگواتا، سرکاری گاڑی ان کے بچوں کو اسکول، کالج لے جاتی، لاتی۔ بیگم اسی گاڑی میں شاپنگ کے لیے اور اپنے رشتے داروں اور سہیلیوں سے ملنے جاتیں۔ مہمان آتے تو اسی میں سیر سپاٹے کرتے۔

فضل الرحمن شریف اور ایماندار آدمی تھے۔ سرکاری وسائل کے ناجائز استعمال پر وہ سربراہ ادارہ پر اکثر نکتہ چینی کرتے رہتے لہٰذا دونوں میں اکثر ان بن ہی رہتی۔ خوشامدیوں کا ٹولا سربراہ ادارہ کو فضل الرحمن کے خلاف بھڑکاتا رہتا اور باس بہرحال باس ہوتا ہے، بیچارے فضل الرحمن کی اکثر جواب طلبی ہوتی۔

تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ایک روز فضل الرحمن نے سرکاری وسائل کے ذاتی استعمال کا کچا چٹھا متعلقہ وزارت کو لکھ بھیجا۔ باس نے باز پرس کی اور گام گلوچ پر اتر آیا تو انہوں نے بھی اس کا گریبان پکڑ لیا۔ الغرض بالآخر بات پہنچی۔ آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا، بیچارے فضل الرحمن ہی

https://www.urdudubes.com/

Scanned with CamScanner

کو معطل کر دیا گیا۔

انہی دنوں فضل الرحمٰن کی اہلیہ تیسرے بچے کی زچگی میں چل بسیں، بچہ بھی مر گیا۔ بیروزگاری میں یہ افتاد..... فضل الرحمٰن کے بقول وہ ہر نماز کے بعد اللہ سے گڑگڑا کر دعا کرتے کہ مجھ گناہ گار کو انسانوں میں لے جا۔ دل کے کسی گوشے میں یہ یقین جاگزیں ہوتا کہ خدا انہیں کسی ایسی جگہ لے جائے گا جہاں وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ دین اور دنیا کے معاملات نمٹا سکیں گے۔

خدا کا کرنا فضل الرحمٰن کے ایک عزیز جو برطانیہ میں مقیم تھے، پاکستان آئے اور ازراہِ ہمدردی انہیں اپنے ہمراہ انگلستان لے گئے۔ فضل الرحمٰن تعلیم یافتہ تو تھے ہی، درس و تدریس سے منسلک ہو گئے اور ساتھ ہی اپنے دین کی تبلیغ بھی شروع کر دی۔ دو بچے جنہیں پاکستان میں چھوڑ آئے تھے، ان میں سے بیٹے کو اپنے پاس بلا لیا۔ بیٹی کی شادی کم عمری ہی میں اپنے بھانجے سے کر دی۔

فضل الرحمٰن نے رجب علی کی ٹیکسی میں آنا جانا شروع کیا تو اپنے بیٹے کی شادی کر چکے تھے اور نوکری سے فراغت پا کر دین کی تبلیغ میں لگے ہوئے تھے۔ شمار ہی نہ تھا کہ کتنے تھے جو ان کی تبلیغ سے حلقۂ اسلام میں آ چکے تھے۔

ایک روز دورانِ سفر فضل الرحمٰن نے رجب علی سے کہا۔ ”رجب علی بھائی! میں پاکستان میں اپنی معطلی کے دنوں میں بلکہ اس سے پہلے بھی اپنے باس کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر اللہ رب العزت سے گڑگڑا کر دعا کیا کرتا تھا کہ مجھ عاصی بندے کو انسانوں میں لے جا جہاں میں یکسوئی سے دین کی خدمت بھی کر سکوں۔ پروردگار کی شان دیکھیے، دانہ پانی کہاں لکھا تھا!“

رجب علی نے ان کی بات سن کر کہا۔ ”اللہ آپ کو وہاں لے آیا جہاں اس نے آپ کی ضرورت محسوس کی۔ بے شمار لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنا کوئی معمولی بات تو نہیں۔“

”پروردگار کا کرم ہے۔“ فضل الرحمٰن عجز سے بولے۔

”یہاں تو خوش ہیں نا آپ؟“ رجب علی نے پوچھا۔

فضل الرحمٰن نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بھائی! سچ بات یہ ہے کہ انسان خوش تو اپنے لوگوں کے درمیان ہی ہوتا ہے۔ پاکستان میرے لہو میں بستا ہے، وہاں میری بیٹی ہے، داماد ہے، ان کے بچے ہیں۔“

”انہیں بھی یہاں بلا لیتے آپ۔“

”ہاں، بلا سکتا تھا مگر داماد نے یہاں آ کر رہنا پسند نہ کیا۔“

”آپ کو اگر چوائس ملے تو یہاں رہیں گے یا پاکستان جا کر رہنا چاہیں گے؟“ رجب علی نے پوچھا۔

فضل الرحمٰن دھیرے سے کھنکھارے پھر گویا ہوئے۔ ”آپ خود بھی پاکستانی ہیں، میں اور آپ وہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ اقوام وقت کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں، ترقی کا سفر طے کرتی ہیں مگر ہم مادی، روحانی، اخلاقی ہر اعتبار سے سمتِ معکوس میں گئے ہیں۔ جس دن مجھے یہ یقین ہو گیا کہ پاکستان سچے، کھرے اور محبِ وطن مسلمانوں کی سرزمین بن گیا ہے، بشرطِ حیات ایک دن کی تاخیر نہیں کروں گا واپس جانے میں۔“

ایک روز فضل الرحمٰن نے رجب علی کو نہایت افسردگی سے بتایا کہ وہ اپنے بیٹے سے خوش نہیں تھے۔

”کیوں جناب؟“ رجب علی چونکا۔

”نالائق خود کو ملکہ کا وظیفہ خوار کہتا ہے، کونسل کے مکان میں رہتا ہے، کام کرتا نہیں..... نالائق کہتا ہے جب مجھے کام کیے بغیر سب کچھ مل رہا ہے تو میں کام کیوں کروں۔ وہ مستقل بیروزگار رہنا چاہتا ہے۔ بیوی بچے برٹش نیشنل ہیں، حکومت سے بینیفٹ لیتے ہیں۔ میرا بیٹا اور اس جیسے بہت سے دوسرے لوگ ہیں جو وظیفہ خوار بن کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی میں نہ کوئی بڑا مقصد ہوتا ہے، نہ نشانِ منزل..... یہ لوگ زندگی گزارتے ہیں بس..... زندگی بھی انہیں گزارتی ہی ہے۔ ان گنت ایسے ہیں جو صحنِ وطن سے چلے اور آج بھی نسل در نسل وظیفہ خوار بنے وہیں کھڑے ہیں جہاں اول دن یہاں پہنچنے پر تھے۔“

مگر اس دیس میں ہی نہیں، دنیا کے بہت سے خطوں میں ایسے لوگ بھی تو تھے جو صحنِ وطن سے نکل کر وطن کی پہچان بن گئے تھے..... بنے ہوئے ہیں۔

رجب علی نے دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کیا کہ اس نے پردیس آ کر وظیفہ خواری کے بجائے محنت اور عزت کی روٹی کو ترجیح دی تھی۔ ثمینہ اس سے رشتۂ ازدواج قائم ہونے پر کتنی مطمئن اور مسرور تھی، یہ کوئی اس سے پوچھتا اور نشاط اسے کھو کر کتنا پچھتائی تھی، یہ وہی جانتی تھی۔

☆☆☆

ریڈیو کنٹرول پر سواریوں اور کمپنی کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے درمیان رابطہ کاری کرتی جین نے اس روز رجب علی کو بتایا کہ کوئی سواری ویسٹ اسٹیشن سے کنٹربری کیتھیڈرل جانے کے لیے صرف اسی کی ٹیکسی میں سفر کرنے کی خواہشمند تھی۔ رجب علی کے لیے یہ کوئی اچنبھا نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اس کی ٹیکسی میں سفر کرنے والی سواریاں اسی

digest library
https://www.urdutube.com/
Scanned with CamScanner

digest library.com

کی ٹیکسی لینے کا تقاضا کرتیں۔ رجب علی نے جین سے سواری کا مقام پوچھا اور ٹیکسی میں بیٹھے شخص کو کنگز مائل پہنچانے کے بعد ویسٹ اسٹیشن سے سواری اٹھانے جا پہنچا۔ ایک لمحے کو تو اسے اپنی بصارت پر وہم کا گمان ہوا..... لیکن نہیں..... وہ نشاط ہی تھی۔

"بیٹھ سکتی ہوں؟" اس نے جھک کر پوچھا۔

رجب علی کے جبڑے اختیاری کوشش کے بغیر بھنچ گئے اور رگوں میں دوڑتے لہو کی گرمی اس کے چہرے تک آ پہنچی۔

"میرا پتا کیسے ملا؟" وہ اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے ناگواری سے بولا۔

"ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔" وہ اجازت ملے بغیر ہی گاڑی کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"میں ٹیکسی نہیں ہوں۔"

"مجازی خدا تو ہیں۔"

"کسی اور کا۔"

"اس سے پہلے میرے۔"

"تھا..... اب نہیں۔"

"پلیز.....!" وہ گڑگڑائی۔ "میری بات تو سنیں تو۔"

"اس قابل ہو؟"

"سوری..... رئیلی سوری!"

رجب علی نے تڑپ کر اپنا رخ اس کی طرف کیا۔ اس نے سر جھکا لیا اور رونے لگی۔

رجب علی نے گاڑی گیئر میں ڈالنے کا قصد کیا۔ نشاط نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے کہیں نہیں جانا..... آپ سے ملنے آئی ہوں صرف۔" وہ اپنی آنکھوں پر لشو پیر پھیرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیوں؟" رجب علی نے درشت لہجے میں کہا۔

"واپس آنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں؟" رجب اپنی آنکھوں میں امڈ آنے والی سرخی کو نہ روک سکا۔

"گھر..... اپنے بچوں کے پاس۔"

"گھر..... اوہ تو اجاڑ چکیں..... اور بچے.....! جنہیں تم کوڑا کرکٹ سمجھ کر پھینک گئی تھیں۔" رجب علی بھبکا۔

"آپ کو کیا پتا..... کتنا روئی، کتنا تڑپی ہوں میں ان کے لیے۔"

"جھوٹ..... بکواس۔"

"ایسا نہ کہیں..... راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی تھی میں ان کے لیے۔"

"بیچارے..... کتنے سال لاوارثوں کی طرح رہے۔ یہاں کام چھوڑ کر جاتا تھا میں اور پاکستان سے ان کی جدائی کا دکھ لے کر آتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے آپ نے بہت اذیت سہی ہے۔"

"مجھ سے ہمدردی کی ضرورت نہیں..... جاؤ اس نجومی کے پاس جس نے کہا تھا تو سال بعد واپسی ہوگی۔"

وہ چونکی۔ "آپ کو کس نے بتایا؟"

"کسی نے تو بتایا ہی ہے..... جا کر پوچھو اس نجومی سے کہ واپسی کا راستہ بند ہو چکا، اب کیا کروں؟"

"پلیز! ایسا نہ کہیں۔" وہ گڑگڑائی۔

"ایسا ہی ہے..... ثمینہ میری بیوی ہی نہیں، میری ایک بیٹی کی ماں بھی ہے۔"

"بچوں کی خاطر میں گزارہ کرلوں گی۔"

"گھر کی مالکن اب وہ ہے۔"

"مجھے معاف کردیں۔"

"میرے معاف کرنے سے اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"فار گاڈ سیک!"

"وقت کا پہیا کبھی الٹا نہیں گھمایا جاسکتا۔"

"تو آپ مجھے معاف نہ کرنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔"

"میں معاف کرسکتا تھا..... اس وقت..... صرف بچوں کی خاطر..... مگر تم پر اس وقت بھوت سوار تھا..... عشق کا..... تم نے..... مجھ سے..... میرے بچوں کا بچپن چھینا..... ان کی شرارتیں چھینیں..... ان کا ہنسنا بولنا چھینا۔ میں ان کی آواز سننے کو ترستا تھا..... تم نے مجھ سے میرے خواب چھینے..... میں کھانے کی میز پر اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھنا چاہتا تھا..... ان سے اپنے دل کی بات کرنا اور ان کے دل کی سننا چاہتا تھا..... تم نے مجھے میری جوانی میں بوڑھا کردیا..... تم اپنے رونے کی بات کرتی ہو..... مرد نہیں روتے..... مگر تمہیں کیا معلوم کہ میں کتنا رویا ہوں..... دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تم نے مجھے، نہ بچوں کو..... کبھی سوچا کہ لوگ کیا کہتے ہیں..... بیٹھے میں نے اس لیے چھوڑا کہ کوئی جاننے والا اپنی ساتھی عورت کے بارے میں بتا رہا تھا..... یہ ہے وہ آدمی جس کی بیوی اسے دوسرے آدمی کی وجہ سے چھوڑ گئی۔"

وہ سر جھکائے سنتی رہی، اپنی آنکھیں مٹھی میں دبے لشو پیپر سے پونچھتی رہی۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ بوجھل آواز میں بولا۔ "جو

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

ہوا..... جو تم نے کیا..... اس کے باوجود میں تم سے نفرت کا دعویٰ نہیں کرتا..... مگر میں تمہیں معاف بھی نہیں کر سکتا۔"

"جو ہوا..... خدا کی مرضی سے ہوا۔"

"بکواس مت کرو..... خدا کبھی بندوں کا برا نہیں چاہتا۔ ہم بندے ہی شیطان کے نرغے میں آ کر اپنا برا کر بیٹھتے ہیں۔"

"آخری بار....." نشاط نے اپنے دونوں ہاتھ باہم جوڑ کر رجب علی کے سامنے کر دیے۔ "بس ایک بار..... مجھے معاف کر دیں۔"

رجب علی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

دیر تک خاموشی رہی پھر رجب علی نے گاڑی کو دوبارہ وہاں لگاتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھی نشاط سے جو کبھی اس کے لیے محبوبہ و معشوقہ ہوا کرتی تھی، پوچھا۔

"کیتھیڈرل؟"

نشاط نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اتر گئی۔ اسٹیشن کی طرف واپس جاتے ہوئے اس نے ایک بار بھی پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

رجب علی نے اسٹیشن ہی سے سواری لینے کی امید میں اپنی ٹیکسی وہیں روک کر آتے جاتے مسافروں پر اپنی نظریں لگا دیں اور نہایت دکھے دل سے زیر لب گنگنانے لگا۔

☆☆☆

نشاط کے آنے اور اس سے اپنی ملاقات کا رجب علی نے نہ بچوں سے ذکر کیا، نہ ہی ثمینہ کو بتانا مناسب سمجھا۔ وہ تو پہلے ہی واہموں میں گھری رہتی تھی۔ ویسے بھی کچھ عرصے سے ثمینہ اور بچوں کے درمیان سوتیلے پن کی دیوار اونچی سے اونچی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ثمینہ کو بچوں اور بچوں کو ثمینہ سے شکایت رہنے لگی تھی۔ آئے دن نیا جھگڑا، نیا فساد..... شکایتیں، حکایتیں، سازشیں..... اس نے یہ کر دیا، اس نے وہ کر دیا..... اس نے یہ کہا، اس نے وہ کہا۔ رجب علی کی سمجھ میں نہ آتا ثمینہ کو سچا سمجھے یا بچوں کو جھوٹا گردانے۔

ثمینہ جو کبھی کہا کرتی تھی کہ وہ رجب علی کے گھر میں صرف اس کے بچوں کی وجہ سے جگہ بنا سکی تھی، اب گلہ کرتی کہ گھر میں اگر رجب علی کے اس کی پہلی بیوی سے بچے نہ ہوتے تو وہ خود کو رجب علی کی بیوی ہونے پر دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی۔

دن چھٹتی چلی گئی۔ رجب علی کے بچے اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے لگے۔

☆☆☆

ہر سمت گہرے سمندر سے گھری مملکتِ سلطنتِ برطانیہ ان دنوں شدید سردی، گہری دھند اور بلا کی ٹھنڈ کی لپیٹ میں تھی۔ گرم کوٹوں اور کمبلوں میں دبکے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تو کہتے۔ "خدا کی پناہ اس سال جیسی سردی پہلے کبھی نہیں پڑی۔" لوگوں کی یادداشت کمزور تھی۔ مطرب میں موسم سرما ہر سال یہی تیور دکھاتا تھا۔ گہری دھند میں اولی شامیں دور سے آتی ریل کی سیٹی کی طرح دل میں اترتیں اور کھوئے لوگ، دکھتے غم یاد دلاتیں۔ دن چھوٹے ہو گئے تھے، راتیں بڑی۔

اس روز رجب علی سٹی مارکیٹ پر سواری اتار کر گاڑی موڑ رہا تھا کہ نگار اسے ایک کیاری کی سنگی منڈیر پر بیٹھی دکھائی دی۔

نگار اس کے بچوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی، طبعاً نیک فطرت اور امن پسند..... بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہونے اور بچپن سے اب تک گھریلو حالات کے اتار چڑھاؤ نے اسے اس کی عمر سے کہیں زیادہ سنجیدہ کر دیا تھا۔ اپنی عمر کی اکثر لڑکیوں کی طرح اسے بننے سنورنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ سادہ لباس، پختی اور بند جوتے جنہیں وہ سردی، گرمی، دھوپ، بارش، گھر میں، گھر سے باہر نہایت مستقل مزاجی سے پہنتی۔

نگار کو دیکھ کر رجب علی نے گاڑی ایک طرف روکی اور گاڑی سے اتر کر نگار تک پہنچا۔ نگار اسے دیکھ کر پہلے چونکی پھر سیدھی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے بیٹا! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" رجب علی نے اس سے پوچھا۔

"ایسے ہی ڈیڈ!" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"ثمینہ سے کوئی بات ہوئی؟"

نگار سر جھکا کر اپنی آنکھوں کے کناروں پر اپنی انگشت شہادت دہری کر کے پھیرنے لگی۔

"مارکیٹ سے کچھ چاہیے؟" رجب نے پوچھا۔

نگار نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آؤ..... گاڑی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

نگار نے اپنا بیگ اٹھایا اور اس کے ساتھ چل دی۔ دونوں گاڑی میں آ بیٹھے۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر رجب علی گویا ہوا۔ "بیٹا! مجھ میں نہیں آتا کسے الزام دوں..... ثمینہ کو، تمہاری ماں کو یا اپنے آپ کو۔"

"کسی کو بھی نہیں ڈیڈ..... ہماری قسمت میں یہی تھا۔"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

نگار کا جواب رجب علی کے دل میں تیر بن کر اترا۔

"بیٹا! کیوں تھی یہ قسمت..... میں نے تو کبھی کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی..... کسی کا برا نہیں چاہا — کسی کا دل نہیں دکھایا..... پھر میرے بچوں کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟" رجب علی کی آواز بھرا گئی۔

"آپ اچھے آدمی ہیں نا ڈیڈا اللہ میاں اپنے اچھے بندوں کی آزمائش کرتے ہیں..... بروں کو تو وہ ڈھیل دیے جاتے ہیں۔"

"پتا نہیں بیٹا! اچھا ہوں کہ برا..... مگر تم لوگوں کی طرف سے بہت دکھی ہوں۔ جانتا ہوں ثمینہ کا رویہ تم لوگوں کے ساتھ دن بہ دن خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا ہے۔"

"ہم چاروں ان کے اپنے بچے تو نہیں ہیں۔"

"میرے تو ہو۔ جب میں اس کا اور رابیل کا پورا خیال رکھتا ہوں تو وہ تم لوگوں کے ساتھ اپنا رویہ اچھا کیوں نہیں رکھتی۔"

"چھوڑیں ڈیڈ..... آپ اپنے دل کو نہ لگائیں۔"

"آئے دن کوئی نہ کوئی بات..... جانتا ہوں، زیادتی ثمینہ کی ہوتی ہے تم لوگوں کے ساتھ..... لیکن اسے کچھ کہوں تو وہ تو اب سننے کو تیار ہی نہیں ہوتی۔ بات بڑھ جاتی ہے..... بگڑ جاتی ہے تو لوگ کہیں گے دو کو پٹے تیسرا اب تیسری بھی....."

"کچھ نہ کہیں ڈیڈ..... بس مجھے ایک بات کی اجازت دیجیے۔"

"بولو میرا بچہ!"

"میں..... آگے پڑھنے کے لیے لندن کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتی ہوں۔ وہیں ہاسٹل میں رہوں گی۔ کبھی کبھار گھر آجایا کروں گی۔"

رجب علی گنگ رہ گیا۔ جس بیٹی کو اس کے زمانہ شیر خوارگی میں وہ اپنے سینے سے لگا کر اسے ہولے ہولے تھپک کر سلایا کرتا تھا، وہ گھر سے دور جانے کی اجازت مانگ رہی تھی۔

"ضروری ہے بیٹا؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

"جی ڈیڈا" وہ سر جھکا کر بولی۔ "میرے مستقبل کے لیے بھی اور....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اور؟"

"شاید گھر کے حالات کچھ بہتر ہو سکیں۔ ثمینہ مام سمجھتی ہیں کہ ہم چاروں مل کر ان کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں..... اپنی ماں کو آپ کی زندگی میں واپس لانے کے لیے..... میں چونکہ بڑی ہوں اس لیے ان کو مجھ پر زیادہ شبہ رہتا ہے۔"

"بیوقوف ہے وہ..... تمہاری ماں کی واپسی کا خیال اسے بھوت کی طرح ڈرائے رکھتا ہے۔" رجب علی بولا۔

"ایک بات پوچھوں ڈیڈ؟" نگار ہچکچاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"تم ایک نہیں، دس باتیں پوچھنے کا حق رکھتی ہو۔"

"کبھی آپ کو یہ خیال آیا کہ وہ آپ کی زندگی میں واپس آجائیں۔"

"وہ کون؟" رجب علی جانتے بوجھتے انجان بنا۔

"ہماری ماں!"

"سچ بتاؤں؟"

"میں آپ سے سچ ہی سننے کی امید رکھتی ہوں۔"

رجب علی نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ "بیٹا! جب تمہاری ماں میری زندگی میں تھی تو میرے لیے یہ تصور بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ میری زندگی میں نہیں ہوگی لیکن — اب جبکہ وہ میری زندگی سے نکل چکی ہے تو اس کی واپسی کا خیال میرے لیے ایک بند باب، ایک بھولا بسرا فسانہ ہے۔"

"آپ کو ان سے محبت تھی؟"

"کسی کی سوچ سے زیادہ۔"

"وہ نقصان میں رہی ہوں گی۔"

"پتا نہیں بیٹا جی کون نقصان میں رہا۔" رجب علی دل گرفتگی سے بولا۔

"مجھے یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت ہے ڈیڈ؟"

"لندن ہی کیوں؟ یہاں بھی تو یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتی ہو۔"

"میں گھر سے بھی دور رہنا چاہتی ہوں۔"

رجب علی خاموش رہا۔

"مجھے جانے دیں..... پلیز!" نگار نے باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

"اوکے۔" رجب علی کا دل بھاری ہو رہا تھا۔

"ویک اینڈ پر آجایا کروں گی ڈیڈا" نگار نے اسے ریلیکس دیکھ کر تسلی دی۔

"خوش رہو۔" رجب علی نے اس کے سر کو بوسہ دیا۔

☆☆☆

نگار کو یونیورسٹی میں داخلہ لے کر گھر سے دور جانے اور ہاسٹل میں رہنے کی اجازت دینے کے بعد رجب علی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

بہت دکھی ہوا تھا۔ نشاط نے غلط قدم نہ اٹھایا ہوتا تو شاید وہ اس دکھ سے دوچار نہ ہوتا۔ اولاد کے سر پر ماں ہونے سے بہت فرق پڑتا ہے۔ رجب علی کا اپنا باپ تو اس کے بچپن میں ہی مر گیا تھا، ماں سر پر تھی جس نے اسے سنبھالے رکھا تھا۔ پھر آپا حسی بجن نے اسے اچھے برے کی تمیز دی تھی۔ ماں سادہ اور دل میں خوف خدا رکھنے والی عورت تھی۔ رجب علی آج بھی ماں کا شکر گزار ہوتا اور اگلے جہان میں اس کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کرتا۔ اسی نے رجب کے دل میں اللہ کی محبت کا بیج بویا تھا جو وقت کے ساتھ ایسا پالیدہ ہوا تھا کہ ہر دکھ سکھ میں رجب علی اللہ ہی سے لو لگاتا۔ ماں ہی تھی جس نے اسے عذاب و ثواب سے آشنا کیا تھا۔ حالات کی ستم گری جب اسے بھٹکانا چاہتی تو ماں اسے دلسوزی سے سمجھاتی۔ "ماں صدقے — وقت سدا ایک سا نہیں رہتا، جب پچھلا وقت نہیں رہا تو یہ بھی نہیں رہے گا۔ روٹی بھی بہت ہوگی اور نعمتیں بھی بہت — ہم کوئی ایسے ویسے خاندان کے تھوڑی ہیں۔ تیرا باپ بھی خاندانی آدمی تھا، ماں بھی حسب نسب والی — تحسیم نے بچوں کو خاندان اور خاندانیوں کو بیچ بنا دیا۔ جن کے پاس وہاں کمانے کو نہیں ہوتا تھا، وہ بڑے بڑے کلیم وائر کر کے جائدادوں والے بن بیٹھے اور جو وہاں جاگیروں والے تھے، یہاں خالی ہاتھ ہو گئے — کوئی بات نہیں — سدا وقت ایک سا نہیں رہتا — اپنا رستہ سیدھا رکھنا بس۔"

آپا بھی اسے اچھا برا سمجھانے اور اچھے وقت کی امید باندھے رکھنے میں پیش پیش رہتی۔

ماں اور آپا کا سمجھانا بجھانا اور نصیحتیں اس کے بہت کام آئی تھیں۔ زندگی کے ہر مرحلے پر ان کی دعاؤں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی باتوں نے اسے تاریکی میں بھی روشنی دی تھی۔

نثار نے لندن کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور گھر سے ہاسٹل شفٹ ہو گئی۔ رجب علی اسے خود چھوڑنے گیا تھا۔ دونوں ہی اداس تھے۔

"ویک اینڈ پر آؤں گی ڈیڈی!"

"لو یو بیٹا!"

"لو یو سو ڈیڈ!"

نثار کے جانے کا یوں تو چھوٹے تینوں بہن بھائیوں نے اثر لیا مگر ڈھائی دو ویک اینڈ پر نثار کے آنے تک بہت اداس اور چپ چپ رہی۔ پھر ہر ہفتے اسے ویک اینڈ کا اس لیے انتظار رہنے لگا کہ نثار کو گھر آنا ہوتا۔ وہ آنے سے پہلے رجب علی کو اپنے پہنچنے کا وقت بتا دیتی، رجب علی اسے اسٹیشن سے عموماً خود ہی پک کرتا لیکن اگر اسے وقتِ مقررہ پر خود اسٹیشن پہنچنے میں کوئی مصروفیت حائل ہوتی تو وہ کمپنی کے کسی اور ڈرائیور کو اسٹیشن سے نثار کو لینے کا پابند کر دیتا۔

نثار جب گھر آتی، خالی ہاتھ نہ ہوتی۔ ہاسٹل میں رہنے سے اسے نت نئے کھانے پکانے آ گئے تھے۔ جب گھر آتی، کئی ڈشز بنا کر فریج میں رکھ جاتی۔ بعض چیزیں صرف رجب علی کے لیے مخصوص ہوتیں جن کی بابت وہ بہن بھائیوں کو تنبیہ کرتی۔ "یہ صرف ڈیڈ کے لیے ہے، تم لوگ چٹ نہ کر جانا۔"

"یار افقیروں کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے۔" طیب شوخی دکھاتا۔

"فقیر انڈر گراؤنڈ اسٹیشنز یا اسٹیشنز سے باہر فقیروں سے جا کر سیکھیں کہ اپنا حصہ کیسے مانگا جاتا ہے۔" نثار مسکرا کر کہتی۔

خوب تھے ملکہ کے دیس کے قرینے بھی۔ بھیک مانگنے والے ہر کس و ناکس کے سامنے ہاتھ پھیلانے یا دینے والوں کا راستہ روک کر ان کے گلے پڑ جانے کے بجائے زیرِ زمین ریلوے اسٹیشنوں میں آتے جاتے مسافروں کی گزرگاہوں میں اپنے آلاتِ موسیقی کے ساتھ نہایت متانت سے کھڑے ایک کے بعد دوسری دھن چھیڑتے رہتے اور کبھی گانے بھی لگتے۔ گزرتے مسافر ٹھٹک ٹھٹک کر ان کی اعانت کیے جاتے۔ بعض مانگنے والے پلیٹ فارم پر یا اسٹیشن سے باہر سڑک کنارے بیٹھ کر ایسی حسین، دیدہ زیب اور رنگین مصوری کرتے کہ دیکھنے والے ٹھٹک کر داد دینے اور اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے یا بٹوے کھولنے پر مجبور ہو جاتے۔

ایسے بھکاری جنہیں گانے بجانے یا مصوری کا ہنر نہ آتا یا آتا بھی ہوتا تو وہ کسی مشقت میں پڑنے کے بجائے اپنا ویسٹ اٹھا کر خاموش کھڑے ہو جاتے۔ بھیک دینے والے ان گداؤں کے کاسۂ گدائی میں بھیک ڈالتے گزر جاتے۔ اس قوم کے گداؤں نے بھی بھیک مانگنے کے لیے کیسے مہذب طریقے اختیار کر رکھے تھے۔

☆☆☆

رجب علی کو پتا ہی نہ چلا کہ کب، کہاں اور کیسے نشاط نے طیب سے راہ و رسم بڑھا لی۔ طیب نے رجب علی سے اجازت مانگنے کے بہانے بنا تمہید اسے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ڈیڈ! میں مام کے پاس جا رہا ہوں — وہ اکیلی رہتی

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

گی..... ہم میں سے کسی ایک کو تو ان کے پاس ہونا چاہیے۔"

رجب علی اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

اسے آپا کی برسوں پرانی بات یاد آئی جب وہ نشاط کے جانے کے بعد بچوں کو پاکستان لے گیا تھا۔ آپا نے کہا تھا اسے بچے نشاط کے حوالے کرنے چاہیے تھے اور اپنی اس بات کی دلیل میں آپا نے کہا تھا..... "انسان کی فطرت ہے، جس طرف جانے سے منع کرو، اسی طرف جاتا ہے..... جو چیز پاس ہوتی ہے اس کی قدر کم کرتا ہے، جو دور ہوتی ہے، اس کی طرف بھاگتا ہے۔ تو اگر ان کی ماں کو طلاق دے دیتا ہے تو بڑے ہو کر یہ اسی کی طرف جائیں گے۔"

آپا کتنی دور اندیش اور دانشمند تھی۔

وہ وقت آ گیا تھا جس کی آپا برسوں پہلے پیشگوئی کر چکی تھی۔

ملکہ کی راجدھانی تھی..... عورت، بچہ سب اپنے قول و فعل میں آزاد اور خودمختار تھے۔ پاک سرزمین نہ تھی جہاں والدین چٹے سروں والی اولاد سے اپنی بات منوا لینے کا اختیار رکھتے تھے۔

"اپنے بھائی بہن سے ملنے کے لیے جب میرا جی چاہے گا، آتا رہوں گا۔"

طیب اپنے بھائی، بہن سے ملنے کے لیے آنے جانے کی بات تو کر رہا تھا، رجب علی کا کوئی ذکر نہ تھا۔ وہ باپ جس نے اپنی زندگی ان بچوں کے لیے وقف کر دی تھی..... نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے انہی کی خاطر دو مرتبہ اپنے اجڑے گھر کو آباد کر کے اس میں پھر سے زندگی کے رنگ بھرنے کی کوشش کی تھی ورنہ اس دیس میں مرد کے لیے ازدواجی پابندیوں میں بندھے بنا بھی گھر میں ایک عورت کو رکھنا چنداں مشکل نہ تھا۔

"ایک مرتبہ گئے تو پھر واپسی کا مت سوچنا۔" اس نے طیب کو دھمکانے کو کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" طیب نے نہایت بے پروائی ظاہر کی۔

"اوکے۔"

طیب چلا گیا۔

طیب نہ صرف خود گیا بلکہ اس نے نشاط کو نجف سے رابطے میں بھی بھرپور اہم کی۔

نجف بہت کم گو، حساس اور رجب علی کا انتہائی ہمدرد تھا، چھوٹا تھا جب نشاط گئی تھی۔ اس کے جانے کا صدمہ اس کے ننھے سے ذہن پر اس شدت سے مرتسم ہوا تھا کہ وہ اپنے بچپن ہی میں عمر کی کئی سیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔ گہری چپ اس کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔

نجف بہت کم بولتا، کم ہنستا اور کم ہی مسکراتا۔ بولتا تو بوڑھوں کی سی متانت کے ساتھ، ہنستا تو اتنی احتیاط سے کہ ذرا زور سے ہنسا تو ہنسی ٹوٹ جائے گی، مسکراتا تو اس کی مسکراہٹ ہی نہیں، آنکھوں میں بھی ملال غالب ہوتا۔ رجب علی سے اسے بہت پیار تھا، یوں لگتا جیسے اس نے اپنے دل میں ماں کے حصے کی محبت بھی باپ کے لیے وقف کر دی تھی۔

پڑھائی کے بعد باقی وقت وہ کمپنی کے آفس میں گزارتا اور کاروباری معاملات میں رجب علی کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔ رات کو اکثر وہی ریڈیو کنٹرول پر ہوتا۔

کمپنی منیجر ڈونلڈ نے رازداری کی شرط پر رجب علی کو ایک دن بتایا کہ طیب نے ماں سے نجف کا رابطہ بھی کرا دیا تھا اور وہ گاہے بہ گاہے اسے فون کر کے باپ اور اس کے بزنس سے برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نجف سمجھدار ہے، مجھ سے ہمدردی بھی رکھتا ہے، وہ کسی کے اکسانے میں نہیں آئے گا ڈونلڈ!" رجب علی نے نہایت مان سے اپنے وفادار منیجر ڈونلڈ سے کہا۔

مگر گھر سے نجف کے جانے کا وقت بھی آ کر رہا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ڈیڈا میں طیب کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

رجب علی دم بخود رہ گیا۔

اتنی جلدی! اسے نجف کے اتنی جلدی جانے کی امید نہ تھی۔

"تمہاری عمر کے لڑکے گزارے کے لیے عموماً دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں اور تم اس عمر میں ایک ایسے بزنس کے چیئرمین شیئرز کے مالک ہو جس کی روز افزوں مقبولیت اور ترقی نے اس شہر میں کاروباری حریفوں کو حیران پریشان کر رکھا ہے اور تم اسے ٹھکرا کر جانا چاہتے ہو..... تمہاری ماں طیب کو اپنے مہرے کے طور پر استعمال کر کے اس بار مجھے نہیں، اپنے بچوں کو شکار کرنے کی کوشش میں ہے۔ جانتے ہو اپنے بچوں میں تمہیں اپنانے سے زیادہ ہمدرد پا کر میں اپنا گھر بھی تمہارے نام کر چکا ہوں۔"

"سوری ڈیڈا مجھے گھر کا مالک ہونے اور بزنس میں شیئرز سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا بھائی مجھے بلا رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے مال، دولت سے زیادہ اہمیت رشتوں کی ہے۔"

"مجھ سے بھی تو تم ایک رشتے میں بندھے ہو۔"

"میں اس رشتے کی دل سے قدر کرتا ہوں۔"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"تمہی جانا چاہتے ہو؟" رجب علی کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔

"آئی لو یو ڈیڈا"

رجب علی نے اپنی آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسو پنہاں رکھنے کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں۔

"پریشان مت ہوں — اس ملک میں بچے، بڑے ہو کر گھر سے چلے ہی جاتے ہیں۔"

"میں — کورا باپ نہیں ہوں۔" رجب علی کی آواز رنج میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"لیکن ہم تو اسی ماحول میں بڑے ہوئے ہیں ڈیڈ — آپ برداشت کر نا سیکھیں۔"

رجب علی یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔

"او کے مائی ایئر سٹ سن — گڈ بائے!"

نجف کو وہیں چھوڑ کر رجب علی خود وہاں سے چلا گیا۔

رجب علی کا جذباتی صدمہ نجف کی راہ نہیں روک سکا۔ اسے جانا تھا، وہ چلا گیا۔

ثمینہ نے طنزاً کہا۔ "ان بچوں پر اتنا جان دیتے تھے؟"

☆☆☆

نگار نے بھی ماں سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ کبھی دو، تین تین ویک اینڈز گزر جاتے، وہ گھر نہ آتی۔ رجب علی نے سبب جاننا چاہا تو اس نے بتا دیا کہ وہ دونوں بھائیوں سے ملنے کی خاطر ماں کے ہاں چلی جاتی ہے۔

بہن، بھائیوں کے جانے کے بعد دُرِ شہوار کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرنے لگا۔ گھر میں ہوتی تو اپنے کمرے میں بند۔ ثمینہ سے اس کی بات چیت بالکل ختم ہوگئی۔ ثمینہ نے گھر سے اس کے زیادہ دیر باہر رہنے پر رجب علی سے اسے لگام دینے کو کہا تو وہ مشتعل ہوگئی۔

"آپ مجھ پر پابندی نہیں لگا سکتے۔" اس نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

"میں باپ ہوں تمہارا۔"

"بس نام کے باپ — آپ نے کیا، کیا ہے ہمارے لیے؟"

رجب علی اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

"مجھے کوئی دعویٰ نہیں۔" رجب علی صدمے میں تھا۔

"پہلے پاکستان لے جا کر دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا — پھر یہاں لا کر سوتیلی ماں کا عذاب سہنے کو ڈال دیا۔"

"قصور کس کا تھا؟"

"مجھے اس سے غرض نہیں۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"آپ لوگوں نے بس اپنا اپنا سوچا، ہماری کسی نے پروا نہیں کی۔"

"اپنی ماں کو دعا میں دو۔"

"جب گھر ٹوٹتا ہے تو قصور کسی ایک کا نہیں ہوتا..... کچھ نہ کچھ قصور تو آپ کا بھی ہوگا۔"

"ہاں تھا میرا قصور۔" صدمے اور برداشت کی انتہائی حد کو پہنچنے سے رجب علی کو اپنا سینہ پھٹتا ہوا سا لگا۔ "میرا قصور یہ تھا کہ میں نے تمہاری ماں کو اپنی اور اس کی حیثیت سے بڑھ کر اچھی زندگی دینے کی کوشش کی — جس زمانے میں یہاں پاکستان سے آئی ہوئی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ فیکٹریوں میں کام کرتی تھیں، میں نے تمہاری ماں کو گھر میں رکھا — آرام دیا — سہولتیں دیں۔"

"زندگی سہولتوں سے نہیں گزرتی۔"

"اچھا — تو پھر کیسے گزرتی ہے؟"

"محبت سے — آپ نے ہماری ماں کو شاید کبھی ویسی محبت نہیں دی جیسی آپ اپنی موجودہ چہیتی بیوی سے کرتے ہیں۔"

"تم حد سے بڑھ رہی ہو — زبان سنبھالو اپنی۔"

"جا رہی ہوں آپ کا گھر چھوڑ کر۔"

اس نے اپنا سامان اٹھایا اور گھر سے نکل گئی۔ جاتے ہوئے اس نے گھر کا دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ گھر کے درودیوار ہل کر رہ گئے۔

رجب علی شدید صدمے کی کیفیت میں سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ثمینہ جو دوسرے کمرے میں کان لگائے باپ بیٹی کی گفتگو سن رہی تھی، کمرے سے نکل آئی۔ رابیل بھی اس کے ساتھ تھی۔

رجب علی کو ثمینہ سے تسلی دلانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ اسے دُرِ شہوار کے جانے سے زیادہ اس کی تلخ گوئی کا صدمہ تھا — اسے کیا معلوم کہ اس کے باپ کو اس کی ماں سے کتنی محبت رہی تھی — وہ اس کا پہلا پیار، پہلی محبت تھی — باقی سب تو سمجھوتا تھا — اسے کیا پتا کہ اس کی ماں کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی تصویریں تو اس نے آج بھی اپنی زندگی کی قیمتی ترین متاع کے طور پر سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں — اسے کیا ادراک کہ اس کی ماں کے جانے کے بعد زندگی ساز طرب سے ساز الم بن گئی تھی — دُرِ شہوار کیا جانتی کہ اس کی ماں بھی اس کے باپ کے لیے زندگی کا دوسرا نام رہی تھی — اس کے جانے کے بعد وہ ایسا ٹوٹا، اس بری طرح بکھرا تھا کہ آج تک خود کو نہ سمیٹ پایا تھا۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

پاس بیٹھی ثمینہ نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ رجب علی اسی طرح بیٹھا رہا۔

"اس عورت نے آخرکار آپ کو ہرا دیا۔" ثمینہ کی آواز میں دلسوزی کے بجائے فتح مندی کا عنصر تھا۔

رجب علی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہار جیت دشمن کے سامنے ہو کر جنگ لڑنے میں ہوتی ہے ثمینہ..... میں نے تو چوکھی لڑی ہے۔"

"چوکھی..... اوہ کیا ہوتی ہے۔"

"وہ لڑائی جو چاروں طرف لڑی جائے۔ مجھے اب بچوں کے جانے کی فکر نہیں ہے..... بڑے ہیں، سمجھدار ہیں..... اپنا بھلا برا جانتے ہیں..... بہرحال میری اولاد ہیں۔ باپ ہونے کے ناتے میرا صدمہ تو فطری امر ہے۔"

"میں اور بچے تو ہیں نا آپ کے ساتھ۔"

رجب علی نے ایک لمبا سانس کھینچا اور دونوں شانوں کو جھٹکا جیسے اولوالعزمی سے اٹھ کر کسی معرکہ سر کرنے چلا ہو۔

ثمینہ خوش تھی کہ رجب علی کے چاروں بچے جن کے بارے میں وہ اپنے گھر والوں سے اور حلقہ احباب میں یہ کہا کرتی تھی کہ اگر رجب علی کے پہلی بیوی سے جائز بچے نہ ہوتے تو وہ خود کو اس دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی ایک ایک کر کے رجب علی اور اس کی زندگی سے نکل گئے تھے۔

☆☆☆

رجب علی اپنا موجودہ گھر ثمینہ سے شادی کرنے سے پہلے ہی خرید چکا تھا۔ ٹیکسی بزنس بھی اس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ مکان نجف کے نام پر کر دینے کی وجہ طیب کے مقابلے میں نجف پر اس کا زیادہ بھروسا اور اعتبار تھا۔ "پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں" کے مصداق نجف کم عمری ہی میں اسے اپنا وفادار، بھائی بہنوں سے محبت کا حامل، محنتی اور سنجیدہ محسوس ہوتا تھا۔ رجب علی نے ٹیکسی کمپنی کے پچاس فیصد حصص نجف کے اور بقیہ پچاس فیصد دیگر تین بچوں کے نام پر نجف کی انہی خصوصیات کی بنا پر رکھے تھے۔ اسے یقین تھا کہ نجف خود غرضی نہیں دکھائے گا۔ رکھنے کو وہ یہ سب کچھ اپنے نام پر بھی رکھ سکتا تھا مگر وہی قباحت کہ شادی کرنے پر میاں بیوی کی نہ بن پائے تو علیحدگی کی صورت اثاثوں کی تقسیم میں عورت کا پلڑا اکثر بھاری..... بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے شادی کا ارادہ تو تھا، سو اس نے حسب سابق آئندہ زندگی کے لیے بھی اللہ کی رحمت پر یقین اور اپنے زور بازو پر بھروسا کرتے ہوئے اس وقت اپنے اثاثے بچوں کے نام پر رکھنا ہی بہتر سمجھا تھا۔

بچے گئے تو رجب علی کا نہ اس گھر میں دل لگتا، نہ کاروبار سے زیادہ دلچسپی رہی۔ بچوں کے جانے پر اسے ملال ضرور تھا، پچھتاوا قطعاً نہیں تھا..... وہ ان کے لیے جو کر سکتا تھا، اس نے حتی الوسع کیا تھا۔ جب ثمینہ اور چاروں بچوں کے باہمی تعلقات میں دراڑیں پڑ رہی تھیں، وہ اکثر ثمینہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا اور بچوں کی حمایت لیتا۔ اس نے بچوں کو ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی سعی کی تھی، روز بروز پھلتا پھولتا کاروبار دیا تھا، بدیسی معاشرے میں انہیں عزت دلوائی تھی۔ وہ گھر سے باہر جاتے تو انہیں جاننے والے مقامی لوگ انہیں ٹیکسی کمپنی اور رجب علی کی اچھی ساکھ کی وجہ سے پہچانتے۔

اب وہ تھا، اس کی ٹیکسی، پردیس کی سڑکیں اور اسے چھوڑ کر جانے والوں کی یادیں۔ رجب علی کا دل کبھی کبھی بے طرح دکھنے لگتا۔ زیرو سے سفر کا آغاز کر کے ہیرو بن جانے والا رجب علی خود کو پھر مقام آغاز پر کھڑا پاتا۔ دامن تہی اور ہاتھ خالی رہ گئے تھے اس کے..... سوال یہ نہیں تھا کہ قصور کس کا تھا، سوال یہ تھا کہ اس کا قصور کیا تھا؟

ڈرشہوار تو گھر سے جاتے ہوئے سارا قصور اسی کے کھاتے میں ڈال گئی تھی۔

اپنا بقیہ سامان سمیٹنے کے لیے ڈرشہوار کچھ دنوں بعد پھر گھر آئی..... جارحانہ تیوروں کے ساتھ۔

اس نے پھر وہی بات دہرائی۔ "آپ نے ہمارے لیے کیا کیا۔"

"کیا نہیں کیا؟" رجب علی نے شاکی لہجے میں کہا۔

"شادی..... شادی۔" وہ اپنے اور رجب علی کے رشتے کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے طنزاً بولی۔

"تم لوگوں کی خاطر..... دوسری اور پھر تیسری شادی میں نے صرف تم بہن بھائیوں کی وجہ سے کی..... دوسری کو طلاق بھی میں نے صرف اس لیے دی کہ وہ تم لوگوں کو اپنانے کو آمادہ نہ تھی ورنہ....."

"ورنہ؟" ڈرشہوار نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا۔

رجب علی اپنے دل میں آئی بات زبان پر نہ لا سکا۔ بیٹی سے یہ کہنے میں محتاط مانع رہا کہ جس دیس میں وہ رہ رہا تھا، وہاں مرد کے لیے عورتوں کی کمی نہ تھی۔

"آپ سے خدا پوچھے گا۔"

"اپنی حد میں رہو۔"

"میں تو اپنی حد میں ہی ہوں..... آپ اپنی حد نہیں سمجھ سکے۔"

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"حد..... اکیا حد نہیں ہوتی؟" رجب علی بھنک اٹھا۔

"ہماری ماں آپ کی ان دو بیویوں سے زیادہ خوبصورت، ان سے زیادہ پڑھی لکھی اور ان سے زیادہ اسٹائلش تھی..... آج بھی وہ آپ کی چہیتی بیوی سے زیادہ حسین ہے..... آپ نے میری ماں کی تعریف کی بھی..... کبھی اپنی زبان سے اپنی محبت کا احساس دلایا اسے۔"

"میں پریکٹیکل آدمی تھا..... ہوں..... ان مردوں میں سے نہیں جو بیوی کو زبانی کلامی لارے دیے رکھتے ہیں..... معمولی مزدور آدمی ہی تو تھا میں..... تمہاری ماں کو میں نے وہ عیش و آرام دیا جس کا مزدور پیشہ مردوں کی بیویاں تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔"

"سب جھوٹ..... فضول۔" دُرِشہوار نے اپنے باقی ماندہ سامان کا بیگ اٹھایا اور چلی گئی۔

جھوٹ نہیں تھا جو رجب علی نے کہا مگر یہ بھی سچ تھا کہ اپنے دل ہی دل میں گزشتہ زندگی کا حساب کتاب کرنے پر رجب علی کو اپنی ایک غلطی کا شدت سے احساس ہوتا۔ اسے معاشی تگ و دو کے ساتھ اپنے گھر کے حالات و معاملات پر بھی نظر رکھنی چاہیے تھی۔ محض نوٹ چھاپنے والی مشین بننے کے بجائے اسے گھر اور بیوی بچوں کو بھی مناسب وقت دینا چاہیے تھا— کئی کئی گھنٹے کام اور زیادہ پیسا کمانے کی خاطر اکثر اوور ٹائم کے بعد جب وہ تھکن سے چور بدن کے ساتھ گھر لوٹتا تو اسے نہ بیوی سے ہنسنے بولنے کی سکت ہوتی، نہ بچوں کے ساتھ کھیلنے کی۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

نثار اور طیب اس کی بند آنکھوں کے پپوٹے چیرنے کی کوشش کرتے۔ "ڈیڈا اٹھو نا..... آپ سو کیوں رہے ہو..... باہر چلو نا۔"

وہ اوں آں، نہوں ناں کرتے کرتے سو جاتا، پھر اسے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ رہتی۔

بچے ضد کرتے۔ "ڈیڈی! باہر چلیں۔"

"بیٹا جی، تھکا ہوا ہوں، سونے دو مجھے۔"

کبھی کبھار گھمانے پھرانے کے لیے باہر لے جانے سے نہ نشاط کی تشفی ہوتی، نہ بچوں کی طبیعت بھرتی۔

"یار! تم انہیں لے جایا کرو۔"

"جی۔" نشاط اسے شاکی نظروں سے دیکھتی۔ "گھر بھی میں دیکھوں، گرسری بھی میرا ذمہ، کرایہ داروں کی پراطو بھی میرے سر۔ بچوں کو باہر گھمانے کے لیے وقت کہاں سے نکالوں؟"

"میں بھی تو تم ہی لوگوں کے لیے اتنی محنت کرتا ہوں۔"

"ہمیں آپ سے صرف پونڈ نہیں، وقت بھی چاہیے۔"

"وقت بھی مل جائے گا، فی الحال کام..... پردیس میں پڑے کس لیے ہیں..... روٹی تو ہمیں اپنے وطن میں بھی مل سکتی تھی۔"

"صبح سے شام تک گھر، باہر کی ساری ذمے داری میرے سر پر۔ کبھی کبھی بہت بیزار ہونے لگتی ہوں۔ آپ سے شادی اس لیے تھوڑی کی تھی کہ سارا وقت کولھو کا بیل بنی رہوں۔ کمبخت یہاں تو کام والیاں بھی نہیں ملتیں، سب کچھ خود کرو۔"

"اچھا، تو پھر کس لیے کی تھی مجھ سے شادی؟"

"انجوائے کرنے کے لیے..... میں تو سیر سپاٹوں، دوستوں سے ملنے جلنے اور ہر نئے فیشن کے کپڑے پہننے کی شوقین ہوا کرتی تھی۔"

"کون منع کرتا ہے..... اپنے شوق پورے کرو۔"

"ادھر سے آواز آتی ہے، مام! دودھ چاہیے، دوسرا کہتا ہے مام! پوٹی، تیسرا چلاتا ہے مام! چوٹ لگ گئی..... بس بیچاری نثار ہے جو تنگ نہیں کرتی، چپ رہتی ہے۔"

رجب علی اور نشاط، دونوں کے اہداف مختلف تھے۔ رجب علی کو پیسا کمانے کی دھن تھی، نشاط سیر سپاٹوں، فیشن اور دوستوں سے میل جول کی شوقین تھی۔

میاں بیوی کے اہداف مختلف ہوں اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ان کا زیادہ وقت ایک دوسرے سے دور، لاتعلقی میں گزرے تو شیطان کو ان کے درمیان آنے کی راہ ملتی ہے۔

پھر تو یہ ہونا ہی تھا، ہو ہوا۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا— اپنے حال بچوں کو خوشحال زندگی فراہم کرنے کے لیے رجب علی کی نیت کتنی ہی راست تھی..... شیطان اس کے اور نشاط کے درمیان آ ہی گیا تھا۔ حیات کے پہیے کو الٹا کون گھما سکتا ہے جو رجب علی یہ قدرت رکھتا۔ دل میں چھپا اک احساسِ خطا ہی تھا بس کہ وہ نشاط کو مکمل خود مختاری نہیں دینی چاہیے تھی۔ اس کے معمولات پر ضروری نظر رکھنی چاہیے تھی، تاہم اس کی اس خطا کے مقابلے میں نشاط گناہ کی مرتکب ہوئی تھی۔ عورت کی خوبی، اس کا اعلیٰ وصف تو یہی ہے کہ شوہر کی عدم موجودگی میں بھی اپنی عفت کی حفاظت کرے، امانت میں خیانت کی مرتکب نہ ہو۔

دُرِشہوار تو رجب علی سے منہ ماری کر کے چلی گئی تھی۔ ماں نے اسے اور باقی تینوں کو بھی نہ جانے کیا جھوٹی سچی

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

داستانیں سنا کر خود کو مظلوم اور بے قصور اور رجب علی کو قصوروار ٹھہرایا تھا۔

رجب علی کئی دن مضطرب رہا۔ دُرِشہوار کے الفاظ کی بازگشت اسے بار بار دکھی کرتی رہی۔ دُرِشہوار کو کیا معلوم کہ اس کے باپ کا بچپن جس حسرت، حسرت، بھوک اور برہنہ پائی میں گزرا تھا، اس کے مداوے کے لیے وہ اپنوں سے دور پردیس میں آبسا تھا۔ یہاں بھی کتنی ٹھوکریں کھائی تھیں تب کہیں جا کر زندگی کا چہرہ قدرے روشن ہوا تھا۔ اپنے بچوں کو وہ، وہ سب کچھ دینا چاہتا تھا جو خود اسے نہیں ملا تھا۔ اس کی شبانہ روز محنت اسی مقصد کے لیے تھی۔ وہ اپنے بچوں کا مستقبل تابناک دیکھنا چاہتا تھا۔

دُرِشہوار کو کیا معلوم کہ اس کی ماں، اس کے محنت کش باپ کا وہ حسین خواب تھی جس کا ٹوٹنا اس کے دل کو آج بھی ملال سے دوچار کر دیتا تھا۔ بظاہر زندگی کے تمام معاملات جاری و ساری تھے مگر اس کے دل کی پنہائیوں میں زندگی آج بھی اسی مقام پر غمزدہ کھڑی تھی جہاں اس کے اور نشاط کے راستے جدا ہوئے تھے۔ مہرین کا اس کی زندگی میں آنا اور مختصر وقت گزار کر چلا جانا، پھر ثمینہ کا آنا بھی اسی مقام پر ٹھہری زندگی کو سرِ مو اس کی جگہ سے نہ ہلا پائے تھے۔

☆☆☆

یکے بعد دیگرے بچوں کے جانے کے بعد رجب علی بہت دلگرفتہ تھا۔ زندگی میں اتنی تگ و دو کا حاصل کیا تھا۔ کاروبارِ حیات تو جاری تھا مگر دل جیسے خالی تھا۔ رجب علی کو بہن بھائیوں سے ملے کئی سال ہو چکے تھے۔ اس نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا تو پہلے ثمینہ اور رابیل کے لیے ثمینہ کے نام سے ایک مکان خریدا اور دونوں کو اس گھر میں منتقل کرنا ضروری سمجھا تاکہ اس کی عدم موجودگی میں انہیں موجودہ گھر نجف کے نام پر ہونے کی وجہ سے کوئی پریشانی نہ ہو۔

ساحلِ سمندر کے نزدیک رہنا ثمینہ کی خواہش تھی۔ کینٹ کا ساحلی قصبہ مارگیٹ مقام انتخاب ٹھہرا۔ ساحلِ سمندر سے محض ایک ڈیڑھ منٹ کی پیدل مسافت پر واقع سمندر کے رخ پر کھلتے دکنوریں طرز کے بام و در والا ایک مکان رجب علی نے ثمینہ کے نام پر خرید کر چار پانچ ہفتوں میں شبانہ روز اس کی دیدہ زیب آرائش کر کے اس گھر کی مرکزی داخلہ گاہ پر "ثمینہ کاٹیج" کی تختی بھی نصب کر دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے نگار کے توسط سے نجف کو بلایا اور ساحلِ مکان اور ٹیکسی کمپنی کی قانونی دستاویزات اس کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے ثمینہ، رابی اور اپنے لیے چھوٹا مکان خرید لیا ہے۔ یہ گھر اور بزنس اب تمہارے حوالے ہے۔ گھر صرف تمہارے نام پر ہے اور میں نے تمہارے نام پر اس لیے رکھا کہ طیب کے مقابلے میں، میں تمہیں زیادہ احساسِ ذمے داری کا حامل پاتا ہوں۔ بزنس میں تم چاروں بہن بھائیوں کے شیئرز ہیں — گھر میں رہو، جسے چاہو، اپنے ساتھ رکھو، میرا کوئی واسطہ نہیں — بزنس سے بھی میرا اب کوئی لینا دینا نہیں — ایک گاڑی میرے پاس ہے، اسی پر کام کروں گا۔ ہمارے گزارے کے لیے کافی ہے۔"

"آپ ناراض ہیں؟" نجف کے لہجے میں شرمساری تھی۔

"نہیں — تم اور تمہارے بہن بھائی میری اولاد ہیں۔ اولاد سے ناراض نہیں ہوا جاتا۔" رجب علی نے توقف کیا۔ "میری ٹیکسی کی مستقل سواریوں میں یونیورسٹی کا ایک پروفیسر بھی تھا۔ اس نے ایک روز مجھے کسی دانشمند کا قول سنایا — وہ کہتا ہے — اپنے بچوں کے ساتھ ان کی سات سال کی عمر تک کھیلیں، پھر اگلے سات سال انہیں نظم و ضبط سکھائیں، پھر اگلے سات سال ان کے دوست بن کر رہیں، پھر انہیں اپنی مرضی پر آزاد چھوڑ دیں۔" رجب علی نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی پھر بولا۔ "میری کہہ لو یا حالات کی بدقسمتی کہ نگار کے سوا میں تم تین بچوں کے ساتھ کھیل نہیں سکا۔ پھر روزگار اور دوسری بہت سی فکروں نے مجھے تم لوگوں کو نظم و ضبط سکھانے کی فرصت ہی نہیں دی۔ تمہیں نظم و ضبط سکھانے میں جسے میری مدد کرنی چاہیے تھی، وہ تم چاروں کو بے یار و مددگار چھوڑ گئی۔ دوست بننے کا مرحلہ آیا تو تم نے مجھے اپنا دشمن سمجھ لیا، سو اب تمہیں تمہاری مرضی پر آزاد چھوڑ رہا ہوں۔"

نجف اپنی جگہ سے اٹھ کر رجب علی کے پاس آبیٹھا اور سر جھکا کر بولا۔ "ڈیڈی پلیز، ناراض نہ ہوں — رابیل کی مدر اور ہمارا ساتھ رہنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ آپ بھی پریشان رہتے تھے اس لیے ہم نے گھر چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا۔"

رجب علی کی آنکھوں میں سرخی پھیل گئی۔ "میں اس کل کا فرد ہوں بیٹا، جو اولاد کو اپنے ساتھ رکھنے کی خوگر ہوتی ہے۔"

"مگر ہم تو لے ہوئے گھرانے کی اولاد ہیں ڈیڈی!"

"میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو۔"

"مام کہتی ہیں، انہوں نے بھی نہیں چاہا تھا کہ ایسا ہو۔"

"اگر میں نے نہیں سوچا تھا اور اس نے بھی نہیں چاہا تھا کہ ایسا ہو تو پھر قصوروار کون ہے؟"

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

"قصوروار جو بھی ہو ڈیڈی! دکھ ہم نے جھیلا ہے..... نقصان میں ہم رہے ہیں۔"

"میری دعا ہے کہ تم چاروں کو اپنی آئندہ زندگی میں اتنا سکھ ملے کہ اپنا ہر دکھ بھول جاؤ۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں آپ نے اپنا نیا گھر کہاں بنایا ہے؟"

رجب علی نے اسے اپنے نئے مسکن کا پتا بتایا۔

"کبھی ملنے کے لیے آسکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں..... مگر ثمینہ سے اچھے رویے کی توقع مت رکھنا۔"

نجف چپ رہا۔

☆☆☆

پاکستان جانے کی تیاری کے آخری دنوں میں ثمینہ نے بھی رجب علی کے ہمراہ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کی اور اس کے خاندان کی جڑیں بھی تو اسی مٹی میں گڑی تھیں۔

وقت انسان کی ہیئت کو کس تیزی سے بدل دیتا ہے۔ رجب علی کے بہن بھائی سب بوڑھے ہو چکے تھے۔ تاہم آپا کی بصیرت اور رجب علی سے آپا کی محبت اسی طرح تھی۔

ریحانہ نے گوہر مقصود پالیا تھا۔ اب وہ یونیورسٹی میں لیکچرر تھی۔ اپنے شعبے ہی کے ایک استاد سے شادی کے بعد وہ دونوں ہی خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔

رجب علی کو دیوانی آپا کہیں ملتی تو وہ اس سے ضرور کہتا۔

"تمہارا غیبی علم ففٹی ففٹی ہے۔ میرے بارے میں تمہاری پیشگوئی سچی رہی ــــ تم نے کہا تھا کوئی مجھے بہکا کر لے جانے کی کوشش کرے گا ــــ پتلی بائی لے گئی تھی مجھے مگر میں بھاگ آیا ــــ تمہاری یہ پیشگوئی بھی سچ ثابت ہوئی کہ میں باہر کے ملک چلا گیا اور پیسا بھی کمایا ــــ مگر میری بہن ریحانہ کے بارے میں تمہاری یہ پیشگوئی کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی، غلط ثابت ہوئی ــــ اس نے شادی کرلی اور خوش ہے۔"

آپا، منجھلی اور دونوں بھائیوں کے بچے نہ صرف جوان تھے بلکہ اکثر کی شادی بھی ہو چکی تھی اور عیال دار تھے۔ وسائل کم اور مسائل زیادہ ہونے کے باوجود سب اپنی اپنی زندگی جیسے تیسے گزار رہے تھے۔

ریحانہ نے تعلیم حاصل کر کے اپنا مستقبل بنانے اور اپنی زندگی سنوارنے کا بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو کھوسٹ بڑھیا بنی منجھلی کی طرح بہو بیٹیوں کے جھگڑے نمٹا رہی ہوتی۔ بہرحال منجھلی بھی خسارے میں نہ تھی۔ شام کو بیٹے اپنے اپنے روزگار سے واپس آکر اس کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے اور دکھ سکھ کی باتیں کرنے لگتے۔ ایک بیٹی کی شادی ہو چکی تھی، دو بیٹیاں ابھی بن بیاہی بیٹھی تھیں۔ ان کی اور بھاوجوں کی چونچیں لڑتیں تو منجھلی ہی صلح صفائی کراتی۔ اپنے گھر کی تو منجھلی "وڈیری" تھی۔ اس کا میاں دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

رجب علی نے ہمیشہ کی طرح آپا کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ آپا نے اسے یاد دلایا۔ "میں نے تجھ سے کہا تھا نا..... بچے ماں کے حوالے کر دے..... چار بچوں کی ذمے داری میں گھر کر اس کی مت ماری جاتی..... انسان کی فطرت ہے، جدھر جانے سے منع کرو، ادھر ہی جاتا ہے۔"

"مجھے یاد ہے آپا! لیکن میں مطمئن ہوں کہ جب تک بچے میرے پاس رہے، میں نے ان کی ذمے داری پوری کی۔ بیٹیوں کو پوری حفاظت سے رکھا..... چاروں اب سمجھ دار ہیں، کوئی ان کا استحصال نہیں کر سکتا۔"

"نشاط کا کبھی خیال آتا ہے تجھے؟" آپا نے رجب علی سے پوچھا۔

کبھی!

"آپا! مجھے یاد ہے، جب منجھلی آپا کا میاں ان کے ساتھ مار پیٹ کیا کرتا تھا تو اماں منجھلی آپا سے کہا کرتی تھیں..... اس سے اپنا پیچھا چھڑا لے..... تمہیں یاد ہے اماں کی اس بات پر تم کیا کہتی تھیں؟"

"کیا کہتی تھی؟" آپا کو اپنا کہا واقعی یاد نہ تھا۔

"تم کہتی تھیں ــــ اماں! گاڑی چلنے دو..... پہلا، پہلا ہی ہوتا ہے ــــ پہلی، پہلی ہی ہوتی ہے..... میں اس وقت تو تمہاری بات نہیں سمجھتا تھا مگر اب سمجھتا ہوں ــــ تمہارے میاں کے لیے بھی تو اس کی پہلی بیوی اور بچے ہی ہمیشہ اہم رہے۔"

"بہت سیانا ہو گیا ہے تو۔"

"اب نہیں ہوں گا سیانا تو کب ہوں گا..... پردیس میں بہت دھکے کھائے ہیں، بہت تجربے اٹھائے ہیں ــــ ٹیکسی کے کام میں تو مجھے اتنی سمجھ بوجھ ملی ہے جو میں ریحانہ کی طرح اسکول، کالج میں پڑھ کر بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا..... اب تو بڈھا ہو چلا ہوں ــــ اب نہیں تو پھر کب سیانا ہوتا؟"

آپا نے ٹھنڈی سانس بھری اور رجب علی کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دلسوزی سے بولی۔ "نصیبوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا..... ماں باپ، بیٹیوں کے نصیب اچھے ہونے کی دعا مانگتے ہیں..... بیٹوں کے لیے بھی ان کا نصیب اچھا ہونے کی دعا مانگنی چاہیے..... میرے بھائی! تو نے بہت دکھ اٹھائے ہیں زندگی میں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

تھا کہ جو بھائی پیدا ہوتے ہی میری گود میں آیا تھا..... جسے میں نے ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح چاہا، اس کا نصیب ایسا سخت ہوگا..... اللہ آگے بھلی کرے..... ثمینہ تو اچھی ہے نا تیرے ساتھ؟"

"یہ وقت بتائے گا۔" رجب علی نے توقف کیا پھر دل شکستگی سے گویا ہوا۔ "اچھی تو وہ بھی تھی آپا..... بھٹک گئی..... اور شاید کچھ بھول مجھ سے بھی ہوئی ہو..... کئی بار سوچا..... جاؤں..... اس سے ملوں اور کہوں، اگر مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو معاف کرنا..... لیکن میں نے ہر مرتبہ اپنا ارادہ ترک کر دیا..... اس نے مجھ سے میرے بچوں کا بچپن چھینا آپا..... شاید مجھے زندگی میں کبھی اتنی فرصت مل ہی جاتی کہ میں اپنے بچوں کی شرارتوں، ان کی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں، ان کی ہنسی سے لطف اندوز ہو سکتا..... ان کے ساتھ کھیل سکتا..... وہ میرے خوابوں کی قاتل ہے آپا..... میں کھانے کی میز پر اس کے ساتھ بیٹھ کر اپنے بچوں سے باتیں کرنا چاہتا تھا..... میں ان کا دوست بننا چاہتا تھا..... ان کے مستقبل کے خاکوں میں اپنے تجربات کا رنگ بھرنا چاہتا تھا..... اس نے میرے سارے خواب ریزہ ریزہ کر دیے آپا..... میں اسے معاف کرنا بھی چاہوں تو دل نہیں مانتا۔"

آپا کا ہاتھ تسلی دینے کو رجب علی کے شانے پر آ پہنچا۔

پاکستان میں آٹھ ہفتے ایسے گزرے کہ پتا ہی نہ چلا۔ بہنوں، بھائیوں اور ان کے بچوں سے تو ملنا رہا ہی، رجب علی نے دور پار کے چند رشتے داروں سے بھی ملاقات کی۔

مہرن کے بارے میں اسے پتا چلا کہ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور ایک بیٹے کی ماں تھی۔ اس کی دوبارہ خانہ آبادی کی خبر سے رجب علی کو خوشی ہوئی اور اطمینان بھی۔

رجب علی اپنے پرانے محلے میں یار دوستوں سے ملنے بھی گیا۔ قریبی دوستوں میں سے تین چار مر چکے تھے۔ جو ملے، انہیں دیکھ کر رجب علی حیران رہ گیا۔ نوجوان لڑکے اب بابے بن چکے تھے۔ چٹے سروں اور چٹی ڈاڑھیوں والے بابے۔ ان کے مقابلے میں تو وہ اب بھی زندگی کی اتنی بہت سی آزمائشوں سے گزرنے کے باوجود توانا دکھتا تھا۔ بگن کی دکان اب نہیں تھی۔ وہ سرکاری گٹر بھی جس کے ڈھکن پر رجب علی اور دوستوں کی محفل جما کرتی تھی، دیکھنے کو نہیں ملا، بستی کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ ثمینہ کا زیادہ وقت اپنے رشتے داروں میں گزرا۔

آٹھ ہفتے پاکستان میں گزارنے کے بعد رجب علی، ثمینہ اور رابیل کے ساتھ برطانیہ واپس لوٹا تو اسے کسی ذریعے سے خبر ملی بچوں نے ٹیکسی کمپنی کسی گورے کو اونے پونے بیچ دی تھی۔ رجب علی کو صدمہ ہوا مگر کیا کر سکتا تھا۔ خود ان پڑھ اور ہنرمند نہ ہونے کے باوجود اس نے اللہ کی مہربانی سے اپنی زندگی بنائی تھی..... خطرات کو خاطر میں نہ لایا تھا..... حوادث سے ٹکرایا تھا..... ڈوب ڈوب کر ابھرا تھا..... نیت صاف، منزل آسان..... خدا کی ہستی پر توکل اور اپنے زور بازو پر بھروسا کرنے والوں کے لیے ملک خدا تنگ نیست!

رہی رجب علی کی خانگی زندگی، تو اپنی جڑوں سے ہٹ کر دوسری زمین پر کھڑے ہونے والوں کو نقل مکانی کی قیمت بہرحال ادا کرنی پڑتی ہے۔ سو، رجب علی نے بھی کی تھی..... دنیا کے نقشے پر سرتانے کھڑے برطانیہ کے طول و عرض میں اس قیمت ادائیگی کی ان گنت کہانیاں بکھری پڑی تھیں۔

☆☆☆

رجب علی اور اس کے چاروں بچوں میں تعلق ٹوٹے کئی سال ہو چکے تھے۔

رجب علی اور ثمینہ کی جائے سکونت مارگیٹ ایک ساحلی مقام تھا۔ نہایت پرسکون، خاموش اور رومان پرور مقام۔ "ثمینہ کاٹیج" ساحل سمندر سے ایک ڈیڑھ منٹ کی پیدل مسافت پر ہونے کے باعث سمندر کا دھیما دھیما شور دن بھر کاٹیج تک پہنچتا رہتا۔ گھر کا کچن بالائی منزل پر تھا اور کچن کی کھڑکی سمندر کے رخ پر کھلتی تھی۔ کچن میں کام کرنے والے کی نظر بار بار سمندر کی طرف جاتی۔ ساحل پر ہمہ وقت موجود افراد اور سطح سمندر پر ڈولتے بجرے ثمینہ کو رجب علی اور رابیل کی عدم موجودگی میں بھی تنہائی کا زیادہ احساس نہ ہونے دیتے۔ مرغابیاں دن بھر سمندر کے رنگ بدلتے پانی پر نیچی پرواز کیے جاتیں، اپنے پر بھگوتیں، پھڑپھڑاتیں اور ساحل پر موجود افراد کی جانب سے اپنی ضیافت کی منتظر رہتیں۔ سمندر کی موجوں سے اٹکھیلیاں کرتی مرغابیاں کاٹیج کے دریچوں میں رکھی رکابیوں میں موجود سامان ضیافت سے لطف اندوز ہونے کو ہوا میں تیرتی ہوئی دریچوں میں آ بیٹھتیں تو ثمینہ ان سے باتیں کرنے لگتی۔

"تمہارے ڈیڈی بریڈ لائے تھے، میں نے تمہارے لیے رکھ دی ہے..... کھا لو..... اور ہاں، کل بسکٹ ادھر ادھر کیوں پھیلا گئی تھیں؟ مجھے ونڈو صاف کرنا پڑی۔ خیر، صاف تو روزانہ ہی کرتی ہوں..... مگر تم بھی ذرا خیال رکھا کرو، چونچیں تمیز سے مارا کرو۔"

مرغابیاں چلاتیں تو ثمینہ کو یوں لگتا جیسے اس کی ہدایت کے جواب میں کہہ رہی ہوں۔ "اوکے..... اوکے

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

مادام..... آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

رجب علی صبح کو کام پر جانے سے پہلے دریچوں میں مرغابیوں کا کھانا رکھے ہونے کا اطمینان ضرور کرتا۔

رابیل کہتی۔ "ڈیڈی! آپ سی گلز کا اتنا خیال کیوں رکھتے ہیں؟"

"بیٹا جی! اللہ میاں ہم انسانوں کو جو رزق دیتے ہیں، اس میں پرندوں اور جانوروں کا بھی حصہ ہوتا ہے..... ہمیں ان کا حصہ دینا چاہیے۔"

موسم گرما میں جو پاکستان کے موسم گرما کی طرح گرم نہ ہوتا، ساحل سمندر پر صبح سے رات تک رونق لگی رہتی۔ سیر و تفریح کے لیے آنے والوں کی ٹولیاں جوق در جوق ساحل پر پہنچتی رہتیں۔ ان سیاحوں کے طفیل ساحل سے بلندی پر متصل رہائشی علاقے میں ہوٹلز، موٹیلز، کیفے اور ریستورانوں کی چاندی ہو جاتی۔ دور دراز سے آنے والے بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کی سہولت ڈھونڈتے، ساحل سے پرے شاپنگ سینٹرز میں خریداروں کا ہجوم رہتا۔ ٹیکسی ڈرائیورز ایک سواری اتارتے، دوسری بٹھاتے۔

موسم سرما میں شدید سردی اور برف باری کے دوران تو ساحل کی رونق ماند پڑ جاتی۔ مرغابیاں اپنی پُرسوز آواز میں ساحل کی نم اور نرم ریت پر فش اینڈ چپس، برگر، سینڈوچ، کیک اور ٹوسٹریز کی باقیات ڈالنے والوں کو پکارنے لگتیں۔ سرد موسم میں ساحل پر دور تک پھیلے سناٹے میں سمندر کا شور ایک درد بھری کیفیت کا غماز بن جاتا..... پیچھے رہ جانے اور چھوڑ کر جانے والوں کی یاد دل کو مغموم کر دیتی..... لیکن موسم سرما میں دھوپ نکلتے ہی ساحل پر تاحدِ نظر دھوپ تاپنے والوں کی انتہائی برہنگی انسانی تہذیب کے ابتدائی دور کے مناظر دکھلاتی۔

رجب علی موسم کی پروا کیے بغیر عموماً دن چڑھے گاڑی کی چابی اٹھاتا، سواریوں سے ملنے والی اجرت رکھنے کے لیے کپڑے کی مخصوص تھیلی ہاتھ میں لیتا اور کام پر نکل جاتا۔ رات گئے واپسی ہوتی۔ ویک اینڈ پر اور بھی دیر ہو جاتی، جب بے خانوں سے بے نوش جھومتے جھامتے، لڑکھڑاتے، سنبھلتے اور اول فول بکتے باہر نکلتے اور گھر جانے کے لیے ٹیکسی کے طلبگار ہوتے۔ کام دن میں بھی چلتا، کسی کو اسپتال جانا ہوتا، کسی کو بینک، کسی کو ایئرپورٹ سرجری تو کسی کو ائرپورٹ۔

حسبِ سابق رجب علی نے مارگیٹ میں بھی بعض سواریوں سے ایسے روابط استوار کر لیے تھے کہ موبائل فون کی سہولت میسر آنے کے باعث اکثر مستقل سواریاں اس سے فون پر رابطہ کر کے اسے بلا لیتیں۔ دور کا سفر درپیش ہوتا تو کبھی ایک دو دن پہلے ہی یا ایمرجنسی میں رجب علی کی ظرافت کے منتظر بنگ ہو جاتی۔ رجب علی فارغ نہ ہوتا تو انتظار کرنے کو کہتا یا معذرت کر لیتا۔ کم فاصلے پر جانے والی سواریوں کی نسبت رجب علی طویل فاصلے والی سواریاں اٹھانے کو ترجیح دیتا۔ دور کے سفر میں پیسے بھی اچھے بن جاتے اور اکثر بخشش بھی مل جاتی۔

گھر میں ثمینہ کا وقت امورِ خانہ داری نمٹانے، رابیل کی نت نئی فرمائشیں پوری کرنے یا ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے رہنے میں گزرتا۔ سلسلہ وار ڈرامے دیکھنے میں اچھا وقت گزر جاتا۔ موڈ ہوتا تو وہ کبھی اکیلی، کبھی رابیل کے ساتھ ساحل پر چہل قدمی کرنے چلی جاتی۔ رابیل اسکول میں ہوتی تو ثمینہ کی ترجیحی مصروفیت ٹاؤن سینٹر میں دکان در دکان ونڈو شاپنگ اور کبھی سیل میں لگی کوئی چیز خرید کر حسبِ موقع کسی کو بطور تحفہ دینے کے لیے رکھ لینا ہوتی۔

رابیل نے دو چار سہیلیاں بنالی تھیں۔ کبھی انہیں اپنے گھر بلا لیتی، کبھی خود ان میں سے کسی کے گھر چلی جاتی، کبھی ساری سہیلیاں مل کر اکٹھے سیر و تفریح کا پروگرام بنا لیتیں۔

رجب علی کے چاروں بچے جب تک ساتھ تھے، رابیل سے بہت پیار کرتے تھے۔ ثمینہ سے ان کے تعلقات کی نوعیت کچھ ہی رہی، رابیل پر چاروں جان چھڑکتے تھے۔ اس کا لاڈ اٹھاتے، اسے اپنے ساتھ گھمانے پھرانے باہر لے جاتے، اس کی پسند کی چیزیں اسے خرید کر دیتے۔ دل کو دل سے راہ کے مصداق رابیل بھی ان سے محبت کرتی تھی بلکہ سمجھ دار ہو جانے کے بعد ان کی غیر موجودگی میں اکثر ثمینہ سے لڑ پڑتی۔

"آپ کی وجہ سے گھر چھوڑ کر گئے ہیں ڈیڈی کے چاروں بچے۔" رابیل بڑبڑاتی۔

"بکواس مت کر۔" ثمینہ اسے گھورتی۔

"میرا اتنی اکیلی ہو گئی ہوں۔" رابیل منہ بسورتی۔

"تو اکیلی ہی ہے..... میرے پیٹ سے پیدا ہونے والی اکلوتی اولاد۔"

"دو چار اور پیدا کر لیتیں نا۔"

"بے شرم۔"

جب تک رجب علی کے بچے ساتھ رہے، رابیل اپنی ہر بات ان سے شیئر کر لیا کرتی تھی۔ وہ گئے تو گھر میں اس کا کوئی رازدار نہ رہا۔ ثمینہ سخت مزاج ماں تھی، رابیل پر اچھی خاصی سختی رکھتی مگر اپنا دل اس نہیں تھا جہاں اولاد ماں باپ کی سخت سست سن کر بلکہ کبھی تھپڑ کھا کر بھی سر جھکا دیتی ہے۔

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

یہاں تو شخصی آزادی کم عمری ہی میں بچوں کو ماں باپ کے منہ کو آنے اور ان کی سختی پر بچوں کو پولیس بلانے اور قانون کا سہارا لینے کا اختیار دیتی تھی۔

رابیل وقت سے پہلے ہی خود کو اپنی عمر سے بڑا اور خود مختار سمجھنے لگی تھی۔ گھر سے باہر جانے سے پہلے وہ اکثر ثمینہ کو یہ بھی نہ بتاتی کہ کون سی دوست کے گھر جا رہی تھی اور کب واپس آئے گی۔ جاتے ہوئے بس اتنا کہتی۔ "مام! میں اپنی دوست کے پاس جا رہی ہوں۔"

"کس دوست کے..... اور کب واپس آئے گی تو؟"

ثمینہ اگر پوچھ لیتی تو وہ بگڑ کر کہتی۔ "زیادہ پوچھ گچھ نہ کیا کریں، میں چڑنے لگتی ہوں۔"

"ماں ہوں تیری۔"

"میں بھی بیٹی ہوں آپ کی، اگر ادھر اُدھر جانا ہوا تو بتا کر جاؤں گی۔" وہ بے باکی سے کہتی۔

ثمینہ تلملا کر رہ جاتی۔

اس کی اپنی ماں تو جب وہ سب پاکستان میں ہوتے تھے، بیٹا، بیٹی کسی سے بھی جواب سن کر پٹائی لگا دیتی تھی۔

رابیل دن بہ دن بے لگام ہوتی گئی۔ رات کو اکثر دیر سے گھر آتی۔ رجب علی کو اس کی اتنی فکر رہتی کہ دھندے کے دوران بھی جونہی گھر کے آس پاس سے گزرتا، گاڑی میں سواری نہ ہونے پر گھر میں جھانکنا نہ بھولتا۔

"رابی آ گئی؟" وہ ثمینہ سے پوچھتا۔

ثمینہ کا جواب اثبات میں ہوتا تو وہ مطمئن ہو جاتا لیکن جواب نفی میں ہونے کی صورت میں وہ اپنے موبائل فون پر ثمینہ کی جانب سے رابیل کے گھر واپس آ جانے کی اطلاع ملنے تک بے چین ہی رہتا۔ رابیل کو اکثر بڑے پیار سے سمجھاتا۔ "گھر جلدی آ جایا کرو بیٹا! تمہیں دیر ہو جائے تو تمہاری ماں پریشان ہونے لگتی ہے۔"

"ان کی تو عادت ہے۔"

"جب تو خود ماں بنے گی تو پوچھوں گی تجھ سے۔" ثمینہ سے گھورتی۔

"مام! میں اب بچی نہیں ہوں، بڑی ہو گئی ہوں۔ آپ لوگ میرے باہر آنے جانے پر اتنی پابندی کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟" رابیل کا اشارہ ماں کے ساتھ باپ کی طرف بھی ہوتا۔

"بیٹا! ہم تمہیں باہر آنے جانے سے منع نہیں کرتے مگر..... یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ تم کہاں ہو، کس کے ساتھ ہو؟ جہاں جاؤ، اپنی ماں کو بتا کر جاؤ..... دیر ہونے لگے تو فون کر دو کہ مام! مجھے دیر ہو جائے گی، فلاں وقت تک واپس آ جاؤں گی۔" بیٹی کو تحمل سے سمجھانا اور سختی سے بچنا رجب علی کی مجبوری تھی۔ جس معاشرے کا وہ اور اس کی اولاد حصہ بن چکے تھے، وہاں کچھ اچھائیاں تھیں تو بہت سی قباحتیں اور مجبوریاں بھی تھیں۔

ان قباحتوں اور مجبوریوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑتا تھا۔ رجب علی جس معاشرت سے اٹھ کر ایک غیر معاشرت میں آ بسا تھا، وہاں اخلاقی حدود و قیود تھیں۔ یہاں تو مار پدر آزاد دنیا تھی۔ وہ اولاد جسے گوری مائیں اور ذمے داری کا احساس رکھنے والے باپ بھی اپنے سینے سے لگا کر رکھتے تھے، ہوش پکڑتے ہی بے لگام ہو جاتی۔ ٹین ایج میں آتے ہی بچوں کے پر نکلنا شروع ہو جاتے، آزادی اور خود مختاری کی خواہش دل میں جڑ پکڑ لیتی۔ ماں باپ کو چھوڑتے اور اپنی راہ پر نکل لیتے۔ سود و زیاں کی چنداں فکر نہ ہوتی۔

متحدہ سلطنت برطانیہ میں موسم سرما کی جولانی ان دنوں ہر سال کی طرح اپنے شباب پر تھی۔ گوری چمڑی والے سیانوں نے عقل و ذہانت کو استعمال کر کے موسم کی سختیوں کو زیر کرنے کے سامان پیدا نہ کر لیے ہوتے تو گرم ملکوں کی متعدد ذی ارواح کی طرح سرد ممالک میں بھی موسم سرما میں زندگی کونوں کھدروں میں دبکی لمبی نیند میں پڑی رہتی۔

موسم ہی پر کیا منحصر، مغرب کے سیانوں نے اپنے لیے ہر معاملے میں سہولت پیدا کر لی تھی اور ملکہ کی راجدھانی کی تو بات ہی کیا تھی۔ دنیا کے دور دراز خطوں سے لوگ قانونی اور غیر قانونی ہر دو طریق سے اس سرزمین کی طرف یوں کھنچے چلے آتے تھے جیسے محبوب حسینہ کی طرف اس کے عشاق۔

دن چھوٹے ہو گئے تھے، راتیں بڑی۔ سمندر جس نے برطانیہ عظمیٰ کو نہایت پیار سے اپنی آغوش میں سنبھال رکھا تھا، سرد موسم میں اپنے عشاق کی بے مہری پر ٹھنڈی آہیں بھرے جاتا۔ ساحلی تفریح گاہوں کو ان دنوں چپ سی لگی تھی۔ مارگیٹ کا ساحل بھی ویران تھا۔

رات ہو چکی تھی، ٹاؤن سینٹر میں کہنا بھی معدوم ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ خمیدہ سڑک کے دونوں پہلوؤں میں جا بجا روشن برقی کھمبوں کی زرد روشنی نے اردگرد کے ماحول کو پراسراریت میں لے رکھا تھا۔ بس اسٹاپ پر تین چار افراد بس کے انتظار میں تھے۔ سمندر کے مدوجزر کا دھیما دھیما شور ساحل سے بلندی پر آباد رہائشی علاقے تک سنائی دے رہا تھا۔ سڑک ویران تھی، مے خانے روشن، ٹیکسی رینک پر قطار میں کھڑی ٹیکسیوں کے ڈرائیور اپنی اپنی گاڑی میں دبکے سواریوں کے منتظر تھے۔ رجب علی بھی دبیز

https://www.urdutubes.com/

Scanned with CamScanner

digest library.com

جیکٹ، گرم پتلون اور اونی ٹوپ پہنے اپنی دونوں بغلوں میں ہاتھ دبائے سواری کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ گاڑی کا ہیٹر اس نے ذرا دیر پہلے بند کر دیا تھا۔ موسم کی شدت اسے اپنی گاڑی سے نکل کر ساتھی ٹیکسی ڈرائیوروں سے گپ شپ کی اجازت دینے میں مانع تھی ورنہ اپنے ہم عمر ساتھیوں کا وہ دوست اور جوان عمر ٹیکسی ڈرائیوروں کا ایسا مربی و راہنما تھا جسے ٹیکسی اڈے پر ہونے کی صورت میں اس کے ہم پیشہ ساتھی گھیرے ہی رکھتے تھے۔

زندگی کی بھٹی نے رجب علی کو تپا تپا کر کندن بنا دیا تھا۔ پردیس میں لمبا سفر کاٹ کر وہ دیس میں بیٹھے اپنے ہی جیسے ان پڑھ ہم عمروں سے کہیں زیادہ تجربہ کار، باشعور اور دانشمند ہو گیا تھا۔

موسم دوست نواز ہوتا تو رجب علی سواری کے انتظار میں گاڑی کے اندر بیٹھنے کے بجائے باہر کھڑا ہونے اور ساتھیوں سے گپ شپ کو ترجیح دیتا مگر اس روز شدید ٹھنڈ کے باعث اشاروں میں ایک دوسرے سے ہیلو ہائے ہوئی۔ رجب علی اب جوان نہ تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بالوں میں سفیدی آ چکی تھی۔ اس عمر میں لگی ٹھنڈ بندے کو اپنے ساتھ ہی لے جاتی ہے۔ رجب علی کو جانے سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ جانا تو ایک نہ ایک دن ٹھہرا اٹل ہوا تھا، اسے معذوری اور محتاجی سے خوف آتا تھا۔ بندہ پلنگ پر پڑ جائے تو زندگی عذاب اور سنبھالنے والے بھی بیزار۔

جانے کا کیا تھا..... بچوں کے جانے کے بعد پاکستان گئے اور واپس آئے بھی اسے پانچ چھ سال ہو گئے تھے اور ان پانچ چھ برسوں میں اس کے دونوں بھائی، بھاوجیں، آپا، آپا کا شوہر اور منجھلی آگے پیچھے گزر گئے تھے بلکہ بہن بھائیوں کے بچوں میں سے بھی چار پانچ وقت سے پہلے ہی چل بسے تھے..... مگر نہیں..... وقت سے پہلے بھلا کون جاتا..... جب جس کا جانا لکھا گیا، وہی اس کے جانے کا وقت ہوتا ہے۔

سخت سردی میں ثمینہ لانبا فرکوٹ پہنے، سر پر اونی اسکارف لپیٹے ٹیکسی ریک پہنچی اور اس نے رجب علی کی ٹیکسی تلاش کر کے اگلی کھڑکی کے شیشے کو کھٹکھٹایا۔ رجب علی اسے دیکھ کر چونک گیا۔ شیشے پر دستک سن کر وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

"رانی چلی گئی۔" رات کے وقت اس کی آمد کا سبب پوچھنے سے پہلے ہی ثمینہ نے روتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

ثمینہ نے ایک کاغذ رجب علی کو تھما دیا۔ اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں رجب علی نے کاغذ پر درج عبارت پڑھی۔

"پیاری ماما اور ابا! میں گھر سے جا رہی ہوں..... ارجیت کے ساتھ۔"

ارجیت، رجب علی کے پڑوس میں رہنے والی رانیل کی دوست امرکور کا بھائی تھا۔

ثمینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رجب علی نے اس کے شانوں پر اپنا بازو دراز کر کے اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور گاڑی کے سامنے سے گزار کر اسے اگلی نشست پر بٹھا دیا۔ اسے خود اپنی ٹانگوں سے بھی جان جاتی لگ رہی تھی، بصارت دھندلا رہی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ ثمینہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اسے اپنا دل ساکت ہوتا لگ رہا تھا۔

"مر گئی ہوتی تو اچھا تھا۔" ثمینہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی پھر قدرے توقف سے بولی۔ "میں مر جاؤں گی۔"

رجب علی نے اپنا ہاتھ ثمینہ کے شانے پر رکھ دیا۔

"کسی کے جانے سے کوئی نہیں مرتا.....!" رجب علی کو خود اپنی آواز کسی اندھے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔ "نشاط گئی، میں نہیں مرا..... نگار گئی، میں نہیں مرا..... طیب اور نجف گئے، میں زندہ رہا..... گل شہوار گئی، میں جی رہا ہوں..... رانی کے جانے سے نہ تم مرو گی، نہ میں۔" رجب علی کا حوصلہ یکلخت جواب دے گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور یکلخت سسکنے لگا۔

رجب علی سے شادی کے بعد سترہ اٹھارہ برسوں میں ثمینہ اسے پہلی بار روتے دیکھ رہی تھی۔

رجب علی کو اتنے صدمے میں دیکھ کر ثمینہ اپنا دکھ بھول گئی۔ اس نے رجب علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے بولی۔ "جانے دیں..... مر جانے..... مجھے پروا نہیں۔"

مگر رجب علی جانتا تھا کہ ثمینہ ایسا اس کا دل رکھنے، اسے حوصلہ دینے کو کہہ رہی تھی..... رانیل تو اس کے دل کی دھڑکن تھی۔

ایسا ہونا تھا..... ہونا ہی تھا۔

مکافاتِ عمل!

رجب علی کے چار بچوں کے لیے اپنے دل کی لگن تنگ کرتے ہوئے ثمینہ نے کب سوچا ہو گا کہ ایک دن اس کی جگر گوشہ بھی گھر سے چلی جائے گی۔

خوشحال زندگی کی چاہ میں بیرونِ ملک جانے والے نوجوان کی مسافرت کا احوال آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے

https://www.urdudigest.com/

Scanned with CamScanner